کشمیر میں اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز۔ سرینگر

کشمیر میں اردو

(دوسرا حصّہ)

پروفیسر عبدالقادر سروری

ترتیب
محمّد یوسف ٹینگ

جموّں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر

ناشر ـــــ سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر

مطبع ـــــ جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

چھاپ ـــــ ۱۹۸۲ء

کتابت ـــــ محمد یوسف، گلزار احمد

قیمت ـــــ

سرِورق ـــــ کشمیر کا پہلا عوامی اخبار "بدیا بلاس" ـــــ

ترتیب

مکمل فہرست مفت طلب فرماویں

دی کشمیر کواپریٹو

سوسائٹی

سری نگر کشمیر

شال

پشمینہ

لوئیاں

نمدے

قالین

پوستین

نقاشی

ایک سعادت مند ڈاکٹر

۱۹۱۴ء میں 'الہلال' میں شائع شدہ ایک اشتہار

میں بھی اپنے والد بزرگوار کو دیکھ رہا ہوں +

پنڈت سالگرام کول سالک کے نام مہاراجہ ہری سنگھ کا ارسال کیا ہوا ایک خط

لوح مزار منشی سراج الدین

نگین باغ سرینگر میں مولانا شبلی کی عارضی قرارگاہ

کشن سمیلپوری

لالہ ملک راج صراف

دیوان نرسنگھ داس نرگس

ٹھاکر پونچھی

ذات نامۂ سروری

میری ولادت سنہ ۱۹۰۶ء، ۱۹ اگست کو شہر حیدر آباد میں ہوئی۔ میرے والد حضرت حاجی محمد سرور کو منصب سے کچھ حصہ ملتا تھا۔ جو بعد میں موعود الخدمت ہوگیا تھا۔ دادا حضرت محمد جعفر قبلہ قدہٗ سرہٗ ایک تارک الدنیا باخدا بزرگ تھے جن کے اجداد میں ایک بزرگ حضرت سرور سلطان قدس سرہٗ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اسلاف عرب سے کشمیر ہوتے ہوئے دہلی آگئے تھے۔ بعد میں ان کی اولاد عالمگیر کے عہد میں دکن چلی آئی۔ عالمگیر کے عہد سے اس خاندان کے افراد دکن ہی میں رہ گئے۔

میرے خاندان کے افراد کو فقر کے علاوہ دینی علوم اور عربی و فارسی سے گہرا لگاؤ رہا۔ چنانچہ میرے بڑے بھائی مولانا محمد جعفر مولوی کامل عربی اور فارسی کے سربرآوردہ عالم تھے۔ جامعہ نظامیہ میں شعبۂ الادب عربی کی خدمت عرصہ تک انجام دی۔ اس کے بعد وہ محکمۂ تعلیمات میں منتقل ہوگئے تھے۔ ان کے شاگردوں میں سے اکثر اعلیٰ علمی عہدوں اور مراتب پر پہنچے۔

میری والدہ کا خاندان حیدر آباد کے دیہات سے تعلق رکھتا تھا۔ خود والدہ پڑھی لکھی نہ تھیں لیکن مذہبی امور اور اشغال میں انہیں غلو کا درجہ حاصل تھا۔ وہ حیدر آباد کے مشہور پیرِ طریقت حضرت سید شاہ محمد عمر قبلہ قدس سرہ سے بیعت تھی۔ جن کے مرید میرے والد بھی تھے۔

میں نے قرآن کی تعلیم مدرسہ مقبرۂ زمان خان شہید میں حاصل کی اور فارسی کی تعلیم گھر پر بڑے بھائی اور والد مرحوم سے پائی۔ ابتدائی تعلیم کے لئے مدرسہ منصبداران میں داخل کیا گیا۔ انگریزی تعلیم مدرسہ مفید الانام میں شروع ہوئی۔ جہاں سے مڈل کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے لئے سٹی ہائی اسکول میں داخل کیا گیا اور ۱۹۲۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوا۔ اور انٹرمیڈیٹ بی۔ اے اور ایم۔ اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۲۸ء میں میرا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی میں بہ حیثیت مددگار پروفیسر اور لیکچرار اُردو فارسی عمل میں آیا۔ ۱۹۴۲ء میں میرا تقرر پروفیسر اُردو اور صدر شعبہ اردو فارسی و عربی کی خدمت پر جامعہ میسور میں ہوا۔ ہندی کے شعبہ کی نگرانی بھی میرے تفویض تھی۔ یہ خدمت میں نے ۱۹۴۷ء تک انجام دی۔

۱۹۴۷ء میں جامعہ عثمانیہ کے اُردو پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی اور مجھے صدر شعبہ کی حیثیت سے واپس طلب کر لیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر اُردو اور صدر شعبہ کی جگہ پر مجھے ترقی ملی اور اس خدمت کو میں ۱۹۶۱ء تک انجام دیتا رہا۔ جامعہ عثمانیہ میں دوسری یونیورسٹیوں کے برخلاف پروفیسروں کی سبکدوشی پچپن ۵۵ برس کی عمر میں ہوتی ہے۔ وظیفے پر سبکدوشی کے بعد تقریباً ایک سال تک اعزازی پروفیسر اور صدر شعبہ اُردو کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔

۱۹۶۲ء میں اس خدمت سے سبکدوش ہوا اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے تحقیقاتی کام کے لئے اعزازی نیشنل پروفیسر کے عہدہ پر مامور کیا۔

۱۹۶۳ء میں میرا تقرر جموں اور کشمیر یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ میں پروفیسر اُردو اور صدر شعبہ اُردو اور فارسی کی خدمت پر عمل

میں آیا۔ چنانچہ اس وقت بھی خدمت انجام دے رہا ہوں۔

جن علمی اور ادبی اداروں سے میرا تعلق رہا ہے اس کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:۔

۱۔ موسس رکن ادارہ ادبیات اُردو، حیدر آباد۔ دکن۔

۲۔ موسس رکن و اعزازی معتمد مجلس تحقیقات اُردو۔ حیدر آباد۔ دکن۔

۳۔ رکن اکیڈمک کونسل و سینٹ عثمانیہ میسور وجموں وکشمیر یونیورسٹی۔

۴۔ صدر مجلس نصاب عثمانیہ میسور وجموں وکشمیر یونیورسٹی۔

۵۔ صدر مجلس نصاب اُردو جامعہ علی گڈھ، مدراس وکرم و جبلپور۔

۶۔ رکن لینگویج اکیڈیمی کا وسنز یونٹ۔ اسمبلی ہند۔

۷۔ معتمد اعزازی انجمن اساتذہ اُردو جامعات ہند۔

۹۔ رکن مجلس مشاورت اُردو ساہتیہ اکادمی ہند۔

۱۰۔ رکن مجلس ترجمہ اُردو دستور ہند۔

۱۱۔ رکن مجلس مشاورت "آجکل" دہلی

۱۲۔ رکن مجلس مشاورت "شیرازہ" سری نگر

تصانیف اور تالیفات کی فہرست ذیل میں درج ہے:۔

۱۔ جدید اُردو شاعری ۱۹۲۹ء مابعد ایڈیشن ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۳ء، ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء، ۱۹۶۰ء

۲۔ دُنیائے افسانہ ۱۹۲۶ء ۳۔ جامعہ عثمانیہ میں اُردو مخطوطات کی تفصیلی فہرست۔ ۴۔ کردار اور افسانہ ۱۹۳۵ء۔ ۵۔ حیدر آباد کی تعلیمی ترقی ۱۹۳۴ء۔ ۶۔ دُنیا کے شاہکار افسانے قدیم افسانے ۷۔ پھول بن ۱۹۳۹ء ۸۔ سراجِ سخن۔ ۹۔ کلیاتِ سراج ۱۹۴۰ء۔ ۱۰۔ قصہ بے نظیر۔ صنعتی ۱۹۳۸ء ۱۱۔ اُردو مثنوی کا ارتقاء ۱۹۴۰ء۔ ۱۲۔ سراج اور انکی شاعری ۱۹۴۱ء۔ ۱۳۔ مراۃ الاسرار۔ شاہ صدرالدین ۱۹۴۴ء۔ ۱۴۔ مہتابِ سخن، مجموعہ کلام لالہ مہتاب رائے سبقت۔ سریرنگاپٹن۔ میسور۔ ۱۹۴۵ء۔

عرضِ ناشر

اس کتاب کا پہلا حصّہ پچھلے برس شایع ہو کر کشمیر شناسی کے ادب کا ایک حصّہ بن چکا ہے۔ اس حصّے میں مصنّف پروفیسر عبد القادر سروری مرحوم نے اپنے اصل موضوع یعنی کشمیر میں اُردو کی گویا تشبیب باندھی ہے اور اس مختلف اللّسان ریاست کی قدیم اور جدید زبانوں کا ذکر کر کے اُردو کے طلوع اور عروج کی داستان بیان کرنے کا منظر نامہ تحریر کیا ہے۔ زیرِ نظر جلد میں وہ بیک وقت گریز اور توصیف، بلکہ تفصیل کے مراحل سے گذرتے ہیں اور اس لحاظ سے تین جلدوں میں شایع ہونے والی کتاب کا سب سے معلومات افزا اور قیمتی حصّہ ہے۔

سروری ایک بڑے دِقت طلب اور دقیق بین مُحقّق تھے۔ اس کا اندازہ زیرِ نظر جلد کے تقریباً ہر صفحے کے مطالعے سے ہوگا۔ انھوں نے کشمیر میں اُردو کے ابتدائی آثار کی تلاش میں دفتروں کے دفتر چھان مارے ہیں۔ وہ اپنا قصّہ مُغل دور سے بھی پہلے شروع کرتے ہیں، پھر مُغلیہ دور میں اردو کا اُفق آہستہ آہستہ کھُلنے لگتا ہے اور ڈوگرہ وقت میں اس کی صبحِ صادق نمودار ہو جاتی ہے۔ سروری، اپنا بیانیہ دورِ حاضر تک لاتے ہیں، اور اس جلد میں دینا ناتھ نادمؔ، مرزا عارفؔ، پریم ناتھ بزازؔ اور غلام احمد کشفیؔ تک لے آتے ہیں۔ جو ابھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔

کشمیر میں اُردو کی ارتقاء کی کہانی کا مطالعہ کرنے والوں کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ کشمیر کے دورِ ظُلمت میں جو انیسویں صدی کی ابتدا سے اس کے وسط تک خاص طور

پر بے حد قہر ساماں رہا۔ یہاں منشی دیا رام کا چرو خوشدل جیسے شاعر موجود تھے۔ جو اُردو کے ایسے موتی سے شعر نکال سکتے تھے۔ ع

آئے تھے مثلِ صبا ہم سیرِ گلشن کر چکے
لے لو مالی باغ اپنا، ہم تو اپنے گھر چلے

گُلاب سنگھ نے جب ۱۸۴۶ء میں کشمیر کو خریدا تو فارسی کا لُٹا ہوا ہاتھی پھر بھی سوا لاکھ کا تھا۔ فارسی یہاں ایک ترقی پذیر اور استقبال آگاہ تمدن کے جسم میں آئی تھی۔ لیکن اب اُس کی نسیں سُکڑ گئیں تھیں۔ جاگیرداری سماج پر سرمایہ دارانہ نظام کے حملے کے ساتھ ہی بڑی بی فارسی کا جاگیرداری پلنگ بوسیدہ ہونے لگا۔ اور یہ چھوٹی بی اُردو کو اپنی چابیاں سُپرد کر کے آنکھیں موندنے لگی۔ اگرچہ رسمی طور پہ دلی دربار نے ۱۸۳۷ء میں فارسی کی جگہ اُردو کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا لیکن اُردو اس سے پہلے عوامی دلوں کی سرزمین پر اپنے خیمے گاڑ چکی تھی اور یہ حکم ایک لمبے عمل کی محض رسم توثیق تھا۔

اُردو کشمیر میں فارسی کی ہٹی اور تازہ صنعتی انقلاب کا ایک تازہ جھونکا بن کر آئی۔ مرزا غالب نے انگریزوں کی ہندوستان کو دین کے سلسلے میں اور باتوں کے علاوہ ــــ "حرف چوں طائر بہ پرواز آمدہ" کا خاص ذکر کیا تھا۔ ریاست جموں و کشمیر میں تار برقی کے پہلے پیغامات اُردو زبان میں ہی موصول ہوئے۔ ریاست میں پتھر کا پہلا چھاپہ خانہ بھی انیسویں صدی کے وسط میں ہی قائم ہوا۔ اور پھر بیسویں صدی تک آتے آتے یہاں کا سارا سرکاری کاروبار اُردو میں چھپنے اور چلنے لگا۔ یہاں تک کہ ڈوگرہ سرکار کا سب سے با اختیار ادارہ یعنی اعلیٰ کونسل (کابینہ) کی کاروائی اُردو میں ہی قلم بند کی جانے لگی۔ چنانچہ ہمارے پاس اس روئیداد کے اصل نسخے موجود ہیں جن پر ادر عابدین کے علاوہ مہاراجہ کے بھی دستخط ہیں جو اُردو کے نہایت خوش خط منشیوں کی تحریر میں ہیں۔ اس سطح پر کیا شکل و صورت تھی اُس کا اندازہ اس مختصر اقتباس سے ہوگا۔ "تحریر ہوئے کہ اصولِ

مندرجہ (۳) دستور العمل کو مکرر منظور کرتے ہوئے راجہ بلدیو سنگھ صاحب راجہ پونچھ کو دربار کی تحریری اجازت پیشتر حاصل کرنے کے بغیر کسی شخص رعایا انگریزی کو مبلغ چالیس روپے ماہوار سے زیادہ پر ملازم رکھنے کا اختیار نہیں ہے۔" کارروائی مورخہ ۲۷۔ اگست سنہ ۱۹۰۰ء بمقام سری نگر۔ ———————— اُس دور میں اُردو کا کشمیر میں ایک اور بڑا کارنامہ یہ رہا کہ وہ یہاں انقلاب اور نجات کا پیغام لے کر بھی آئی۔ اور ان کے اظہار کی آواز بھی بن گئی۔ پنجاب میں اُردو صحافت پچھلی صدی کے آخری وسط میں برگ و بار لائی تھی۔ ان اخبارات میں کچھ تو کشمیریوں کے ہاتھوں میں تھے۔ (جیسے "اخبارِ عام" لاہور)۔ ان اخبارات میں کشمیر پر بھی توجہ ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نشریات کشمیریوں کا ذہنی لمس پاکر ایک نئی اُتھل پُتھل کی بشارت دے رہی تھیں۔ چنانچہ کشمیر میں باقاعدہ سیاسی بیداری کا عنوان اُردو صحافت نے ہی تحریر کیا۔ رنبیر سنگھ کی کشمیری پنڈتوں کے ایک طبقے سے ٹھن گئی اور اُس کے پس منظر میں سیاسی اور اقتصادی دونوں وجوہات کارفرما تھیں۔ کشمیری پنڈت وادی کے سب سے تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ مسلمانوں کی آمد اور استقلال کے ابتدائی جھٹکوں کے بعد سُلطان زین العابدین کے زمانے میں ان کی حالت نے پھر سنبھالا لیا۔ اور یہ اپنے قلم کے پتواروں سے امورِ خسروی کا سفینہ رواں رکھتے رہے۔ جموں کے حکمران خاندان نے وہاں کے نسبتاً نو آموز اقارب اور بیرونِ ریاست کے یقینی طور پر زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کو کشمیر کی انتظامیہ میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ کشمیری پنڈتوں کو اپنی روزی اور روٹی کے لالے پڑنے لگے۔ اُدھر پنجاب میں قومی تحریکوں کے اُبھار نے دلوں میں جولانیاں پیدا کرنا شروع کر دیں۔ چنانچہ اس مرحلے پر کشمیریوں کے جذبات کی ترجمانی ہرگوپال خستہ نے کی۔ اُس نے کشمیر کے قحطِ عظیم میں رنبیر سنگھ کی انتظامیہ کی کارستانیوں کی کڑی نکتہ چینی کی اور یہ آواز اُردو کے اخبارات، ریفارمر، خیر خواہ، راوی وغیرہ کے صفحات سے ہی بلند کی گئی۔ اس شور و شیون سے جموں و کشمیر کی

حکومت اس قدر زِچ ہو گئی کہ آخر کار خستہ کو باہو قلعے میں پابہ جولاں کر دیا گیا۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ خستہ کو عوام نواز آواز کا جواب بھی لکیر کے فقیر ایک کشمیری پنڈت راجہ کول عرض بیگی دیری نے دیا۔ یہ مصاحب صفت مداحی اُردو میں سما نہ سکی اور اس لئے فارسی میں تحریر ہوئی۔

ایک طرف تو یہ صورت تھی دوسری طرف لاہور میں علامہ اقبال کشمیریوں کے بے پناہ حُزن کو اپنے اشعار کے نگینوں میں سمو رہے تھے۔

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا
توڑ اُس دستِ جفا کیش کو یا رب جس نے
روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

لیکن احتجاج کے ساتھ آرزو مندی کی شمع بھی اُردو کے ہی شمعدان پر جل رہی تھی۔ اگرچہ شبلی نعمانی کو کشمیر کی ہوا راس نہ آئی۔ لیکن محمد حسین عارف، جسٹس شاہ دین ہمایوں اور خوشی محمد ناظر کی کشمیر پر لکھی ہوئی نظمیں کشمیر کے خوبصورت ترین قصیدوں میں شمار کرنے کے قابل ہیں۔ اس صدی کی ابتدا سے اس کے نصف وسط تک کشمیر میں اُردو کا زرّیں زمانہ تھا۔ اور اس زمانے کی ساری جھلکیں سروری نے بڑی تفصیل سے بیان کی ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت کشمیر اُس علاقے کے کشش ثقل کے مدار میں تھی۔ لاہور اس نظام شمسی کا مرکز تھا اور اُردو کا چڑھتا ہوا دریا کشمیر میں بھی کوہ و دمن سے ٹکرا رہا تھا۔ تقسیم کے بعد جہاں اس دریا کے سوتے خشک ہو گئے وہاں خود ریاست میں سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کے حقوق کا چرچا ہونے لگا اور اُردو تخلیقی سطح پر علیحدہ ہونے لگی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب میں کچھ ایسے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے نام اور اُن

کے کلام کے نمونے مل جاتے ہیں کہ ان ادیبوں اور شاعروں کا نام اب اسی کتاب کی وجہ سے تاریخ ادب کے حافظے میں رہ سکے گا۔ اس طرح سے یہ کتاب ایک سفینۂ نوح ثابت ہوگی ہے کہ جو بھی اس میں سوار ہوا، قعر گمنامی میں ڈوب جانے سے بچ گیا۔

سروری کی اس تصنیف کو تنقید سے زیادہ تاریخ اور تذکرے کی ذیل میں شمار کیا جانا چاہیئے۔ انہوں نے عام طور پر مداحی اور توصیف کے دریا اس افراط سے بہائے ہیں کہ جو بھی اس تصنیف کے گھاٹ پر آ نکلا، خوشحال اور مالامال ہو کے چلدیا۔ یہ ایک نقاد کا نہیں بلکہ ایک ہمدرد کا روّیہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہیں کہیں تجربات و تفصیلات کو زیب داستاں کرنے میں کچھ زیادہ ہی فیاضی سے کام لیا ہے۔ لیکن محقق اور تذکرہ نگار کے حق میں یہ خامی نہیں بلکہ خوبی بن جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شغف اور شوق سے یہ خرمن اکٹھا کر دیا۔ اس کی درجہ بندی اور مقام شناسی تو ہوتی ہی رہے گی۔

بعض مقامات پر سروری سے چوک بھی ہوئی ہے، مثلاً وہ ۱۹۳۱ء کی تحریک کشمیر کے ضمن میں کہتے ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے اُس وقت تحریک آزادی زندہ رکھنے کیلئے بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق مرحوم کو لاہور بھیج دیا، تسامح ہے۔ کیونکہ ۱۹۳۱ء میں دونوں حضرات سیاست کے منچ پر موجود نہ تھے۔ دراصل سروری ۱۹۴۶ء کی بات کرتے ہیں۔

اس کتاب کی تیسری اور آخری جلد اگلے سال شایع کی جائے گی جس میں ہم عصر اُردو ادیبوں اور شعراء کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ کتاب کی تکمیل کے بعد یقیناً کشمیر کے دبستانِ اُردو کے متعلق ایک واضح تر اور بہت روشن صورت منظر عام پر آجائے گی۔

اس کتاب کے لئے بعض نادر تصاویر بہم کرنے کے لئے میرے ساتھ ہمارے پبلیکیشن انچارج بشیر اختر نے کافی لگن سے کام لیا ہے۔ میں اُن کا شکر گذار ہوں۔

محمد یوسف ٹینگ

سری نگر ۷۔ نومبر ۱۹۸۲ء

پیش گفتار

پروفیسر عبدالقادر سروری کی تصنیف "کشمیر میں اُردو" کا دوسرا حصہ پیشِ خدمت ہے۔

سروری کی شاندار تصنیف کا پہلا حصّہ اکادمی کی طرف سے پچھلے سال شایع ہوا ہے۔ اُس جلد کو سروری نے کشمیر میں اُردو کی آمد اور اُبھار کا پس منظر اُجاگر کرنے کے لئے لکھا ہے۔ ایک دیدہ ور ادب شناس اور ماہرِ لسانیات کی حیثیت سے وہ یہ بات جانتے تھے کہ ایک نئی زبان کا چلن اور اُس میں ادب کی تخلیق کوئی الگ تھلگ وقوع نہیں ہو سکتا۔ — یہ ایک تہذیبی عمل کا تسلسل ہوتا ہے اور اُس کے تانے بانے اردگرد کے تواریخی، سیاسی، سماجی اور لسانی حقایق سے جُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب ان تقاضوں کے زیر اثر مختلف نسب کی زبانیں اور مختلف اقسام کے ذوق ایک دوسرے کے ساتھ ہم بغل ہونا شروع کر دیں تو ایک نئی تہذیبی تولید کے سامان بہم ہو جاتے ہیں۔ اُردو تو خیر، اپنی خصلت میں ہی دو تہذیبی دھاروں کے معاشقے کی خوبصورت اولاد ہے۔ کشمیر میں اس کی آمد اور پیشقدمی بڑے زمانے تک محدود رہی اور اُس کی وجہ صرف کشمیر کا جغرافیہ نہیں ہے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ کسی قوم کی تواریخ اُس کی جغرافیہ کے بندھنوں میں جکڑی رہتی ہے۔ کشمیر کے آبِ حیات

تک پہنچنے کے لئے اُس کے دُشوار گُذار راستوں کے ظُلمات سے گذرنا پڑتا ہے۔ اُردو جب حیدرآباد دِلّی۔ لکھنو اور لاہور کی موافق آب و ہوا میں پنپ رہی تھی۔ اُس وقت بھی شرفأ یا زیادہ سے زیادہ بگڑے نوابوں کی زبان تھی۔ مُہم بازوں یا حکمرانوں کی نہیں۔ اسی لئے میرؔ اور غالبؔ کے یہاں کشمیر کا ذکر اور اس کی توصیف تو نظر آتی ہے لیکن خود انہیں کیا' ان کے زیادہ فارغ البال ہم عصروں یا شاگردوں کو کشمیر آنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ بڑے ادیب اور تہذیبی شخصیات تحریکوں کے تیز دھار سرے (SPEAR HEADS) ہوتے ہیں۔ وہ جہاں بھی اپنا خیمہ گاڑ دیں۔ ماحول کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ کشمیر میں اُن کی آمد و رفت کا سلسلہ بہت مدت تک محدود رہا۔ اس طور اُردو کے اثر و نفوذ کی صورتِ حال بھی آگے نہ بڑھ سکی۔

لیکن اس سے بڑی بات یہ ہے کہ کشمیر میں اُردو کی نشو و نُما کے لئے ایسی موافق فضا موجود نہیں تھی، جیسی جموں یا دِلّی کے اطراف و اکناف میں تھی۔ سروری نے زیرِ نظر حصے میں لکھا ہے کہ جموں اور اُس کے نواح میں پنجابی، لہنذا پہاڑی یا ڈوگری جو زبانیں رائج ہیں، وہ اُردو کی ہمزاد ہیں۔ اُن میں صِرف لفظی سرمایے کا اشتراک ہی نہیں بلکہ لِسانی قالب اور جُملوں کی ساخت و پرداخت کی مُشابہت بھی موجود ہے۔ اس لئے اُردو ان علاقوں میں پہنچتے ہی ابتدائی جان پہچان کے بعد اُن کی ہمجولی بننے لگی۔ کشمیر میں صورتِ حال ذرا مختلف ہے۔ کشمیری زبان اپنی سرشت اور گرائمر میں اُردو سے بہت دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو بولنے والے دوستوں کو کشمیری سیکھنے میں بے اندازہ دِقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سروری کو اس صورتِ حال کا پورا اندازہ ہے اور اسی لئے انہوں نے اُردو کے وِرود کی کہانی کو کشمیر کی تواریخ اور لِسانی صورتِ حال سے جوڑنے کے لئے اس کے سوادِ اعظم کے ساتھ ذیلی جھرنوں پر بھی روشنی کی کرنیں مرکوز کیں۔ اس بات کا اس لئے ذکر کیا جارہا ہے کہ پہلی جلد کی اشاعت کے بعد کچھ حلقوں میں یہ ہلکی ہلکی سرگوشیاں ہوئیں کہ اس جلد کا کشمیر میں اُردو کی تواریخ سے کیا تعلق ہے؟

واقع یہ ہے کہ اگر اُردو کی کشمیر میں آمد اور عروج کو تدریسی سطح سے اوپر اُٹھا کر اس کے صحیح تہذیبی تناظر میں دیکھنا ہے تو پہلی جلد اس کتاب کے لازمی جُزو کی حیثیت رکھتی ہے سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ اپنی خود مختار صورت میں اُس حصے کے مختلف باب عام اُردو قاری کو متعلقہ گوشوں کے بارے میں بے حد قیمتی معلومات بہم کرتے ہیں۔

سروری کا یہ بیان صحیح ہے کہ اُردو کشمیر میں فارسی کی تہذیبی لہر کی رَو میں پہنچی۔ فارسی جب کشمیر میں آئی تو وہ ایک تازہ دم تہذیبی لہر اور ایک اُبھرتے ہوئے سیاسی اقتدار کی اتحادی تھی۔ کشمیر میں صورتِ حال اس لئے اور زیادہ شدید ہوگئی کیونکہ یہ اسلامی تعلیمات کی قاصد اور سفیر بھی تھی۔ سیاسی اقتدار اور مذہبی اعتقاد جیسے کلیدی اہمیت کے عوامل نے اس کی پُشت پناہی کی اور یہ کشمیر کی تہذیبی زندگی پر چھا کر رہ گئی۔ اس کا یہ جلال چھ سو سال تک قائم رہا۔ چھ سال بہت طویل زمانہ ہے اور اس زمانے میں فارسی طبقۂ عالیہ کی حدود سے نکل کر کافی برگ و بار لائی۔ واقعہ یہ ہے کہ فارسی کشمیر میں عوامی زبان اور کشمیریوں کی مادری زبان تو نہیں بنی لیکن گذشتہ پانچ چھ صدیوں میں کشمیر کی تہذیبی اور ادبی تواریخ فارسی زبان کی آغوش میں ہی موجود ہے۔ اس کے رُسوخ کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیری زبان کی شکل و شمائل پر فارسی کا گہرا رنگ چڑھ گیا۔ اس کی پارینہ لفظیات کا سارا خزینہ دِگرگوں ہوگیا اور اُس پر فارسی نے اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ یہ بات کشمیر میں اُردو کے فروغ کے لئے غالب کے الفاظ میں "خُداساز" ثابت ہوئی اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ کشمیر میں اُردو فارسی کی تہذیبی پرورش کی زائیدہ ہے۔ پچھلی صدی کی ابتداء سے ہی یورپ کے صنعتی انقلاب کی دستک بھی دیر اور تاخیر سے ہی سہی سات سمندروں اور نو سلسلہ ہائے کوہ کے پردے پھاڑ کر کشمیر میں بھی گونجنے لگی۔ ذرائع آمد و رفت میں آسانیاں فراہم ہونے لگیں اور کشمیر آنا صرف بادشاہوں اور اُن کے مشیروں و مصاحبوں کا ہی شغل نہیں رہا۔ دوسری طرف فارسی کے چراغ کا روغن سوکھنے لگا۔ جو

تلوار اس کو بادِ مخالف سے محفوظ رکھنے کے لئے سپر بن گئی تھی۔ وہ بجھنے لگی۔ تیسرا اہم واقعہ یہ رونما ہوا کہ مسلمانوں کا بہت سا مذہبی سرمایہ اُردو میں بھی بہم ہونے لگا۔ ان تمام عناصر و عوامل نے کشمیر کو اُردو کے محور میں پھینک دیا۔ آہستہ آہستہ مدرسوں اور مکتبوں میں بھی اُردو فارسی کی جگہ لینے لگی۔ کشمیر سے جو تاجر اور طلباء پنجاب وغیرہ جاتے تھے۔ وہ بھی اس زبان کی شُدھ بُدھ حاصل کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ کہ اب اس خطے میں رابطے کی زبان یہی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ وہ مزدور جو کشمیر کے ستم شعار جاڑے سے بدک کر میدانوں میں تلاشِ رزق کے لئے جاتے رہے ہیں وہ بھی یہ زبان سمجھنے اور ٹوٹی پھوٹی اُردو بولنے لگے۔ جب یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی تو ڈوگرہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اس صدی کے اوائل میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ اُردو پٹوار خانے سے لے کر عدالتوں اور پھر دفتروں اور دربار ہر جگہ پر دخل انداز ہو گئی۔ اُردو مدرسوں میں پڑھائی جانے لگی اور اس کی تعلیم و ترویج میں دوسرے عوامل نے بھی اہم حصہ ادا کیا۔

ان عوامل میں ایک یہ تھا کہ ریاست کے نظم ونسق کے لئے بیرونِ ریاست سے جو اعلیٰ افسر اور دیگر لائے گئے ان کی بڑی تعداد ایسے اصحاب پر مشتمل تھی جو یا تو اُردو کے اچھے ادیب تھے یا اُردو کے بہت اچھے قاری جن کا اُردو کے اہم ادیبوں سے یارانہ یا رابطہ تھا۔ اس بارے میں سروری نے تفصیلات بہم کی ہیں۔ جن پر اضافہ کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

اُردو کا کشمیر میں کس قدر اثر و نفوذ ہونے لگا تھا۔ اُس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۸۵ء — ۱۸۵۶ء) نے ڈوگری زبان کو سرکاری زبان بنانے کے جوش سے آنکھیں اُٹھا کر اُردو کے عظیم انشاء پرداز مولوی محمد حسین آزاد سے ڈوگرہ حکومت کی تاریخ لکھوانے کی بڑی کوشش کی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ شمس العلماء آزاد کی کتاب "دربارِ اکبری" کے دلکش طرزِ تحریر اور اس کی شہرت سے مہاراجے کے مُنہ میں پانی

بھر آیا تھا۔ اور وہ شمس العلماء کے قلم کے رتھ پر سوار ہو کر اپنی نیک نامی کی تمنا کرنے لگے تھے۔ چنانچہ "مکاتیبِ آزاد" میں اُن کا ایک خط میجر سید حسین بلگرامی کے نام موجود ہے۔ جو ۸۔ اپریل ۱۹۸۲ء کو تحریر کیا گیا تھا۔ آزاد کا کہنا ہے "کہ میں نے یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ کیونکہ بقول اُن کے" میری اپنی کتابیں ناتمام پڑی ہیں کہ میری جان اور لوگوں کی آنکھیں ان میں لگی ہیں۔ میں کسی کی کتاب لکھوں۔ طمع کا منہ کالا۔" اردو کی ترویج کے سلسلے میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد کی ابتدا میں جموں میں احمدی پریس کے قیام کا ذکر کئے بغیر نہیں رہا نہیں جاسکتا۔ اس میں سرکاری کاغذات۔ فارم وغیرہ اُردو میں بھی چھپتے تھے۔ ادھر ہیں سے ہر گوپال کول خستہ تحفۂ کشمیر نام کا سرکاری اخبار نکالتا تھا۔ بعد میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے ہی دور کے آخیر میں جموں میں وکرم بلاس پریس قائم ہوا۔ جس میں "بدیا بلاس" نام کا اُردو ہندی کا مشترکہ اخبار چھپنا شروع ہو گیا۔

بعد میں اُردو زبان کے اس افسوں کا جادو مہاراجہ پرتاپ سنگھ پر بھی چل گیا۔ حبیب کیفوی نے چوہدری خوشی محمد ناظر کے تذکرے میں لکھا ہے کہ جب ناظر کا اُن کے اعلیٰ منصب سے ایک درباری سازش کے باعث میں تنزل کر دیا گیا تو مہاراجہ نے ان کی نظم "جوگی" کا شہرہ سُنا چنانچہ اُن سے فرمایش کر کے جب یہ نظم پرتاپ سنگھ نے سُنی تو وہ اتنا خوش ہوا کہ ناظر کو اپنے منصب پر بحال کر دیا گیا۔ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں کابینہ کے اجلاسوں کی روئیداد اُردو میں ہی قلمبند ہوتی تھی اور ان پر مشتمل کچھ ضخیم مخطوطات آرکائیوز میں محفوظ ہیں۔

اُردو کشمیر میں سیاسی بیداری کی نقیب بھی بن گئی۔ لاہور کے اخبارات "کوہِ نور" "زمیندار" "اخبارِ عام" "پیسہ اخبار" وغیرہ کے فائل اب بھی کشمیر کے کچھ گھروں میں محفوظ ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" بجلی کا ایک کڑکا تھا۔ جس نے سارے ہندوستان کی طرح کشمیر کے اہلِ دل اور اہلِ دول حضرات کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ الہلال کی زبان اُردو تھی۔ اس نے کشمیر میں اُردو نوازی کے ہی نہیں، حریت پسندی کے تخم بھی بوئے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ الہلال کے شماروں میں ایک کشمیری تاجر کا اشتہار بڑے نمایاں

انداز سے شایع ہوتا تھا۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس اخبار کی کشمیر میں خاصی اشاعت تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کا اثر بھی کافی تھا۔ "مخزن" کا ذکر تو سروری صاحب کر چکے ہیں اور اُس میں لکھنے والے کشمیریوں کا بھی۔

اس صدی کی ابتداء سے ہی کشمیریوں کو غلامی کے خوابِ غفلت سے جگانے کے لئے بھی اُردو میں ہی پہلی تکبیریں بلند ہوئیں۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے آغاز میں ہی انہیں یوں للکارا ع

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا
توڑ اُس دستِ جفا کیش کو یارب جس نے
روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

سو تدابیر کی اے قوم یہی ہے تدبیر
چشمِ اغیار میں ملتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اُخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دُنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

محمد الدین فوق نے اُردو کو کشمیریوں کی مظلومیت کی زبان بنا دیا اور اُن کی فریاد کا آلۂ صوت الجہر۔ اُن کی ادبی خدمات کی تفصیل سروری نے درج کی ہے۔ لیکن اس بات کو بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ فوق نے کشمیر سے باہر کشمیریوں کی آواز بلند کرنے کے لئے کئی اخبارات یکے بعد دیگرے نکالے۔ یہ اخبارات کشمیر میں بھی پہنچتے تو یہاں دلوں میں ہیجان بپا کرتے۔

اس صدی کی چوتھائی دہائی کشمیر میں سیاسی اور تمدنی بیداری کا صبح صادق تھی کہ یہ دونوں رجحانات ایک دوسرے کے ہمراز اور دمساز ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال اسی دہائی کی ابتدا میں کشمیر آئے اور یہاں دل پر زخم کھا کر چلے گئے۔ یہ زخم بعد میں کشمیر کی نجات کے گلشن رازِ جدید کا شگوفہ ثابت ہوا۔ اُن کے واپس لاہور پہنچتے ہی وہاں کے اُردو اخبارات نے کشمیریوں کے بارے میں انکشافات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور یہ بات اب خفیہ نہیں رہی کہ ان مضامین کی چنگاری علامہ اقبال کے حُبِ وطن سے نکلتی تھی۔ اُدھر شیخ محمد عبداللہ لاہور کے اسلامیہ کالج میں پہنچ گئے اور انھوں نے وہاں حالات کا مشاہدہ کر کے اپنے سینے کی منقل دہکالی۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر کا "انقلاب" کشمیر کی تحریک کا ہراول دستہ بن گیا۔ اس اخبار نے کشمیر دربار کی بے مہریوں کو بے نقاب کرنا۔ اور کشمیر میں مسلمانوں کی مظلومیت کا بالخصوص پردہ چاک کرنا شروع کیا۔ یہ مضامین شیخ محمد عبداللہ ہی کی مساعی سے وہاں پہنچتے تھے چنانچہ آج یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ۱۹۳۱ء میں کشمیر کی تحریکِ آزادی کے رسمی آغاز سے پہلے جن واقعات نے کشمیر کے ساکن پانیوں میں پتھر پھینک کر ارتعاش پیدا کر دیا۔ اُن میں ۱۹۳۰ء کے ابتدائی مہینوں میں "انقلاب" کے داخلہ کشمیر پر پابندی عائد ہونا بھی ہے۔ لیکن کارروائی پر کشمیر اور کشمیر کے باہر بڑا غل مچا۔ لیکن خود ادارہ "انقلاب" نے اس کا توڑ یوں کیا کہ اُس نے مکتوب کشمیر کے عنوان سے ایک اور اخبار نکالا اور اس میں اور زیادہ شدت سے مہاراجہ اور اس کی حکومت پر برس پڑا۔ اس پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔ تو فوراً "کشمیری مسلمان" کے نام سے ایک اور اخبار نکالا گیا۔ اس سلسلے کا تیسرا اخبار "مظلوم کشمیر" تھا۔ الغرض یہ کھیل اتنے استقلال اور مشاقی سے کھیلا گیا کہ دربارِ کشمیر کی سانس پھول گئی اور وہ عاجز نظر آنے لگا۔ اُدھر ان اخبارات کی کشمیر میں مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ بقولِ شیخ محمد عبداللہ، یہ اخبارات جن کی قیمت ایک پیسہ فی پرچہ ہوتی تھی۔ ایک دو بلکہ پانچ پانچ روپے میں بکتے تھے۔

مئی ۔ جون ۱۹۳۱ء میں تحریکِ کشمیر کا دھارا دلوں کے چشموں سے اُبل کر چار سو میں گرجنے لگا تو اس کی ترجمانی میں اُردو زبان آگے آگے تھی۔ شیخ محمد عبداللہ کی خوش نوائی نے تحریک کی حُدی خوانی کا کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے جامع مسجد سرینگر میں اپنی سب سے پہلی تقریر کے آغاز میں آغا حشر کاشمیری کی نظم ع

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو ہٹ جاؤ دید دراہ جانے کے لئے

سے شروع کی۔ بعد میں بھی وہ اقبال اور دوسرے اُردو شاعروں کی نظمیں، گا گا کر کشمیریوں کا دِل گرماتے رہے۔ انھوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں محمد رجب، غلام مرتضیٰ وغیرہ کے ساتھ مل کر پہلا دارالمطالعہ قائم کیا۔ جو تحریک کی آگ سلگانے کے لئے دیا سلائی کے طور پر کام آیا۔ اس دارالمطالعہ میں تقریباً سو فی صدی جرائد و اخبارات اُردو میں ہی رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ بعد میں ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے خونین ڈرامے کے بعد جب حکومت نے عوامی نمائندوں سے اُن کے مطالبات کی فہرست طلب کی۔ تو انگریزوں کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی "میموریل" پیش کیا گیا۔ میموریل حکومت جموں و کشمیر کے آرکائیوز میں محفوظ ہے۔

۱۹۳۱ء کے بعد کشمیر میں تحریر و تقریر کی آزادی کا دور شروع ہو گیا چنانچہ سٹیج سے اُردو کے بہترین مقرروں نے تقریریں کیں۔ ان میں مولانا مظہر علی اظہر، مولانا ظفر علی خان، مولانا سید حبیب (ایڈیٹر سیاست) سر تیج بہادر سپرو، مولانا علم دین سالک وغیرہ شامل تھے۔ حفیظ جالندھری اور مولانا ظفر علی خان نے کشمیر پر نظمیں لکھیں۔

اُدھر کشمیر کا پہلا اخبار پنڈت پریم ناتھ بزاز نے "وِتستا" کے نام سے اُردو میں نکالنا شروع کیا۔ تحریکِ آزادی کا تقریباً سارا لٹریچر اُردو میں تیار ہونے لگا۔ اسمیں

مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے صدارتی خطبات، قراردادیں اور دوسری اہم دستاویزات شامل ہیں۔ اُدھر کشمیر میں اُردو ادیبوں کا ایک بڑا کاروان سامنے آنے لگا۔ ان میں پنڈت نند لال طالب، پنڈت پریم ناتھ بزاز، پریم ناتھ پردیسی (جو ابتدا میں رونق بھی تخلص کرتے تھے) میر غلام رسول نازکی، نجم الدین عشرت، سدھیشور ورما وغیرہ شامل تھے۔ اُدھر جموں و کشمیر میں اُردو اخبارات کا ایک کاروان بھی جاری ہو گیا۔ ان میں رہبر، چاند، البرق ہمدرد، صداقت، اصلاح، جمہور، پاسبان، جاوید، خدمت وغیرہ شامل تھے۔ ان اخبارات نے مولانا محمد سعید مسعودی، پنڈت پریم ناتھ بزاز، پنڈت کیشپ بندھو، اللہ رکھا ساغر، عبدالمجید قرشی، نرسنگھ داس نرگس، میر عبدالعزیز، نند لال واتل، غلام احمد کشفی، مولوی عبدالواحد جیسے صحافیوں کو سامنے لایا۔

کشمیر میں اُردو کی تحریک کو ریاست کے باہر سے آنے والے نامور ادیبوں نے بھی بڑا عروج بخشا۔ وہ کشمیر آتے، تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ اُن کی شہرت اُن سے پہلے ہی کشمیر پہنچی ہوتی تھی۔ اس لئے انہیں کچھ ایسے ہی اشتیاق سے دیکھا جاتا جس طرح بڑے قومی رہنماؤں یا آج کل کے فلمی ستاروں کو دیکھا جاتا ہے۔ ایسے مشاہیر میں پنڈت برجموہن کیفی بھی تھے۔ جو کشمیر دربار کے اسسٹنٹ فارن سیکرٹری بن کر آئے۔ اور نواب جعفر علی خان اثر بھی جو یہاں وزیر رہے، حفیظ جالندھری تو تحریک آزادی کے رہنماؤں کے قریبی دوست بن گئے۔ اور انہوں نے کشمیر کی تحریک آزادی کی حمایت میں اپنی کم مشہور مگر معرکتہ الآرا نظم ؏

شیر سے محروم ہے مالک ہے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

لکھی۔ فیض احمد فیض بھی برابر یہاں آتے رہے۔ اُن کی بیوی ایلس کے ساتھ اُن کا نکاح کشمیر میں ہی پڑھا گیا اور شیخ محمد عبداللہ نے قاضی کے فرائض انجام دیئے۔ خلیفہ عبدالحکیم

عبدالسمیع پال، آثر صہبائی اور محمدالدین تاثیر کشمیر میں ملازمت اختیار کر کے یہاں کی ادبی محفلوں کا محور بن گئے۔ احسان دانش اور روش صدیقی بھی آتے رہے اور محفلوں میں حصہ لیتے رہے (روش کا تو کشمیر پر لکھی ہوئی نظموں کا ایک مجموعہ "خیاباں خیاباں" کے نام سے کلچرل اکیڈمی نے شایع کر دیا ہے)۔ کشمیر اُس وقت برصغیر کی بڑی اُردو تحریک سے باضابطہ جڑ گیا۔ جب ۱۹۴۷ء میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق جموں تشریف لائے۔ انہوں نے یہاں کے ایک ادبی اجتماع میں اُردو کے حق میں بڑی زوردار تقریر کی۔ اس جلسے کے اختتام پر انجمن ترقی اُردو (ہند) کی شاخ پہلی بار ریاست میں قایم کی گئی جس کے پہلے صدر جموں کے ایک سخن نواز سجن پنڈت بہاری لال بھاکڑی سیشن جج مقرر ہوئے۔ حبیب کیفوی اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور اُن کے بیان کے مطابق اس مرکزی شاخ نے ریاست کے طول و عرض میں انجمن کی شاخوں کا جال پھیلا دیا۔[۵] ڈاکٹر عبدالحق نے پرجا سبھا (ریاستی اسمبلی) کے اجلاس کا مشاہدہ بھی کیا۔ وہ سبھا میں اُردو تقاریر کے معیار سے اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے دہلی میں کُل ہند اُردو کانفرنس کی تقریب پر اپنی رپورٹ میں ان تقریروں کے بارے میں لکھا:

"شاید ہندوستان کے کسی صوبے میں اُردو اس قدر مقبول اور رائج نہیں جس قدر کشمیر میں ہے۔ مدارس میں اُردو پڑھائی جاتی ہے اور ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ دفاتر کی زبان بھی اُردو ہے اور بہت اچھے اُردو کے ادیب اور شاعر موجود ہیں۔ وہاں کی اسمبلی کے اجلاس کو بھی جا کر دیکھا ہے سب ممبر بلا استثناء اُردو میں بلا تکلف تقریریں کرتے تھے۔ یہ سُن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ پنجاب اسمبلی میں ایسی اچھی اُردو کی تقریریں نہیں ہوتیں"۔

کاش مولوی صاحب اپنی عمر دراز کو کچھ اور دراز کر سکتے۔ اس طرح سے اُنہیں اسی اسمبلی میں مرحوم شمیم احمد شمیم، مولانا محمد سعید مسعودی اور پنڈت درگاپرشاد در

۵: "کشمیر میں اُردو" از حبیب کیفوی۔ شایع کردہ مرکزی اُردو بورڈ۔ گلبرگ۔ لاہور

اور سید علی گیلانی کی فصیح اور برجستہ بذلہ سنجی سے شرابور تقاریر سننے کو ملتیں۔ اور وہ دیکھتے کہ اِن اصحاب نے کس طرح اُردو بولنے کے فن کو بامِ عروج پر پہنچایا۔

ریاست میں اُردو کے وجود پر بیرونِ ریاست کی لسانی صورتِ حال کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ ہندوستان میں سیاسی تحریک کے بہاؤ نے لسانی اُفق کا رنگ بدلنا بھی شروع کر دیا۔ ہندی اور اُردو کا مسئلہ شدت سے سامنے آگیا۔ ہندی کے دوستوں نے حکومت پر اثر انداز ہو کر پرجا سبھا میں ہندی کے حق میں قواعد بنوانے کی کوششیں کیں۔ لیکن عوامی نمائندوں نے بحیثیتِ مجموعی اُردو کی پاسداری کی۔ ریاست میں ذریعہ تعلیم کی زبان کا تقرر کرنے کے لئے اُس وقت کے ناظمِ تعلیمات خواجہ غلام السیّدین کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی۔ کمیٹی نے ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ اپنی رپورٹ میں کہا:

> "وہ زبان جو تواریخی اور تعلیمی اسباب کی بناء پر ریاست کی عام زبان ہے، وہ اُردو ہے جو ریاست میں پہلے درجے سے لے کر اوپر تک کیلئے ذریعہ بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو ریاست میں رہنے والوں کی اکثریت کی مادری زبان نہیں ہے لیکن یہ ڈوگری، لہندا اور پنجابی سے بہت قریب ہے۔ اور ایک حد تک پہاڑی اور گوجری سے بھی ملتی جلتی ہے۔ لہٰذا اُن لڑکوں کے لئے جو یہ زبان نہیں جانتے ہیں۔ اُردو کا ذریعۂ تعلیم ہونا کوئی دشواری کا سبب نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی حکومت نے اعلان کیا کہ سکولوں میں "آسان اُردو" ناگری اور فارسی رسم الخط میں پڑھائی جائے گی۔ یہ اُردو اور ہندی کے درمیان ایک مصلحت آمیز سمجھوتہ تھا اور اس کے ذریعے اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے وکیلوں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن یہ آویزش عوامی زندگی کی مختلف سطحوں پر اُبھرتی رہی۔ نیشنل کانفرنس کے مرحوم صدر شیخ محمد عبداللہ نے ۸ جنوری ۱۹۴۱ء کو شاہی مسجد سرینگر میں کہا:

"نیشنل کانفرنس اس بات پر بھی یقین رکھتی ہے اور واقعات چمکتے ہوئے سورج کی طرح اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس پر ریاست کے تمام لوگ سالہا سال سے تعلیمی اور درباری ضروریات کے لئے اتفاق کر چکے ہیں۔ آئندہ بھی یہی زبان اُن کی ترقی کا وسیلہ بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔" (اعلانِ حق۔ صفحہ ۲۶۔ ۲۷)

اس معاملے پر نیشنل کانفرنس کی ہائی کمان میں زبردست اختلاف رہا اور پنڈت کیشپ بندھو، پنڈت پریم ناتھ بزاز اور پنڈت جیالال کلم کے نیشنل کانفرنس سے الگ ہونے کی وجہ یہ اختلاف رائے بھی بنا۔ اس صورتِ حال کے باوجود تقسیم ہند کے وقت اُردو جموں وکشمیر میں رابطے کی سب سے مضبوط زبان تھی۔ یہاں کے تقریباً ننانوے فی صد اخبارات اسی زبان میں شائع ہوتے تھے۔ اگرچہ سرکار کے اعلیٰ صیغوں کی خط وکتابت انگریزی میں ہوتی تھی۔ لیکن عدالتوں، محکمہ مال وغیرہ میں اُردو کا زبردست چلن تھا۔ کشمیر کے اکثر اور جموں کے قابلِ لحاظ مدرسوں میں آسان اُردو اور وہ بھی فارسی رسم خط میں پڑھائی اور پڑھی جاتی تھی۔ ریاست کی سب سے بڑی عوامی جماعت نیشنل کانفرنس (جو ۱۹۴۷ء کے بعد یہاں حکمران جماعت بننے والی تھی) نے اپنے مستقبل کے لئے تیار کئے ہوئے آئینی منصوبے "نیا کشمیر" میں اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان بنائے رکھنے کا اعلان کر دیا اور اُردو میں جموں اور کشمیر کے بہت سے ہونہار شاعر اور ادیب سامنے آنے لگے۔

لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد صورتِ حال میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی اور یہ بھی تواریخی عوامل کا نتیجہ تھا۔ اُردو اگرچہ بدستور دفاتر اور مدرسوں کی زبان بنی رہی لیکن کشمیری، ڈوگری اور دوسری علاقائی زبانوں نے اپنے بولنے والوں کے قومی شعور کی انگڑائی کے ساتھ ساتھ اپنا حق منوانا شروع کر دیا۔ کشمیری میں چھ سو سال کا ادبی ذخیرہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ یہ ایک مُلحق اور مُتصل خطۂ زمین کے تیس لاکھ سے زیادہ لوگوں کی زبان تھی۔ مغربی پاکستان

کے اُردو مراکز سے جُدائی اور ہندوستان میں اُردو کے پس منظر میں چلے جانے سے کشمیر میں اس کی نشو و نما متاثر ہونے لگی۔ اُدھر قومیتوں اور زبانوں کے نقارخانے میں کشمیریوں کو اپنی پہچان (IDENTITY) اور تشخص کے گم ہو جانے کا اندیشہ ستانے لگا۔ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے پُشتہ تعمیر کرنے کے لئے انہوں نے کشمیری زبان کی ڈھال اُٹھالی۔ اُردو زبان کے چند تجربہ کار سخن گو مثلاً میر غلام رسول نازکی، محمد امین کامل، دینا ناتھ نادم وغیرہ کشمیری کا رُخ اختیار کر گئے اور اس طرح سے کشمیری زبان ہی اُن کے اظہار کی معتبر آواز بن گئی۔ ڈوگری زبان میں اگرچہ قدیم تحریری سرمایہ کم ہی تھا لیکن جموں کے ادیبوں نے آزادی کے بعد سے کچھ اس شدت کے ساتھ اس کے ادبی سرمایے کی ترویج شروع کر دی کہ چند دہائیوں میں یہ پنجابی کی ایک بولی کے درجے سے اُٹھ کر ایک سنجیدہ زبان کی حیثیت سے اپنے حقوق طلب کرنے لگی۔ یہی عمل کم و بیش پہاڑی، گوجری زبانوں میں بھی جاری ہے۔ یہ زبانیں اب ذریعہ تعلیم میں بھی مناسب تبدیلیوں کی طلبگار ہو رہی ہیں۔ لیکن اُردو زبان کے لئے اُمید کا پہلو یہ ہے کہ یہ ریاست میں اس وقت بھی رابطے کا سب سے معتبر اور موثر ذریعہ ہے اور موجودہ لسانی اور سیاسی صورتِ حال پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ابھی بہت مدت تک اس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔ اسی طرح عدالتوں اور محکمہ مال کی نچلی سطحوں پر اب بھی اُردو کا بلا شرکت غیرے سکہ چل رہا ہے۔ ریاست میں اس وقت بھی صحافت کی تقریباً کُلی زبان اُردو ہی ہے اور اس میں شایع ہونے والے اچھے اخبارات کی اشاعت روبہ ترقی ہے۔ اُردو ریاست میں کاروبار کی زبان بھی ہے اور اس کے چھاپے خانے بھی خوب پھل پھول رہے ہیں۔ اُردو میں ریاست کے دونوں حصوں میں کچھ بہت ذہین اور بہت باصلاحیت ادیب لکھ رہے ہیں اور ریاست کے علاوہ ریاست سے باہر بھی دادِ تحسین حاصل کر رہے ہیں۔ ان عوامل کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اُردو بہت عرصے

تک ریاست جموں و کشمیر میں ایک اہم ترین تہذیبی اور سماجی رول ادا کرتی رہے گی۔

مرحوم سردری کی اس شاندار تصنیف کا دوسرا حصہ پیش کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جلد کے پہلے باب "ابتدائی آثار" کے صفحہ ۶۰ پر شیخ نصیر الدین غریب کے تذکرے کے بعد کے صفحے ہمیں مسودے میں دستیاب نہیں ہوئے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سردری صاحب نے لکھ تو لئے ہوں لیکن بعد میں گم ہو گئے ہوں۔ ہم نے اس باب کو کسی طرح مکمل کرنے کی سعی کی ہے۔ اس میں عرق ریزی کی ضرورت تھی اور وہ ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ اسی لئے اس کا عالم یوں ہو گیا ہے ع

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اس حصے میں جن شخصیات، ادیبوں وغیرہ کے تذکرے آئے ہیں۔ ہم نے اُن کی تصاویر حاصل کرنے کی بہت کوشش کی۔ کچھ حالات میں ہم کامیاب رہے اور کہیں پر ناکام ـــ انشاء اللہ آئندہ حصے میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

سری نگر۔ ۳۱، دسمبر ۱۹۸۲ء

محمد یوسف ٹینگ

ابتدائی آثار

سنسکرت زبان کا کشمیر سے جو گہرا تعلق رہا ہے۔ اس کی تفصیل پچھلے باب میں گذر چکی ہے۔ سنسکرت کو مذہبی علوم و فنون کے واسطے کے طور پر اور تہذیبی تصورات کے اظہار کے ذریعہ کی حیثیت سے خاطر خواہ فروغ نصیب ہوا تھا۔ سنسکرت، جدید ہند آریائی بھاشاؤں کا، جس میں اُردو بھی شامل ہے، قدیم شائستہ روپ مانی گئی ہے۔ لیکن علمائے لسانیات کے پاس یہ بات مُسلّم ہے کہ جہاں تک جدید ہند آریائی زبانوں کی نشو و نما کا تعلق ہے۔ اس میں سنسکرت سے زیادہ ان پراکرتوں کو دخل رہا، جو عوام کی بول چال میں رائج تھیں اور کتابی شکنجے میں جکڑی جا کر، ارتقا سے محروم نہیں ہو گئی تھیں۔ کشمیر میں قدیم زمانے میں، کھڑی بولی، ہندی یا اُردو کی ماخذی پراکرتوں کے رواج کے آثار کا پتہ نہیں چلتا۔ کچھ قدیم قواعد نویسوں نے پیشاچی پراکرت کا تعلق کشمیر سے، اس کا اطلاق لہندا[۱] اور پنجابی پر تو کیا ہے لیکن کشمیر پر اس کا اطلاق موثق نہیں۔ اس کے علاوہ کشمیر کے وسط ایشیا اور خاص طور پر دردستان اور بلتستان سے ثقافتی، لسانی اور کسی حد تک جغرافی

۱۔ نواح سندھ کی ایک زبان

علاقات کی بناء پر اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا کہ کشمیری زبان کی نشوونما پر دردی اور بلتی کا اثر کس حد تک ہے۔

بُدھ مت کا تعلق بھی کشمیر سے گہرا رہا اور اشوک کے عہد میں بُدھ مت کی چوتھی مجلس جو کشمیر میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کے نتیجے کے طور پر 'مہایان شاخ' کا آغاز ہوا۔ بدھ مذہب[۵] کے صحائف کی زبان پالی تھی۔ چنانچہ بُدھ مذہب ہندوستان سے باہر مثلاً چین، جاپان، تبت، برما اور سیلون، جہاں جہاں پھیلا، پالی بول چال کی زبان کے طور پر نہیں، بلکہ کتابی مقدس زبان کے طور پر کشمیر پہنچی، اسی لئے ان علاقوں میں پالی میں تصنیف و تالیف کے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے، یہ حیرت کی بات ہے کہ یہاں پالی کے کوئی تحریری آثار نہیں ملتے۔ اس کے مقابلے میں بُدھ متی علماء کی تصانیف سنسکرت میں ملتی ہیں۔ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ کشمیر میں بُدھ مت کے عالموں نے پالی کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہوگا۔ پالی کی کچھ تصانیف اگر یہاں پہنچی تھیں، اور ان کا چلن بھی یہاں رہا تھا۔ تو اب اس کا پتہ چلانا ہمارے لئے دشوار ہے۔ کشمیر کے ایک مورخ پرتھوی ناتھ کول بامزئی نے اپنی تاریخِ کشمیر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور صرف یہ کہہ کر گذر گئے ہیں کہ — "اشوک کے عہد میں جب بُدھ مت وادی میں پہنچا۔ اس نئے مذہب کے صحائف اور اس کا ادب، یہاں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے برخلاف جہاں پالی میں لکھے گئے، سنسکرت میں لکھا گیا۔" بامزئی نے اس کے اسباب پر روشنی ڈالنے کی کوشش نہیں کی، تاہم ان کے بیان سے کشمیر میں سنسکرت کی تصانیف کی روایت کے گہرے اثر کی نشان دہی ہوتی ہے۔

پالی کے بول چال کے روپ کو بعض علمائے لسانیات نے مغربی پراکرت کی حیثیت سے، کھڑی بولی، ہندی اور اُردو کا ماخذ مانا ہے۔ بامزئی نے سنسکرت کے کشمیر میں رواج پر بحث کرتے ہوئے بلھن کی سند پر پراکرت کا بھی تذکرہ کیا ہے اور

۵: یہ کانفرنس راجہ کنشک کے عہد میں ہوئی اور بعض مورخ اسے تیسری کانفرنس کہتے ہیں۔

لکھا ہے کہ کشمیر میں خواتین بھی سنسکرت اور پراکرت روانی سے بولتی تھیں۔
لیکن جہاں تک پراکرت کا تعلق ہے یہ بیان مبہم ہے، ظاہر ہے۔ سنسکرت کی طرح
پراکرت کا معیار ایک نہیں تھا، اسی لئے سنسکرت کے مقابلے میں پراکرتیں یعنی بول
چال کی زبانیں کئی تھیں۔ اس اعتبار سے کشمیر میں پراکرت کے مفہوم وسیع ہو جاتے ہیں۔
ہند آریائی کے علماء کے لحاظ سے ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ پیشاچی پراکرت علاقہ
متعین ہوتا ہے، جس سے لہندا اور پنجابی کی نشو و نما ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ پرانی
تاریخوں میں کشمیر کو پیشاچی علاقہ بتایا گیا ہے، لیکن پیشاچی کی حقیقی بیٹی، لہندا
اور کشمیری میں کچھ ظاہری مماثلوں سے قطع نظر، کئی بنیادی اختلافات ہیں، جن کے
پیشاچی پراکرت کے کشمیر میں رواج کا امکان دور از قیاس ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ ماننا
پڑتا ہے کہ یہ کشمیری پراکرت، یعنی بول چال کی زبان تھی۔ اس سلسلے میں کشمیری کے آغاز
کے بارے میں گریرسن کا نظریہ ہماری مدد کرتا ہے۔

کشمیر میں جو بھی پراکرت رائج رہی ہو، اس میں کسی زمانے میں بھی تصنیف و
تالیف کے آثار دستیاب نہیں ہوتے اور یہ کشمیری مزاج اور اہل کشمیر کے تصنیف و تالیف
کے بڑھے ہوئے شوق کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ ایک ضعیف روایت پراکرت تصنیف "ملند
پنھو" کے بارے میں یہ ملتی ہے کہ اس کا مصنف ناگ سین، کشمیر کی سرحد کے قریب ایک
مقام ناگ سینی کا رہنے والا تھا۔ لیکن یہ نسبت نام کی مناسبت کی سجھائی ہوئی معلوم
ہوتی ہے۔ اصل میں کشمیر میں پراکرت میں تصنیف و تالیف کے دستیاب نہ ہونے کا سبب
بھی سنسکرت میں لکھنے کی روایت کا زبردست اثر معلوم ہوتا ہے۔

کشمیر کی تاریخوں میں قدیم زمانے کے نظم و نسق وغیرہ کی تفصیلات میں کچھ لفظ ایسے
ضرور ملتے ہیں، جن کا روپ کھڑی بولی ہندوستانی کا ہے جیسے:
ہڑیہ (نوہڑہ) ناؤ، اندھ، کوٹ، ناٹک، چھاونی، گھاٹ، بدھ

بیگہ، گنہم، چنا، مسور، مونگ وغیرہ۔

ان میں سے بعض لفظوں کے کشمیر کی مقامی پیداوار ہونے کے بارے میں شبہ ہے۔ ان میں سے کچھ لفظ اشیاء کے ساتھ آئے اور کچھ اس قدیم پراکرت سے نشو و نما پائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، جو قدیم زمانے میں یہاں رائج رہی۔

اُردو کی قدامت کی کھوج لگانے والے محققین نے قدیم ترین آثار میں، تلک کا تذکرہ خاص طور پر کیا ہے، جو کشمیری تھا اور ایک نائی کا لڑکا تھا۔ "تاریخ بیہقی" کے مصنف کی سند پر، اس نے قاضی حسن شیرازی کے پاس فارسی کی تکمیل کی تھی۔ وہ سنسکرت بھی بخوبی جانتا تھا۔ کشمیر پر اپنے ایک حملے کے دوران "محمود غزنوی" اس سے واقف ہوا تھا۔ اور اس کی قابلیت سے متاثر ہو کر، اسے اپنے ساتھ غزنین لے گیا تھا۔ یہاں وہ "فارسی اور ہندی" کے ترجمان کی خدمت انجام دیتا تھا۔ لیکن عرب اور ایرانی مصنفین کے یہاں "ہندی" کے استعمال کو، اس زمانے کی لسانی صورت حال کے مدنظر احتیاط سے قبول کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مصنفین عموماً ہند سے متعلق ہر چیز کو "ہندی" سے موسوم کرتے ہیں۔ اور زبان کے سلسلے میں جہاں وہ "ہندی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس سے اکثر سنسکرت مُراد ہوتی ہے۔

ایک اور روایت راجانند (سنہ ۱۰۱۵ء) کی بھی تاریخوں میں ملتی ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ محمود سے پسپا ہونے کے بعد، راجہ نے صُلح کی درخواست کی اور تحفے، تحایف کے ساتھ ایک شعر بھی محمود کی تعریف میں ہندی میں لکھ بھیجا تھا۔ جس پر محمود بہت خوش ہوا اور پیر غلام حسن مصنف "تاریخ کشمیر" نے لکھا ہے کہ راجہ کو پندرہ قلعوں کی حکومت عطا کی۔

بعد کے ادوار میں کشمیری سلاطین میں سے سلطان زین العابدین کے بارے میں [illegible] "[illegible] سلطان بزبان فارسی و ہندی و تبتی خوب تکلم می کردند" ([illegible] ۱۹۹)

اس میں شبہ نہیں کہ پندرہویں صدی عیسوی تک قدیم ہندی اور اردو کی تشکیل ہو چکی تھی۔ چنانچہ پندرہویں صدی کے اواخر تک خاص طور پر دکن کی بہمنی قلمرو میں حضرت گیسو دراز اور ان کے بعد شاہ میراں جی، اس سیال زبان کو اپنے متصوفانہ خیالات کے اظہار کے لئے برتنے بھی لگے تھے۔ تاہم اس کی تفصیلات ہمارے پاس موجود نہیں کہ زبان کا وہ کیسا روپ تھا۔

سلطان زین العابدین کے جانشینوں میں سلطان حسن شاہ (۱۴۷۲ء-۱۴۸۴ء) موسیقی کا بڑا دلدادہ تھا۔ چنانچہ اس کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ اس نے ہندوستان سے بارہ سو ماہرینِ موسیقی کو بلوا کر اپنے دربار میں ملازم رکھا تھا۔ بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے فنِ موسیقی پر ایک کتاب "فارسی زبان ہندوستان" میں تصنیف کی تھی۔ بیجاپور کے سلطان علی عادل شاہ ثانی نے بھی موسیقی کی دھنوں پر اردو میں منظومات موزون کئے تھے جسے "نورس نامہ" یا "کتابِ نورس" کے نام سے موزوں کیا تھا۔ اور فارسی کے مشہور شاعر اور انشا پرداز ظہوری نے اپنی "سہ نثر" اسی کے دیباچے کے طور پر لکھی تھی۔ سلطان حسن شاہ کی کتاب کا اب پتہ نہیں چلتا۔

جموں اور اس کے ملحقہ علاقے، پنجاب سے متاثر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈوگری جو ان علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ وہ خود اردو (اور ہندی) کی بہن اور جدید ہند آریائی کی ایک شاخ ہے اور ان زبانوں کا لفظی سرمایہ ہم ماخذ اور متجانس ہے۔ پنجاب کے اثر سے اردو کا اس علاقے سے روشناس ہونا، کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن یہ علاقہ عموماً فوجی کارروائیوں کا مرکز رہا اور علم و ادب کی تحریکیں یہاں بعد میں اٹھیں۔

قدیم ترین تحریری آثار جو ہم کو کشمیر میں دستیاب ہوتے ہیں، وہ سترہویں صدی کے اواخر سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ عموماً ریختہ کا انداز رکھتے ہیں۔ اس زمانے تک مغل فوجوں کا ربط کشمیر سے قایم ہو چکا تھا۔ سلطان یوسف شاہ چک، فارسی کا خوش گو شاعر تھا لیکن

اس کے بارے میں مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ہندی میں بھی شعر کہتا تھا۔ حسن لکھتے ہیں : "طبع موزوں داشت ، اشعار فارسی و ہندی و کشمیری بدیہہ می گفت۔ (ص ۲۹۶)"
یوسف شاہ کے فارسی اشعار تو دستیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ہندی اشعار نہیں ملتے۔ اس کی ملکہ حبہ خاتون، موسیقی میں دستگاہ رکھتی تھی اور خود یوسف کو موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک شاعر کا دل اور حُسن نظر رکھتا تھا۔ اکبر کے دربار سے اس کا واسطہ رہا تھا۔ جہاں ہندی شعراء کی قدر تھی۔ اس طرح کوئی تعجب نہیں کہ یوسف شاہ کو بھی ہندی میں شعر کہنے سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہو۔

یوسف شاہ کا کلام نہیں ملتا تو ہم کو اس کے ایک مصاحب خواجہ ابوالقاسم جبلی کے فرزند خواجہ محمد مومن جبلی کا ریختہ کلام مل جاتا ہے۔ یہ خاندان کشمیر کے معتبر خاندانوں میں سے تھا۔ خواجہ مومن کی تعلیم اچھے پیمانے پر ہوئی تھی۔ ان کے پہلے اُستاد مُلا محمد جوہر ناتھ اپنے عہد کے فضلا میں گراں قدر رکھتے تھے۔ بعد میں مولوی خواجہ حیدر چرخی کی خدمت میں بھی خواجہ نے تعلیم کی تکمیل کی، اور فارسی میں خوب شعر کہتے تھے۔

حضرت بابا نصیب الدین غازی سے انہیں عقیدت تھی اور اسی عقیدت مندی کے اظہار کے طور پر غازی تخلص اختیار کیا تھا۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد خواجہ مومن غازی نے دنیا ترک کر دی اور مرشد کامل کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ اس سفر میں فریضہ حج سے بھی فارغ ہوئے۔ اس وقت تک حضرت نصیب الدین کی خدمت میں وہ حاضر نہیں ہوئے تھے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جب وہ مدینہ منورہ میں، روضہ نبوی پر استغراق کی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے، انہیں بشارت ہوئی کہ ان کے مرشد ان کے وطن میں ہیں۔ وطن لوٹ کر، بابا نصیب الدین غازی کی خدمت میں حاضر ہو روحانی فیض کا اکتساب کیا۔ بابا نصیب الدین کے انتقال کے بعد خوب سے خوب تر
[illegible] راس نے بیٹھنے نہ دیا اور وہ پھر سفر پر روانہ ہوئے۔

اور حج سے فارغ ہونے کے بعد بغداد گئے جہاں ۱۰۵۲ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

فارسی شاعری میں خواجہ مومن کا پایہ بلند ہے۔ ریختہ میں ان کی فکر کے آثار میں سے صرف ایک رباعی دستیاب ہوتی ہے، جو اپنے ایک دوست کو دیوہ سر میں لکھ بھیجی تھی۔ رباعی میں 'بادِ شمال' کے ذریعے دوست کے نام پیام بھیجا ہے۔

اے باد اوتر گر گذری دیوہ سر ازمن خبری نیز بہ آں دلبر بر
کشمیری و فارسی اگر گوش نکرد ہندلیش بگوی کہ "اوترمیر اتر"

یہاں سے فارسی کے کئی اچھے شاعر اٹھے تھے۔ ان میں سے پنڈت ٹھاکر داس نامی اور ٹھاکر رازداں کا تذکرہ "بہارِ گلشن کشمیر" میں آتا ہے۔ دیوہ سر کولگام کے قریب ایک قصبہ ہے۔ رباعی میں "بادِ اوتر" اور "اوترمیر" میں تجنیس کا جو حسن ہے، اس سے رباعی کے معنوی لطف میں بڑا اضافہ ہوگیا ہے۔

خواجہ محمد جبل کے کلام کا یہ نمونہ، ہندوستان میں اردو کے تشکیلی دور کے ریختوں اور ملفوظات سے مشابہ ہے،

اکبر کے بعد شاہ جہاں کا عہد، ہندوستان کی طرح کشمیر [illegible] او [illegible] سرگرمیوں کی وجہ سے ممتاز ہے۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانے تک بھی کشمیر [illegible] فارسی علماء کو مذہب اور تصوف سے لگاؤ رہا۔ شاہ جہاں کے عہد میں، فارسی کے چوٹی کے شاعر اور انشاء پرداز، ہندوستان آتے رہے اور ان میں سے اکثر کعبۂ حسن فطرت کشمیر کی زیارت کے لئے یہاں بھی آئے۔ ان شعراء کو کشمیر کی دعوت دینے کا بڑا اہم سبب، اس زمانے میں کشمیر کے ناظم، ظفر خان احسن کا دربار اور اس کی ادب دوستی اور علماء اور شعراء کی [illegible] چنانچہ میرزا [illegible] صائب اس کے ساتھ ہی کشمیر [illegible] اور بعد میں ابوطالب کلیم، محمد جان قدسی، ملا طغرا مشہدی، محمد قلی سلیم، جلالا طباطبائی، [illegible] جیسے نامور ادیب اور شاعر یہاں آیا اور ان میں سے بعض یہاں رہ گئے اور یہیں [illegible] دفن ہوئے۔

ظفر خان احسن فارسی کا قابل ترین شاعر تھا۔ اس کی اصل تربیت (خراسان) سے تھی، لیکن اس کی ولادت ہندوستان میں ہوئی تھی اور وہ ان علاقوں میں رہا تھا، جہاں کھڑی بولی نشو و نما پا رہی تھی۔ اسی لئے، اس کے فارسی کلام میں، ہم کوئی لفظ اس زبان کے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً کچھ شعر ہیں:

ز تنبولی و از بقال و عطار	بسر گرم است در کوچہ بازار
زنی مشکل کہ خیزد دیگر آہنگ	ز رشکِ بانسلی دارد دِل تنگ
نہال مولسری آں زیبِ گلشن	کرد و گُل مینتواں بر دان بخرمن
ز گلہا کیوڑہ گردید ممتاز	درو پیچیدہ بو چوں نغمہ درساز
ز طوطی و ز مینا و ز کویل	زہر یل آنکہ آہنگش برد دل
ز کمرک بزمِ مستان گشت روشن	ز شمع او گلستاں گشت روشن

احسن دو مرتبہ کشمیر کا ناظم رہا۔ پہلی مرتبہ ۱۶۳۲ء میں وہ اپنے باپ کا نایب مقرر ہو کر آیا تھا۔ ۱۶۴۲ء تک یہاں رہا۔ دوسری مرتبہ ۱۶۴۵ء سے ۱۶۴۷ء تک وہ کشمیر میں رہا۔ اسے کشمیر سے عشق تھا، چنانچہ اپنے اکثر اشعار میں اس کا اظہار کیا ہے۔ ایک شعر ہے:

اگر فرصتم بخشدم روزگار	کنم رشک فردوس کشمیر را

ایک اور شعر میں زاہد کو بہشتِ بریں سونپتا اور خود کشمیر پہ قناعت کرتا ہے:

بہشتِ بریں از شمار ابراں	بہ احسن گزاراید کشمیر را

اپنی مثنویوں "جلوۂ ناز" اور "میخانہ راز" میں بھی کشمیر اور اس کے مناظر کی تعریف کی ہے اور کشمیر کے دلکش منظروں کی تفصیل پر بھی ایک مثنوی "ہفت منزل" کے نام سے لکھی ہے۔ اس نے اہل کشمیر کی ایک شکایت یہ کی تھی کہ اگلے ناظموں کے جو [illegible] قانون [illegible] شاہ جہاں کو توجہ دلا کر منسوخ کروا دیا!

مغل باغات کی باز تعمیر کی اور خود بھی کئی نئے باغ بنوائے اور ان باغوں میں ایران اور ترکستان سے پھل اور پھول منگوا کر لگوائے۔

اس سے بڑھ کر ایک اور کام اس نے کشمیر کی ذہنی تزئین کا یہ کیا کہ اس زمانے کے سربرآوردہ فارسی شعراء کو کشمیر میں جمع کر دیا۔ اور ان کی سرپرستی کی۔ ان شعراء کے نام اوپر دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ہر ایک نے کشمیر کی مدح سرائی کی ہے۔

احسن کے کشمیری معاصرین میں، ملا محمد محسن فانی کا بڑا مرتبہ ہے۔ وہ سربرآوردہ عالم اور شاعری کے فن میں بھی اُستاد کا مرتبہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی تربیت سے غنی کاشمیری، نافع جیسے شاعر اُٹھے۔ فانی کے احسن سے ابتداء میں اچھے مراسم رہے، لیکن بعد میں کہتے ہیں کہ ایک رقاصہ نجی یا نچی کے سلسلے میں ان میں شکر رنجی ہو گئی اور فانی کشمیر سے دہلی چلے گئے، جہاں شاہ جہاں نے ان کی قدر کی اور الہ آباد کی صدارت کے عہدے پر انہیں فائز کیا۔ اس سے پہلے فانی بخارا میں بھی رہ چکے تھے۔ آخری عمر میں وہ کشمیر لوٹ آئے اور درس و تدریس میں زندگی گذار دی۔

فانی غزل اور مثنوی دونوں کے استاد تھے اور اپنی مثنویوں میں وہ اُردو یا ہندی لفظ بڑے حسن کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، مثلاً ذیل کے شعر ہیں:

نوبہار آمد بسیر گلشن ہندوستان	زیبدار طوطی بجائے پر برآرد برگ پاں
در چمن ہر صبح مینا می کند راگ بسنت	نیست طوطی را بجز کلیان چو بلبل بر زبان
چنبیہ میگیرد چو نرگس دستِ گلچیں را بزیر	لالہ می بندد حنا چوں گل بپائے باغبان
گُل ز شبنم ہار چنبیلی بگردن افگند	تا تواند شد حریفِ شاہدِ ہندوستان

یہ اس قصیدہ کے شعر ہیں، جو شاہ جہاں کی مدح میں لکھا گیا تھا۔ بعض مثنویوں میں بھی انہوں نے اُردو لفظ استعمال کئے ہیں۔ ایک مثنوی کے یہ شعر ہیں:

بود مرکب خاص آں ملک بہل | گرز و سیر عالم شود بہم تو سہل
لبِ گل رخاں سرخ از پاں شود | گہرہائے دنداں چو مرجان شود
بخوں ریزئ عاشقاں ہر سحر | زدہ خنجر بیرۂ پاں در کمر

فانی کا انتقال ۱۶۷۰ء میں ہوا۔

میرزا داراب جویا، غنی کے معاصر تھے اور ان کا شمار کشمیر کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ میرزا صائب کا ان کی شاعری پر بڑا اثر تھا۔ اور اسی کے انداز میں شعر کہتے تھے۔ ان کے بھائی میرزا کامران بیگ گویا بھی، اپنے زمانے کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ جویا ابراہیم خان ناظم کشمیر سے متوسل رہے۔ ابراہیم خان کے ساتھ دو شاعر ملا محمد سعید اشرف اور ملا علی تجلی، ہندوستان سے کشمیر آئے تھے اور دونوں نے جویا کی شاگردی اختیار کی تھی۔ جویا کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انہوں نے کچھ ریختے بھی کہے تھے۔ جو اب دستیاب نہیں ہوتے۔ جویا کا انتقال ۱۱۱۵ھ میں ہوا۔

جویا کے معاصرین میں ملا فصیحی بھی خوش فکر شاعر گذرا ہے۔ وہ صاحبِ دیوان تھا۔ اور اس نے اپنے کئی اشعار میں اُردو لفظ استعمال کئے ہیں۔ مثلاً ذیل کا شعر ؎

آشفتہ تر از ماست بسی انجمن | بی نور شود شمع طرب در لگن ما

شاہ جہاں کے عہد میں شہزادہ دارا شکوہ کا کشمیر کی تہذیبی اور علمی زندگی سے گہرا تعلق رہا۔ وہ اور اس کے پیر اخوند ملا محمد شاہ بدخشانی، جو عام طور پر ملا شاہ بدخشی کے نام سے مشہور ہیں، کشمیر میں عرصے تک رہے۔ ملا شاہ تصوف میں ایک خاص مسلک "کسبِ ماہ" کے بانی تھے اور ان کے گروہ صوفیا کے مشاغل چاندنی راتوں میں ہوا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے دارا شکوہ اور اس کی بیگم پری بیگم اور بہن جہاں آرا کی مساعی سے، چشمہ شاہی کے قریب کوہ زبرون کے ڈھلوان پر ایک عمارت تعمیر

کرائی گئی تھی، جو اب پری محل کے نام سے مشہور ہے۔ اس عمارت میں تصوّف کی کتابوں کا کتب خانہ تھا اور ملّا شاہ اور ان کے برادران طریقت کے مراقبے، اوراد اور وظائف بھی یہیں منعقد ہوتے تھے۔ پری محل کے نام نے، آج بھی اس اُجڑی ہوئی عمارت کے اطراف ایک رومانی حصار بنا رکھا ہے، چنانچہ کشمیر کے اکثر شاعروں نے، پری محل کو موضوع بنا کر تخیّل کی بلند پروازی دکھائی ہے اور نفیس نفیس نظمیں لکھی ہیں۔ قیصر قلندر نے "پری محل کا خواب" کے عنوان سے ایک عمدہ غنائیہ لکھا ہے، اس کے کچھ حصّے یہ ہیں :

یہ شرف گاہ تمدن جو ہے ویراں ویراں
جس کی آنکھوں ہی میں کجلایا ہے نورِ دانش
جس سے تاباں تھے کبھی کوشک و قصرِ حکمت
یہ در و بام پُر اسرار خموشی کے اسیر
رقص و نغمے کی اداؤں کا جو ہر لوچ لئے
جیسے رقاصۂ گلفام ٹھٹک رہ جائے

ملّا شاہ کچھ کھڑی بولی کے کلام کے راوی تھے، جو ان کے پیر میاں میر سے منسوب ہے۔ میاں میر، شاہ جہاں کے عہد کے بڑے صوفی درویش ہوئے ہیں ان کا پورا نام میر محمدؒ بن سائیں داتا ہے اور وہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ دوسرے فرقوں میں بھی بہت احترام رکھتے تھے۔ شاہ جہاں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، سکھوں کے چھٹے گرو، ہر گوبند، ان کے معتقد تھے اور امرتسر کے گوردوارہ کا سنگ بنیاد انہیں کے ہاتھوں رکھوایا تھا۔ گمر دہر گوبند کی نقل و حرکت پر، جہانگیر کو شبہ ہوا اور اس نے انہیں گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا تھا، تو میاں میر ہی نے سفارش کر کے

گرد کو رہا کر دیا تھا۔ ان کے ملفوظات کو ملّا شاہ نے کشمیر ہی میں دارا شکوہ کو سنایا تھا۔ اور دارا شکوہ ان سے ایسا متاثر ہوا تھا کہ، ان کو جمع کر کے ہم مفہوم قرآنی آیتوں اور حدیثوں اور فارسی اشعار کے ساتھ ایک رسالے کی صورت میں مرتب کر کے "ایماء المحققین" اس کا نام رکھا ہے۔ چند ملفوظات ذیل میں منقول ہیں:

دونھ جگ انتر پیرہے اور گھٹ گھٹ انتر جیو
جو پیو ہے ایکھیں جیو کو بھاوے پیو

بیت

مائی کا پتلا کیو اور آپی بیٹھو آ
نین بھیتر بیٹھ کے آپے آپ دکھا
آپ کہت اور آپ سنت اور آپکی کرتا یات
پگ پر آپھیں ڈولتا اور آپ ڈلاوے پات

کشتواڑ، جس کی کچھ تفصیلات، تاریخی حصّے میں دی جا چکی ہیں، کشمیر کے نوابعات میں ہونے کے لحاظ سے، کشمیر پر مغلوں کے تسلّط کے بعد، کشمیری مغل تہذیب کے زیر اثر آ گیا تھا۔ اور اس ادبی ذوق کا حصہ دار بن گیا تھا۔ چنانچہ کشتواڑ سے کچھ فارسی کے اور چند اُردو کے بھی اچھے شاعر وقتاً فوقتاً اُٹھے۔ کشتواڑ کے راجاؤں میں بھی شعر و ادب کا ذوق رہا۔ چنانچہ سترہویں صدی کے وسط میں راجہ مہا سنگھ پیدا ہوا تھا (۱۶۵۱ء) اس کی تعلیم فارسی میں ہوئی تھی۔ لیکن ہندوستانی زبان اپنے اطراف بول چال کی زبان کی حیثیت سے وہ جانتا اور اس میں شعر بھی موزوں کر لیتا تھا۔ چنانچہ شیو جی دلسنے اپنی "تاریخ کشتواڑ" میں اس کے کچھ شعر نقل کئے ہیں۔ اس سے ہی یہ روایت بیان کی ہے کہ مہا سنگھ عدل و انصاف سے حکومت کرتا تھا اور سخاوت

ہیں بھی وہ اطراف و اکناف میں مشہور تھا۔ اس کی سخاوت کا شہرہ سن کر بھاٹ قوم کا ایک فقیر اس کے پاس آیا۔ راجہ نے اسے ایک لاکھ روپیہ دیا اور ساتھ ہی یہ بھی پوچھا کہ "پہاڑی راجاؤں میں سے کسی کو مجھ جیسا سخی پایا ہے؟" یہ سنتے ہی فقیر نے روپیہ پھینک دیا اور اس کی ڈھیر پر پیشاب کر کے بولا "مجھ جیسا بھی کسی کو دیکھا ہے، جو ایک لاکھ روپیہ پر پیشاب کر سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر فقیر چلا گیا اور لکھا ہے کہ بارش ایسی بند ہوئی کہ خلق خدا عذاب میں پڑ گئی۔ راجہ نے کشتواڑ کے مشہور نیلہ کنٹھ جی کے مندر میں جا کر یہ مناجات نہایت درد اور عجز کے ساتھ پڑھی:

سوکن لاگی ستر سو جھن — مرگھہ سب بن ہیں سوئی رہیں رومی کی
ہالی ہل بہائی جیراں بھوئی — گہنتیں موں کچھ رسوں!
اب کب برسوگے کھوئی! — بنتی مہاجات بورن کی ہاہا سنو!
پر بوسری نیلہ کنٹھ رہی سولی کی — پرجا کی پرو گہن ہار سبھا کی کر دو سنبھال
دیکھیے مہاراج مہرباں ہوئی کی

مناجات ختم ہوئی اور آسمان سے پانی برسنے لگا اور سارا علاقہ سیراب ہو گیا۔

چندر بھان برہمن کا تذکرہ جس سے قدیم اردو کا یہ شعر منسوب ہے:

خُدا نے کس شہر اندر ہمن کیوں لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے، نہ پیالا ہے

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے اپنی تاریخ "کشیر" میں کشمیر کے فارسی گو شعرا میں شامل کیا ہے اور مولفین "بہار گلشن کشمیر" نے ریاست گوالیار کے کتب خانے میں محفوظ ایک کتاب "شاعران کشامرہ" کی سند پر یہ لکھا ہے کہ برہمن کا خاندان دو سو برس پہلے دہلی اور پھر آگرہ جا کر بس گیا تھا۔ شاہ جہاں نے اس کی فارسی میں قابلیت کی بنا پر

اسے اپنا منشی خاص مقرر کیا تھا۔ بعد میں وہ داراشکوہ کا میر منشی ہوگیا تھا۔ فارسی میں اس کا ایک دیوان اور کلیاتِ برہمن قابل قدر کارنامے مانے جاتے ہیں۔ آخری عمر میں وہ ترک دنیا کر کے بنارس چلا گیا تھا۔ شاہ جہاں اور داراشکوہ کے ہمراہ وہ کشمیر آیا اور یہاں کچھ عرصہ رہا بھی تھا۔ فارسی میں برہمن اپنے زمانے کا استاد مانا جاتا ہے اور اس کی ذہنی صلاحیتیں متنوع تھیں۔

میر کمال الدین حسین اندرابی رسوا سے کشمیر میں اُردو کے ترقی یافتہ روپ کا آغاز ہوتا ہے۔ رسوا اورنگ زیب کے آخری عہد کے کشمیری انشا پردازوں اور شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ کم و بیش شمالی ہند کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں جعفر زٹلی، افضل اور فضلی کے معاصر تھے۔ انشا میں وہ اپنے عہد کے سب سے زیادہ مشہور علما میں سے ہیں۔ ان کی انہی صلاحیتوں کی وجہ سے اکثر امراء اور نظمائے کشمیر ان کے قدردان تھے اور مکتوب نگاری کی خدمت ان کے تفویض کرتے تھے۔ فاضل خان، ناظم کشمیر (۱۶۹۸ء - ۱۷۰۱ء) نے ان کی سرپرستی کی۔ فاضل خان کے بعد عنایت اللہ خان ناظم (۱۷۱۲ء - ۱۷۱۳ء) سے بھی ان کا توسل رہا۔ چنانچہ حج کے سفر سے اس کی واپسی کے بعد رسوا نے اس کی مبارک باد میں ایک نفیس رقعہ لکھا تھا۔

رسوا دہلی میں رہے تھے، جہاں ان کے فن کی قدر ہوئی اور شہزادہ اکبر شاہ کی سرکار میں وہ ملازم رہے، لیکن جب معظم نے اکبر شاہ کو شکست دی تو وہ کشمیر لوٹ آئے اور یہاں اپنے فن کی خدمت اور نوجوانوں کی اس فن میں تربیت کرتے ہوئے زندگی گذار دی۔ چنانچہ اس فن میں ان کے بہت تلامذہ ہوئے۔ ایک شاگرد لچھی رام نے ان کے رقعات کو، ان کے فارسی اور اُردو کلام کے ساتھ ایک مجموعے کی صورت میں اکٹھا کر کے "رقعاتِ خاتم الکمال" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کے مخطوطے محکمۂ تحقیقات، سری نگر کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

رسوا کا اُردو کلام ریختہ، نظموں اور غزلوں کی شکل میں رہتا ہے۔ ان کی ایک ریختہ نظم حسب ذیل ہے۔

امشب صنم کے واسطے جان و تنم در جنگ ہے
ساز طپیدن . . . . . . آہنگ ہے[1]

از دیدۂ خونبار من و ز نالہائے زارِ من !
اندر سرائے تار من امشب جوش ہے سب رنگ ہے

وری کر از چشم ترم و ز چشم زاد سر...... !
اما دِل غم پرورم تجھ سنگ دِل کے سنگ ہے

با غیر اُلفت تا کُجا از یار وحشت تا بکی !
سب سوں وفا ہم سوں جفا اے بے وفا کیا ڈھنگ ہے

کو باش اصدر عاشقاں مجھ سا بلا گرداں ہے
ہر چند از عشق چو من تجھ بے وفا کو ننگ ہے

تا رفتہ از دیدہ ام با کس نبا رامیدہ ام
از جملہ جگ رنجیدہ ام، با کامیابم جنگ ہے

غزل خوانی کا یہ انداز، ان کے بعض معاصرین، دہلی، اورنگ آباد خاص طور پر بعد کے شعراء جیسے یکرنگ، ناجی وغیرہ کے یہاں ملتا ہے ــــ ایک ریختہ مناجات بھی لکھی تھی۔

شُد نفس و شیطان رہبرم اللہ میاں ترا کرم
از ہر چہ گوئی بد ترم اللہ میاں تیرا کرم

غیر از تو موجود ے نہیں میرا سکا سب نایب[1]
خالق تہیں، رزاق تہیں، اللہ میاں تیرا کرم

---

[1] ۔ سروری صاحب نے مصرع اسی طرح نقل کیا ہے۔

در خلوت در انجمن ماں باپ اور فرزند و زن !

تجھ بن نہیں آرامِ مَن ، اللہ میاں تیرا کرم

ناکردنی کردم بسی ناخوردنی خوردم بسی

باخود گنہ کردم بسی، اللہ میاں تیرا کرم

ہستیم ہاہمچوں خر بگل از فعلِ بے ہودہ فعل

مارا بہ نفسِ ما ہِہل اللہ میاں تیرا کرم

یہ مناجات طویل ہے اور سولہ اشعار پر مشتمل ہے۔ ایک اور ریختہ غزل قابلِ مطالعہ ہے۔

محبت پیت معشوقوں ہیں کم ہے

نہ از عشاق پروا ہے نہ غم ہے

رسوا کی ایک غزل ہے۔

محبت پیت معشوقوں ہیں کم ہے

نہ از عشاق پروا ہے نہ غم ہے

نہیں یک لحظ از یاد تو غافل

تمہارے نیہہ میں دل دمبدم ہے

بہت مشتاق ہیں تیرے ولیکن

ٹھکانے سے محبت دوٹوک کم ہے

ارے کوئی جہاں میں یار کم ہے

اگر ہے یار، بے آزار کم ہے

ندیدم بے جفا یک بے وفا را

دریں گلشن، گُل بے خار کم ہے

دِل دادم و غمہا را خریدم
جگت میں، پیت سا بیپار کم ہے

ایک اور غزل کے کچھ شعر ہیں:

دل و جان اس لٹک اوپر فدا ہے
ستم گر بے وفا، یہ کیسا ادا ہے
بیک نظارہ دِل دادیم از دست
وفا دشمن، جفا خو ہے، بلا ہے
بمسکیں دِل، بدہ دیدار کی بھیک
گدا ہے، بے نوا ہے، بے خدا ہے

ایک غزل کا شعر ہے:

کمر بستی بخونِ بے گُنا ہاں!
خدا سیں ڈر، خدا سیں ڈر، خدا سیں

شاہ جہاں کے عہد سے اکثر اہلِ سخن، قدر دانی کی وجہ سے، کشمیر سے دہلی جانے لگے تھے۔ جہاں حکمرانوں اور متوسل امراء کے درباروں میں، ان کی قرار واقعی قدر ہوتی تھی۔ میرزا عبدالغنی بیگ قبولؔ، کشمیر کے اساتذہ فارسی میں شمار ہوتے ہیں۔ غنیؔ کاشمیری کے معاصر مرزا داراب جویاؔ کے تلامذہ میں ان کا مقام بلند ہے۔ اپنے زمانے میں وہ اُستاد مانے گئے۔ جن میں محمد علی حشمتؔ اپنے زمانے کے اساتذہ میں شمار ہوئے۔ عبدالحئی تاباںؔ انہیں کے شاگرد تھے اور ان کی صحبتوں سے کئی خوش فکر شاعر اُٹھے۔ بھگوان داس ہندی نے انہیں ملا شاہ بدخشی کے اقرباء میں بتایا ہے کہ پیر غلام حسن کھویہامی، مصنف "تاریخ کشمیر" ان کی صلاحیتوں کے بارے

میں رقمطراز ہیں۔

"مجلس طرازی شعر و سخن، و دقیقہ پردازی ایں فن را بدرجہ کمال رسانید و مرجع ارباب معنی شُد۔"

ایہام گوئی، اس زمانے میں ہندوستان کے شعراء میں بہت مقبول تھی۔ قبولؔ پر بھی اس کا اثر تھا۔ عالمگیر کے زمانے میں وہ دہلی گئے اور ہدایت اللہ خان کی مصاحبت میں نائب وزیر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ بندرابن داس خوشگو نے اپنے "سفینہ ہندی" میں ان کے بارے میں مفصل لکھا ہے۔ اس وقت قبول نواب صمصام الدولہ سے متوسل تھے۔ نواب کی مدح میں انہوں نے قصیدے بھی لکھے ہیں۔ فرخ سیر کے عہد میں انہیں صلابت خان کی مصاحبت حاصل رہی۔ خوشگو اکثر ان کی صحبتوں میں شریک رہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ لکھا ہے کہ خوشگو اپنی غزل سُنا رہے تھے۔ قبولؔ نے ایک مصرعہ کے بارے میں مشورہ دیا کہ اس کو دوسرا مصرعہ کہہ کر مطلع بنا دیا۔ خوشگو نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ آخری زمانے میں قبولؔ نے فقر کی زندگی اختیار کر لی تھی اور شاہ جہان آباد میں مرجع خلائق بن گئے تھے۔ اس زمانے میں وہ پُرانے قلعہ میں رہا کرتے تھے۔

قبولؔ فارسی کے علاوہ اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن ان کا زیادہ کلام نہیں ملتا۔ تذکروں میں صرف ایک شعر نقل کیا گیا ہے۔ جو حسب ذیل ہے ؎

دِل یوں خیال زُلف میں پھرتا ہے نعرہ زن
تاریک شب میں جیسے کوئی پاسباں پھرے

قطب الدین باطنؔ نے ان کا نام مرزا علی بیگ اور شیفتہ غنی بیگ لکھا ہے لیکن پیر غلام حسن اور علی ابراہیم خاں خلیل نے ان کا پورا نام میرزا عبدالغنی بیگ قبولؔ لکھا ہے۔

قبول کا انتقال ۱۱۲۵ھ میں ہوا۔ ان کے فرزند میرزا گرامی بھی فارسی کے شاعر تھے اور اُردو میں بھی کچھ کلام چھوڑا ہے۔ میر نے اور قائم نے طبقۂ دوم کے شعرا میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ:

"چیز ہاے چند از قبیل شعبدہ و نیرنگات بدست آوردہ عالمی را بآب میراند دبطور ملاحدہ و زنا..... باکمال، بے معنی و بے باکی میزیست، ہموارہ مطعون زمان ارباب تحقیق می بود در آخر سلطنت، حضرت فردوس آرامگاہ حرف وجودش کز نمک فنا از صفحۂ روزگار برداشت۔"

ذیل کا شعر گرامی کی فکر کا نتیجہ ہے:

حاضری جن محل نہیں کھاتا | بیگمی ہے پنیر منعم کا!

افغان عہد کے فاضل پنڈتوں میں، پنڈت دیارام کاچرو خوشدل اونچا مقام رکھتے ہیں۔ وہ فارسی کے شاعر اور اچھے انشاء پرداز تھے۔ خوشنویسی میں بھی انہیں مہارت تھی۔ ان کی ولادت سری نگر کے محلہ رینہ واری میں ۱۷۷۴ء میں ہوئی تھی۔ افغان ناظم عطا محمد خاں کے عہد (۱۸۰۷ء — ۱۹۱۰ء) سے ان کا عروج ہوا۔ مغلیہ دور کے بعد، فارسی ادب اور شاعری کی ترقی کے لحاظ سے افغان دور "دورِ ثانی" کہلاتا ہے۔ افغان حکمرانوں نے، خوشدل کے علم و فضل اور انشاء میں کمال کی وجہ سے، ان کی قدردانی کی۔ چنانچہ تیمور شاہ کے میر منشی مقرر ہو کر وہ کابل گئے۔ کچھ عرصہ زماں شاہ دُرّانی کے امیر الامراء رحمت خان المخاطب بہ وفادار خان کے میر منشی بھی رہے۔ اپنے مربیوں کی مدح میں انہوں نے کئی قصیدے بھی لکھے ہیں۔ وہ غزل بھی اچھی کہتے تھے اور دو رسالے "بہارِ سخن" اور "گلزارِ سخن" بھی ان کی یادگار ہیں۔ خوشدل نے کچھ مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ ایک مثنوی میں اپنے سری نگر سے کابل تک

سفر کا حال اور راستے میں جو شہر ہیں۔ ان کی تفصیل اور خاص طور پر لاہور اور کابل کی توصیف کی ہے۔ کابل میں ان کا قیام عرصہ تک رہا۔ مگر کشمیر کی انہیں اکثر یاد آتی تھی۔ ایسے ہی ایک موقع پر انہوں نے یہ شعر کہے تھے:

مرا یادِ وطن آشفتہ تر کرد   نمی دانم چرا قسمت بدر کرد
زجوش گریہ چشم اچھ وَل شُد   بہت شد، مار شُد تالاب ڈَل شد

خوشدل کی دلچسپیاں وسیع موضوعات پر حاوی تھیں۔ شعر و انشا اور خوشنویسی کے علاوہ انہیں موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ انہوں نے موسیقی پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ ان کا یادگار کارنامہ ایک بیاض ہے جو بہت ضخیم ہے اور متنوع اندراجات پر حاوی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی پسند کے منتخب اشعار، اساتذہ کی مثنویاں، تاریخی قطعے، مکاتیب، سب اکٹھے کئے ہیں۔ موسیقی کے راگوں اور راگنیوں کے سلسلے میں کئی اشعار اور ریختے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً ایک "فردِ ہندی" ہے۔

آ گئے تھے، مثلِ شبنم، سیرِ گلشن کر چلے
باغباں تو دیکھ لے اپنا چمن ہم گھر چلے

دو ابیات ہیں:

خود فنا ہو کے ذات سوں ملنا   یہ تماشا حباب میں دیکھا
آپ کوں سوز اور کوں لذت   یہ صفت کوں کباب میں دیکھا

ذیل کا قطعہ بھی بیاض سے ماخوذ ہے۔

مدارِ دارِ دنیا در سفر ہے   بہ آبِ زر لکھا ہے بوعلی نے
کہ عمرِ بے وفا اندر گذر ہے   کہ سونے سے مسافر کوں خطر ہے

موسیقی سے لگاؤ کے سبب انہیں اردو اور ہندی شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ اشعار اور قطعات کے علاوہ انہوں نے کئی گیت بھی لکھے ہیں۔

ذیل میں ایک گیت درج ہے۔

اُٹھو میرے لالہ مدن گوپالہ — آیا تیرا بالہ بلاونہ کو
دودھ، مکھن، روٹی چوپٹ کی — دیوانگی بنسی بجانہ کو
جاگیۂ گوپالہ، لالہ پنچھی بند بولے — جاگیو پنچھی بولہ لالہ پنچھی ہنسے

"سہ تالہ" کی لے میں یہ شعر لکھے ہیں۔

جس باغ میں بہلی گئی! — اُس باغ میں جانا پڑا
اُوس باغ میں پانی نہیں — خون جگر کھانا پڑا

افغان عہد میں جو شاعر منظر عام پر آئے۔ ان میں سے بعض کی سرپرستی سُکھ جیون مل کھتری نے کی۔ وہ لاہور سے افغان ناظم عبداللہ خان (۱۷۶۲ء) کا صاحب کار مقرر ہو کر کشمیر آیا۔ سُکھ جیون مل میں اور عبداللہ خان میں کچھ خصومت ہو گئی تھی۔ اس لئے اس نے ایک ذی اثر شخص، ابوالحسن بانڈے کی مدد سے رات کے وقت عبداللہ خان اور اس کے دو بیٹیوں کو قتل کر کے، حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لی اور احمد شاہ درانی نے جب اس کے خلاف فوج بھیجی تو اس کو شکست دے کر، پادشاہ دہلی کے نام کا خطبہ مسجدوں میں پڑھوایا اور بقولِ حسن والا گوہر اور بقولِ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی عالمگیر ثانی کی خدمت میں تحفے تحایف بھیج کر راجہ کا خطاب حاصل کیا۔ ابتداء میں اس نے عدل و انصاف سے حکومت کی۔ لیکن بعد میں میر غلام علی آزادِ بلگرامی کے بیان کے مطابق مسلمانوں سے تعصب برتنے لگا تھا۔ آخر درانی نے نورالدین خان بامزئی کی سرکردگی میں فوج بھیج کر اس کا قلع قمع کیا۔ اس کی تفصیل تاریخی حصّہ میں گذر چکی ہے۔

اپنے عروج کے زمانے میں، سُکھ جیون مل کو نام و نمود کی بھی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ فارسی شاعری اور ادب سے اُسے لگاؤ تھا اور وہ خود بھی فارسی میں شعر کہتا

تھا۔ اس نے کئی شعراء کو اپنے دربار سے متوسل کر لیا تھا۔ جن میں ملا لعل محمد توفیق ملا رفیع مائیتجی۔ میرزا محمد جان بیگ سامی، عبدالوہاب شایق، رحمت اللہ بانڈے نوید، محمد علی خان متین، ملا راجح شامل تھے۔ اپنے نام کو کشمیر کی تاریخ میں زندہ رکھنے کے لئے اس نے ایک "شاہنامہ کشمیر" کی تجویز بنائی تھی اور اس کے مختلف حصے مختلف شاعروں کے ذمہ کئے تھے۔ لیکن یہ "شاہنامہ" نامکمل رہ گیا۔ توفیق، شایق وغیرہ نے اس کے جو حصے نظم کئے تھے، وہ محفوظ ہیں۔

توفیق فارسی کے اچھے غزل گو شاعر تھے۔ ان کا دیوان موجود ہے۔ اس کے علاوہ "شاہنامہ کشمیر" کے بھی کچھ حصے انہوں نے نظم کئے تھے۔ اور وہ محفوظ ہیں۔ ان کی دو اور تصانیف "رسالہ شیبی" اور "سراپا" بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کی ایک رباعی میں ہندوستانی زبان کے کئی لفظ آئے ہیں۔ یہ رباعی توفیق نے سکھ جیون مل کے دورہ پرگنہ ولر کے موقع پر کہی گئی تھی۔ سکھ جیون مل پالکی میں سوار تھا اور توفیق اس کے ساتھ تھے۔ توفیق نے یہ رباعی اس کے سامنے پڑھی تھی۔

ایں پالکی طاق کہ مطبوع نکوست!

چشمی است کہ از بانس فراز س ابروست

چترش فلک دیدہ و مژگاں جالر

چوں مردمک دیدہ مہاراجہ درست

توفیق ملا ساطع کے شاگردوں میں سے تھے، بعد میں انہوں نے محمد رضا مشتاق سے بھی مشورہ سخن کیا تھا۔ پیر غلام حسن نے لکھا ہے۔ انہیں اپنے عہد میں ملک الشعراء کا مرتبہ حاصل تھا اور ملا طاہر غنی کے بعد ان کے مرتبہ کا شاعر اور کوئی پیدا نہیں ہوا۔ "شاہنامہ کشمیر" کے لئے انہوں نے یوسف شاہ چک سے لے کر عالمگیر کے عہد تک کے حالات، دو ہزار اشعار میں نظم کئے تھے۔ حسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ ــــ

"در مجلس سکھ جیون سر دفترِ شعرای مجلس می بود"

میرزا محمد جان بیگ سامی کے سُکھ جیون مل کے حلقہ شعرا میں داخل ہونے کا ایک دلچسپ واقعہ پیر غلام حسن نے اپنی تاریخ کے حصہ چہارم "در ذکر شعرای فارسی" میں لکھا ہے۔ ایک دن سُکھ جیون مل کے درباری شعراء کی محفل جاری تھی۔ سامی اس وقت تک درباری شعراء میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ محفل میں سُکھ جیون مل نے حافظ کا مصرعہ: "اے فروغِ ماہ حُسن از روئے رخشانِ شُما" طرح کے طور پر دیا تھا۔ اور شعراء اس پر طبع آزمائی میں مصروف تھے۔ سامی جب وہاں پہنچے تو ایک کاغذ پر یہ شعر لکھ کر اندر بھجوا دیا:

سامی از راہِ حیا بیرونِ دَر افتادہ است
باز گردد یا درآید، چیست فرمانِ شُما

سکھ جیون مل نے انہیں اندر بُلا لیا۔ اس وقت سے وہ مجلس کے رُکن بن گئے۔

پیر غلام حسن نے ان کا مختصر حال لکھا ہے، لیکن حکیم قدرت اللہ قاسم نے تفصیل لکھی ہے۔ ان کا خاندان قسماق کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد انہیں لے کر کشمیر آئے۔ سامی نے عبدالرشید بیتو سے تلمّذ حاصل کیا اور جلد منظرِ عام پر آ گئے۔ قاسم اور شیفتہ نے جنہیں سکھ جیون مل کی تجویز "شاہنامہ کشمیر" کا علم نہیں تھا، لکھا ہے کہ سامی نے شاہ عالم کے عہد میں فردوسی کے شاہنامہ کے انداز پر مثنوی لکھنی شروع کی تھی۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ اور یہ شاہنامہ ادھورا رہ گیا۔ یہ دراصل اس "شاہنامہ کشمیر" کی طرف اشارہ ہے، جس کا ایک حصہ سامی کے بھی تفویض ہوا تھا۔ سُکھ جیون مل کے سقوط کے بعد سامی کچھ عرصہ خُرم خان، افغان ناظم کشمیر (۱۷۶۶ء - ۱۷۷۱ء) سے بھی متوسل رہے۔ خُرم خاں کی مدح میں انہوں نے ایک قصیدہ لکھا تھا، جس میں یہ صفت رکھی ہے کہ اس کے ہر شعر سے دو تاریخیں برآمد ہوتی ہیں۔ آخری زمانے

ہیں وہ دہلی چلے گئے تھے اور اردو کے مشہور استاد خواجہ میر درد کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ چنانچہ اپنے پیر کی مدح میں ساؔمی نے کئی رباعیاں، ترجیع بند اور ترکیب بند لکھے تھے۔ قاسم کا بیان یہ بھی ہے کہ اعظم الدولہ محمد میر خان بہادر نے ساؔمی سے اپنے اشعار میں اصلاح لی تھی۔

ساؔمی کا اردو کلام کافی مل جاتا ہے۔ ان کی طبیعت میں چہل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان سے اور ایرانیوں کی طرح، ہندوستانی لفظ صاف ادا نہیں ہوتے تھے۔ اس کی معذرت میں انہوں نے یہ قطعہ کہا تھا :-

ہندی میں زبان نہیں اُلٹتی ۔۔۔ گو لاکھ کہوں مُغل پسر ہوں
گر سہو بھی ہو تو کیا اَچھنبا ۔۔۔ بے عیب خُدا ہے، میں بشر ہوں

ایک اور ایرانی نے کہا تھا ـــ "ہندی و رندی زباں لٹ پٹ است"

ساؔمی کی ایک غزل کے شعر حسب ذیل ہیں :

افسوس کہ اغیار ہوئے یار تمہارے ! ۔۔۔ غمّاز بنے محرم اسرار تمہارے
مرغانِ قفس دن کو تڑپتے ہیں لیکن ۔۔۔ دن رات تڑپتے ہیں گرفتار تمہارے
ہم گھر میں تمہارے کہو کس راہ سے آئیں ۔۔۔ دشمن ہیں ہمارے در و دیوار تمہارے
جب گرم غضب ہوتے ہو تم لیتے ہیں بوسہ ۔۔۔ ڈرتے نہیں آتش سے گنہگار تمہارے

مُلا رفیع بانہچی، میر امان اللہ شہید کے تلامذہ میں تھے۔ عربی علوم کی تکمیل انہیں سے کی تھی۔ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ کچھ عرصہ امیر الامرا صمصام الدولہ کی ملازمت میں بھی رہے۔ ایک موقع پر حُسنِ طلب کے طور پر ایک بیت لکھ کر امیر الامرا کے پاس بھیجی تھی :

بہ ایں محیط کرم گرچہ آشنا دارم ۔۔۔ کفم چو کاسہ گرداب از گہر خالی است

اس پر امیر الامرا نے ایک ہزار روپے انہیں عطا کیا تھا۔ آخری زمانے میں وہ سکھ جیون مل سے

وابستہ رہے۔ سکھ جیون مل کے حلقے کے شعراء شعر کہنے کے لئے نئی نئی تقریبیں ڈھونڈتے تھے۔ ایک موقع پر "شکر نمک" کی ردیف میں قصیدہ کہنے کی طرح نکالی۔ سب نے اس پر طبع آزمائی کی۔ مُلا رفیع نے ایک طویل قصیدہ لکھ کر سُکھ جیون مل کو پیش کیا تھا۔ اس کا ایک شعر ہے:

ای کہ اک عالم اُمیت از در گہش یابد دو وقت،

دال، چاول، ماش، و برنج روغن و شکر نمک

سِکھوں کا عہدِ کشمیر کی تاریخ میں ظلم و استبداد، لوٹ کھسوٹ کے لئے بدنام ہے۔ اس دور کی بدعنوانیوں کے بارے میں بعض شاعروں اور ادیبوں نے لکھا ہے لیکن حمید اللہ شاہ آبادی نے نظم و نثر دونوں میں جس طنزیہ انداز سے اس عہد کی پھبتی اڑائی ہے۔ وہ کشمیر کی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ حمید اللہ پرگنہ برنگ میں پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں اسلام آباد، اننت ناگ میں منتقل ہو گئے تھے۔ درس و تدریس ان کا مشغلہ تھا۔ بلا نگار شاعر اور انشا پرداز تھے۔ فارسی میں، ایک مزاحیہ مثنوی سعدی کی بوستان کے جواب میں "شکرستان" لکھی تھی۔ ان کا "چائے نامہ" بہت مشہور ہے۔ ایک تاریخی مثنوی "اکبر نامہ" بھی لکھی تھی۔ ایک رسالہ "ردِ شیعہ" بھی ان کے افکار سے موجود ہے۔ لیکن اپنے عہد پر موثر سب سے زیادہ دلچسپ ان کا "بیبوج نامہ" یا "ناپُرسان شاہ" ہے۔ جس میں سکھ نظم و نسق کی ایسی ہجو کی ہے کہ جس کی مثال ادب میں کم ملتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ان ایام حسرت فرجام میں چرخ ستمگر و سُفلہ پرور کی گردش سے خطۂ کشمیر جنتِ نظیر میں خانخانان کے تصرف سے نواب عادل خاں تبدیل ہو کر، حکومت سلطانِ شہر ناپُرساں، راجہ راجگان تاراج سنگھ کے قبضے میں آئی اور حریص سنگھ جو رعیت پروری اور عدالت گستری میں نامی تھا۔ کشمیر کی

صوبہ داری پر مشرف ہوا۔ چونکہ راجہ راجگان کو رعایا پروری اور شفقت منظور تھی۔ اس لئے ہدایت کی کہ عدل اس طرح کیا جائے کہ اہالیان کا منہ حکایت و شکایت سے بند کر دینا چاہیئے۔ ہر رہزن کو اذن عام ہو کہ بے محابا اپنے کام میں مشغول رہے۔ برف میں قلبہ کاری کی جائے اور بہار میں وصولات کی جائیں۔ گریز خان میر شمشیر اور ادبار خان بخشی، فوج، شامت سنگھ چہرہ نویس، مردار سنگھ قابچی، چرکین سنگھ آتش پز رہزن بانڈے دربان، مقری سنگھ دفتری . . . .''

اس ہجویہ بیانیہ میں جگہ جگہ اشعار اور نظمیں بھی آگئی ہیں۔ پنجاب کے یہ سکھ، اہل کشمیر کے لئے، ہندوستانی تھے۔ چنانچہ آج تک بھی سارے ہندوستانیوں کے لئے پنجابی ہی کا لفظ اہل کشمیر کے یہاں مستعمل ہے اور ظلم و استبداد کی جو سوغات پنجابی لائے تھے۔ وہ ہندوستانی تحفے بن گئے۔ حمید اللہ کہتے ہیں:

ہمی آید بجائے تمر ہندی ترشروئی ز ہندوستان بخروار

یہ جذبات نفرت جو سکھوں کی تباہ کاریوں کا تحفہ تھے۔ آج بھی اہل کشمیر کے دلوں میں باقی ہیں۔ حمید اللہ نے اسی لب و لہجہ میں ایک نظم ''ناپرسان نامہ'' میں لکھی ہے۔ جو حسب ذیل ہے:

گشت یکرنگ کشور و وادی بوم در شہر کرد آبادی!
گر شغالی بکوچہ می نالید ہیچ سگ مانعش نمیگردید!
در مساجد بجائیگاہ لبیب! چغد واعظ نشست و زاغ طبیب
گاو را گرز باغ کس میراند برجگر زاغ منتظر می ماند
بود وردِ زبان اہلِ خراج دھرم کا راج ملک کا ناراج

آخری شعر کے دوسرے مصرعے میں حمید اللہ نے مذہبی عقیدوں کو حکومت کا

اصول بنانے میں، جو بربادی مضمر ہے۔ اس کا بڑا ترقی پسند تصور پیش کیا ہے۔ اس شعر کے پہلے مصرعے کو قاضی ظہور الحسن سیوہاری نے اپنی "نگارستانِ کشمیر" میں اس طرح لکھا ہے — "ہیئے بہ درد زبان اہلِ خراج":

ان حالات میں کوئی تعجب نہیں جو لوگ اپنا وطن عزیز ترک کر کے، امن کی تلاش میں ہندوستان اور پنجاب چلے گئے ہوں۔ چنانچہ اُردو شعراء کے تذکروں میں اس عہد کے بہت سے شعراء کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ کشمیر میں پیدا ہوتے تھے۔ اور دہلی یا اور مقامات کو چلے گئے تھے۔ یا ان کا خاندان دہلی منتقل ہو گیا تھا۔ جہاں وہ پیدا ہوئے۔ انہیں میں ایک بڑے ایسے شاعر خواجہ احسن اللہ خاں بیان ہیں۔ یہ دہلی کے ابتدائی دور کے شعراء، ناجی، یکرنگ، فغاں وغیرہ کے معاصر تھے اور فغاں کے دوست بھی تھے۔ بیان آخری زمانے حیدر آباد چلے گئے تھے۔ جہاں نواب ارسطو جاہ وزیرِ اعظم نظام علی خاں، حکمرانِ حیدر آباد کے درباری شعراء میں داخل ہو گئے تھے۔ بیان بڑے قادر کلام شاعر ہوئے ہیں۔

سودا کے معاصرین میں محمد علی حشمت، اپنے عہد کے سربرآوردہ سخن سنج اور سربرآوردہ شعراء میں سے عبد الحیٔ تاباں کے اُستاد تھے۔ وہ "مخزنِ نکات" کے مصنف قایم چاند پوری کے ہم عصر تھے۔ اور قایم نے انہیں "مردم کشمیر" میں شمار کیا ہے۔ حشمت دو سال قطب الدین علی خان کی رفاقت میں رہے اور انہیں کے ساتھ ۱۱۵۸ھ میں مراد آباد گئے اور خان مذکور کے ساتھ علی محمد روہیلہ کے خلاف جنگ میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ حشمت عبد الغنی بیگ قبول کے شاگرد تھے اور صاحبِ دیوان ہیں۔

سودا کے ایک اور معاصر رنگین کا ذکر خلیل نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ کشمیری نژاد ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ دیا ہے:

مدت ہوئی ہم اس میں کچھ بھی اثر نہ پایا — اس واسطے دعا سے آخر کو ہاتھ اُٹھایا

خواجہ محمد امین، امین کشمیری سے پٹنہ چلے گئے تھے۔ علی ابراہیم خاں خلیل نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۴ھ میں وہ نواب محمد رضا خاں مظفر جنگ کی ملازمت میں تھے۔ یہ صاحب تھے اور فارسی میں بھی ایک دیوان ان کی یادگار ہے۔

رائے سیتا رام عمدہ ابتدائی دور کے شعرا میں اہمیت رکھتے ہیں۔ امراللہ الہ آبادی نے لکھا ہے کہ وہ کشمیر میں پیدا ہوئے تھے اور انہیں انعام اللہ خاں یقین کا متبع بنایا ہے۔ ان کا کافی کلام ملتا ہے۔ دو شعر یوں ہیں:

کسو کے سینے میں ہرگز مرا سا داغ نہ تھا
مرے چراغ سا روشن کوئی چراغ نہ تھا

چمن میں کھینچ کے لائے ہیں لکرخاں مجھ کو
وگرنہ سیر چمن کا مجھے دماغ نہ تھا

مہتاب رائے تاب کے بارے میں ذکا نے لکھا ہے کہ وہ کشمیری خاندان سے ہیں اور شاہ عالم ثانی کے اُستاد حافظ عبدالرحمن خاں احسان سے انہوں نے شعر کا فن سیکھا تھا۔ اسی طرح گنگا داس تسکین، اجودھیا پرشاد حیرت، اور حافظ محمد حفیظ کشمیری کا ذکر بھی ذکا کے یہاں ملتا ہے۔ یہ قدرت اللہ قاسم کے شاگردوں میں تھے اور مرثیہ میں شہرت رکھتے تھے۔ تایب کا تخلص شیفتہ نے تاب لکھا ہے۔ حیرت لکھنؤ میں مقیم تھے اور شیخ قلندر بخش جرات سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ ایک مختصر دیوان چھوڑ دیا ہے۔

علی ابراہیم خاں خلیل نے میرزا مظہر جانجاناں کے معاصرین میں ایک سخن گو منشی کشن چند مجروح کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کی اصل کشمیر سے ہے اور خود ان کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ میرزا مظہر جانجاناں سے وہ شور سخن کرتے تھے۔ ان کے کلام سے کچھ نہیں دیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس وقت کہ ۱۱۹۶ھ ہے۔ مجروح لکھنؤ میں عزت

کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

کچھ اور شعراء یہ ہیں:

غلام ناصر جرّاح جن کا خاندان دہلی میں بس گیا تھا اور یہ وہیں پیدا ہوئے تھے۔ شیفتہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"نظر بہ پیشہ ایں تخلص پذیرفتہ والحق دستگاہی نیکو داشت" جس طرح پیشے کی رعایت سے انہوں نے تخلص چنا تھا۔ تخلص کی مناسبت سے شعر بھی کہتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے:

جرّاح ٹانکے دینے میں مت کر درنگ تو

اس واسطے کہ زخم مرے یار گرم ہیں

محمد عبداللہ خاں خستہ، میر جیون کے عرف سے مشہور تھے اور دہلی میں رہتے تھے۔ ان کے والد کے بارے میں شیفتہ نے لکھا ہے کہ مجدالدولہ، عبدالاحد خاں کے متوسلین میں سے تھے۔ پنڈت امرناتھ شعلہ لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ خواجہ بینگا جو شیدا تخلص کرتے تھے اور علاقہ بندی کے فن میں ماہر تھے۔ شیفتہ نے ان کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں

جانیں مشتاقوں کی لب تک آئیاں!

ہائے ہے بلبے ظالم تیری لاپروائیاں!

جا کان میں باتوں کے بہانے لیا بوسہ

دیوانہ ہوں شیدا میں بڑا کام کیا ہے

ان کے بیٹے مغل علی مغل بھی شاعر تھے۔

فیض، کرپا کرشن کا تخلص تھا۔ جو لکھنؤ میں بس گئے تھے۔ مرزا علی خاں محشر کے بارے میں شیفتہ نے لکھا ہے کہ جب لکھنؤ میں تھے۔ ان میں اور جرأت کے شاگرد میرزا علی

مہلت میں نزاع تھی۔ آخر دونوں نے گومتی کے کنارے مجادلہ کے ذریعے نزاع کا تصفیہ ٹھہرایا۔ مہلت زخمی ہوئے اور زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ محشر خوفِ قصاص میں دہلی بھاگ گئے اور وہاں پہنچ کر خواجہ میر دردؔ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب لکھنو لوٹے تو مہلت کے ورثا نے قصاص میں ان کو قتل کر دیا۔ محشر کے دو شعر ہیں :-

جاں منتظر ہے آنکھوں میں وقتِ رحیل ہے
جلدی پہنچ کہ تیرے ہی آنے کی ڈھیل ہے

دور میں اس چشم کے گردوں کو آسائش نہیں
کس گھڑی، کس دم، نئے فتنے کی فرمائش نہیں

میر محمد علی نادر بھی دہلی کی شعر و سخن کی محفلوں میں روشناس تھے۔ شیفتہ نے ان کا نام محمد عارف علی لکھا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے :

سو طرح سے بات اگر کیجئے تو کھلتا ہی نہیں
مجھ میں اور اس میں نہ جانوں پڑ گئی کیسی گرہ

قاضی خواجہ امین الدین خاں امینؔ، قاضی وحید الدین خاں کے بیٹے تھے۔ جو امیر الامرا نجیب الدولہ کے زمانے میں قاضی القضا کے عہدہ پر مامور تھے۔ امینؔ شہزادہ جہاندار شاہ کی سرکار میں ملازمت رکھتے تھے۔ عشقیؔ نے لکھا ہے کہ وہ پہلے منشی ہلاس رائے اخلاص سے مشورہ سخن کرتے تھے اس زمانے میں وہ پٹنہ میں رہتے تھے۔ فارسی میں ان کا کلام زیادہ ہے اور وہ فارسی کے اچھے شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن آخری زمانے میں اردو سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ شورش اور عشقیؔ نے ان کے بہت سے شعر نقل کئے ہیں۔

۱۱۱ گنگا پرشاد رعدؔ لکھنو کے متوطن تھے۔ ایک اور گنگا پرشاد رندؔ تخلص کا ذکر

بھی تذکروں میں آتا ہے لیکن غالباً یہ ایک ہی شاعر تھا۔ کتابت میں عدم وضاحت کی سبب اعد، رند پڑھا گیا۔ سرور نے ان کا تخلص رند لکھا ہے۔ یہ شعر ان کا ہے۔

آپ غیروں ساتھ یوں ہر دم ہنسا بولا کریں
اور ہم دیکھا کریں، تڑپا کریں، رویا کریں

امیر بخش خاں شہرت دہلی میں رہتے تھے اور حکیم ثناء اللہ فراق کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ آخر عمر میں یہ حیدرآباد چلے گئے تھے اور مہاراجہ چندو لال شاداں وزیراعظم ریاست کی سرکار میں ملازم ہو گئے تھے۔ قدرت اللہ قاسم کے بیان کے مطابق اس زمانے میں وہ میر فریدالدین آفاق سے مشورہ کرتے تھے۔ آفاق بھی انہیں کے ساتھ حیدرآباد گئے۔

میاں عسکری نالاں اور ان کے بیٹے طالب حسین خاں طالب دونوں شاعر تھے۔ نالاں دہلی میں نواب ذوالفقار الدولہ کے زمانے میں اعتبار رکھتے تھے۔ طالب بعد میں لکھنو گئے اور انشاء اللہ خاں انشاء کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ اس زمانے میں وہ شہزادہ سلیمان شکوہ کی سرکار میں داروغہ کے عہدہ پر مامور تھے۔ قاسم نے یہ دو شعر لکھے ہیں:

اشک یوں جم گئے ہیں اپنے بھی مژگاں سے لپٹ
اوس جیسے کہ رہے خار مغیلاں سے لپٹ

دشت میں آہ، میرے یار، جو طالب نے بھری
ایک شعلہ گیا خاشاک بیاباں سے لپٹ

ابتدائی دور کے شعراء میں محمد عارف، عارف کا نام بھی ملتا ہے۔ جو رفوگری کے فن میں ماہر تھے۔ غالباً اکبرآباد میں بھی رہے تھے۔ اس لئے خلیل اور عشقی نے انہیں

اکبر آبادی لکھا ہے۔ عارف، میر اور سودا معاصر تھے اور مصحفی کے بیان کے مطابق شرف الدین مضمون اور شاہ مبارک آبرو سے اصلاح لیتے تھے۔ یہ صاحب دیوان تھے اور خود ان کے کئی شاگرد ہوئے۔ ایک شاگرد نے ان کا دیوان مرتب کیا تھا۔

شیخ نصیر الدین غریب، دہلی میں رہا کرتے تھے۔ قاسم نے ان کے اخلاق و عادات کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ فارسی میں ان کی شہرت تھی اور کبھی کبھی اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ قاسم نے ان کی ایک غزل پوری نقل کی ہے جس کے تین شعر یہ ہیں:

جس جا کہ قدم رکھتے ہیں سر تن سے جُدا ہو
جاتے ہیں اوسی کوچہ میں ہم، دیکھئے کیا ہو!

مت چھیڑ تو اس زُلفِ سیہ فام کوں ناداں
دیکھا نہیں کاٹا کوئی کالے کا جیا ہو

حکیم مومن خان مومن اُردو کے ممتاز شاعروں میں سے ہیں۔ اُن کے والد حکیم احسن خان احسن کا شمار دہلی کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ حکیم احسن خان خونی رشتے سے کشمیری تھے۔ اور یہی خون مومن کی رگوں میں دوڑتا تھا۔ اُردو کے اتنے بڑے شاعر کے ساتھ کشمیر کی وابستگی اُردو اور کشمیر کے تعلق کو ایک دِلچسپ موضوع بنا دیتا ہے۔ مومن خان سیاسی طور پر بڑے باشعور تھے۔ اور وہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک سے بھی ربط رکھتے تھے۔ اسماعیل شاہ نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز شمال مغربی ہند کو بنایا تھا۔ وہ کشمیر کے معاملات سے بھی دِلچسپی رکھتے تھے۔ اور معرکۂ بالاکوٹ میں ان کی شکست نے کشمیر کو رنجیت سنگھ کے حلقۂ اثر میں پھینک دیا۔

حافظ محمود شیرانی نے میرپور کے ایک شاعر غلام محی الدین کی مثنوی

"گلزارِ فقر" کا ذکر کرتے ہیں۔ جو بقول اُن کے ۱۲۳۱ھ میں لکھی گئی۔ حافظ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ لوگ نہ ہندوستان گئے اور اُردو دانوں سے تعلق میں آئے لیکن اُردو میں اپنی تصنیفات لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے مثنوی کے کچھ اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ جن میں چند یوں ہیں ع

غلام محی الدین ایک فقیر — جس کا حضرت آپ ہے پیر
حق کی راہ میں سب کچھ دیا — سب کچھ دے کر حق مول لیا
یہ نسخہ جب تھیا تمام — گلزارِ فقر ہوا نام

ہندوستان کے اُردو دان طبقے نے پچھلی صدی کے اواخر سے ہی کشمیر میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ مرزا غالب کے تلامذہ میں چند کشمیریوں کے نام بھی ملتے ہیں۔ جن کا مالک رام نے "غالب کے شاگرد" میں تفصیلی ذکر کیا ہے۔ انجمن حمایت الاسلام کے سرپرستوں میں کشمیر کے مشہور رئیس خواجہ عبدالصمد ککرو بارہمولہ والے بھی تھے۔ وہ سر سید اور شبلی کے بھی دوست تھے اور محسن الملک اور مولانا حالی کے بھی۔ خواجہ عبدالصمد اُردو کے ایک بہت اچھے خطیب تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ وہ مقبل تخلص کرتے تھے۔ عبدالصمد ککرو اقبال کے اولین قدر دانوں میں تھے۔ جب اقبال نے انجمن حمایت الاسلام کے جلسے میں اپنی مشہور نظم "شکوہ" پڑھی تو وہاں مرحبا مرحبا کے نعرے گونجنے لگے۔ خواجہ عبدالصمد نے شاہ توس کا ایک بیش قیمت دوشالہ اقبال کے شانوں پر رکھا جس کا موقع پر ہی نیلام ہوا۔ نیلامی سے حاصل ہونے والی خاصی رقم انجمن کے بیت المال میں جمع کرائی گئی۔

اس صدی کی ابتدا میں جن شاعروں نے اُردو میں اُبھر کر اپنا مقام بنا لیا۔ اُن میں شوکت علی خان فانی بدایونی بھی شامل ہیں۔ فانی کا دل غم و حزن کا گنجینہ تھا اور اُن کا کلام آنسوؤں میں بھیگا ہوا نظر آتا ہے۔ فانی کشمیر آئے۔ تو انہوں نے

کشمیر کے خوبصورت مناظر سے زیادہ یہاں کے عوام کی حالتِ زار کی طرف نظر ڈالی۔ اُن کا حساس دل زخمی ہوگیا اور انہوں نے ان الفاظ میں اپنی دردمندی کا اظہار کیا ؎

اس باغ میں جو کلی نظر آتی ہے
تصویر فسردگی نظر آتی ہے
کشمیر میں ہر حسین صورت فانی
مٹی میں ملی ہوئی نظر آتی ہے

کشمیر میں حالِ اہلِ کشمیر تو دیکھ
ہر پاؤں میں افلاس کی زنجیر تو دیکھ
سمجھے ہم کیا تھے، دیکھتے ہم کیا ہیں
کشمیر کے خواب اپنی تعبیر تو دیکھ

پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی
مخلوق کی دل گداز حالت دیکھی
قُدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر
دوزخ میں سموئی ہوئی جنت دیکھی

کشمیر کے طالب علم اس صدی کی ابتداء سے ہی پنجاب اور یو۔پی کی درسگاہوں میں تعلیم کے لئے آتے رہے اور اسی طرح یہاں کے مزدور اور بیوپاری بھی سلسلۂ معاش میں ان مقامات پر آتے تھے۔ ان دنوں یہاں اُردو کا بول بالا تھا۔ اخبارات اُردو

میں نکلتے تھے۔ اور کاروبار کی زبان اُردو تھی۔ یہ لوگ بھی اُردو پڑھتے اور اُردو میں خط و کتابت کرتے۔ اس وقت بھی سری نگر میں پچھلی صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کی ابتداء میں لکھے ہوئے خطوط نظر آتے ہیں جو باہر گئے ہوئے کشمیریوں نے کشمیر میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو لکھے۔ یہ خطوط اُردو کی مُروجہ طرز میں ہیں۔ عبارت آرائی کی کوشش کئے بغیر لکھنے والا اپنے مطلب کی ساری باتیں بخوبی ظاہر کر لیتا ہے۔

پہلی عالمگیر جنگ نے ساری دنیا کی طرح کشمیر میں بھی جھٹکے پیدا کئے۔ مہاراجہ کشمیر نے تاج برطانیہ کے ایک دوست کی حیثیت سے اپنی فوج کے کئی دستے ہندوستان سے باہر لڑنے کے لئے بھیجدیئے۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے کشمیر کے جنگجو قبائل سُدھن، راجپوت وغیرہ میں براہِ راست بھرتی کی اور یہ "رنگروٹ" مختلف محاذوں پر لڑتے رہے۔ ان کا گھر سے نام و پیام اُردو کے ہی ذریعہ ہوتا تھا۔ اُن دنوں ریاست میں بھی جنگ کی خبروں کے متعلق بڑا تجسُس پایا جاتا تھا۔ ریڈیو ابھی منصۂ شہود پر نہ آیا تھا اس لئے لوگ تازہ بتازہ خبروں کے لئے پنجاب سے شائع ہونے والے اخبارات کے لئے بے تاب رہتے تھے۔ جو کبھی ڈاک سے پہنچتے اور کبھی آتے جاتے مسافروں کے ہاتھ۔

کشمیری پنڈت کشمیر سے لہروں کی صورت میں باہر گئے۔ وہ بڑے تعلیم یافتہ اور شعور یافتہ تھے۔ وطن سے باہر جاکر بھی وہ اپنی برادری کو نہ بھولے۔ اور نہ رسم و رواج اور عقاید و ضوابط کو ــــ وہ انجمنوں کے اجلاس بلاتے اور رسالے نکالتے۔ ان رسالوں میں "کشمیر درپن" وغیرہ مشہور ہوئے اور ان میں کشمیر اور کشمیر سے باہر کے کشمیری پنڈتوں کی کیفیات و احوال درج ہوتے۔ شادی غمی کی اطلاعات، رشتوں کی تلاش، اصلاح رسوم وغیرہ۔ ان رسالوں سے سر تیج بہادر

سپرو، منشی دیا رام نگم، اور دوسرے اہلِ نظر کشمیری پنڈت وابستہ تھے۔ یہ رسائل کشمیر بھی پہنچتے اور یہاں بالواسطہ طور اُردو کی ترویج کا ذریعہ بھی بنتے۔

کشمیری پنڈت کے اس سلسلے میں بڑا ممتاز نام پنڈت برج نارائن چکبست کا ہے۔ برج نارائن ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کر کے وہیں آباد ہو گئے۔ انہوں نے قانون کی ڈگری لی اور جلد ہی وکالت کے پیشے میں نام پیدا کیا۔ چکبست اُردو میں حُبِ وطن کی شاعری کے بانیوں میں سے تھے۔ وہ کشمیر بھی آئے اور شاید اسی سفر کی بازگشت میں انہوں نے یہ والہانہ شعر کہا ہے:

ذرہ ذرہ ہے میرے کشمیر کا مہمان نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

کشمیر پر اُن کی ایک اور نظم ملتی ہے۔ جس کے چند بند یوں ہیں:

ہر لالۂ کوہسار ہے شکلِ گُلِ راحت!
داغ اس کے یا ہیں خالِ رُخِ حورِ مسرت
کیا سبزۂ خوش رنگ ہے سرمایۂ عشرت
دِل کے لئے ٹھنڈک ہے جگر کے لئے فرحت
ایسا نہیں قدرت نے کیا فرش کہیں پر
اس رنگ کا سبزہ ہی نہیں روئے زمیں پر

وہ طایر کہسار لبِ چشمۂ کہسار
وہ سرد ہوا وہ کرمِ ابرِ گہر بار
وہ میوۂ خوش رنگ وہ سرسبز چمن زار
اک آن میں صحت ہو جو برسوں کا ہو بیمار

یہ باغِ وطن رشکِ گلزارِ جناں ہے
سرمایۂ نازِ چمن آرائے جہاں ہے

چھوٹے ہوئے اس باغ کو گذرا ہے زمانہ
تازہ ہے مگر اس کی محبت کا فسانہ
عالم نے شرف جن کی بزرگی کا ہے مانا
اُٹھے تھے اسی خاک سے وہ عالم و دانا

تن جن کا ہے پیوندِ اب اس پاک زمیں کا
رگ رگ میں ہے ہماری رواں خوں انہیں کا

ہاں میں بھی ہوں بلبل اسی شاداب چمن کا
ہے چشمۂ فردوس یہ عالم ہے دہن کا
کس طرح نہ سرسبز ہو گلزار سخن کا
ہے رنگ طبیعت میں چمن زارِ وطن کا

تازہ ہیں مضامیں بھی طبیعت بھی ہری ہے[1]
ہاں گلشنِ قومی کی ہوا سر میں بھری ہے

برج نارائن چکبست نے اپنی مختصر عمر میں دادِ سخن دے کر ۱۹۲۶ء کو انتقال کیا۔

پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزارِ نسیم" کا تذکرہ اُردو میں میر حسن دہلوی کی "سحر البیان" کے ساتھ ساتھ کیا جاتا ہے۔ نسیم بھی کشمیری تھے اور اپنے

---

[1] تصویرِ مناظر۔ حصہ اول۔ تاجور نجیب آبادی۔ عطر چند کپور لاہور۔

کشمیری نسب پر نازاں، دیگر کشمیری پنڈت شاعروں کا مفصّل تذکرہ "بہارِ گلشنِ کشمیر" کی دو جلدوں میں مُفصّل طور پر ملتا ہے جو پنڈت کشن کول نے ۱۹۳۲ء میں لاہور سے شایع کی ہے۔

اُردو کے ریاست میں ابتدائی چلن کے سلسلے میں مذہبی تحریکوں کا حصہ رہا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں دلی میں وہابی تحریک کا غلغلہ تھا۔ یہ تحریک اپنے اصلاحی جوش میں تحریکِ آزادی کا سا روپ اختیار کرنے لگی تھی۔ اور اس کے حامیوں میں اُردو کے کچھ ادیب اور صحافی بھی پیش پیش تھے۔ یہ تحریک پچھلی صدی کے اواخر میں کشمیر پہنچی اور اس کے ساتھ اس کا اُردو میں لکھا ہوا لٹریچر بھی۔ عیسائی مُبلّغوں نے کشمیر میں اُردو میں ہی لکھے مسیحی لٹریچر سے ابتداء کی اور بعد میں کشمیری کا رُخ کیا۔ احمدیت کے بانی مرزا غلام احمد اُردو میں مہارت رکھتے تھے اور اُن کی کتابیں بھی کشمیر کے کچھ دانشوروں کے پاس پہنچ گئی۔ مرزا صاحب کے پہلے خلیفہ مولوی نورالدین، مہاراجہ رنبیر سنگھ کے ایک معتمد مشیر تھے اور ان کی وجہ سے بھی اُردو کو کافی سہارا مِلا۔ سوامی دیانند کی آریہ سماج تحریک بھی کشمیر میں اُردو کے ذریعے ہی پہنچی اور یہاں کے کشمیری پنڈتوں نے اس کی طرف خاص رغبت دِکھائی۔

استقلال

ڈوگرا حکومت کا قیام۔ ہند سے روابط کے عوامی پہلو۔ پارسی تھیبیٹر کمپنیوں کی مقبولیت، گلاب سنگھ کے دور کی مراسلت کا مخطوطہ، رنبیر سنگھ کے عہد کے نئے تقاضے۔ تعلیم کی اصلاح۔ رنبیر سنگھ کے دربار کے نورتن۔ گلاب نامہ کے قطعات تاریخ۔ ہندوستانی نقیب، دارالترجمہ اور اس کی خدمات۔ نظم و نسق کی رپورٹ۔ مہتہ شیر سنگھ کا سفر نامہ۔ رپورٹ مجموعی، رسالہ "پیداوار اور جا توران لداخ"۔ دیوان شیو ناتھ کول منتظر۔ ٹھاکور پرشاد دانچو مفتون۔ پرمانند کی وانی داسدیوجی۔ ویشنہ کول عنادل۔ نرنجن ناتھ ربینہ۔ لچھمی نارائن بھان عاجز۔ حسن ڈار۔ اللہ بخش دردی۔ رحیم بخش شیدا۔ سید محمد انور شاہ اور زینب بی بی محجوب، رسول میر۔

چند نوادرِ نثر :

"تواریخ حسن" از مادھو جان کاشمیری۔ سردار دیوی سہائے کی "ہند کلاسیکل ڈکشنری"۔ تاریخ جدول معصومی۔ "پنج باب حنفیہ"۔ سرکاری پریس، ہدیہ مہاراج۔ سرکاری ہفتہ وار۔ "بدیا بلاس"

اخباروں کے اجراء کی ممانعت۔ بیرونِ ریاست کے کشمیری مفادات کے اخبارات۔

کشمیر سے باہر:

انشاء، دیا شنکر نسیم۔ حکیم مومن خاں مومن۔ غالب مفتی صدرالدین آزردہ۔ غالب کے کشمیری شاگرد۔

سکھوں کے دورِ حکومت کے ابتلاء سے گذرنے کے بعد مہاراجہ گُلاب سنگھ کے زیرِ اقتدار نئی ریاست کی تشکیل کے نتیجے کے طور پر ریاست جموں وکشمیر کے سیاسی اور کسی حد تک سماجی حالات ایک صورت میں ڈھلنے لگے۔ اور علم و ادب کی کچھ روایات قائم ہونے لگی تھیں۔ لیکن جیسا کہ تاریخی خاکے سے واضح ہے، خود گُلاب سنگھ کے ماہ و سال زیادہ تر کچھ ملحقہ علاقوں کو سر کرنے اور خود سرداروں کو زیر کرنے اور نئی نئی قائم کی ہوئی ریاست کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں صرف ہو گئے۔ انہوں نے کوئی دس برس حکومت کی اور اس علاقے میں امن و امان اور سیاسی استحکام قائم کرنے میں انہیں کامیابی ہوئی۔ دربار اور نظم و نسق کی حد تک، ان کے زمانے میں، اگلے دور کی روایات قائم رہیں۔ فارسی ان کی درباری زبان تھی، گو اُردو عوام کی بول چال اور تعلیمی اداروں میں راہ پانے لگی تھی۔ فارسی کے شعراء میں اس زمانے میں پنڈت ٹھاکر داس رازداں نامی، پنڈت راج، پنڈت ست رام بقایا، پنڈت گوپال کول غیبوری منظرِ عام پر آئے۔ انشا پردازوں میں میرزا احد اور ان کے فرزند میرزا سیف الدین قابلِ ذکر ہیں، جو ریاست میں وقائع نگاری کے عہدہ پر مامور تھے اور آخر الذکر نے

۱۹۴۶ء[1] سے ۱۹۴۸ء کے دوران کے جو وقائع لکھے ہیں، وہ آٹھ دس جلدوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ میرزا سیف الدین نے کشمیر کی ایک تاریخ "خلاصۃ التواریخ" کے نام سے فارسی میں لکھی تھی۔

سکھوں کے عہد میں ریاست کے تعلقات پنجاب سے گہرے ہو گئے تھے، جہاں بڑے بڑے شہروں، خاص طور پر صوبہ کے صدر مقام لاہور میں اردو ادب اور شاعری کا ذوق خاصہ نشو ونما پا چکا تھا۔ سکھ دربار سے جموں و کشمیر کے الحاق کے سبب، پنجاب سے اُردو ادب اور خاص طور پر صحافت کی نئی تحریکیں اُٹھتیں، وہ جموں اور کشمیر میں بھی راہ پالیتیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے بھی اُردو شعر و ادب کی روایات مختلف ذریعوں سے جموں و کشمیر سے روشناس ہونے لگی تھیں۔ گلاب سنگھ کے آخری زمانے میں برطانوی سامراج کے خلاف آزادی خواہوں کی جنگ کو ناکام بنانے اور آزادی خواہوں کو کچلنے کے لئے ریاست سے، جو فوج دہلی کو بھیجی گئی تھی، دہلی میں عرصہ تک مقیم رہی، اور اس کے لوٹنے تک، اس قوم کو اُردو سے اچھی خاصی واقفیت ہو چکی تھی۔ لیکن اس سے بھی ایک اور زیادہ مؤثر ذریعہ موسیقی تھی۔ اس سے پہلے ریاست میں اُردو کی اشاعت اور مقبولیت کے سلسلے میں موسیقی کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس عہد میں، موسیقی میں ایک اور نیا عنصر داخل ہوا۔ اور یہ عوام پسند عنصر تھا۔ پہاڑی سارنگی نواز [illegible] اُردو غزلوں اور گیتوں کو لے کر پہنچ چکے تھے اور وہ گھوم کر عوام کو سناتے پھرتے تھے۔ جموں اور کشمیر دونوں جگہ بہت مقبول ہو گئے تھے۔ عوام ان گیتوں اور غزلوں کو سننے کے بعد، انہیں ذوق و شوق سے گنگناتے رہتے تھے۔ غزلوں کے کچھ شعر جو عام لوگوں میں زبان زد تھے۔ وہ

---

[1] سرور صاحب سے سہو ہوا ہے۔ اصل میں ۱۸۴۶ء اور ۱۸۴۸ء ہونا چاہیئے۔

یہ ہیں:

کیا خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائے گا
یار سے ملنا نصیبِ دشمناں ہو جائے گا

دفن کرنا مجھ کو کوچۂ یار میں   قبر بلبل کی بنے گلزار میں

جموں میں اور کسی حد تک کشمیر میں بھی راس لیلا اور رام لیلا کے تماشے مقبول ہونے لگے تھے۔ یہ تماشہ کرنے والے، ہندوستان کے مختلف شہروں میں گھومتے پھرتے جموں اور کشمیر بھی آتے تھے اور تماشے دکھاتے تھے۔ یہ تماشے بھی مقبول تھے اور ان کے گانے خاص طور پر لوگوں کے زبان زد ہو جاتے تھے۔ ایک مقبول گیت کا نمونہ یہ ہے:

اے مرے پیارے برادر بن کو جانا چھوڑ دے
بن کو جانا چھوڑ دے اور ......

یہ غزلیں اور گیت ایسے مقبول ہو گئے تھے کہ لوگ ان کو بار بار پڑھنا چاہتے تھے۔ اس لئے مہندر رینہ[1] کے والد نے ان گیتوں کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا تھا، جو چھپا بھی تھا۔

ان گیتوں اور غزلوں کے ٹکڑے کشمیری موسیقی میں بھی پیوست ہونے لگے تھے۔ کشمیری بھانڈ جو اپنے کرتب اور فن میں سارے ہندوستان میں شہرت حاصل کر چکے تھے، اردو، ہندوستانی گیت گاتے تھے اور یہ کشمیر میں بھی بہت پسند کئے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ قوالی کا ذوق بھی اس زمانے میں عام طور پر پھیلنے لگا تھا۔ اور قوال اُردو غزلیں گاتے تھے۔ رفتہ رفتہ قوالی کی محفلیں اتنی مقبول ہو گئی تھیں کہ کشمیر میں قدیم تر دور کی صوفیانہ شاعری کی جگہ انہوں نے لینی شروع

---

[1] اُردو کے ایک کشمیری شاعر، سری نگر میں رہتے ہیں۔

کردی تھی[۱]۔ بہت ہی ابتدائی دور میں جیسے شعر عام طور پر پسند کیے جاتے تھے اور لوگوں میں مقبول ہو جاتے تھے، ان کی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں:

مرا جان جاتا ہے یارو سنبھالو　　کلیجے میں کانٹا چھپا ہے نکالو

یا یہ شعر:

اب لڑکپن چھوڑ دے ظالم شباب آنے کو ہے
ان حبابوں کے کٹوروں میں گلاب آنے کو ہے

شعر ہیں غزل کا [illegible] کشمیر کے عوام میں مقبول [illegible]
[illegible] طول و عرض [illegible] بہت [illegible]
[illegible] باشندوں لوگ [illegible]

مہاراجہ گلاب سنگھ [illegible]
نقلیں جو زیادہ تر فارسی [illegible]
صورت میں مدون ہوئی ہیں۔ اس کا مخطوطہ ڈائریکٹر [illegible]
ریاست جموں وکشمیر [illegible] مرکزی حکومت [illegible]
مراسلت، نومبر ۱۸۵۶ء اور جولائی ۱۸۵۰ء کے درمیان گلاب سنگھ اور کانگڑہ کے برطانوی افسروں، مسٹر ٹیلر، میجر اڈورڈ لیک، اور مسٹر جانسن کے مابین لالہ بوٹا مل کی معرفت ہوئی تھی۔ لالہ بوٹا مل ریاست جموں وکشمیر کے ملازم تھے جنہیں دیوان جوالا سہائے نے کانگڑہ میں وکیل مقرر کیا تھا۔ مخطوطہ میں شامل ایک تحریر کے مطابق وہ سنہ ۱۹۱۰ ہجری (مطابق ۴۴-۱۸۴۳ء) سے اس کام پر مامور تھے۔

---

(۱) یہ بیان محل نظر معلوم ہوتا ہے۔ قوالی نے آج بھی صوفیانہ محفلوں کی جگہ نہیں لی ہے۔

مخطوطہ میں اکثر مراسلے زمینوں کی تبدیلی کی کارروائیوں سے متعلق ہیں، جن کا طریقہ کار پنجاب کے چیف کمشنر سر جان لارنس اور دیوان جوالا سہائے کے درمیان ۲۸ نومبر ۱۸۶۶ء میں طے پایا تھا۔ ان کارروائیوں میں کئی اُردو میں بھی ہیں۔ اور ان کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ اسی مخطوطے میں شامل ایک اور رسالہ بھی بہت اہم ہے۔ یہ ریاست میں چائے کی کاشت سے متعلق ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے لالہ بوٹا مل کے ذمہ کانگڑہ میں چائے کی کاشت کے طریقوں اور اصول کے بارے میں معلومات کی فراہمی [illegible] بعد میں ان معلومات کی بنیاد پر جموں میں بھی چائے کی کاشت [illegible] لالہ بوٹا مل نے کانگڑہ کے ڈپٹی کمشنر کو جموں کے بارے میں جو رپورٹ [illegible] اقتباس حسب ذیل ہے:

> "نمبر [illegible] الحکم پروانہ ہذا سے مطلع ہو کر عرض پرداز ہوں کہ جو چائے [illegible] جموں میں لگائے گئے ہیں۔ وہ بخوبی کاشت ہو گئے ہیں، اور جو تخم چائے سرکار سے عنایت ہوا تھا اور باغبان بھی سرکار سے ملے تھے۔ وہ بوٹے ہائے کو لگانے اور کاشت کرنے تخم چائے میں تن دہی نہیں کرتے اور پیش گاہ مہاراجہ صاحب بہادر سے بھی پروانہ بنام کمترین بدیں مضمون صادر ہوا ہے کہ باغبانانِ مذکور کاشت کرنے تخم چائے کے تن دہی نہیں کرتے۔ لہٰذا اوس کے عوض اور باغبانان آنے چاہئیں۔"

لالہ بوٹا مل کا بیان ہے کہ چائے کی کاشت کے بارے میں انہیں ایک سنسکرت مخطوطہ بھی دستیاب ہوا تھا جس کا ترجمہ انہوں نے اُردو میں کیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی مخطوطے میں شامل ہے اور "ہدایت کاشت چاء" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی فصلِ اول کا عنوان ہے:

"زمین کا بیان جو چاول بونے کے لائق ہو"

اس رسالے کے ترقیمہ کی عبارت حسبِ ذیل ہے :

"ختم شد تحریر بتاریخ سی ام ماہ ماگھ ۱۸۵۷ء سمت ۱۹۱۲ء
مقام بھون کانگڑہ میں از کتاب بید اچھری زبانی کالی پرشاد
کے لکھیا ہے ۔"

جموں میں اُردو کا ابتدائی نمونہ ہونے کے دوران، زمانے کے لحاظ سے اور اس اعتبار سے کہ یہ اُردو میں اس موضوع پر غالباً پہلا رسالہ ہے اس کی بہت اہمیت ہے۔

گلاب سنگھ نے برسر اقتدار آنے کے دوسرے سال ڈوگری اور فارسی کی طباعت کے لئے ایک مطبع "ردیا پرکاش پریس" کے نام سے قائم کیا تھا جس میں سرکاری فرامین ڈاک کے ٹکٹ اور اسٹامپ اور قانون کی کتابیں چھاپی جانے لگی تھیں۔ ان کتابوں کی چھپائی کے سلسلے میں ان کے عہد میں کچھ نمایاں کام نہیں ہوا تھا۔ اس سلسلے میں پنڈت دیا کرشن گردتوں کے ایک مضمون کے اقتباس آگے درج کئے جا رہے ہیں۔

گلاب سنگھ کے نظم و نسق کے کاموں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد رنبیر سنگھ نے براہِ راست یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس سے پہلے باپ نے ان کی تربیت کے لئے انہیں مختلف محکموں سے متعلق کر رکھا تھا۔ اور گلاب سنگھ کے انتقال تک وہ بیٹے کو اہم امور میں مشورہ دیتے رہے تھے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد رنبیر سنگھ کو حالات کے اقتضا کے مطابق نظم و نسق میں اصلاح کرنے کی ضرورت داعی ہوئی۔ چنانچہ ان کے زمانے میں ریاست کے نظم و نسق کو برطانوی ہند کے معیاروں پر لانے کی کوشش شروع ہوئی۔ اس نئے نظام کا واسطہ اُردو زبان تھی جو اس وقت تک برطانوی ہند میں فارسی کی جگہ لے چکی تھی۔

خود مہاراجہ رنبیر سنگھ کو ہندو مذہب کے فروغ اور سنسکرت زبان اور

علوم وفنون کی اشاعت میں گہری دلچسپی تھی۔ اس مقصد کی پیش رفت میں انہوں نے کئی مندر بنوائے اور پاٹھ شالے قائم کئے تھے۔ جموں میں ان کا بنوایا ہوا رگھوناتھ مندر اور اس سے متعلق قائم کیا ہوا سنسکرت پاٹھ شالہ، جس کو اس سلسلے میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، ان کی ہندو تہذیب کے احیاء کی مساعی کی بلیغ شہادت ہے۔ پاٹھ شالہ شری سنسکرت مہاودیالیہ کے نام سے موسوم تھا۔ اس پاٹھ شالہ میں برہمن لڑکوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی اور ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے علاوہ ان کے ذاتی اخراجات کی کفالت بھی حکومت کی جانب سے کی جاتی تھی۔ رگھوناتھ مندر کے اطراف کئی اور مندر بنوا کر اسے ایک مرکزی حیثیت دے دی گئی تھی۔ پاٹھ شالہ سے ملحق سنسکرت مطبوعات اور مخطوطات کا ایک وسیع کتب خانہ بھی قائم کیا گیا تھا، جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مخطوطات منگوا کر محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ یورپ کے کچھ علماء جیسے ڈاکٹر اسٹاین اور ڈاکٹر بوہلر نے اس کے مخطوطات استفادہ کیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ کئی مخطوطات وہ ساتھ لے گئے تھے۔ رنبیر سنگھ نے ایک اور کام یہ کیا تھا کہ جموں اور کشمیر کے مقدس ہندو مقامات، مندروں اور تیرتھوں کا ایک جائزہ مرتب کروایا اور ان کے تحفظ اور تنظیم کے لئے ایک وقف بھی قائم کیا تھا، جس کے قواعد وضوابط فارسی میں "آئین دھرمارتھ" کے نام سے مدون کئے گئے تھے۔

رنبیر سنگھ کے عہد میں" انگریزی حکومت کے استحکام کے نتیجے کے طور پر، ریاست کے نظم ونسق کی طرح، اس کی علمی اور ادبی روایات کو بھی قرونِ وسطیٰ کے ڈھرّے سے نکل کر، نئی راہوں پر گامزن ہونا پڑا۔ نیا تعلیمی نظام اور نئے علوم وفنون جو ہندوستان میں رائج ہونے لگے تھے، ان سے ریاست کوری نہیں رہ سکتی تھی۔ نئے نظم ونسق کے لئے بھی نئے تعلیم یافتہ عہدیداروں اور اہلکاروں

کی ضرورت تھی۔ اسی تقاضا کے مدنظر، مہاراجہ رنبیر سنگھ ریاست میں انگریزی تعلیم کے مدرسے قائم کرنے پر مجبور تھے۔ اس کے ساتھ، فارسی اور عربی کے مدارس بھی قائم کرنا ضروری تھا، کیونکہ دفتروں اور دربار کی زبان ابھی تک فارسی تھی لیکن ہندوستان کے اور علاقوں کی طرح جموں اور کشمیر میں بھی فارسی اب افادی زبان اور علم و ادب کا محرک وسیلہ نہیں رہی تھی اور عہد کے تقاضوں اور ضرورتوں نے اُردو کو آگے بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ریاست کے مدرسوں میں اُردو پڑھائی جا رہی تھی، اور اس کا نصاب عموماً وہی ہوتا۔ جو ہندوستان کے اور علاقوں میں اس وقت رائج تھا اور وہی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اُردو، عربی اور فارسی، مدارس اور سکولوں میں بھی تعلیم کے ذریعے کے طور پر رائج تھی۔ ریاست کے پڑھے لکھے لوگ سب فارسی سے واقف تھے اور ان کے لئے اُردو میں تعلیم و تدریس کا کام آسان تھا۔ مہاراجہ نے نئے علوم و فنون کو اُردو اور کچھ اور زبانوں میں منتقل کرنے کے لئے جو دارالترجمہ قائم کیا تھا، وہ دراصل ایسے ہی حالات کے تقاضے کا نتیجہ تھا۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے اپنی تاریخ "کشمیر" میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے پیش نہاد خاطر، اکبر اعظم کی علمی سرپرستیاں تھیں اور وہ اس کا نمونہ اپنے دربار میں پیش کرنا چاہتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ ان کا مذاق عام پسند اور ان کے وسائل محدود تھے۔ اس لئے جس طرح کے پڑھے لکھے لوگوں کو انھوں نے اپنے دربار میں جمع کر لیا تھا، ان میں دو تین سنسکرت کے علما کے سوا، باقی اوسط معیار کے تعلیم یافتہ تھے۔ اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی اہمیت رکھتی تھی کہ اس عبوری دور میں، جب قدیم علوم و فنون کی طرف سے توجہ ہٹنے لگی تھی اور نئے علوم و فنون کمال کے

موافق عام نہیں تھے۔ علم وفضل کے اگلے معیار قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے رنبیر سنگھ کے یہ علماء، جنہیں اکبر کے اتباع میں بعض وقت "نورتن" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ علم و دانائی کی پوری آب و تاب نہیں رکھتے تھے۔ اس کے باوجود مہاراجہ رنبیر سنگھ کی یہ کوشش ہی، ان کے دارالترجمہ کی طرح ایک قابلِ تحسین کارنامہ ہے۔ یہ سارے علماء اُردو سے واقف تھے اور اکثروں نے اُردو میں لکھا ہے۔

ان علماء میں سے سب سے پہلے قابلِ ذکر دیوان کرپا رام ہیں۔ جو مہاراجہ کے دیوان اور معتمد علیہ تھے۔ انہیں فارسی پر اچھا عبور تھا، اور فارسی میں چار پانچ کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی تصانیف "گلاب نامہ" "تاریخ کشمیر" "ہدیۃ التحقیق" "تحقیق تناسخ" اور "ردّ اسلام" ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم "گُلاب نامہ" ہے جو مہاراجہ گلاب سنگھ بانی ریاست جموں وکشمیر کے حالات اور ان کے عہد تک کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بڑی تقطیع کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر، نہایت اہتمام کے ساتھ سرکاری مطبع شری رنبیر پرکاش جموں سے ۱۸۷۵ء میں شایع ہوئی تھی۔ اس کی عبارت آرائی کا انداز ہندوستان کے فارسی انشاء پردازوں کا مرصّع انداز ہے۔ یہی اسلوب دیوان کرپا رام کی دوسری تصانیف میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صوفی نے یہ بھی لکھا ہے کہ دیوان کرپا رام، مہاراجہ رنبیر سنگھ کی "نورتن" سبھا کے ابوالفضل تھے۔ لیکن ابوالفضل کی وسعتِ نظر کے مقابلے میں ان کی تصانیف سے ہندو مذہب کی پاسداری عیاں ہے، اس لئے انہیں ابوالفضل کی "ضد" کہنا زیادہ زیبا ہے۔

"گلاب نامہ" کی تصنیف کا سنہ ۱۹۲۲ بکرمی سمت (م ... ۱۸۶۵ء) ہے۔ اس تصنیف کے ... اردو کے شعراء میں سید اسمٰعیل ... تیر اور ان کے فرزند

ابو محمد بدر نے جنہیں رنبیر سنگھ کے دربار سے تعلق رہا تھا۔ قطعات تاریخ لکھے تھے۔ منیر رام پور کے دربار سے منسلک تھے۔ ان کا پہلا قطعہ ہے:

گلاب سنگھ مہاراجہ عظیم الشان
زمینِ ہند میں خورشید آسمانِ خرد
گلاب نامہ میں احوال ان کا ہے مرقوم
اسی سبب سے یہ نسخہ ہے بوستانِ خرد
علاوہ ان کے ہے حال اور بھی رئیسوں کا
جو تھے زمانہ پیشیں میں قدردانِ خرد
خدیوِ عصر مہاراجۂ زمانہ تمال!
کہ جن کے عہد میں عالی ہوئی ہے شانِ خرد
سپہر مرتبہ رنبیر سنگھ عالی جاہ
کہ ان کی مدح میں ہے دُرفشاں زبانِ خرد

. . . .

. . . .

منیر میں نے یہ تاریخ پائی سمت میں
گلاب نامہ بہار بہشت جانِ خرد
۱۹۲۲ بکرمی

ایک اور تاریخ کا شعر ہے:

گلاب اس صحیفے کا ہے جزو نام زمانے میں ہے یہ جواب ارم

تیسرے قطعہ کا تاریخی شعر ہے:

گلاب نامہ ہے نام اس کتاب کا زیبا کہ اس میں ذکر مہاراجہ نشیں کا ہے۔

چوتھی تاریخ کا یہ شعر ہے:

مشتاق، گلاب نامہ ہے سا اہلِ خرد   کیا نام خدا دفترِ جان بخش چھپا

پانچویں قطعہ تاریخ کا آخری شعر ہے:

بھلا اس نسخۂ بے مثل کی ہم قدر کیا جانیں

رئیسوں کے ہے قابلِ تذکرہ نامی رئیسوں کا

ایک چھٹی تاریخ کے تین مصرعے یہ ہیں:

چھپی نور کی یہ کتاب مصنف   ہوئی شیفتہ دیدہ پاک بیناں

. . . .   یہ زیبا ہے تاریخ مسند نشیناں

منیر کے فرزند اور شاگرد ابو محمد بدر نے بھی "گلاب نامہ" کے لئے تاریخ کہی تھی، جس کے دو شعر یہ ہیں:

واہ کیا تالیف کی دیوان کرپا رام نے

ہر ورق خوش آئینہ، خوش جوہر پنجاب ہے

بدر نے تاریخ چھپنے کی یہ سمت بلیغ کہی

اخبارِ بلادِ کشورِ پنجاب ہے

کرپا رام کی دوسری تصنیف "ہدیۃ التحقیق" کے لئے تاریخ کشمیر ہی کے ایک شاعر پنڈت شو ناتھ کول منتظر نے کہی تھی:

واہ تحقیق تاریخ کیا چھپی   تیرگی کے دور جس نے جہل کی

کون کیا تاریخ اس کی لکھ سکے   ہاتف غیبی ہی جب خود یہ کہے

دیوان کرپا رام کے علاوہ دوسرے صاحبانِ علم میں ڈاکٹر بخشی رام، پنڈت گنیش کول شاستری، پنڈت صاحب رام، مولوی غلام حسین طالب لکھنوی، مولوی عبداللہ مجتہد العصر، حکیم ولی اللہ شاہ لکھنوی، حکیم نور الدین قادیانی اور بابو نصر اللہ عیسائی

پر نورتن کی فہرست مکمل ہو جاتی ہے

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ اس حلقہ میں مختلف مذاہب اور نقطۂ خیال کے لوگ اکٹھے کر لئے جائیں۔ پنڈت گنیش کول اور پنڈت صاحب رام سنسکرت کے یقیناً اچھے عالم تھے۔ چنانچہ سنسکرت کے یورپی عالم سٹائین نے پنڈت صاحب رام کو "گذشتہ چند نسلوں میں سنسکرت کا سب سے بلند عالم" بتایا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ان کے ذمہ جموں کشمیر میں تیرتھوں کے جائزے اور ان کی ایک توضیحی فہرست تیار کرنے کی خدمت کی تھی۔ حکیم نورالدین قادیانی، میرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفہ سوئے اور میرزا صاحب کے انتقال کے بعد وہی ان کے جانشین اور امام مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنی خود نوشت اردو میں لکھی ہے اور اس میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی بہت ستائش کی ہے۔ بابو نصر اللہ عیسائی نے کشمیر کے بارے میں ایک انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جس کی کچھ تفصیل آگے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دارالترجمہ کے سلسلے میں آرہی ہے۔

"بہار گلشن کشمیر" میں کشمیر کے پنڈت شعراء کا اردو میں ضخیم تذکرہ ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے نورتن کے جو نام دیئے ہیں، ان میں ڈاکٹر صوفی سے اختلاف ہے۔ وہ نام یہ ہیں:

۱۔ دیوان کرپا رام ۲۔ [illegible] ۳۔ پنڈت مہانند جو در
۴۔ پنڈت رام جو در ۵۔ دیوان بدری ناتھ مدان ۶۔ پنڈت [illegible]
جیو (صاحب رام) ۷۔ پنڈت ٹیکا رام کول اور ۹، خواجہ ثناء اللہ۔

اس حلقہ کے مناظرے منگل کے روز شام کو مہاراجہ کی صدارت میں منعقد ہوتے تھے، جن میں ان اصحاب کے علاوہ دوسرے پنڈت اور مولوی بھی حصہ لیتے تھے۔ مسلمان علماء میں

مولانا قلندر علی پانی پتی بھی ان مناظروں میں شرکت کرتے اور اہم مذہبی مسائل جیسے تقدیر، تدبیر، تناسخ جبر و اختیار وغیرہ پر مباحث ہوتے اور اس طرح مہاراجہ کی معلومات میں اضافہ کی ایک صورت نکل آتی۔ دیوان کرپا رام کا رسالہ غالباً انہیں مباحث کا نتیجہ تھا۔

اکبر کے دربار سے مماثلت کی تکمیل کے سلسلے میں، مہاراجہ رنبیر سنگھ کی اس خواہش کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ جب شمس العلماء آزاد کی "دربار اکبری" شائع ہوگئی، تو انہوں نے آزاد کو ڈوگرہ خاندان کی تاریخ لکھنے کی دعوت دی تھی۔ اور اس کے شایانِ شان صلہ کی پیش کش بھی کی تھی۔ لیکن آزاد نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ تاہم یہ واقعہ خود اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور اگر آزاد اس خدمت کے لئے تیار ہو جاتے تو یقیناً ڈوگرہ خاندان کی ایک یادگار تاریخ ہماری دسترس میں ہوتی اور "دربار اکبری" کی مماثلت میں، یہ "دربار رنبیری" کی تاریخ [illegible] پاتی۔

رنبیر سنگھ کے زمانے میں سلطنت کے استحکام نے فطرتاً ان کے دل میں اور باتوں کے ساتھ ساتھ دربار کی شان و شوکت اور رعب و داب کی روایت قایم کرنے کا خیال پیدا کیا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ہندوستان سے نقیبوں کو بلوا کر دربار میں ملازم رکھا۔ یہ نقیب دہلی سے آئے تھے اور مغلیہ دربار کے روایات سے واقف تھے۔ چنانچہ جب دربار منعقد ہوتا تو مہاراجہ کی آمد پر، مغلیہ درباروں کے انداز میں اس کا اعلان کرتے اور اہلِ دربار کو متنبہ کرتے تھے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی یہ ساری دلچسپیاں، ریاست میں اردو کا ذوق پیدا کرنے کے سلسلے میں اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ مہتم بالشان کارنامہ ان کا قائم کیا ہوا دارالترجمہ یا محکمہ تالیف و ترجمہ تھا۔ جو مغربی علوم کو ریاست کی زبانوں اور خاص طور پر اردو میں منتقل کرنے کے مقصد سے قایم کیا گیا تھا۔

کشمیر کے مشہور سخن پرداز، قیصر قلندر نے اپنے ایک مضمون "کشمیر میں اُردو" (شاعر، بمبئی ۱۹۶۱ء) میں اس کی وضاحت کی ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہدِ حکومت سے آج تک اُردو زبان سکولوں میں تعلیم و تفہیم کا ذریعہ رہی ہے۔ اور ریاست کے طالبانِ علم کی دسترس میں نئے علوم پہنچانے کے لئے، محکمۂ تراجم کی جانب سے اُردو میں، بہت سی علمی کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ محکمۂ تراجم مہاراج رنبیر گنج کے نشیبی علاقے، جہلم کے کنارے اس عمارت میں قائم کیا گیا تھا، جہاں اب ہسپتال ہے۔ مہاراجہ کی سنسکرت سے دلچسپی نے اس کام کو زیادہ وسعت بخش دی تھی۔ اس کی پیش رفت میں کچھ نئے مغربی علوم کی کتابوں کے ترجمے سنسکرت میں بھی کرائے گئے تھے۔ سنسکرت اور اُردو کے علاوہ چند کتابوں کے ترجمے ڈوگری میں بھی کئے گئے۔ لیکن کشمیری کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔ اس ادارہ کے کام کی ساری تفصیلات اب ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔ لیکن اس کی باقیات الصالحات اور نظم ونسق کی ایک دو رپورٹیں، جو مل سکی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمے ایک سے زیادہ زبانوں میں کئے جاتے تھے اور بعض کتابوں کے ترجمے بیک وقت دو یا تین زبانوں میں بھی کئے گئے ہیں۔ زیادہ ترجمے اُردو میں ہوئے۔

دارالترجمہ کے ناظم پنڈت گوبند کول تھے اور مُفتی رشید الدین کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کی بناء پر مولانا محمد عزیز الدین مفتی اعظم اس کے صدر تھے۔ ان کے فرزند مفتی اعظم محمد شریف الدین بھی مُترجمین میں شامل تھے۔ انہوں نے "اخوان الصفا" کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا اور ان کی مدد سے ایک پنڈت نے اُس کا ترجمہ سنسکرت میں بھی کیا۔ کچھ سنسکرت کتابوں کا ترجمہ عربی اور فارسی میں کرایا گیا تھا۔ اس ادارہ کے کام کے بارے میں پنڈت اننت رام شاستری کے ایک مضمون "ریاست میں سنسکرت زبان کا ارتقاء" سے روشنی پڑتی ہے۔ جو

شمارہ (شمارہ مارچ ۱۹۶۲ء) میں شائع ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"اس زمانے میں جو تعلیمی کتب تیار کی گئیں۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے، مختلف مضامین مثلاً علم طبقات الارض، کا ترجمہ انگریزی سے ہندی میں، جیوگرافیا اور فزیکس کا انگریزی سے ہندی میں، جامع العلوم کا عربی سے فارسی میں، تاریخ فتح آسام کا فارسی سے ہندی میں، "تاریخ کشمیر" "تاریخ روم" کا انگریزی سے ہندی میں "تاریخ قادری" کا ترجمہ فارسی سے ہندی میں اور "جراح کھنڈ" کا سنسکرت سے ہندی میں ترجمہ کروایا گیا۔"

اننت رام شاستری کا یہ مضمون ظاہر ہے کہ دارالترجمہ کے کام کے ایک مخصوص پہلو کے بارے میں ہے، اور وہ ابتدائی دور کے لکھنے والوں کی طرح اُردو کو بھی ہندی سے موسوم کرتے ہیں۔ شاستری نے اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ ترجمہ کی ہوئی کتابوں کو چھپوانے کے لئے چھاپہ خانہ بھی قایم کیا گیا تھا۔ جو ریاست میں پہلا چھاپہ خانہ تھا۔ یہ چھاپہ خانہ ودیا ولاس پریس کے نام سے موسوم تھا۔ اور اس میں اردو، فارسی کتابیں اور ناگری رسم خط کی کتابیں چھاپی جاتی تھیں۔

رنبیر سنگھ کے جانشین مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو علمی امور سے دلچسپی نہیں تھی، اس لئے کام کا یہ سلسلہ مسدود ہو گیا اور مخطوطات کا بچا کھچا ذخیرہ جو سری نگر میں محکمۂ ریسرچ کے کتب خانے میں پہنچا۔ اس کے تحفظ اور اس کی تہذیب میں محکمہ کے سابق ناظم صاحب زادہ حسن شاہ نے دلچسپی لی اور اس کے اُردو مخطوطات کی فہرست تیار کرنے اور تفصیلات مہیا کرنے میں میں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ یہ ذخیرہ "رنبیر کلکشن" کے نام سے موسوم ہے اور اس میں کافی تعداد میں اُردو مخطوطات موجود ہیں۔ یہ ساری کتابیں زیادہ تر انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ ان میں علم

طب سے متعلق ترجموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے ۔ طب میں میٹریا مڈیکا۔ اپیڈیمالوجی علم تشریح ، ادویہ ، علم قابلہ اور امراض اطفال پر کئی مخطوطے ہیں ۔ طب کے علاوہ ایک دو ترجمے علم حرب اور فوجی علوم سے متعلق ہیں ، تاریخ اور سوانح پر بھی ایک دو مخطوطات موجود ہیں ۔ ایک رسالہ منطق پر اور کارآمد فنون میں کاغذسازی اور باورچی گری پر بھی رسالوں کے ترجمے ہوئے تھے ۔

میٹریا مڈیکا پر تین مخطوطات محفوظ ہیں ، جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کئے گئے ہیں ۔ لیکن اصل میں کتابوں کے نام کا ذکر نہیں ہے ۔ مخطوطہ ۱۹۱ میں صرف اس کا ذکر ملتا ہے کہ یہ انگریزی کا ترجمہ ہے ۔ مخطوطہ ۲۱۴ نہایت ضخیم اور تین جلد والے ہیں ہے ۔ اس کے علاوہ ایک اور مخطوطہ ۱۹ بھی ہے ۔ یہ تینوں ترجمے سلیس اور عام فہم زبان میں ہیں اور اردو اور ناگری دونوں رسم خط میں لکھے گئے ہیں ۔ انگریزی اصطلاحیں عموماً جوں کی توں برقرار رکھی گئی ہیں ، جیسے سپرٹ ، فسل وغیرہ ۔ ان کی شرح اردو میں کر دی گئی ہے ۔ جہاں طب یونانی کی اصطلاحیں مل سکیں وہ بھی دے دی گئی ہیں ، مثلاً مخطوط ۱۹۱ سے چند مثالیں یہاں پیش ہیں ۔

ٹرائی ، ٹیوریشن : اس لفظ کے معنی سفوف کرنے کے ہیں ۔

گرینیولیشن : جملہ اشیاء از قسم دھات کے دانے اس ترکیب سے بناتے ہیں کہ دانے بھی بنتے جائیں ۔

اسی طرح سفلمنگ ، ملٹری شن ، فاسفارک ایسڈ ، پوٹاشیم وغیرہ کی بھی شرح کر دی گئی ہے ۔ انگریزی اصطلاحوں کو اردو حروف میں لکھتے ہوئے ایک اچھا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس کا املا "رکنی" انداز پر لکھا گیا ہے ۔ مثلاً ڈی کاک شن ، سبلی مے شن ، الکسی وی شن وغیرہ ۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں لاطینی اصطلاحیں بھی درج کر دی گئی ہیں مثلاً "کارگل" "کارگا" ۔ بعض شکل یونانی

بھی اور انگریزی اصطلاحوں کے معنی ہندی میں بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔ مخطوطہ ۱۹۰ میں طب کے موضوع پر ہے جس کے آغاز میں موضوع کے بارے میں تفصیلات درج کر دی گئی ہیں۔ انگریزی اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ اُردو میں جو اصطلاحیں مروج ہیں، وہ بھی لکھ دی گئی ہیں۔ مثلاً تیزاب، سونٹھ، فیلے، کافور، مثلث وغیرہ، جہاں انگریزی اوزان اور پیمانے دیئے ہیں، ان کے مقابل ہندوستانی اوزان بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔

مخطوطہ ۱۴۳ کے آغاز کی حسب ذیل عبارت سے، ان ترجموں کی خصوصیات پر روشنی پڑ سکتی ہے:

"اس گرنتھ کا نام ہے میٹریا میڈیکا۔ اس فن کا نام ہے، جس سے فایدہ اور استعمال دوا کا معلوم ہوتا ہے اور جب تک اس فن سے واقفیت کما حقہ، نہ ہو، تب تک بیماری کا علاج نہیں کیا جاتا ہے۔ اس واسطے تشریح الامراض سے بیشتر مدارس طبی میں اس فن کو سکھاتے ہیں۔ لیکن فقط دوا کی خاصیت، فایدہ اور استعمال کا جاننا کافی نہیں ہے۔ ان کے ملانے اور وزن کرنے کی ترکیب سے بھی واقفیت پیدا کرنی بس ضروری ہے۔"

مخطوطہ ۱۹۱ سے بھی ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔ اس کی عبارت میں ہندی کا بھی استعمال ہوا ہے۔

"تیسری قسم گوند کی اکیشیا اروے کا نامک ہے کہ جس کو سنسکرت میں "گم سندر" کہتے ہیں اور ہندوستان میں جو ویکول کا درکش واولیہ کر کے ہوتا ہے اس کے گوند کی خاصیت بھی اسی طرح ہے۔"

"انا ٹومی" (۴۵۸۴) پر ایک مخطوط محفوظ ہے، جو دیوناگری رسم خط میں لکھا گیا ہے۔ ایک اور مخطوط "علم الامراض" پر اردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں لکھا ہوا ہے۔ زبان عام طور پر ایک ہی ہے، صرف کہیں کہیں الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔ علمِ طب کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"طب وہ علم ہے جس سے انسان (آدمی) کی تندرستی اور بیماری کا حال دریافت ہوتا ہے اور اس کے قاعدوں پر عمل کرنے سے صحت کا قیام اور مرض کا زوال ہو سکتا ہے۔"

تعریف تشریح کی — تشریح وہ علم ہے جس کے ذریعے سے اعضا کی ساخت، شکل اور مقدار اور عدد اور وضع دریافت کی جاتی ہے۔

تعریف فزیالوجی: فزیالوجی اس علم کا نام ہے، جس میں انسان کے زمانے کی صحت کے احوال مثل پرورش جسم اور خروج رطوبات اور دورانِ خون اور حرکتِ تنفس اور کیفیت قوتِ ہاضمہ، اور جاذبہ اور حقیقتِ تولد انسان اور پیدائش ہر عضوِ بدن اور ان کے افعال وغیرہ بیان کئے جاتے ہیں۔"

"ترجمہ شرح اسباب" دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں عام امراض کی تفصیل ہے اور دوسری جلد میں امراض کبیر، جیسے سوء مزاج جگر، ضعف الکبد وغیرہ کی تفصیلات شامل ہیں۔ اس کے مترجم حکیم فدا محمد خاں ہیں۔ مترجم نے ایک طویل دیباچہ قلمبند کیا ہے، جس میں اپنے کچھ حالات اور ترجمے کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں۔ دیباچہ کا اقتباس حسبِ ذیل ہے:

"امابعد، احقر العباد الی اللہ الصمد فدا محمد ابن اشرف الحکماء حکیم محمد یوسف خاں مرحوم ابن زبدۃ الحکماء بطلیموس دوران حکیم

غلام حسن خاں مغفور شاہ جہاں آبادی بخدمت شایقانِ و ماہران علمِ طب کے التماس کرتا ہے کہ کتاب شرحِ اسباب علاماتِ حکیم نجیب الدین سمرقندی کی شرح ہے اور شارح اس کے جالینوس وقت فیثا غورث ثانی حکیم نفیس الدین کرمانی ہیں۔ یہ شرح غایت اشتہار سے محتاجِ تعریف و توصیف کی نہیں ہے۔ مگر چونکہ زبان عربی میں ہے، اکثر عوام اس کے فوائد معتدبہ سے محروم تھے۔ لہذا حسب الحکم بندگانِ عالی مقامی، حضور فیض گنجور، دادگستر عالی گوہر، رعیت پرور، قدردان علم و ہُنر، برجیس رتبت، کیوان منزلت، نیرِ اعظم آسمان عظمت، ماہِ مُنیرِ سپہر رفعت معدن جود والاحسان، فیاض زمان، معلیٰ نشان، راجۂ راجگان، مہاراج دھیراج، راجیشر سری مہاراجہ رنبیر سنگھ بہادر والئ ملک جموں و کشمیر کہ سخاوت اور بخشش اون کی شہرہ آفاق ہے اور سب سے زیادہ اون کو شوق ترقی علم و کمالات ہے اور تین صاحبزادے والاتبار، گردوں وقار، حضور لامع النور، چوں معالیہ ثلاثہ عام اجسام ضروری الوجود و چوں ہر سہ ارواح بدن انسان مطلوب و مقصود۔ . . . . . . "

آگے مہاراجہ کے تینوں فرزندوں کی تفصیل لکھی ہے :

"سب سے بڑے صاحبزادے، سری میاں صاحب میاں پرتاپ سنگھ ولی عہد ریاست اور دوسرے صاحبزادے . . . میاں صاحب میاں رام سنگھ اور تیسرے صاحبزادے . . میاں صاحب میاں امر سنگھ دام اقبالہم و حشمتہم . . . . "

حکیم فدا محمد خاں یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں پہلے دیوان جوالا سہائے کی خدمت میں حاضر ہوا، جن کی سفارش سے دیوان کرپا رام نے مجھے سرکار میں ملازم کر دیا۔ یہ ترجمہ ۱۲۸۷ھ میں جموں میں مکمل ہوا۔

"اسباب الامراض" (۱۹۵ و ۱۹۶) دیوناگری اور اردو دونوں رسم خط میں لکھا گیا ہے۔ ابتدا میں امراض صداع اور ان کی قسموں کی تفصیل فارسی میں لکھی ہے۔ اور ماخذوں کا تذکرہ کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تالیف ہے۔ امراض نزلہ و زکام کی تشریح سے ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"آتش یا گرمی حمام یا گرمی سونگھنے چیزوں گرم مثل مشک عنبر وحنا اور زعفران یا مالش کی جاوے سر کوں ساتھ ساتھ کسی گرم چیز کے تو یہ عایہ ہوتا ہے . . . . . فقط۔"

"علامات: علامت اوس کی ظاہر ہونا سرخی آنکھوں کی خارش اور سوزش ہونا پیٹی کو اور زیادہ ہونا مرض کا باعث گرمی تپ سے اور ہونا پیاس کا زیادہ . . . . . "

"اسبا الامراض والعلاجات" (۲۹۸) کا وسنت رائے نے اردو اور دیوناگری دونوں میں ترجمہ کیا ہے۔ زبان اردو، ہندی اور پوٹواری (پوٹھاری) کا آمیزہ ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ایک دیباچہ دیوناگری میں لکھا ہے، جس میں مترجم نے اپنے کچھ حالات بھی لکھ دیئے ہیں۔ اقتباس ہے:

"مہاراجہ جموں دکشمیر دی آگیا تے میں نے وسنت رائے برہمن بیٹے شری لالہ بھولا ناتھ وادے دلیش نوذ محل نگر باشی نے چار کتابوں یونانی چکتیا پوٹواری بھاشا میں ایک جگہ اس پستک دیکھے کا رتک ماس سموت ۱۹۲۵ تے پر آرمبھ کر کے جیٹھ ماس

۱۹۲۶ اس آشاڑھ ماس کے دسے پورن کیا۔ ۔ ۔ ۔"

کتاب حمد و ثنا سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد مترجم نے کتاب کی تالیف کا حال لکھا ہے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کی مدح سرائی میں حکیم فدا محمد خان سے بازی لے جانے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"اما بعد، حقیر پُر تقصیر بخدمت ارباب فراست و اصحاب کیاست گذارش پرداز ہے کہ اس زمان سعادت نشان کی ازبسکہ طبع اقدس بندگان دارا زمان ثریا جاہ کیواں مکاں دُر یکتائے عظمتِ و بختیاری، مدۃ التاج، رہبت و کامگاری، بہارِ گلشن، عدل و انصاف، آب و تاب چمن بدال، و الطاف، خدیو دریا دل، عادل باذل، سری مہاراجہ صاحب بہادر، ابداللہ اجلالہم و اقبالہم رات اور دن ترقی علوم غریبہ و فنون عجیبہ در ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کافہ برایا و خشنودی رعایا میں مصروف ہے، لاجرم آجکل اس ریاست میں وہ ترقی اور افزائش علم و ہُنر ہوئی ہے کہ کبھی زمان سلف میں بدیارہ خیال نہ آئی تھی۔ چنانچہ بنظر افادہ عام نسبت اس مورِ ضعیف کے ارشاد فرمایا کہ اگرچہ اسباب و علامات امراض بدنی کی تشریح کتب متقدمین وغیرہ مندرج ہے۔ مگر چونکہ اکثر عبارات اون کی عربی و فارسی ہیں، مبتدی کی سمجھ میں آنا، اون عبارات کا ذرا آسان نہیں۔ اگر کوئی رسالہ صرف اس باب میں بزبانِ اُردو تالیف ہو تو البتہ خالی از لطف نہ ہوگا۔ لہٰذا اس ہیچ مداں نے بحکم المامور معذور کتب مثل قانون و تشریح اسباب و نفیس و سدیدی و طب اکبر وغیرہ سے تالیف رسالہ ہذا کرکے

"اسباب الامراض والعلاجات" نام رکھا۔

"علاج الامراض" کا ترجمہ وسنت رائے (لبنت رائے) نے پوٹھاری میں اور فضل الدین نے اُردو میں کیا۔ اور دونوں ترجمے ایک ساتھ سطر بہ سطر لکھے گئے ہیں۔ ترجمہ ۱۹۲۵ء۔ ۱۹۲۶ بکرمی میں ہوا۔ رسالے کا آغاز" ادبھار اور نجاروں" کے بیان سے ہوتا ہے۔ اقتباس حسب ذیل ہے:

"— اون امراض میں اکثر میدانی زہر بدن کے اندر سرایت کرجاتا ہے اور وہ یہ بیماریاں ہیں۔ اول ویدا ولا یعنی چیچک، دوئم روبی اولا یعنی خسرہ سیوم اسکارلٹ نیور یعنی سُرخ بخار، چہارم ایلی سیلس یعنی حمرہ . . . . ،"

دیباچہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ، تصحیح اور طباعت میں" درجہ اول کے ینیٹو ڈاکٹر مرزا امیر بیگ" سے بڑی مدد ملی ہے۔ طب میں ان کی مہارت کی بھی تعریف کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ اس کتاب میں جتنے یونانی علاج شامل ہیں۔ وہ حکیم فضل الدین کے مجوزہ ہیں۔ تالیف میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کی تفصیل بھی درج ہے۔ سی پی چارلس ایلیٹ ڈپٹی کمشنر ضلع لدھیانہ اور میجر مرسر ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی امداد اور دلچسپی کا بھی اعتراف کیا گیا ہے۔

امراض کی تفصیل، تشخیص طریقوں کو صاف اور سلیس زبان میں لکھا ہے اصطلاحیں عربی اور فارسی کی جو اُردو میں رائج ہیں، انہیں استعمال کیا ہے اور کہیں کہیں انگریزی اصطلاحوں کو بھی برقرار رکھا ہے۔ بعض الفاظ میں املا کا اختلاف ہے، مثلاً "چوہتی" (چوتھی) حطی کہ (حتیٰ کہ) "چہڑآوتا ہے" (چڑھ آتا ہے) اس کے

علاوہ کہیں کہیں مقامی الفاظ بھی برتے گئے ہیں، جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہوگا:

" ان دونوں کے نکلنے کے تیسرے روز ایک لطوبت مثال پانی کے جس کو جس کو شیرم بولتے ہیں بھر جاتی ہے۔ یہ رطوبت بھری والہ طلب انگریزی میں ولیسی کل کہلاتے ہیں۔ جڑ ان دونوں کی خوب سخت اور متفرق ہوتی ہیں۔ سرے ان دونوں کے ہمیشہ دبئے ہوئے ہوتے ہیں اور یہی خاص کر ان دونوں کی شناخت ہے۔"

"ترجمہ تشریح البوق" (۱۹۸ء) اُردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں ہے۔ اس کے مترجم بھی لالہ وسنت رائے (لبسنت رائے) ہیں۔ ان کی زبان میں گنجلک ہے۔ آغاز کرتے ہیں:

" بعد حمد و سپاس حکیم علی الاطلاق واضح ہو کہ یہ کتاب بیان تشریحات میں ہے اور تشریح عبارت ہے۔ اظہار شئے اور کشف کرنے حقیقت اوس شئے کی بتمامہ جو اوس میں کچھ شبہ ہوئے جیسا کہ تشریح ہے کہ اول نطفہ بنایا خون بستہ پھر بنایا اوس کو پارہ گوشت پھر اوس میں بنائیں استخوان اور پہنایا ادن پر گوشت اور پوست اور بخشی صورت۔ فقط۔۔۔۔"

مخطوطہ کے کاتب رام چندر رینہ ہیں اور اس کے اختتام کا سنہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ ترقیمہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

"بہ اتمام رسید و بہ انجام انجامید رسالہ ہذا فی التشریح بدن الانسان حسب الایمانی سید احمد شاہ کہ از صاحب حکمائے اجلہ و اکابر روزگار است۔۔۔۔ تحریر بتاریخ دویم ماہِ مُبارک ہکہ

سمت ۱۹۲۸ء مطابق ۱۲۸۵ ہجری مقدسہ راقم رامچندر رینہ . . "

" ہدایت پیدائش بچہ " اور " امراض الصبیان " پر ایک ایک مخطوطہ رنبیر کلکشن میں محفوظ ہے ۔ ان کے مترجمین یا مرتبین کا پتہ نہیں چلتا ۔ غالباً یہ بھی انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں ۔ " ہدایت پیدائش بچہ " ناقص الآخر ہے ۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ۔

" فصل اول — جاننا چاہیئے کہ جب لڑکا پیدا ہوا تو اوس کے بدن کو ہوائے سرد سے محفوظ رکھیں ۔ بعدہ ' ناف کی آنت کہ جس کو نال بھی کہتے ہیں اور وہ سشمہ یعنی آنول سے لگی ہوتی ہے ۔ اوس کو انگوٹھے اور سبابہ کی انگلی سے پکڑ کر بچے کے پیٹ سے آنول کی طرف نرمی و ملائمی اچھی طرح دوہیں تا خلط و ریح وغیرہ سے جو کچھ کہ اوس میں ہوتا ہے ، خوب صاف ہو جائے ۔ پھر سوت کے نرم دھاگے کو کسی مناسب روغن میں چرب کر کے ناف کی انتڑی کو دو جگہ سے بخوبی باندیں ۔ ایک ناف کے نزدیک دوسرا اور اس سے ایک بالشت کے فاصلے پر . . . . . "

" امراض الصبیان " (۲۳۶) اردو اور ناگری دونوں رسم خط میں لکھا گیا ہے ۔ اصطلاحیں اُردو ، فارسی ، ہندی اور انگریزی سب استعمال کی گئی ہیں ۔ بعض اُردو لفظوں کے مترادف ہندی لفظ بھی لکھے گئے ہیں ۔ جیسے عورت ، استری ، بیان ، درنن ، رسالہ چھ مقالوں اور چار حصوں پر منقسم ہے ۔ زبان سلیس اور صاف ہے ۔ بچوں کی ہڈی ٹوٹنے اور اس کے علاج کی تفصیل لکھی ہے :

" ہڈی ٹوٹ جانا ۔ اصطلاح میں اس کو فرا کچر بولتے ہیں ۔ بچوں

کی ہڈی نسل جوانوں کے ٹوٹ کر دو ٹکڑے نہیں ہو جاتی بلکہ خم کھا کر آدھی کھنچ جاتی ہے اور آدھی بل کھا جاتی ہے۔ علاج اس کا معمولی طور پر کریں اور اسپلنٹ کو دو یا تین ہفتے باندھ رکھیں مگر چمڑے یا موٹے کاغذ کا اسپلنٹ بہ نسبت لکڑی کے بہتر ہے۔"

"دستورِ قابلہ" (۱۹۴۶ء) بھی اُردو اور دیوناگری دونوں میں ہے۔ ابتداء میں ناگری خط میں فصلوں کی فہرست درج ہے۔ اصل متن کا آغاز اسطرح ہوتا ہے:

مقدمہ: پہلی فصل۔ پلوس کی ہڈیوں کے بیان میں
واضح ہو کہ کوکھ اور چوتڑ اور پیرو اور قطن اور دُمچی کی ہڈیوں سے مل کر ایک شکل مجموعی سلفچی کے مانند بنتی ہے۔ اس کو انگریزی میں پلوس بولتے ہیں۔

پلوس کی تشریح۔ پلوس چار ہڈیاں ہیں۔ دو ہڈیاں کولے کی جس کو اس انا ینما کہتے ہیں اور تیسری ہڈی قطن جس کو انگریزی میں سیکرم بولتے ہیں اور چوتھی ہڈی دُمچی کی جس کو عربی میں عُصعُص اور فارسی میں استخوان، نشست گاہ اور انگریزی میں کاکیکس کہتے ہیں۔"

یہ مخطوطہ ۲۰۴ اوراق کا ہے:

مدرسہ طبیہ کے طلبا کے فائدے کے لئے ایک رسالہ "ہدایت الاطبا" کے نام سے مرتب کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ ایک تقریر پر مشتمل ہے جو غالباً کسی انگریز عہدہ دار نے مدرسۂ طبیہ کے طلبا کے لئے ان کی تعلیم کے اختتام کے موقع پر کی تھی۔ تقریر میں پیشہ طلب کی اہمیت اور نزاکت اور نوجوانوں کو کسی بڑے وفاہی

مقصد کے پیش نظر رکھنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اس کے مطالب مفید اور عبارت، دلچسپ ہے۔ ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"ہم زاہدِ ریاکار اور حاکمِ ظالم کی بہ نسبت طبیبِ نامعتبر کا منہ دیکھنا زیادہ ناپسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ زاہدِ ریاکار اپنے ظاہر کو پاکی کے لباس سے آراستہ رکھتا ہے اور اوس کے روبرو ہر وقت دروازہ توبہ کا کُھلا رہتا ہے۔ لیکن طبیب کا کام بذاتِ خود اس قدر مخفی ہے کہ اوس کے ہم پیشہ لوگوں کو بہت کم پتہ لگتا ہے کہ اوس نے اپنی دیانت کو کیونکر نباہا۔ اور عوام بہ سبب نہ ہونے کسی معتبر پہچان کے جس کے ذریعے سے اوس کے کام کی بخوبی دریافت کرلیں۔ اپنی کسی خیالی دلیل پر اکثر اوس کی عزت کرتے ہیں۔ بہ ایں لحاظ کہ وہ اون کو ظاہر میں لائق معلوم ہوتا ہے اور اوس کی گفتگو شایستہ ہے یا کسی شخص کو اتفاقاً ایسے مرض سے آرام ملتا ہے کہ جب بعض اطباء دست بردار ہوئے ہوں۔ ۔ ۔ ۔"

طب کے علاوہ دوسرے افادی علوم میں ایک رسالہ "مورچہ بندی" پر ہے جو کسی انگریزی رسالے کا ترجمہ ہے۔ اس کے مترجم مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے رُکن پنڈت بخشی رام ہیں۔ یہ رسالہ ۱۴۱ اوراق پر مشتمل ہے اور اس کی تکمیل کی تاریخ ۲۶ ساون ۱۹۲۵ بکرمی ہے۔ رسالے کے آغاز میں اصطلاحوں کی تشریح کی گئی ہے اور مسایل کو سمجھایا گیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ "کل عمارت حفاظت سے مطلب یہ ہے کہ تھوڑی فوج ایسی مفید جگہ پر رکھی جائے کہ وہ بہت سی فوج کا مقابلہ کرسکے۔"

۲۔ صلابت کونچہ۔ ایک لمبی اڑ کو کہتے ہیں، جس سے پیچھے کے آدمیوں

کی حفاظت بہ آسانی ہو سکے یا اوس سے دشمن دور رہ سکے اور یہ دو طرح کی ہے۔ ایک قدرتی دوسری تیار کی ہوئی۔"

رسالہ کے سرنامہ پر یہ عبارت درج ہے ۔۔۔۔ "یہ کتاب ترجمہ کردہ پنڈت بخشی رام جی از کتاب انجنیری انگریزی"

فوجی فنون سے متعلق ایک اور رسالہ " علم تیر اندازی " ہے جسے غلام غوث خان نے تصنیف کیا ہے۔ غلام غوث خان جموں کے رہنے والے تھے۔ علم تیر اندازی وہ غالباً ولی عہد ریاست پرتاپ سنگھ کو سکھایا کرتے تھے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کی فرمائش پر انہوں نے یہ رسالہ لکھا تھا۔ چنانچہ ابتداء میں پرتاپ سنگھ کی تعریف انہوں نے جس طرح کی ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔

" در صفت خورشید آسمان شجاعت و سخاوت ماہ منیر سپہر رفعت و عدالت، سری میاں صاحب پرتاپ سنگھ جیو صاحب بہادر دام اقبالہ و اجلالہ، می گوید . . . . . . "

ریاست کے حکمران خاندان میں " میاں " کا لفظ راجکمار اور خاص طور پر ولی عہد کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ غلام غوث خان نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کی تعریف میں ایک نظم بھی لکھی ہے۔ حمد، نعت، مہاراجہ رنبیر سنگھ اور میاں پرتاپ سنگھ کی توصیف کے بعد لکھا ہے کہ مہاراجہ نے ان سے علم تیر اندازی پر ایک رسالہ لکھنے کی فرمائش کی تھی، جس کے اتباع میں یہ رسالہ مرتب کیا گیا ہے۔ رسالہ پچیس کلیات پر مشتمل ہے اور آغاز حضرت پیغمبر اسلامؐ کی سنت کے اس واقعے سے ہوتا ہے کہ آپ منبر پر اکثر اوقات یہ آیت تلاوت فرماتے تھے۔ "واعدو لھم ما استطعتم من قوت ۔۔۔۔" اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے: "الاان قوت الرمی"۔ اس لئے علما کہتے ہیں کہ علم تیر اندازی کا سیکھنا ادب بلکہ سنت ہے۔

علم تیراندازی کا آغاز انھوں نے حضرت آدم سے بتایا ہے لکھتے ہیں:

علم تیراندازی کا رب نے جو بھیجا درجہاں
ہوا نزولِ آدم کو یک تیر بے کماں
حضرت جبرئیل نے سکھلایا اون کو یہ ہنر
تب مروّج در جہاں ہوا ہنرِ تیر و کماں

غلام غوث خاں غالباً اس فن کے اچھے ماہر تھے، لیکن وہ اچھے شاعر تھے اور نہ اچھے انشاء پرداز۔ جگہ جگہ انھوں نے اُردو اور فارسی اشعار داخل کئے ہیں لیکن یہ سب تُک بندی ہے۔

پکوان کی ہدایات پر مشتمل ایک رسالہ "رہنمائے رسوئیاں" ناقص الآخر ہے۔ اس کے مصنف کا پتہ نہیں چلتا۔ رسالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"چونکہ یہ امر قابلِ لحاظ تصوّر کیا گیا ہے کہ جب کبھی کوئی لطیف یا نفیس یعنی تکلّف دار اور مزیدار کھانا بنوانا ہو تو ایسے ہر طرح کے کھانے بنانے سے پیشتر یخنی، شوربا، آب جوش اور آب گوشت بنانے کی بہت ضرورت ہے۔ مگر جس حالت میں کہ روزمرہ کے طور پر کھانے بنوانا ہو تو اوس حالت میں اون شوربوں کے بنانے کی ضرورت نہیں . . . . . ."

فنونِ مفیدہ میں ایک رسالہ کاغذ سازی پر اہم ہے، جو کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ رسالہ "رسالہ کاغذ سازی" کے نام سے موسوم ہے اور کاغذ کی تیاری میں جن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ ان سب کی تفصیل اس میں درج ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشینوں کے خاکے بھی دیئے گئے ہیں۔

سوانح پر دو کارنامے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک "تذکرہ حالاتِ انبیاء" اور دوسرا

"ذکر اولیائے ہنود" اول الذکر رسالے کے مصنّف کا نام مخطوطے میں درج نہیں ہے، رسالے میں حضرتِ آدم سے لے کر حضرت محمد صلعم اور ظہور دانیال تک سالے اہم پیغمبروں کے مختصر حالات لکھے گئے ہیں۔ جن انبیاء کے حالات رسالے میں درج ہیں وہ یہ ہیں:

آدم، قابیل، شیث، عوج بن عنق، اِدریس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، اسماعیل، داؤد، سلیمان، عزیز خضر، یعقوب، یوسف، لوط، ایوب، عمران، موسیٰ، ہارون، عیسیٰ، یوشع، کالوب، سموائیل، محمد الرسول اللہؐ۔ ظہور دانیال۔

آدم کے حال میں لکھا ہے:

"آدم سب سے پہلے پیغمبر ہیں، محرم کی دسویں تاریخ، جمعہ کے دن بعد زوال کے آپ کے جسم مبارک میں روح داخل ہوئی۔ بعد اوس کے فرشتوں نے سجدہ کیا اور بہ سبب کھانے گیہوں کے بہشت سے نکالے گئے۔ ان کی پسلی کو چیر کر حوّا کو نکالا۔ ان سے ہی تمام دنیا کی آبادی ہوئی۔"

قابیل اور ہابیل کی روایت تفصیل سے بیان کی ہے، جو ایک دلچسپ مختصر قصّہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان اور اسلوب سیدھا سادہ ہے۔

"ذکر اولیائے ہنود" نابھ داس کی "بھگت مال" کا ترجمہ ہے۔ مترجم کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ کتاب کا اسلوب سلیس اور واضح ہے اور کہیں ادبی جھلک بھی ملتی ہے۔ میر مادھو کے حال میں لکھا ہے:

"میر مادھو جی، عابد الٰہی مشہور و معروف ہیں۔ اول امیر کبیر تھے مذہب محمدی رکھتے تھے۔ رہرو متھرا برندابن میں پہنچے، اپنے

منشی سے جو بھگوت کا معتقد تھا۔ راس لیلا کی بڑائی سن کر تماشا دیکھنے کا شوق ہوا۔ منشی نے بدریافت غلبہ شوق امیر کے بعد اقرارات عجب و پرستش وغیرہ کے راس کرنے والوں کو بلایا اور امیر نے بہ ادب و شوق تمام اذکار آلہی کو دیکھا۔ جان و دل سے عاشق اصلی صورت نند نندن برندابن چند کا ہو گیا اور تمام مال و خزانہ خدائے تعالےٰ کے نذر کیا۔ بعدہٗ لباس و دنیا کو بھی ترک کر دیا۔ سری کرشن، گویاں جنگل و کوچہ ہائے سری بندرابن میں طالب اصل مطلوب عزیز کا پھرنے لگا۔"

آگے اس کی کرامات اور بھگوان کرشن کی اس پر عنایات کی تفصیل ہے۔ ان کے ایک فارسی قصیدہ کا مطلع بھی لکھا ہے، جو حسب ذیل ہے:

تا کے ز خود رانی سخن سری کرشن گو سری کرشن گو
بگذار کبر ما و من سری کرشن گو سری کرشن گو

علم منطق پر ایک رسالہ "کتاب کبریٰ در علم منطق" کا ترجمہ ہے۔ اصل فارسی کے ساتھ، ترجمہ اردو اور سنسکرت میں سطر بہ سطر لکھا ہے۔ سب سے پہلے فارسی نہایت خوش خط، اس کے نیچے سنسکرت اور اس کے نیچے اردو رسم خط میں، زبان پر سنسکرت کے علاوہ بولی کا اثر بھی ہے۔ جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے:

" جانو سما دھان ہووے کہ منشیہ کو ایسا چیتنا والا بل ہے کیا کہ جیسا تس میں وستوؤں کیا مورتیاں لکھنے آدتیاں ہیں۔ پرنتو درپن میں محسوسا توں کیاں مورتیاں ہی کیوں دیکھنے میں آوتیاں ہیں . . . ."

یہ رسالہ اپنے موضوع، مطالب اور ترجمے کے طریقے ہر لحاظ سے اہم ہے۔ اس کے علاوہ لسانی آمیزش کے مطالعے کے اعتبار سے بھی اہم مواد رکھتا ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے علماء میں بابو نصر اللہ عیسائی کا نام آ چکا ہے۔ نصر اللہ نے ڈاکٹر جان اِسن کی تصنیف "کشمیر ہینڈ بک" "تاریخ رہنمائے کشمیر" کے نام سے اُردو میں منتقل کیا تھا۔ اس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے حکم سے اُردو میں کیا گیا اور مکمل ہونے کے بعد ان کی خدمت میں منظوری کے لئے پیش کیا گیا۔ ترجمہ کا سنہ ۱۸۷۴ء ہے۔ اس ترجمہ سے وادی کشمیر کے بارے میں ایک اقتباس یہاں درج ہے:

"کشمیر خصوصاً ایک ہی بڑی وادی ہے جو کہ ہر طرف سے بلند اور برفانی پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے، جس میں دریائے جہلم موجزن ہے اور علاوہ اس بڑی وادی کے اور بھی چھوٹی چھوٹی وادیاں ہیں، جن سے چاروں طرف سے اس دریا میں پانی پڑتا رہتا ہے مگر وادی کشمیر ان تمام وادیوں میں سے بڑی اور مشہور و معروف ہے۔"

مترجم نے لکھا ہے کہ یہ کتاب خاص و عام کے استفادہ کے لئے مشتہر کی گئی لیکن اس کے مشتہر کئے جانے کی تفصیل نہیں ملتی۔ اس کا صرف ایک مخطوطہ دستیاب ہوتا ہے جو محکمۂ ریسرچ، سری نگر کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

رنبیر سنگھ کے اس دارالترجمہ کے بارے میں نظم و نسق کی کچھ رپورٹوں سے، جو اُردو میں چھپتی تھیں، تھوڑی بہت تفصیلات ملتی ہیں۔ مثلاً ۱۸۸۲ — ۱۸۸۳ء کی ایک رپورٹ میں اس کے بارے میں یہ کیفیت درج ہے:

"سال حال کوئی کتاب جو انگریزی سے شاستری (سنسکرت) اور شاستر سے بھاشا اور عربی سے اُردو میں ترجمہ ہوئی ہیں، ختم نہیں ہوئیں"۔

رپورٹ میں ترجموں پر جو مصارف سالانہ ہوتے رہے ان کی تفصیل لکھی ہے:

" ۵۰۲۴ روپیہ، اُجرت ترجمہ اس سال میں صرف ہوا"

اس دارالترجمہ سے ہٹ کر بھی ریاست میں علمی اور ادبی کوششیں ہوتی رہیں ان میں ریاست کی سرکار کی جانب سے جو کام ہوا تھا۔ اس میں ایک اہم رسالہ قابل ذکر ہے۔ جو " پیداوار اور جانوران لداخ کے " نام سے موسوم ہے۔ یہ رسالہ وزارت لداخ ریاست جموں وکشمیر کی جانب سے ۱۸۸۵ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس زمانے میں سردار محمد اکبر خان وزیر لداخ تھے۔ رسالہ مرتب ہونے کے بعد سردار نے اسے دیوان لکھپت رائے کے پاس پیش کیا تھا۔

رسالے میں زمینی پیداوار کے عنوان کے تحت، اکھروٹ (اخروٹ) ہاڑی توت، انگور، سیب اور کچھ اور میوؤں کی تفصیل لکھی ہے اور ان کی پیداوار کے رقبوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اسی طرح درختوں اور ان کی مختلف قسموں کا ذکر ہے۔ جو اس دور دراز علاقے میں اُگتے ہیں۔ جانوروں میں جنگلی بیل، جنگلی بکری، ہرن، گرگ، جنگلی کتا، لومبڑی، سانپ، جنگلی چوہا، خرگوش، مچھلی اور یا سگ آبی، مُرغ آبی، بگلا خورد، لام چکرا، ولیشک جو بٹیر جیسا ایک پرندہ ہے، کبوتر، لوگو، (ایک چڑیا) چکٹا (چڑیا) کا ذکر ہے۔ کانوں کی تفصیل سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے:

" علاقہ نوبرا میں موضع پنامیسک کے نزدیک ایک میدان ہے جس سے پھول پیدا ہوتے ہیں اور یہ جگہ لداخ سے پانچ منزل پر ہے۔ اور علاوہ اس کے ایک کان پھولی علاقہ ماچی گو گرہ میں بھی ہے مگر اس جگہ سے لانے سے خرچ زیادہ اور آمدنی کم ہے۔ اس واسطے ادس جگہ سے مائی نہیں جاتی۔"

یہ رسالہ ایک سرکاری دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور اس زمانے میں مرتب ہوا تھا جب اردو ابھی سرکاری زبان تسلیم نہیں کی گئی تھی۔ اس نوعیت کی ایک اور اہم دستاویز مہتہ شیر سنگھ کا سفرنامہ ہے جو ۱۹۶۶-۶۷ء میں مرتب ہوا تھا۔ مہتہ شیر سنگھ رام پور کشمیر کے رہنے والے تھے، اور رنبیر سنگھ کی سرکار میں ملازم تھے۔ رنبیر سنگھ کو ریاست کی تجارت کو فروغ دینے کا بہت خیال تھا، اس لئے انہوں نے مہتہ شیر سنگھ کو ریاست کے پڑوسی ملکوں اور مقامات کا سفر اختیار کرنے اور مقامات اور راستوں کی کیفیت مرتب کرنے پر مامور کیا تھا۔ اسی کے اتباع میں، مہتہ شیر سنگھ ۶۷ء میں کابل بلخ، بخارا، وغیرہ کا سفر کیا اور منزلوں کی تفصیل اور ایک منزل سے دوسری منزل تک کے پہنچنے، راستے کی کیفیت، مقامات اور شہروں کے حالات پر مشتمل یہ رپورٹ تیار کی تھی، جو سفرنامہ کے نام سے موسوم ہے۔ دیباچے میں وہ کچھ اپنے بارے میں اور اس سفر کی تحریک کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"واضح ہو کہ یہ نمک پروردہ قدیمی حضور انور سری مہاراجہ صاحب بہادر فیاض زمال، والی جموں و کشمیر ساکنہ خاص رامپور کا مہتہ شیر سنگھ نام، قوم کا برہمن اور بنظر نمک خوری و بخواہش آب و دانہ مقررہ بہ روانگی واسطے کرنے دریافت حال تجارت ملک شاہ افغان، و امیر خوقند، و امیر بخارا شریف کے خاص شہر سری نگر سے یعنی پایہ تخت حضور پُر نور بہ بدرقہ لطف الٰہی روانہ ہوا۔ چنانچہ بہ نیاز مند بتاریخ ۱۶ ماہ ساون ۱۹۲۳ بکرمی جنتی مکان مذکور سے بعد حصول قدمبوسی حضور انور براہ مظفر آباد و ہزارہ و اٹک پشاور و کابل و بلخ و بخارا شریف، و سمرقند، و طاش قند و خوقند لطیف و کاشغار دیار قند و لداکھ وغیرہ گردش کر کے بعد مدت

شانزدہ ماہ بتاریخ ۱۲ ماہ کاتک ۱۹۲۴ء قدمبوس پایہ تخت کشمیر جنت نظیر کا ہوا۔"

جن جن مقامات کو شیر سنگھ گئے، وہاں کی سابق حکومت، حال فرمانروا، اور مقامی حالات سب کا تذکرہ کیا ہے۔ کل ۱۷۲ مقامات کی تفصیل سفرنامہ میں درج ہیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مقامات کا ذکر سرسری طور پر کر دیا ہے، کچھ سوالات قائم کئے اور ان کے جوابات بھی لکھے ہیں۔ سفرنامہ مرتب ہونے کے بعد یکم فروری ۱۹۶۸ء کو دیوان نہال چند کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

اس زمانے تک اُردو کے ریاست میں پھیلاو اور سرکاری اور دفتری کاموں میں اس کا استعمال عام طور پر رائج ہو چکا تھا۔ جس کا اندازہ لداخ کے بارے میں رسالے اور مہتہ شیر سنگھ کے سفرنامے سے ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اس زمانے میں ریاست کے نظم و نسق کے بارے میں جو رپورٹیں شایع ہوتی تھیں، وہ بھی اُردو میں شایع ہوتی تھیں۔ دارالترجمہ کے سلسلے میں ایک رپورٹ کا اقتباس درج کیا جا چکا ہے۔ ایک اور مکمل رپورٹ جو "رپورٹ مجموعی" کے عنوان سے مرتب ہوئی تھی۔ اور جس کی تفصیلی سُرخی ہے:

" انتظام ممالک ریاست جموں و کشمیر ابتدائے ماہ پوہ ۱۹۲۹ لغایتہ ماہ مگھ ۱۹۲۱ بکرمی، حسب الحکم سری مہاراجہ بہادر دام اقبالہٗ بہ اہتمام کی گئی۔"

کئی خلاصوں پر مشتمل ہے۔ خلاصہ (الف) کے تحت حسب ذیل عنوانات کے بارے میں کیفیت درج ہے:

" رقبہ، مردم شماری، تعداد وزارت و پرگنات جموں، پیمائیش بندوبست معہ اوسط پرتہ، تعداد وزارت و پرگنات سرینگر

تعداد پرگنات لداخ و اسکردو گلگت، تجارت، احوال تجارت پشمینہ"۔

ان تفصیلات کے علاوہ رپورٹ میں مقدمات فوجداری، مقدمات دیوانی، احکامات گورنمنٹ عالیہ، جیلخانہ جات، پولیس، ملٹری یعنے جنگی، ڈاک خانہ جات، ترقیات، صاحبانِ عالیشان سیاحانِ کشمیر، ترجمہ علوم، ہسپتال و شفاخانہ جات نہر دریائے چناب واقع اکنور، رپورٹ انتظام، غرض ریاست کے نظم ونسق کی ساری تفصیلات جو ۷۳-۱۸۷۲ء سے متعلق ہیں، مندرج ہیں

جموں کے مختلف علاقوں کے موسمی حالات کے بارے میں رپورٹ میں ذیل کی معلومات درج ہیں :-

"۱- علاقہ جات جموں میں بارش متوسط ہوئی مگر علاقہ کوہستان بسوہلی و رام پور و چھیال میں کم بارش اور بے وقت ہوئی۔ فصلیں سال ۱۹۲۰ بکرمی بوجہ ناقص ہوئیں و نرخِ غلہ گراں رہا۔ (۲) علاقہ سری نگر و لداخ و اسکردو و گلگت میں بارش برمحل ہوئی، فصلیں اچھی ہوئیں اور نرخِ غلہ ارزاں اور آفت رعی و خامی سے (یعنی صدمہ ہوائی از حد گرم یا سردی سے مادہ پیدائش غلہ شالی ناقص ہوجاتا ہے) ممالک سری نگر محفوظ رہا یہ حدی ممالک گلگت وغیرہ جوانب میں بہر طور امن رہا۔"

ایک اندراج کا اقتباس جو صاحبان عالی شان کی سیاحت کشمیر سے متعلق ہے، حسبِ ذیل ہے :

"۲۲۲ کس صاحبانِ عالی شان و ۶۲ میم و لیڈی صاحبہ واسطے گلگت کے سری نگر تشریف لائے۔"

رپورٹ کے سال میں مختلف مدارس میں طلباء کی جو تعداد تعلیم پا رہی تھی ۔ ۱۵۳۳ درج ہے ۔ تجارت کے بارے میں ذیل کا اقتباس قابل مطالعہ ہے :

' بعد انتقال محمد شاہ بادشاہ چغتائیہ کشمیر بہ قبضہ افاغنہ ہو گئی ۔ . . . . اکثر بیوپاری . . . . . . دکھن حیدر آباد و بڑودہ وغیرہ راجپوتانہ سے برائے تجارت پشمینہ ، مال سبک مانند شال قدوار و شاہ پسند خرید کر ، ہندوستان لے جاکر دو چند سہ چند فروخت کرتے تھے ۔ "

جہاں تک ادبی جد و جہد کا تعلق ہے ۔ اس عہد میں کئی ایک شاعر اور انشاء پرداز منظر عام پر آئے ۔ پنڈت دیوان شیو ناتھ کول منتظر ، جن کا قطعہ تاریخ ، دیوان کرپارام کی تصنیف " ہدیۃ التحقیق " کے بارے میں درج کیا جا چکا ہے ، اچھے شاعر تھے ۔ وہ ۱۸۳۸ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے اور تعلیم سے فراغت پانے کے بعد لاہور چلے گئے تھے ۔ جہاں محکمہ تعلیم میں انہوں نے ملازمت کی پھر کشمیر لوٹ آئے اور سب رجسٹرار اور نائب محکمہ صدر الصدر و عدالت جموں کے عہدہ پر مامور رہے ۔ کوئی ستر برس کی عمر میں انہوں نے انتقال کیا ۔ وہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ ان کے قدردان تھے ۔ " بہارگلشن کشمیر " کے مرتبین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی چند تصانیف ہندی نظم میں بھی تھیں ۔ فارسی میں وہ حافظ سے خاص طور پر متاثر تھے ۔ جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے :

گو منتظرا تو ہمچو حافظ   یارب شب ظلمتم سحر کن

اسی غزل کے دو شعر اور ہیں :

گر لذت درد عشق خواہی   از وصل صنم دلا ، حذر کن

کس نیست بجز جمالت ایں جا — بے پردہ بچشم من گذر کن

منتظر نے فارسی میں کافی کلام چھوڑا تھا اور اردو میں ایک کلیات ان کی یادگار ہے جو کئی قصیدے، مناجاتیں اور ایک مسدس "شکوہ چرخ" شہر آشوب کے انداز پر لکھا تھا۔ انہوں نے کئی غزلیں غالب کی زمین میں لکھی تھیں۔ ایک غزل کے دو شعر ہیں:

دہن زخم اپنا وا نہ ہوا — ہائے حق نمک ادا نہ ہوا

دل کو اپنے ہے جستجو اس کی — جو کبھی صورت آشنا نہ ہوا

ایک اور غزل کے دو شعر ہیں:

کیا یہی شرط محبت ہے کہ اب — میرے رونے پہ ہنسا کرتے ہیں

دیکھ کر شوق عنایت کا ان کو — دل ہزاروں کے لیا کرتے ہیں

پنڈت ٹھاکر پرشاد دانچو مفتون بھی ملازمت کی تلاش میں لاہور گئے تھے۔ اور عدالت دیوانی میں ملازمت اختیار کی تھی ۱۸۵۷ء میں وظیفہ حاصل کرنے کے بعد دہلی چلے گئے تھے۔ غزل اچھی کہتے تھے اور کبھی کبھی جدت سے بھی کام لیتے تھے۔ ان کے اشعار کا اقتباس ہے:

ستارہ چمکے ہے جوں آب چاہ میں مفتون
چمکتا خال ہے محبوب کا ذقن کے بیچ

شراب ناب سے تاباں ہے جوہر مینا
شکستہ ہوئے تو بن جائے خنجر مینا

پنڈت نند رام جو پرمانند کے نام سے مشہور ہیں، ایک تارک الدنیا سنیاسی اور صوفی شاعر تھے۔ انہوں نے ایشور بھکتی کے گیت ہندوستانی اور پنجابی ملی جلی زبان میں گائے وہ ٹن کے رہنے والے تھے۔ ان کی ولادت سپر بن ۱۷۹۱ء میں ہوئی تھی۔ ان کے والد سری کرشنا

پنڈت مٹن کے ایک گاؤں سیر میں پٹواری تھے۔ والد کے انتقال کے بعد وہ اس خدمت پر مامور ہوئے لیکن ان کی طبیعت کو تصوف اور بھکتی سے لگاؤ تھا۔ چنانچہ آخری عمر میں ملازمت ترک کردی تھی۔ للہ دید اور نور الدین ریشی کے علاوہ، گورو نانک کی تعلیمات سے بھی وہ متاثر تھے۔ تعلیم انہوں نے فارسی میں پائی تھی، اس لئے فارسی سے بھی لگاؤ تھا۔ ابتداء سے انہیں مذہبی کتابوں اور ویدانت کے مطالعے کا شوق تھا۔ کچھ مسلمان صوفی درویشوں کی صحبتوں سے بھی انہوں نے استفادہ کیا تھا۔ یہی ملے جلے اثرات، ملی جلی زبان میں جسے وہ "بھاکھا" کہا کرتے تھے، انہوں نے شاعری کی ہے۔ ماسٹر زندہ کول نے جو اردو اور کشمیری کے شاعر ہوئے ہیں، ان کے کلام کو تبصرہ اور حواشی کے ساتھ تین جلدوں میں مدون کیا ہے۔ مقدمہ اس پر انگریزی میں لکھا ہے:۔

پرمانند کا آخری زمانہ تکلیفوں میں گذرا۔ بیوی کی بدمزاجی اور لڑکے کی موت نے زندگی سے ان کا جی سیر کردیا تھا، تاہم ایشور کی لو جو لگی ہوئی تھی، اس میں کمی نہیں ہوئی بلکہ اس میں اضافہ ہوگیا تا آں کہ ان کا انتقال ۱۸۷۹ء میں ہوگیا۔ ان کے کلام کے کچھ اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

کیا ہے جگ کوئی جانتا ناہیں   گیان بنا پہچانتا ناہیں
ست سنگ گنگ اشنان کرے   نہ آون تیرتھ تن نہاوے
پرمانند اس سماوی سے   لے ہووے ست وادی سے

کھاؤ، پیو، سوو، جاگو آؤ جاؤ، پیار   لاڈ، یاد، راتیں دن میں کرلیہو سب ویوہار
ہر جانو اس کو مانو اس کو سونپو بارم بار

نہ کر، نہ کر، نہ کر کے کر!   کرموں کو نہ چھوڑ!
من مانی سے من نہ لدو   ابھیمانی سے منہ موڑ!

پھیر پسارو، اکھیاں میٹھوا ! ہاتھ اُٹھا کر جوڑ !

سنتوں کے پرنام

پرمانند نے فارسی میں بھی شعر کہے ہیں اور فارسی میں وہ غریب تخلص کرتے تھے۔

ویدوں سے یہ حکم چلا ہے ! جیو آتما شیو وشی کلا ہے

اپنا اپنا کرموں کا پھل مائی ایک دو بھائی !

بندرابن میں راس رچالو ! نام ہیو گوپال

رکھی نے کیا بات سُنایا چوراں کو سدساہ بنایا

چور وہی نا پکڑے کوئی نامک رکھن روی آوئی

کشمیری میں پرمانند نے "رادھا سوئم" اور "سودام چرتر" دو طویل نظمیں لکھی ہیں۔ جو "گیان پرکاش" کے عنوان سے اکٹھی شایع ہوئی ہیں۔ ماسٹر زندہ کول ثابت نے ان کے کلام کو بسیط مقدمہ کے ساتھ شایع کیا۔

پرمانند کے معتقد اور شاگرد، سوامی لکھمن جو بُلبل " کشمیری اور اُردو دونوں میں لکھتے تھے۔ ان کی ایک نظم "سری راماگیتا" جو کشمیری میں ہے، پنڈت نرنجن ناتھ رینہ نے مرتب کر کے شایع کی ہے۔ بُلبل، سندر رازدان کے فرزند تھے، پہلے سری نگر میں رہا کرتے تھے، پھر دوسری شادی کے بعد ناگام چلے گئے تھے، جہاں کچھ عرصہ تک تجارت کرتے رہے۔ فارسی میں انہیں اچھی دستگاہ تھی۔ اس لئے آخر میں تجارت ترک کر کے فارسی پڑھانے کے لئے مکتب قایم کر لیا تھا۔ پرمانند کے اثر نے انہیں بھکتی کی طرف مایل کیا اور کشمیری لیلائیں اور بھجن لکھتے رہے۔ ایک چائے نامہ اور قصہ نل دمن اور ایک رزمیہ سام نامہ بھی منظوم کیا تھا، جس کا ماخذ فردوسی کا "شاہنامہ" تھا۔ بُلبل کا انتقال ۱۸۸۶ء میں ہوا۔ اپنی موت سے پہلے انہوں نے یہ قطعہ تاریخ کہا تھا:

بیا اے باغبان بلبل قفس انداخت در گلشن
ز آبِ شبنمش غسلی ز برگ گل کفن افگن
چمن کے بیچ میں سبزے کے تختے پر لٹا دینا
پھر اک گلبن کی شاخوں سے ملا اس کا کرو روشن
صبا از عندلیب گو کہ از بلبل نوا بر گو
کہ زیر پائے عشق رام جی آمد شہرانِ لکھمن

پرمانند کے ایک اور عقیدت مند پنڈت واسدیو جی بھی تھے۔ ان کی کچھ نظموں اور صوفیانہ اشعار کو پنڈت نرنجن ناتھ رینہ نے "گیان پرکاش" کے ساتھ شائع کیا ہے۔

اسی سلسلے کے ایک صوفی ولیشنہ کول یا کشمیر ناتھ کول غافل بھی تھے جن کا ذکر کشمیری کے حصے میں کیا گیا ہے وہ اردو میں بھی کہتے تھے۔ ان کے ملی جلی زبان میں لکھے ہوئے کچھ شعر یہ ہیں :۔

پریم آشمن پر بھو آیا !	بہ کشمیری زبان رامائن آیا
سنسکرت اور کشمیری ہماری	بہ اردو فارسی ہر فقرہ بندی
مرکب اس میں انگریزی مکمل	مرتب سات علموں بہر کل

پنڈت نرنجن ناتھ رینہ، جن کا تذکرہ اوپر آیا ہے، شاعر اور مصنف تھے اور انہیں بھی دھیان، یوگ اور تصوف سے لگاؤ تھا۔ اس دلچسپی کے باعث پرمانند، پنڈت لکھمن جو بلبل اور پنڈت واسدیو جی کی نظموں کو مرتب کیا تھا۔ اور "گیان پرکاش" سے موسوم کیا تھا۔ اس کتاب کے تعارف کے طور پر سرنامہ پر انہوں نے یہ شعر موزون کر کے لکھے ہیں !

تشنہ لبوں کے واسطے ساگر اسے کہو	گم گشتگانِ راہ کا رہبر اسے کہو
ویدانت کا یہ سار ہے سدھانت سے بھرا	اندھوں کے واسطے نورِ بصر اسے کہو

رینہ نثر بھی اچھی لکھ لیتے تھے۔ "گیان پرکاش" کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ انہوں نے

نمبر میں لکھا ہے جس کا اقتباس حسبِ ذیل ہے:

"ناظرینِ کرام، آج احقر کا دِل بلّیوں اُچھل رہا ہے کہ احقر کو ایک بار پھر اپنی ترمیم شدہ پوستک کے ذریعے، جو گیان، دھیان، یوگ اور سادھن کے طریقوں سے سرتاپا بھرا ہوا ہے، اپنے قومی بھائیوں کے دربار دُربار میں پھر حاضر ہو کر باریابی کا موقع مِلا ہے۔ پوستک کیا ہے وہی پُرانی مئے معرفت سہ آتشہ کر کے بوتلوں میں بند کی گئی ہے۔ جس کے دو چار بوند چکھنے سے وہ ستی مصداق:

مست مئی بیدار گر دو نیم شدی
مست ساقی روزِ محشر بامداد

طاری ہوتی ہے۔ جس کا نشہ دائمی صورت اختیار کر کے طالبِ حق کو مست الست بنا دیتا ہے اور عالمِ خیال میں محو کر کے اس کو دنیا و مافیہا سے بےخبر کرتے ہوئے خوفِ مرگ سے آزادی بخشتا ہے۔"

آگے رقمطراز ہیں:

"اس پوستک میں سودام چرتر، رادھا سوئمر اور شیوہ لگن کے علاوہ سرچشمہ حقیقت سوامی لکھمن جو المتخلص بہ بُلبُل کے پاکیزہ خیالات اور پنڈت واسدیو جی وغیرہ کے ارشادات و کنایات درج کئے گئے ہیں۔"

اسی زمانے کے ایک اور فقیر منش شاعر، پنڈت لچھمن نارائن بھان عاجز تھے، جن کی فکر کا محور زیادہ تر الشور بھگتی رہی۔ اس تعلق سے ان کے کلام میں بھی بہت سے ایسے لفظ آجاتے ہیں، جو عام ادبی زبان سے مانوس نہیں ہیں۔ مثلاً:

پرتھم میں گنیش جی کے دھائن — چرنوں میں انھوں کے سر نواؤں
جاسوں مجھے برہم گیان ہووے — ست کرم میں میرا دھیان ہووے

ان کی مناجات کے کچھ شعر ہیں :-

گنہ بخشو مرے سیتا کی عصمت کے تصدق میں
گنہ بخشو مرے رادھا کی اُلفت کے تصدق ہیں
سراپا جُرم ہوں افعال سے میں اپنے نادم ہوں
مری بخشش ہو عصمت کی محبت کے تصدق ہیں

ایک شعر میں اپنی آزاد فطرت کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے :

نہیں مُنعمانِ دہر کی پروا ذرا ہم کو !
ہمیں عاجز گدائی درِ رگھبیر کافی ہے

محمد الدین فوق نے حسن ڈار کا تذکرہ اپنی تاریخ میں لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا خاندان افغانوں کے عہد میں، ان کے ظلم و استبداد سے بچنے کے لئے ۱۸۱۶ء کے قریب لاہور چلا گیا تھا۔ حسن بغاوت پسند طبیعت کا نوجوان تھا۔ پنجاب میں اس خاندان نے کافی ترقی کی۔ حسن کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک نظم لکھی تھی جس میں کشمیر میں افغانوں کے ظلم و تشدد اور لوگوں کی بے لسبی کا تذکرہ کیا ہے۔ شعر ہیں :

جب کابل کے افغانوں کا اس ملک میں آکر راج ہوا
اس راج کے ظلم و تشدد سے کرتا ہی رہا فریاد حسن
لیکن نہ فغاں افغان نے سُنی اور جورِ عظیم بھی کم نہ ہوا
اس عالم جبر و تعدّی میں آخر کو ہوا برباد حسن

فوق نے لکھا ہے کہ پنجاب جاکر حسن نے محنت مزدوری کی اور کچھ کمایا پھر تعلیم بھی حاصل کی چنانچہ اس کی اولاد میں کئی پڑھے لکھے فرد ہوئے، جن میں سے بعضوں نے اہم عہدے بھی پائے۔ حسن کے ان اشعار سے اس تفصیل کا تھوڑا بہت اندازہ ملتا ہے۔ کہتے ہیں :

آ دیکھ کہ اب کس شان سے ہے وہ اوجِ فلک کی چوٹی پر
رکھی تھی جس تعمیر کی تونے غربت میں بنیاد حسن
کشمیر کی ارضِ پاک میں تیری خاک کے ذرے مہر بنے
پنجاب میں وہ اقبال بڑھا ہے صاحب عدل داد حسن

حسن کا انتقال ۱۸۵۵ء میں ہوا۔

حسن نے کشمیر سے پنجاب جا کر نام و نمود حاصل کیا تھا، تو لاہور کے ایک صاحبِ علم اللہ بخش دردی لاہور سے کشمیر آئے اور دیوان لچھمن داس گورنر سے متوسل رہے۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ گو ان کے معیار اونچے نہیں تھے۔ دردی نے کچھ قصیدے دیوان لچھمن داس کی مدح میں لکھے تھے اور کچھ نظمیں بھی کہی تھیں۔ لیکن ان کا ایک مسدس جو ۱۸۴۴ء میں لالہ تاراچند کے بیٹے دیوان چند کی شادی کے موقع پر کہا گیا تھا، بعض ایسی تفصیلات پر حاوی ہے، جن سے اس زمانے کی تہذیب اور شائستگی پر روشنی پڑتی ہے۔ محفل شادی کے اہتمام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اطلس و کمخواب کا تھا فرش ہر جانب بچھا
شامیانہ سرخ مخمل کا تھا پھر اوس پر تنا
گرد اُس کے موتیوں کی جھالروں کی تھی ضیا
ہر بشر بے ساختہ ہو بول اُٹھتا، مرحبا
جشنِ جمشیدی کی ہے جلوہ نمائی ان دنوں آپ نے دیوان جی محفل سجائی ان دنوں

رقص و سرود کے انتظامات کا حال لکھتے ہیں:

بین باجا بھی دکھاتا تھا عجائب رنگ ڈھنگ
طوطک و طنبور و ڈھولک، طبلہ و طاؤس و چنگ
بانسری و عود و الغوزہ اور چکارا جل ترنگ

محفل اندر پکارے اوس جگہ پر ہو کے دنگ

جشن جمشیدی کی ہے جلوہ نمائی ان دنوں   آپ نے دیوان کی محفل سجائی ان دنوں

محمد الدین فوق نے اپنے بزرگوں ہیں، بابو رحیم بخش شیدا کا تذکرہ تاریخ اقوام مشرق میں کیا ہے۔ جو دیوان لچھمن داس کی جائیداد کے مہتمم تھے۔ شیدا عرصہ تک لاہور میں رہے اور بلوچستان کی ریاست لس بیلہ میں نائب تحصیلدار کے عہدہ پر بھی مامور رہے۔ آخر میں وہ کشمیر میں مقیم ہو گئے تھے۔ شیدا، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے لیکن فوق نے ان کا کلام نقل نہیں کیا ہے:۔

سید محمد انور شاہ، غالباً بیج بہاڑہ کے رہنے والے تھے اور بابا نصیب الدین غازی کی زیارت سے ان کا تعلق تھا۔ وہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ رامپور چلے گئے تھے اور نواب کلب علی خان کی سرکار میں ملازم تھے۔ ان کے اُردو اشعار دستیاب نہیں ہوتے۔ ان کی صاحب زادی زینب بی بی محجوب بھی شعر و سخن سے وابستگی رکھتی تھیں۔ لیکن نعت اور منقبت کہتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے افکار کا ایک مجموعہ "گلبن نعت" کے نام سے ۱۲۹۷ء مطابق ۸۔۱۸۷۷ء میں مرتب کیا تھا۔ وہ نثر بھی لکھ لیتی تھیں۔ "گلبن نعت" پر انہوں نے ایک طویل دیباچہ "منقبت کی گزارش" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں اپنی بیماری کی تفصیل لکھتی ہیں کہ:۔

"یہ عاجز تیراں سال کی عمر سے ایسے مرض میں مبتلا ہے کہ یہاں جس کا ذکر، تکالیف و تشریح تعب نامناسب ہے۔"

یہ بھی لکھا ہے کہ شاعری سے انہیں ابتداء سے دلچسپی تھی۔ لیکن والد شعر کہنے سے منع کرتے رہے۔ کہتی ہیں :۔

"اگرچہ طبیعت پہلے سے غزلیات و اشعار کی مُبدع تھی، لاکن ان کی تشبیہ کرنے سے بباعث امتناع والد ماجد کے مجبور اور رو کی رہی۔"

مذہبی موضوعات پر بلند پایہ کلام سرانجام کرنے کے لئے جس تربیت کی ضرورت ہے۔ اس سے زینب بی بی محروم تھیں۔ تاہم ان کے اندازِ تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم اچھی ہوئی تھی۔ اس مجموعے کی تخلیق کے بارے میں لکھتی ہیں :

"اسی اثناء میں، میں خواب میں دیکھتی ہوں کہ سید الابرار علیہ الصلوٰۃ والسلام معہ دیگر انبیاء نامدار مثل حضرتِ آدم، حضرتِ موسیٰ وحضرتِ عیسیٰ تشریف فرما ہیں۔ جنابِ رسالت مآب صلعم نے ارشاد فرمایا کہ اے محجوب کچھ سُنا۔ ایک نعت رو روکر سُنائی۔ حضرتِ سرورِ کائنات نے محظوظ اور مُنبسط ہوکر مجھے پیار کیا۔ آنکھ کھُل گئی۔ چہرہ آنسوؤں سے اسی طرح تر تھا۔ مجھے جو شوق اور قلق اس وقت عارض ہوا اس کے بیان سے زبان عاجز ہے۔ اسی روز سے نعت گوئی کا شوق دامنگیر ہوا۔ یہاں تک کہ پندرہ روز میں یہ کتاب "گلبن نعت" مرتب کی۔

اس طرح یہ مجموعہ جو محجوب کی عقیدتمندی کی یادگار ہے، مرتب ہوا جس کے بارے میں خود وہ کہتی ہیں :

"محبت اور سوز و گداز اور حال کچھ اور چیز ہے اور سخن گوئی و سخن فہمی و قال کچھ اور چیز۔"

ان کی ایک نعت کے کچھ شعر ہیں :۔

"عیاں واللیل سے ہے وصف گیسوئے معنبر کا
سراسر والضحیٰ تعریف رخسار مُنوّر ہے
ترا وصفِ مُقدّس ہے الم نشرح لک صدرک
تری مدح و ثناء میں سورۂ والنجم وکوثر ہے
ہوا ہے شوق بیماری میں تری نعت گوئی کا

تعالی اللہ کہ سیدھا آجکل میرا مقدّر ہے

ایک اور نعت کے چند شعر ہیں :-

یا رسولِ عربی شاہسوارِ مدنی	دیکھ لے آکے مری خستگی و دل شکنی
دیکھ کر گوہرِ لعل و لب و دندانِ نبیؐ	ہیں خجل گوہر و یاقوت و عقیق یمنی
جوششِ عشق سے مجذوب خیال آتا ہے	اب مدینہ کو چلوں ڈال گلے میں کفنی

نعت کے علاوہ حضرتِ عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں بھی کچھ نظمیں کہی ہیں، "گلبن نعت" کا مخطوطہ جموں و کشمیر محکمہ آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ بابا عبدالرحمان متوطن نیچ بہاڑہ نے ۱۲۹۸ھ میں لکھا ہے، بابا عبدالرحمن حضرتِ بابا نصیب الدین غازی کی درگاہ کے متولی تھے۔

محمد انور شاہ نے، اس مجموعے کے لئے دو قطعے فارسی میں لکھے ہیں اور ایک قطعہ اردو میں لکھا ہوا سرور کا ہے۔ انور شاہ کے قطعے کے کچھ شعر ہیں :-

نیک طینت، زندہ دل، مجذوب پاکیزہ کلام
زد رقم ایں نسخہ در نعتِ حبیب کبریاؐ
عندلیبِ طبع انور از پے تاریخ سال
گفت دلکش گلبن نعتِ محمد مصطفےٰؐ

سرور کے قطعے کے شعر ہیں :-

گلبن نعتِ نبی مجذوب سے	کرلیا جب حضرتِ حق نے قبول
مصرعۂ تاریخ سرور نے کہا	مرحبا صلِ علیٰ، نعتِ رسولؐ

ایک نعت جو بطور مناجات کے کہی ہے۔ اس میں نواب کلب علی خان کی توصیف کی ہے اور اپنے والد کی سخن پردازی کا نواب کلب علی خاں کی مدح میں یہ شعر کہے ہیں :-

جنابِ کلب علی خاں محیطِ بخشش و داد

ہو سر پر اس کے سدا سایہ شہ بغداد
کہ ہیں وہ والی و ممدوح میرے والد کے
کہ جس کے فیضِ کرم سے ہے اک جہاں آباد
وہی ہیں مالک ملکِ فراستِ و شوکت !
اسی کا چاکر ادنیٰ ہے . بو نواس و قباد
فلک سریر، و ملک خو، بلند مرتبہ ہے
مطیع شرعِ محمد رئیس نیک نہاد
جہاں کے جتنے ہیں مشہور و نامور شعراء
اسی کے شعر و سخن پر کیا ہے سب نے صاد

اپنے والد کے لئے دعا کرتی ہیں :-

ہمیشہ عزت دنیا ہو میرے والد کو | کہ ہیں وہ فنِ سخن میں یگانہ و استاد
انہیں کے فیضِ سخن سے ہوئی ہوں میں ممتاز | اونھوں نے شعر و سخن کا دیا مجھے ارشاد

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد انور شاہ شعر و سخن میں ایک پایہ رکھتے تھے اور مجبوب نے جس سیاق میں ان کی شاعری کا تذکرہ کیا ہے اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ نواب کلب علی خاں کی دربار سے شعراء کے زمرہ میں منسلک تھے۔

رسول میر، کشمیری کے سربرآوردہ غزل سرا، جن کا تذکرہ، کشمیری کے حصے میں گذر چکا ہے، سری نگر اور اس کے شعر و سخن سے دور، قصبۂ ڈورو، شاہ آباد میں مقیم رہے اور ۱۸۶۷ء سے قبل وفات پائی[1]۔ عشق و محبت کے اس نغمہ سنج نے کشمیری کو مالا مال کیا، لیکن کچھ

لہ: یہ امر، تازہ تحقیق کی رُو سے غلط ثابت ہوگیا ہے۔ اب اس بات کی معتبر شہادت ملی ہے کہ وہ ۱۸۷۶ء کے بعد بھی زندہ تھے۔ (ط)۔

تبرکات ان کے اُردو میں بھی ملتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اُردو شاعری کی روایات سے واقف تھے، اور کچھ مصرعے کشمیری میں شعر کہتے ہوئے ان کے قلم سے بے ساختہ نکل پڑتے تھے۔ ایک عظیم شاعر کی باقیات ہونے کے اعتبار سے یہ قابل قدر ہیں۔ فرمایا ہے:۔

جب آیا تونے گھبرایا ہمارے مَن اَلا جانو[ل]
دیا دِل تو پرائے ساتھ رُلائے تَن اَلا جانو

پیر غلام حسن کھویہامی کی مشہور فارسی تاریخ کشمیر موسوم بہ "تاریخ حسن" کا ترجمہ پنڈت مادھوجان کشمیری نے اُردو میں کیا تھا۔ لیکن یہ مکمل تاریخ کا ترجمہ نہیں، بلکہ دوسری جلد کا ترجمہ ہے اور وہ بھی مکمل نہیں ہے۔ "تاریخ حسن" چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد کشمیر کے جغرافیائی حالات اور مشہور مقامات کے بارے میں ہے۔ دوسری جلد سیاسی تاریخ ہے، تیسری جلد اولیائے کرام کشمیر اور چوتھی جلد شعرائے کشمیر کے بارے میں ہے۔ تیسری جلد" اولیائے کشمیر" کا اُردو ترجمہ مولوی محمد ابراہیم نے کیا تھا جسے نور محمد تاجر کتب، سری نگر نے شایع کیا ہے۔ مادھوجان نے اپنے ترجمہ کو" تواریخ حسن" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس ترجمہ کا صرف ایک مخطوطہ سری پرتاپ پبلک لائبریری، سری نگر میں محفوظ ہے۔ اس کے مخطوطے میں ترجمہ یا کتابت کا سنہ درج نہیں ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ خود مُصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

ترجمہ سلیس اور سادہ زبان میں ہے، لیکن جملوں کی ساخت پر جگہ جگہ فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ راجہ سوسل کے حالات سے ایک اقتباس اس ترجمہ کا ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ل :۔ اس قسم کے ریختے رسول میر سے پہلے بھی کشمیری زبان میں ملتے ہیں (ت ل)

"راجہ سوسل دوسری دفعہ ۱۱۸۸ بکرمی (۱۱۳۲ء) میں پادشاہی تاج سر پر رکھ کر تخت پر بیٹھا اور بکھاچر نے پہاڑی راجوں سے امداد حاصل کر کے بیچ بہاڑہ میں دشمنی کا جھنڈا بلند کیا۔ اس طرف سے سوسل نے لشکر نکالا، لڑائی میں ہل گئے۔ سوسل کی فوج سے بہت سے مارے گئے۔ بکھاچر نے چکدر کی عمارتوں میں آگ دے کر، بہت سا مال واسباب انسان اور چار پایہ ضائع کئے۔ . . . ."

رنبیر سنگھ اور ان کے جانشین پرتاپ سنگھ کی ہندو مذہب کی خدمت کا جوش اور ولولہ ان کے ہندو وزیروں اور امراء میں بھی نمایاں تھا۔ وزیروں میں دیوان کرپارام کی مساعی کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ رنبیر سنگھ کے آخری زمانے کے ایک وزیر "سردار دیوی سہائے" بھی اس سلسلے میں بہت نمایاں ہیں۔ لیکن ان کا کام کرپارام کے مقابلے میں زیادہ علمی اور دیرپا اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ایک اہم تصنیف "ہندو کلاسیکل ڈکشنری" کے نام سے لکھی ہے، جو ۱۸۸۰ء میں مکمل ہوئی۔ اور ۱۸۹۴ء میں مطبع خادم التعلیم لاہور سے چھپی۔ کتاب کے سرنامہ پر اس کے موضوع اور اس کے احاطے کی تفصیل لکھی گئی ہے۔

"دیوتوں اور اوتاروں کے ویدک اور پورانک حالات اور راکشوں رشیوں، راجاؤں اور مصنفوں کے پورانک سوانحات عمری ـــــ"

مصنف نے کتاب کی تصنیف اور اس کی ضرورت کی تصریح کرتے ہوئے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

"مقصد اعظم اس تصنیف کا یہ ہے کہ عام اشخاص اہل ہنود کو اپنے قدیمی دیوتوں، رشیوں، مصنفوں اور راجاؤں کے حالات سے بخوبی آگاہی ہو۔"

"اگرچہ یورپ میں اس قسم کی تصنیفات کا بہت رواج ہے، اِلا سنسکرت، ہندی یا کہ اُردو میں ایسی تصنیف دیکھی نہیں گئی۔"

"یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہندوؤں کی قدیم تاریخ مکمل اور مسلسل نہیں مِل سکتی۔" . . . .

. . . . اگرچہ اس باب میں بہت سعی اور جد وجہد کی گئی کہ مُصنّفوں کے پورے حالات لکھے جاویں اور کتاب ہذا کو زیادہ دلچسپ بنایا جاوے۔ مگر یہ مراد پوری نہ ہوسکی . . . . . کیونکہ مُصنّفوں کی کوئی تاریخی کتاب نظر سے نہیں گذری۔ علماء سلف کو شوق وقایع نویسی رہا تو راجاؤں، رشیوں وغیرہ کے حالات لکھنے کا شوق رہا، کسی کی طبیعت اس طرف مایل اور راغب نہیں ہوئی کہ ان عالموں اور مُصنّفوں کے حالات بھی بطور سوانح عمری ہا تحریر کئے جاویں۔

سنسکرت ناموں کے صحیح تلفظ کے مقصد سے مصنف نے الفاظ کی نقل یا خط بدلی (TRANSLITERATION) کی تجویز بھی "قواعد" کے عنوان کے ماتحت ابتداء میں دے دی ہے۔ یہ تجویز اس اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے کہ یہ اس نوع کی ابتدائی کوششوں میں سے ہے سنسکرت کے حروف (اصوات) کے لئے اُردو حروف عام طور پر آسانی سے تجویز کئے جا سکتے ہیں لیکن سنسکرت کی مخصوص اصوات جیسے حلقی نؚ (ङ) کوزی یا معکوسی رفقی نُ (ण) اور صغیری شُ (ष) اور انفی (क्ष) کے لئے مصنف نے جو علامتیں تجویز کی ہیں، وہ جاذبِ توجہ ہیں:-

ङ = نُ ۔ ण = ݨ ۔ ष = شِ اور क्ष = کھ۔

اس میں ष کے تلفظ کے لئے اُردو کی جو علامت دی ہے، وہ रव کے مقابل کی ہے۔ لیکن مصنف کی تجویز کی ہوئی علامت۔ اس حرف کے تلفظ کے اختلاف کو ظاہر کرتی ہے۔ چنانچہ پراکرتوں میں یہ صوت باضابطہ طور پر "کھ" کی طرح ملفوظ ہوتی تھی۔ جیسے رشی = رکھی، اسی طرح (کش) بھی "کھ" کی طرح ملفوظ ہوتی تھی جیسے "کشیر" = "کھیر" وغیرہ۔ مصنف نے اپنی تجویز کے سلسلے میں کچھ تصریحات بھی درج کر دی ہیں۔

کتاب اس اعتبار سے معلومات آفریں ہے اور اس سے اُردو میں ہندو مذہب پر تصانیف میں ایک شائستہ اضافہ ہوا۔ اس سے نہ صرف ہنود بلکہ عام علماء بھی یکساں طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

سیف الدین پنڈت نے ایک "تاریخ" جدول معصومی مشہور بہ موجز التواریخ" کے نام سے لکھی تھی۔ جو خادم پنجاب پریس لاہور سے شائع ہوئی تھی۔

ریسرچ لائبریری سری نگر میں ایک رسالہ ۱۲۸۸ھ (م ۱۸۷۲ء) کا مرتبہ محفوظ ہے، جو "پنج باب حنفیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اصل رسالہ فارسی میں لکھا گیا ہے، لیکن اس کے آخر میں ایک قطعہ تاریخ اُردو میں درج ہے، اس سے مصنف اور سنہ تصنیف کا پتہ چلتا ہے۔ یہ رسالہ حافظ سعد اللہ کا مصنفہ ہے اور اس کی تکمیل پر ان کے کسی دوست نے اُردو میں یہ قطعہ تاریخ کہا تھا۔ قطعہ یہ درج ہے:-

"پنج باب" حافظ سعد اللہ کی   نام نظم اور نام ناظم دیکھ
یوں ہوئی تاریخ خوش دلخواہ دیکھ   پنج باب حافظ سعد اللہ دیکھ

ریاست میں پریس کے قیام اور اخبار کے اجراء کی اجازت ڈوگرا حکمرانوں کی مطلق العنانی جاری رہنے تک نہ مل سکی تھی۔ حالانکہ ہندوستان میں اخبار شائع ہوتے تھے۔ اہلِ ریاست میں بھی اخبار پڑھنے کا مذاق ترقی کر چکا تھا اور خود ریاست میں اخبار نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر پنجاب اور لاہور سے شائع ہونے والے اُردو اخبار ریاست میں

منگوائے جاتے تھے۔ خود ریاست کے بعض اصحاب نے اخبار جاری کرنے کی اجازت کیلئے مہاراجہ رنبیر سنگھ اور ان کے بعد ان کے جانشین، پرتاپ سنگھ کے دربار میں درخواست پیش کی لیکن نامنظور ہوئی۔ یہ حکمران اخبار کو اپنے اقتدار میں مزاحم بلکہ اخبار جاری کرنے کے خیال کو اپنے اقتدار کے خلاف بغاوت کے مترادف سمجھتے تھے لیکن جب مسلسل مطالبہ ہوتا رہا تو خود مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ۱۸۵۸ء میں ایک پریس قائم کیا۔ یہ پریس جو ودیا بلاس پریس کے نام سے موسوم تھا، پہلے پہل ان کے دارالترجمہ کی کتابوں کو چھاپنے کے مقصد سے قایم کیا گیا تھا۔ اس کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لئے پانی پت سے مولوی قلندر علی خان کو طلب کیا گیا تھا۔

مولوی قلندر علی خان نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کی خدمت میں پیش کرنے کے مقصد سے منطق اور کچھ علوم کے مباحث پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی تھی، جو "ہدیہ مہاراج" کے نام سے موسوم تھی۔ پنڈت دیا کرشن گردش اپنے مضمون "ریاست جموں و کشمیر میں فن تحریر و طباعت" میں اس مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب رنبیر سنگھ کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکی، بلکہ ۱۹۲۹ء بکرمی میں مطبع ودیا بلاس کے افسر اعلیٰ میر نثار کے اہتمام سے طبع ہوئی۔ یہاں سنہ میں کچھ تسامح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کا انتقال ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ اور ۱۹۲۹ء بکرمی کے مطابق ۱۸۷۳ء ہوتا ہے۔ گردش نے "ہدیہ مہاراج" کے بارے میں مزید معلومات یہ فراہم کی ہیں کہ یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۴۲۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ زبان کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے فارسی اور عربی میں کامل مہارت کی ضرورت تھی۔

ودیا بلاس پریس سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی "ودیا بلاس" نام سے جموں سے شایع ہونے لگا تھا۔ اور یہ سرکاری اخبار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اخبار کی نوعیت کی یہ پہلی چیز تھی جو ریاست سے شایع ہونے لگی تھی۔ پہلا اخبار ۱۸۶۶ء میں شایع

ہوا۔ اس کے پہلے مدیر پنڈت گوپی ناتھ گرٹو تھے۔ یہ اُردو اور ناگری دونوں رسمِ خط میں نکلتا تھا۔ اس کے نامہ نگار ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں سے خبریں بھیجتے تھے۔ اس اخبار کے مقصد اور طریقۂ کار کے بارے میں ذیل کا اقتباس قابلِ مطالعہ ہے :

"صداقتِ اساس اخبار بدیا بلاس ہفتہ وار شنبہ کو نصف اُردو، نصف ناگری بنظرِ فائدہ عام بہ اہتمام تمام طبع ہو کر اس مطبع سے شایع کیا جاتا ہے اور دوسرے بروز بخدمات فیض آیات ناظرین والاتمکین بھیج دیا جاتا ہے۔ عبارت اس کی زوائد سے مُبرا ہے اور حشو سے مُعرّا۔ اخبار صحیح غلط نہیں، صفحات خوش خط بدخط نہیں، جو خبر ہے کارسپانڈنٹان صدق مقال کی زبانی ہے یا خلاصہ اخبارات انگریزی و ہندوستانی ہے۔ باایں ہمہ بنظرِ خریداری قیمت مختصر ہے۔ . . . . "

شمارہ ۱۵۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء (جلد ۴، شمارہ ۴۸) کی ایک خبر اور سُرخی ذیل میں درج ہے :-

"شایقین حج بیت اللہ و زایرین مدینہ منوّرہ کو ظاہر ہو کہ سر بارٹل فریزر نام کا آگبوٹ جو مضبوطی اور تیز رفتاری اور صفائی وغیرہ میں بہت مشہور ہے ماہ شعبان کی پانچویں تاریخ تک حاجیوں کو لے کر بندرگاہ جدہ روانہ ہوگا۔ حاجی محمد صدیق بن صاحب نے اس کا ٹھیکہ کر لیا ہے۔ جن صاحبوں کو واسطے حج کے جانا منظور ہو تو اول اپنے خطوط معہ چہارم قیمت کرایہ بمعینہ تفصیل ذیل کے موافق بمبئی کے محلہ ناگپاڑہ قدیم مولوی نظام الدین صاحب کے مکان پر حاجی محمد صدیق کے پاس روانہ کریں۔"

یہی خبر ناگری میں بھی چھپی ہے

اخبار میں کچھ دلچسپی کی خبریں بھی شامل ہوتی تھیں۔ مثلاً اسی اخبار میں "خدا کی قدرت" کے عنوان سے ایک خبر شایع ہوئی ہے۔ جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:۔

"نامہ نگار نیر اکبر بدایوں سے تحریر فرماتے ہیں کہ ایک غریب آدمی کی عورت حاملہ تھی اور اس کے رہنے کا مکان پرانا اور بوسیدہ تھا۔ کثرت بارش سے ٹپکنے لگا۔ اس کے خاوند نے چھت پر مٹی وغیرہ ڈال کر درست کیا، لیکن اوسی حالت میں بارش کا یہ زور ہوا کہ مکان کی ایک دیوار گر گئی اور اسی حالت میں عورت کے بچہ پیدا ہوا۔۔۔۔ کیا شانِ الٰہی دیکھئے کہ وہ بچہ اور اس کی ماں بچ گئی۔۔۔۔"

اسی شمارہ میں امیرِ کابل کے نام روس کے ایک مراسلہ کا تذکرہ کیا گیا ہے اور جموں کی ایک خبر یہ شائع ہوئی ہے کہ مہاراجہ کے سری نگر سے جموں آنے کی خبر گرم ہے اور انتظامات ہو رہے ہیں۔ ایک خبر سری دیوی جی کی جاترہ کے لئے مختلف مقامات سے لوگوں کے جموں میں آنے کے بارے میں ہے۔

لیکن مہاراجہ اور ان کے دربار کی اس کوشش کے باوجود ایک عوامی اخبار جاری کرنے والا اور پڑھے لکھے عوام میں ایسے اخبار پڑھنے کی جو خواہش پیدا ہو گئی تھی اس کی تسکین اس سرکاری اخبار سے نہیں ہو سکی۔ چنانچہ کئی ایسے اصحاب جو ریاست کے ملحقہ صوبے، پنجاب کے شہروں اور لاہور میں عوامی زندگی اور اخباروں کی چہل پہل دیکھ چکے تھے، ریاست میں پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کے لئے کوشاں رہے اور جب مہاراجہ کے دربار سے ان کی درخواست مسترد کر دی گئی تو ایسا بھی ہوا کہ کچھ اصحاب ریاست سے ملحقہ شہروں، جیسے سیالکوٹ جالندھر یا لاہور جا کر اخبار نکالنے لگے تھے۔ ان میں سے اکثر اخبار خود ریاست میں مرتب ہونے اور چھپائی اشاعت کے لئے باہر بھیج دیئے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں

پنڈت ہر گوپال کول خستہ اور ان کے بھائی پنڈت سالگرام سالک کی کوششوں کی طرف ان کے حالات میں اشارہ کیا گیا ہے انہوں نے مہاراجہ رنبیر سنگھ سے پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کی اجازت مانگی تھی، جب ان کی درخواست مسترد ہو گئی تو انہوں نے لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں سے بھی اخبار وقتاً فوقتاً جاری کئے، ان کے علاوہ بھی لاہور میں کئی اور کشمیری پنڈت بھی تھے جنہوں نے ایک سبھا سی قائم کر لی تھی اور اپنے طبقے کی فلاح و بہبودی کے لئے اخبار اور رسالے بھی جاری کرتے رہے۔

پنڈت گوپی ناتھ گرٹو جن کا ذکر "بدریا بلاس" کی ادارت کے سلسلے میں کیا گیا ہے اس اخبار کے بند ہو جانے کے بعد وہ لاہور چلے گئے تھے جہاں سے وہ اور ان کے فرزند پنڈت بال کشن گرٹو "اخبار عام" نکالتے رہے۔ یہ پہلے ہفتہ وار تھا، لیکن بعد میں ۱۸۸۱ء سے اسے روزانہ کر دیا گیا تھا۔ یہ اخبار ۱۹۳۸ء تک جاری رہا۔

ایک اور اخبار "مراسلہ کشمیر" کے نام سے ۱۸۸۰ء سے نکالا جانے لگا تھا۔ اور یہ بھی کشمیری پنڈتوں کا اخبار تھا، جو لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ پنڈت ہر گوپال خستہ نے ۱۸۸۲ء میں "خیر خواہ کشمیر" ہفتہ وار جاری کیا تھا۔ اس زمانے میں وہ اور ان کے بھائی پنڈت سالگرام سالک دونوں مہاراجہ کے معتوب تھے اور ان کی سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کی وجہ سے ریاست سے نکال دیئے گئے تھے۔ اس اخبار کو وہ مہاراجہ اور ان کے دربار پر تنقید کرنے کے لئے استعمال کرتے رہے۔ یہ اخبار ایک سال سے زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ پنڈت خستہ نے ایک اور ہفتہ وار "راوی بینظیر" بھی لاہور سے کچھ عرصہ کے لئے نکالا۔ اس کے علاوہ ایک اور اخبار "پبلک نیوز" کے نام سے بھی وہ نکالتے رہے۔ لاہور سے نکلنے والا اخباروں میں ایک اور اخبار "رفیق ہندوستان" بھی تھا جو ۱۸۸۰ء میں جاری کیا گیا تھا اور کشمیر کے معاملات کے بارے میں لکھتا تھا۔

۱۹۸۵ اب میں کشمیری پنڈتوں کی تقلید میں مسلمانوں کو بھی اخبار جاری کرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن سب سے پہلا اخبار جو ایک مسلمان بابو غلام محمد کی ادارت میں ۸۶-۸۵ ۱۸ء میں شائع کیا گیا۔ وہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور ان کے ہمدردوں کا جاری کیا ہوا اخبار تھا۔ چنانچہ اس میں انگریزی حکومت کے، ان کے خلاف اقدام کے بارے میں سخت تنقیدی مضامین چھپتے تھے۔ ریاست میں جو کونسل قائم کی گئی تھی، اس کے خلاف بھی اس میں مضامین چھپتے رہے۔ ۱۸۸۷ء تک یہ اخبار جاری رہا۔

کشمیر سے باہر

علم وفن، تجارت یا مذہبی عقیدتمندی کے عروج کے زمانے میں، قوموں میں اکثر ابھار کا ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے، جس کے بل بوتے پر وہ اپنی قومی یا جغرافیائی سرحدوں کو عبور کرکے، دور دراز ملکوں میں پھیلنے کی طرف مائل ہوجاتی ہیں۔ بودھ مبلّغ، مذہبی تبلیغ کے جوش میں، جسے وہ بنی نوع انسان کی بھلائی اور نجات کا ذریعہ جانتے تھے، ہندوستان سے نکل کر اطراف کے دور دراز ملکوں تک پہنچ گئے۔ مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں تجارت کے جذبے نے یورپی قوموں کو ناپیدا کنار سمندروں کو پار کرکے، مشرقی ملکوں میں پہنچ جانے کا حوصلہ عطا کیا۔ اپنی تجارت کے عروج کے زمانے میں کشمیری تاجر ایک طرف وسط ایشیا کے ملکوں کو جاتے تھے دوسری وہ ہندوستان کے مختلف شہروں پہنچتے اور سمندروں کو عبور کرکے پڑوس کے ملکوں کو بھی جاتے تھے۔ کشمیری تاجروں کے انڈونیشیا اور جاوا پہنچنے اور وہاں کے حالات پر تحریری دستاویزیں چھوڑ جانے کی مثالیں انہی صفحات میں کہیں ملیں گی۔

ایک اور سبب جو کسی ملک کے جوہر قابل کے جلاوطنی اختیار کرنے کا،

اپنے ملک میں، مذہبی یا کسی اور طرح کی ناروا داری یا استبداد بھی ہوتا ہے کشمیر کی صورت میں یہاں کی سرد آب و ہوا بھی صاحبِ ثروت لوگوں کو موسم سرما میں اطراف کے ملحقہ علاقوں میں چلے جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں کی جلد جلد بدلنے والی سیاست بھی خاندانوں کو وقتاً فوقتاً باہر جانے یا ہجرت کر جانے پر مجبور کرتی رہی۔ لاہور اور اس سے زیادہ امرتسر اور سیالکوٹ قریب ہیں، چنانچہ ان دونوں شہروں میں اہلِ کشمیر کی نو آبادیاں سی بن گئی تھیں۔ سیالکوٹ قدیم کشمیری راجاؤں کے زیرِ نگین بھی رہ چکا تھا۔ ان راجاؤں کی آخری کمزور حکومت کے زمانے میں، بہت سے چھوٹے چھوٹے راجہ، اپنے علاقے میں مستحکم قلعے یا کوٹ بنوا کر، خود مختار ہو گئے تھے۔ اور یہ دور کشمیر کی تاریخ میں کوٹہ راج یا قلعہ یا قلعہ والوں کی حکومت سے موسوم ہے۔ اندرکوٹ، لوہر کوٹ اور کئی کوٹ اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ انہی میں سیالکوٹ بھی شامل تھا۔ اس الحاقی نوعیت کے شواہد حال کے زمانے تک بھی ملتے ہیں۔ کشمیر کے اکثر اہلِ ثروت کی سیالکوٹ اور امرتسر میں کوٹھیاں اور جائیدادیں موجود ہیں۔ کشمیر کا ریذیڈنٹ، سرما میں جموں کی بجائے سیالکوٹ کو اپنا مستقر بناتا تھا۔ تو دراصل اسی تعلق کے مدِنظر چکوں کے عہد کی مذہبی ناروا داری کے زمانے میں کئی علماء جن میں مُلا کمال الدین اور مُلا جمال الدین شامل ہیں۔ سیالکوٹ ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ یہ دونوں عالم اپنے عہد کے سارے اسلامی دنیا کے علماء میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ سیالکوٹ میں ان کے درس مدرسہ مسجد میاں وارث میں ہوتے اور اطراف و اکناف کے تشنگانِ علم ان سے استفادہ کرتے تھے۔ انہیں میں تین سر برآوردہ علماء، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، مولانا شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی اور نواب سعداللہ خان علامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ملا عبدالحکیم منطق، فلسفہ، فقہ، حدیث، اور تفسیر میں اپنا عدیل نہیں رکھتے تھے۔ نواب سعداللہ خان دہلی میں شاہجہان کے وزیرِ اعظم ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ

علوم اور خاص طور پر ریاضی میں انہیں محققانہ مہارت حاصل تھی۔

یہی سیالکوٹ علامہ اقبال کا بھی مولد تھا۔ اُردو کے کچھ اور قابلِ ذکر شاعر اور ادیب بھی یہیں سے اُٹھے تھے۔

سیالکوٹ سے ہٹ کر ہندوستان کے اور شہروں جیسے دہلی، لکھنو وغیرہ میں جو کشمیری خاندان آباد ہوگئے تھے۔ ان میں بھی وقتاً فوقتاً سر برآوردہ ادیب اور شاعر اُٹھتے رہے۔ اس دور میں سب سے پہلا نام انشاء اللہ خان انشاء کا آتا ہے جن کے بارے میں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کشمیری خوب جانتے تھے اور اس زبان میں شعر بھی کہتے تھے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا بیان ہے کہ وہ:

"ترکی، پشتو، پوربی، پنجابی، مارواڑی، مرہٹی، کشمیری اور ہندی بھی خوب جانتے تھے۔ اور ان سب میں شعر کہہ سکتے تھے۔"

انشاء کی ذہانت اور طباعی کا اندازہ کرتے ہوئے ان کے ہندوستان کے کئی زبانوں کو جاننے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں لیکن کشمیری زبان میں شعر کہنے کی صلاحیت ان میں اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی تھی جب تک کشمیر اور اہلِ کشمیر سے ان کا گہرا ربط نہ رہا ہو۔

انشا کے کچھ بعد، پنڈت دیا شنکر نسیم ہیں، جنہوں نے اُردو کی بڑی شائستہ خدمت انجام دی اور اس پر اپنی فکر اور فن کے گہرے اثرات چھوڑے۔ پنڈت نسیم خاص طور پر اُردو مثنوی میں ایک بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ میر حسن کی "سحر البیان" کلاسیکی اور مثنوی نگاری کے عروج کا انتہائی نقطہ مان لی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ نسیم کی "گلزارِ نسیم" بھی اپنے مخصوص اسلوب کے عروجِ کمال کی یادگار ہے۔ اظہار میں ایجاز کے اس حسن کے ساتھ، اُردو میں کوئی دوسری مثنوی بلکہ کوئی اور دوسرا شعری کارنامہ پیدا نہ ہوسکا۔ کلاسیکی اُردو ادب میں یہ دراصل کشمیری ذہانت کا ایک شاہکار ہے۔

نسیم کا خاندان لکھنؤ میں بس گیا تھا، جہاں ان کی ولادت ۱۸۱۱ء میں ہوئی تھی استادِ عہد خواجہ حیدر علی آتش کے وہ شاگرد تھے اور آتش کا اُردو غزل کے ارتقاء میں بڑا نمایاں حصہ ہے لیکن جہاں تک ایک منظم تجویز کے ماتحت ایک مکمل کارنامہ کی پیش کش کا تعلق ہے، ان کا قلم بھی "گلزارِ نسیم" کے انداز کا کوئی کارنامہ پیش نہ کر سکا۔

نسیم کا انتقال بہت کم عمری ہی میں ہو گیا لیکن اپنی جواں سالی کی یادگار وہ ایک ایسا ہمیشہ بہار کارنامہ چھوڑ گئے، جو اُردو شاعری کے شہ کاروں میں اپنا مقام رکھنے گا۔ نسیم کا انتقال ۱۸۴۲ء میں ہوا۔

ہندوستان پر انگریزی سامراج کے تسلط کے ابتدائی دورِ ابتلاء میں چوٹی کا مقام رکھنے والے سخن سنج، حکیم مومن خاں مومنؔ، کشمیری نژاد تھے۔ مومن حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے اور وہ حکیم نامدار خاں کے بیٹے، جو شرفائے کشمیر سے تھے، مغلوں کی حکومت کے آخری دور میں کشمیر سے دہلی آکر، شاہی طبیبوں کے زمرہ میں داخل ہو گئے تھے۔ نارنول میں انہیں جاگیر بھی عطا ہوئی تھی، جسے انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی داروگیر میں اپنے قبضے میں لے لیا اور اس کے عوض میں خاندانی وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ مومن ۱۸۰۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ شاہ عبدالعزیز سے ان کے خاندان کے عقیدتمندی کے تعلقات تھے۔ چنانچہ انہیں سے مومن نے عربی پڑھی۔ مولانا اسمٰعیل شہید ان کے ہم سبق رہے۔ مومن کی ذہانت اور طباعی کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ شاہ صاحب کی تقریر ایک بار سُن کر لفظ بہ لفظ حفظ رکھتے تھے۔ نجوم بھی سیکھا تھا اور طب جوان کا خاندانی علم تھا۔ اس میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کی وضعداری ضرب المثل ہے۔ ۱۸۴۲ء میں ٹامسن نے دہلی کالج کے فارسی کی پروفیسری کے لئے غالب کو طلب کیا اور وہ اپنی وضعداری کو قائم رکھنے کے لئے اس سے بغیر ملے لوٹ گئے۔ تو یہ عہدہ حکیم مومن خاں کو پیش کیا گیا اور اسی روپیہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ مومن نے بھی یہ تنخواہ قبول نہیں کی۔ مہاراجہ کپور تھلہ کی طلبی پر ان کے دربار میں

جانا اپنی آزاد وضعی کے خلاف سمجھا۔ دہلی میں ہی رہے اور اپنے فن میں مگن۔ ۱۸۶۸ء میں کوٹھے سے گر کر وفات پائی۔

مومن سید احمد شہید کے معتقد اور انگریزوں کے خلاف ان کی تحریک حریت کے ہمنوا تھے۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ اس کے شواہد ملتے ہیں۔ غزل کے وہ چوٹی کے اساتذہ میں سے ہیں۔ گو مختصر مثنوی میں بھی ان کا مقام اونچا ہے۔ غزل کے اظہاری سانچوں میں فنی گنجلک پیدا کرنے کے اس رجحان کو جو ناسخ نے شروع کیا تھا۔ مومن نے بہت سدھارا، بہت سنوارا اور نتیجتاً اس دبستان کے امام کا رُتبہ حاصل کر لیا۔ شاعر شہد اور شاعر ہر عہد غالب کے زندگی بھر مدِ مقابل رہے اور اپنے زمانے میں مقبولیت کے لحاظ سے ان سے برتر بھی سمجھے جاتے تھے۔

خود غالب کے بارے میں والدہ کی جانب سے' ان کے کشمیر سے رشتہ کا نظریہ جسے پہلے پہل میرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے خاندانی بزرگوں کی روایت کی سند پر سجایا تھا، غالب صدی کے سال ۱۹۶۹ء میں کچھ اور ضمنی تائیدی شہادتوں کے ساتھ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اپنی "غالب اور آہنگ غالب" میں لبعض اور نقادوں نے اپنے مضامین میں' جن میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے ترجمان "ادبیات" کے غالب نمبر (۱۹۶۹ء) کا ایک مضمون "غالب اور کشمیر" بھی قابلِ ذکر ہے' یہ نظریہ پھر ابھرا ہے ــــ تائیدی شہادتوں میں سے ایک غالب کے نانا، خواجہ غلام حسین کمیدان کے نام کے ساتھ "خواجہ" کا احترامی سابقہ، جو کشمیر میں معززین کے نام کے ساتھ علی العموم لگا ہوتا ہے اور آگرہ میں اس خاندان کا کشمیریوں کے کڑہ میں قیام بھی ہے۔

غالب کے مخلص دوستوں میں مفتی صدر الدین خان آزردہ کا خاندان بھی کشمیری تھا۔ آزردہ اپنے زمانے کے سر برآوردہ علماء میں سے تھے۔ ان کی ولادت دہلی میں ۱۷۸۹ء میں ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور

مولوی فضل امام جو مولانا فضل حق خیر آبادی کے والد تھے سے تعلیم حاصل کی تھی، اور اپنے عہد میں صاحب مسند ہوئے۔ جیسا کہ مالک رام نے لکھا ہے:

"ہندوستان نے اس جامعیت کے بہت کم شخص پیدا کئے ہیں۔ شاہی میں بھی مسندِ افتا پر فائز تھے۔ انگریزی عہد میں بھی صدر الصدور رہے۔ ساری عمر درس و تدریس میں گذاری اور شاہ جہانی مدرسہ دار البقاء کو پھر سے زندہ کیا۔ طالب علموں کے اخراجات کے خود کفیل ہوتے تھے۔"

مولانا کے شاگردوں میں سر سید احمد خان، مولانا خیر الدین (والد مولانا ابوالکلام آزاد) نواب صدیق حسن خان اور مولوی فیض الحسن خان قابلِ ذکر ہیں۔ شعر و سخن کا عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ پہلے شاہ نصیر کو کلام دکھایا کرتے تھے، پھر بجرم اکبر آبادی سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مجموعہ کلام ۱۸۵۷ء کی دار و گیر میں تباہ ہو گیا۔ شعرا کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ آزردہ کا انتقال ۱۸۶۸ء میں ہوا۔

غالبؔ کے کشمیری الاصل شاگردوں میں، خواجہ عبد الغفار جو وفا اور اختر دونوں تخلص کرتے تھے۔ نواب سید محمد ذکریا خاں زکی، خواجہ فیض الدین عرب حیدر جان شائق قابلِ ذکر ہیں۔ خواجہ عبد الغفار کے جدِ اعلیٰ خواجہ حفیظ اللہ شال اور پشمینہ کی تجارت کرتے تھے۔ تجارت کے سلسلے میں وہ ڈھاکہ گئے، اور وہیں رہ گئے۔ خواجہ عبد الغفار اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ریختی میں بھی شعر کہتے تھے اور نزاکت تخلص کرتے تھے۔ زکی کا خاندان دہلی کے معزز سادات میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے والد سید محمود خاں محمود بھی شاعر تھے۔ "عمدہ منتخبہ" کے مؤلف اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرورؔ، جو کشمیر کے مشہور سخن سنج، محمد جان بیگ

سامی کے شاگرد تھے۔ ان کے نانا ہوتے تھے۔ زکی نے مولانا امام بخش صہبائی اور پنڈت رام کشن بسمل سے فارسی، عربی اور منطق پڑھی تھی۔ طب میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں دہلی چھوڑ کر چلے گئے تھے اور عرصہ تک میرٹھ، گورکھپور، بریلی، الہ آباد اور بدایوں میں رہے۔ محکمۂ تعلیم میں ملازم تھے۔ شائق، خواجہ خلیل اللہ خاں کشمیری کے فرزند تھے۔ اور یہ خاندان بھی ڈھاکہ چلا گیا تھا۔ میر عبدالغنی سے اس خاندان کی قرابت ہوتی تھی۔ شائق اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ غالب کے قیام کلکتہ کے زمانے میں غالباً ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

عروج

پچھلے عہد کے ناکافی اقدامات۔ پرتاپ سنگھ کی معزولی اور اخبارات کی تحریکیں۔ نظم ونسق کو برطانوی سطح پر لانے کی ضرورت۔ برطانوی ہند سے عہدہ داروں کا تقرر۔ اُردو کی مقبولیت۔ دو بھائیوں کا کشمیر کے اُفق پر نمودار ہونا۔ پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور پنڈت سالگرام سالک۔ حسن ابن علی۔ مولوی محمد عبداللہ وکیل۔
پیرزادہ محمد حسین عارف۔ منشی سراج الدین احمد خان۔ شیخ غلام نقشبند۔ قاضی عبداللہ منظور۔ چودھری خوشی محمد ناظر۔ جسٹس شاہ دین ہمایوں۔ میرزا سعدالدین سعد۔ شبلی کا سفرِ کشمیر منشی امیرالدین۔ منشی غلام محمد صادق۔ منشی غلام محمد خادم۔ مولانا عبدالقدیر بدری۔ حکیم فیروزالدین طغرائی اور ان کے تلامذہ۔ واسہ کول اوگرہ بُلبل۔ مجرم۔ عاجز۔ صبا۔ گنجور۔ ضیاء الدین ضیاء محی۔ بہائی۔ محمد الدین فوق۔ بسمل۔ میرزا مبارک مُبارک شیخ غلام حیدر خاں چشتی۔ پیرزادہ غلام احمد مہجور۔ ناز۔ سوشیلا ٹکو۔ بشمبر ناتھ ریبہ۔ آنند لال رتن۔ سعدالدین چشتی۔ اسد میر۔ نیاز کاشمیری۔

چند تواریخ۔ مولوی حشمت اللہ کی تاریخ۔ کاہن سنگھ بلادریہ۔
پیر نجم الدین عشرت۔ تاریخ جادار۔ مفتی محمد شاہ سعادت۔
تاریخ جموں۔ ایک مخطوطہ۔
حکومتی کونسل کی کارروائیوں کی ایک مسل۔ ایک روبکاری کی نقل۔
ایک خیر مقدمی تقریر۔

ادارے۔

صحافت۔

کشمیر سے باہر۔ اقبال۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ آغا حشر۔
سر تیج بہادر سپرو۔

عروج

اس صدی کے ربعِ اول کے قریب ریاست جموں وکشمیر کی زندگی میں ہلکے سے ارتعاش پیدا ہونے لگے اور دھیمے انداز میں سہی ، عہد کے تقاضوں کے منشاء کے سبب آہستہ آہستہ قدم اٹھنے لگے ۔ یہ عہد مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہدِ حکومت کے آغاز سے منطبق ہوتا ہے ۔ ہندوستان میں برطانوی سامراج کے ماتحت اجتماعی زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ۔ ان کا اثر ریاست میں بھی محسوس ہونے لگا تھا ۔ نظم و نسق کو جمہوری سطح تک بلند کرنے کے لئے کچھ اقدامات جو پچھلے عہد میں کئے گئے وہ عوام کی تشفی نہیں کر سکتے تھے ۔ اس لئے جد و جہد برابر جاری رہی ۔ نظم ونسق کو برطانوی ہند کے مماثل بنانے کے مقصد سے ، برطانوی ہند سے کچھ عہدیداروں کی خدمات مستعار لی گئیں ۔ اور حسنِ اتفاق ان میں سے اکثر اردو ادب اور شاعری کا ذوق رکھتے تھے ۔ ان کے اثر سے ادب اور شعر کا ایک نکھرا ہوا انداز نشو و نما پانے لگا ۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں اردو کی علمی ، ادبی اور افادی اہمیت کے مدِ نظر ، اسے ذریعۂ تعلیم اور ادبی اظہار کا وسیع موقف حاصل ہو چکا تھا ۔ اور یہ دفتروں ، عدالتوں اور دربار کی زبان بن گئی تھی ۔ اس زمانے میں کشمیری ادیبوں کے بیرونِ ریاست کے ادیبوں سے روابط میں بھی وسعت پیدا ہوئی اور بعض چوٹی کے ادیب کشمیر آنے جانے لگے ۔ یہ صحیح ہے کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی حکومت نے ، اپنے پیش رو کی طرح

اُردو کی ترقی کے لئے کوئی نمایاں کام انجام نہیں دیا۔ اس کے باوجود عوامی مقبولیت کے بل بوتے پر، اُردو پھیلتی اور پھلتی پھولتی رہی اور اجتماعی اور تعلیمی اور علمی اور ادبی زندگی کے ساتھ یہ زبان ایسی لازم و ملزوم ہوگئی تھی کہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں اِسے سرکاری زبان قرار دے کر پرتاپ سنگھ کے ہی عہد میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی دلچسپیاں محدود تھیں۔ ہندو مذہب کی خدمت کا جذبہ اُنہوں نے والد سے ورثہ میں پایا تھا۔ وہ سناتن دھرم کے عقاید کے سختی سے پابند تھے۔ انھی کی پشت پناہی سے ریاست میں ایک سناتن دھرم سبھا بھی قایم ہوئی اور وہ زمانہ ولیعہدی میں اس کے صدر خود تھے۔ اور سیکرٹری پنڈت سالگرام سالک، جو اُردو کے ادیب اور شاعر تھے، جنہوں نے آریہ سماج کے خلاف سناتن دھرم عقائد کی تائید میں کچھ رسالے بھی شائع کئے تھے۔ اور کئی مناظروں میں حصہ لیا تھا۔ نظم و نسق کی حد تک پرتاپ سنگھ نے اس ڈھانچے کو قایم رکھا، جو رنبیر سنگھ کے عہد میں قایم ہو چکا تھا۔ لیکن اطراف کے علاقوں میں حالات کی سُرعت کے ساتھ تبدیلی کے باعث، ریاست کے قرونِ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام کو بدلنے کے مطالبے ہو رہے تھے۔ عوامی مفادات کے مسایل میں سب سے اہم مسئلہ کاشتکاروں کی حالت کو بہتر بنانے کا تھا۔ سالہا سال سے یہ طبقہ استحصال کا شکار تھا اور محصولات کے بار سے دبا جا رہا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں برطانوی حکام کے اصرار پر اراضی کے نئے اصول پر بندوبست کی طرف توجہ ہوئی تھی اور اس کام کے لئے مسٹر ونگیٹ کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ لیکن مورّخوں نے لکھا ہے پنڈت طبقہ کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہوئی۔ کیونکہ بڑی زمینوں کے مالک پنڈت تھے۔ آخر مسٹر ونگیٹ نے مجبور ہو کر اس کام سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں والٹر لارنس کا تقرر اس کام کے لئے عمل میں آیا۔ اور مورّخ پیر غلام حسن کھویہامی کو ان کی اعانت کے لئے مقرر کیا گیا۔ لارنس اور پیر غلام حسن کی

محنت اور کوشش سے اراضی کے نئے بندوبست سے غریب مزارعین کی مشکلات کچھ رفع ہو سکیں۔ پیرزادہ محمد حسین عارف نے جو اس زمانے میں عدالت کے جج تھے اور کشمیر کے بارے میں ایک نظم "آئینہ کشمیر" کے نام سے لکھی تھی، اپنے ایک شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے:-

دُعائیں جان کو لارنس کے دو یہ ہے طفیل اس کا
زمینداروں کی حالت کو جو کچھ سُدھرا ہُوا دیکھا

درباری سازشوں اور خاندانی ریشہ دوانیوں کے باعث ۱۸۸۹ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے اختیارات سلب کر لئے گئے تھے۔ اس پر ریاست میں اور زیادہ تر ریاست سے باہر مہاراجہ کے طرفداروں میں شور و غوغا بلند ہوا اور اخباروں میں مہاراجہ کی موافقت میں ایک مہم کا آغاز ہو گیا۔ باہر سے تحریک چلانے والوں میں زیادہ تر کشمیری پنڈت تھے۔ جو ملازمت یا کاروبار کے سلسلے میں کشمیر سے باہر مقیم تھے۔ کیونکہ جیسا کہ "بہارِ گلشن کشمیر" کے مرتبین نے لکھا ہے، کشمیری پنڈت ہندوستان میں جہاں کہیں تھے، کشمیر کو اپنا وطن اور راجہ کو اپنے افتخار کی علامت سمجھتے تھے۔ اور کشمیر سے باہر جو سربرآوردہ شاعر تھے، جیسے پنڈت شیام لال مُشران بیخبر وغیرہ قصاید لکھ کر پرتاپ سنگھ کے حضور میں اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے تھے۔ پنڈت تربھون ہجر نے جو اُردو کے بلند پایہ شاعر ہیں پرتاپ سنگھ کی وفات پر ان کا نوحہ لکھا تھا۔ حالانکہ ڈوگرا حکمرانوں سے پنڈتوں کو شکایت تھی کہ وہ ملازمتوں میں ڈوگروں کو کشمیری پنڈتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے باوجود جب کبھی مہاراجہ کے اقتدار اور حقوق کا مسئلہ اُٹھتا، وہ سینہ سپر ہونے کے لئے تیار ہو جاتے۔ کشمیر سے باہر پنڈتوں کی جو تنظیمیں تھیں وہ بھی مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی حمایت کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ پنڈت ہرگوپال خستہ اور پنڈت سالگرام سالک نے مہاراجہ کی حمایت میں باہر سے اخبار جاری کئے۔ کچھ ؟

میں اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان اخباروں میں انگریزی حکومت کے خلاف مضامین سخت لب و لہجے میں نکلتے تھے۔ اُردو کے مشہور شعرا میں پنڈت برج نرائن چکبست اور پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی اس مہم میں شامل ہوئے تھے کشمیر کے استاد الشعراء منشی امیر الدین امیر نے اپنی ایک نظم میں مہاراجہ کے اختیارات کے سلب ہونے اور حکومت کے لئے کونسل کے قائم ہونے کی طرف اپنے ایک شعر میں اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

تختِ ایوانِ جلالت کی نہ کچھ پوچھ امیر
راجہ اُٹھا بھی نہ تھا جس سے بیٹھی کونسل

اخباروں کی ہلچل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۱ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے اختیارات بحال ہوگئے۔ مگر نظم و نسق میں ان کی مدد کرنے کے لئے ایک کونسل قائم ہوئی جس کے صدر خود مہاراجہ اور کونسل کے ایک رُکن ان کے بھائی راجہ امر سنگھ تھے جن کے بارے میں بعض مورخین نے لکھا ہے کہ پرتاپ سنگھ کے خلاف سازش میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس زمانے کے ایک سربرآوردہ شاعر، پنڈت سالگرام سالک نے ایک گیت کے انداز میں ان سازشوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کا ذمہ دار انگریزوں کو ٹھہرایا ہے۔ گیت کا اقتباس ہے:۔

پھوٹ پڑی راجہ کے گھر میں پیڑ لگا بڑھنے دن دن
بھائیوں کو کیا خوب لڑایا، وہی ہے راج فرنگی کا
لاکھوں شال دوشالے فردیں، بک گئیں کوڑی کوڑی میں
توشہ خانہ سارا لوٹا، وہی ہے راج فرنگی کا

نظم و نسق میں اِصلاح کے مدنظر، برطانوی حکومت نے کشمیر میں رزیڈنٹ کے تقرّر کا مسئلہ اُٹھایا۔ یہ مسئلہ اس سے پہلے، مہاراجہ گلاب سنگھ اور پھر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے

لوگ جوق در جوق آتے اور جب وہ کھیل دیکھ کر نکلتے تو غزلیں اور گیت اور ان کی لَے کانوں میں رچی ہوئی ہوتی اور گنگناتے جاتے۔ ان کمپنیوں میں الفرڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی اور البرٹ پارسی تھیٹریکل کمپنی کے کھیلوں کی ریاست بھر میں اتنی شہرت تھی کہ لوگ ان کو دیکھنے کے لئے بے چین رہتے اور کھیل کے دن ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہوتے۔ ان کمپنیوں نے آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کو جموں و کشمیر کے عوام سے روشناس کرایا۔ اور ان کو مقبول بنایا۔ ان کھیلوں کے گانوں، غزلوں اور گیتوں میں راس اور بھانڈوں اور نوابوں کے گانوں سے زیادہ ادبیت ہوتی تھی۔ جن سے عوام اور خواص کے ادبی مذاق کو اونچا کرنے میں بڑی مدد ملی۔ کھیلوں کے مکالمے، ان کے انداز، غزلیں اور گیت عوام اور خواص میں اتنی مقبولیت حاصل کر لیتے تھے کہ شعر لوگوں کے زبان زد ہو جاتے۔ اسی طرح کی ایک مقبول غزل کا مصرعہ ذیل میں درج ہے:

نغاں بن کر ملالِ خاطرِ محزوں عیاں کیوں ہو

ایک اور غزل جو مقبول تھی، اس کا مصرعہ ہے:

جی سے مر کر بھی نہ رشکِ بُتِ ناداں نکلا

غالب اور ان کی غزلیں بھی جموں اور کشمیر کے عوام سے اسی زمانے میں روشناس ہوئیں۔ انہیں لوگ سڑکوں پر گاتے پھرتے تھے اور محفلوں میں انہیں قوّال اور دوسرے گانے والے گا کر سناتے تھے۔ غالب کے کلام کی مقبولیت اور اس کی اشاعت کا ایک اور اہم سبب، وہ صاحبِ ثروت لوگ، راجے، اور مہاراجے جو ہندوستان سے کشمیر کی سیر کو آتے تھے، ان میں سے اکثر گانے کے شوقین ہوتے تھے اور ان کے مذاق کی تشفی کے لئے موسیقی داں، غالب کے کلام کو ساز کے سُناتے اور داد اور انعام پاتے تھے۔ معیاری شعراء کے کلام بہادر شاہ ظفر کا کلام اور خاص طور پر ان کی غزل جس کا مطلع ہے:

زمانے میں بھی اُٹھایا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے بہ لطائف الحیل اسے ٹال دیا تھا۔ اس وقت مہاراجہ کے خاندان اور دربار میں سازشوں کی وجہ سے اس کو ٹالنا ناممکن ہو گیا چنانچہ ۱۸۸۷ء میں کرنل ہنوی کشمیر کے پہلے پولٹیکل پریذیڈنٹ مقرر ہو کر آئے۔ ریذیڈنسی کے دفتر میں فارسی میں مراسلت کی ضرورت کے مدِ نظر جو منشی اور عملہ مقرر کیا جاتا تھا ان میں اُردو کے بھی کئی اچھے عالم جمع ہوتے گئے۔ جن کو شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ ڈوگرا حکومت خاص طور پر مسلمانوں کی کسی طرح کی تنظیم کو، خواہ وہ علمی اور ادبی ہی کیوں نہ ہو، روا نہیں رکھتی تھی۔ اس لئے رزیڈنٹ کے دفتر کے صاحبانِ ذوق نے رزیڈنسی میں ادبی اجتماعوں کی صورت نکال لی۔ کیونکہ یہاں مہاراجہ کا اقتدار نہیں چل سکتا تھا۔ اس طرح، رزیڈنسی اُردو شعر و سخن کے ذوق کو پروان چڑھانے کا مرکز بن گئی۔

ریاست کے نظم و نسق کو برطانوی ہند کی سطح تک اُٹھانے کی ضرورت کے مدِ نظر، نئے اور انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کی ضرورت تھی، چنانچہ ابتدا میں پنجاب سے کئی اعلیٰ لیاقت رکھنے والے عہدہ داروں اور کچھ منشیوں کی خدمات بھی مستعار لی گئیں۔ عہدہ داروں میں سے چند اُردو کے شستہ ذوق رکھنے والے بھی تھے۔ ان میں پیرزادہ محمد حسین عارف اور چودھری خوشی محمد ناظر کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں اصحاب اور خاص طور پر ناظر اُردو کے سر برآوردہ شاعر تھے۔ ان صاحبانِ ذوق کے کشمیر میں قیام سے، اُردو شعر و سخن کے ذوق کو نکھرنے اور ترقی کرنے میں بہت مدد ملی۔

ریاست میں اُردو کی مقبولیت اور اشاعت کا دوسرا دور جو انیسویں صدی کے ربع آخر سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں بمبئی کی پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کا بڑا حصہ رہا۔ یہ کمپنیاں جموں اور کشمیر میں اپنے کھیل دکھاتیں، جن کو دیکھنے کے لئے

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

اور دوسری غزل جس کا مطلع حسب ذیل ہے:

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا

بہت مقبول تھی۔

جموں وکشمیر کے اسٹیج پر جو ڈرامے مقبول تھے۔ ان میں سفید خون، خوبصورت بلا، اور چندرا دلی قابلِ ذکر ہیں۔ بیتاب کے ڈراموں میں مہابھارت، کرشن سُداما یہودی کی لڑکی وغیرہ بہت مقبول رہے۔

ان تھیٹریکل کمپنیوں کی بدولت جموں وکشمیر میں، آغا حشر کی شہرت اور مقبولیت اس قدر بڑھ گئی تھی۔ کہ صاحبانِ ذوق اور ادب دوستوں نے ان کی یادگار میں ایک دن منانے کی تجویز کی، چنانچہ "حشر ڈے" بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ اور اس میں شرکت کرنے اور تقریر کے لئے لاہور کے کئی ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ان ادیبوں میں عبدالمجید سالک خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ یادگار تقریب سرینگر میں ہیڈ و میموریل اسکول، شیخ باغ میں منعقد کی گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک مشاعرہ نہایت وسیع پیمانے پر منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں مقامی شعراء کے علاوہ پنجاب اور ہندوستان کے کئی شاعروں نے اپنا کلام سُنایا تھا۔ اس مشاعرے اور دوسرے مشاعروں کی روداد اور غزلیں، "پرتاپ" اخبار میں شائع ہوتی تھیں۔ مشاعرے کی محفلیں اور شائستگی کا ایک جز ہیں۔ ہندوستان کے اور مقامات کی طرح اُردو شاعری کو مقبول بنانے اور اس کا ذوق پیدا کرنے میں مشاعروں کا نمایاں حصہ رہا۔

ان سارے حالات اور اسباب نے مل جل کر، کشمیر کو رفتہ رفتہ اُردو کا ایک مرکز بنا دیا۔ اور اس میں کچھ لسانی اور کچھ تہذیبی مناسبتوں کا تقاضا بھی شامل تھا۔

جموں کی ڈوگری اُردو کی متجانس زبان ہے اور دونوں اپنا بنیادی لفظی سرمایہ ایک سرچشمہ سے پاتی ہیں۔ کشمیر میں کشمیری اور اُردو دونوں کا تہذیبی پس منظر ایک ہے۔ اس کے علاوہ لفظی سرمایے میں بھی فارسی کے ماخذ اور ادبی روایات مُشترک ہیں۔

رنبیر سنگھ کے عہدِ حکومت کے آخری زمانے میں کشمیر کی فضاء پر دو بھائی نمودار ہوئے جن کی طرف پچھلے صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہ پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور پنڈت سالگرام سالک تھے۔ ان کے والد رام چند کول کا تعلق کشمیر اور پنجاب دونوں جگہ سے رہا۔ چنانچہ یہ دونوں بھائی غالباً لاہور ہی میں پیدا ہوئے۔ خستہ کی تعلیم و تربیت لاہور ہی میں ہوئی۔ یوں بھی اہلِ کشمیر میں سے اکثر اصحاب جو اپنی اولاد کو عصری ضرورتوں کے مطابق تعلیم دِلانا چاہتے تھے۔ انہیں لاہور ہی بھیجتے تھے۔ سالک کی ابتدائی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ اس کے بعد خستہ کو پٹیالہ کے ایک سکول میں ملازمت مِل گئی۔ اور یہ خاندان پٹیالہ چلا گیا۔

سالک نے پٹیالہ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ کالج میں ان کے فارسی کے اُستاد مشہور عالم مولوی امین الدین تھے جنہوں نے غالب کی "قاطع بُرہان" کے سِلسلے میں جو لفظی جنگ چھڑ گئی تھی اس میں "قاطعِ قاطع" لِکھ کر غالب کے خلاف نمایاں حصّہ لیا تھا۔ سالک کے نوجوان ذہن پر پٹیالہ کے قیام نے جو تاثرات چھوڑے تھے ان کو انہوں نے رجب علی بیگ سرور کے "فسانۂ عجایب" کے دیباچہ میں لکھنؤ کی توصیف کے انداز پر، اپنی مُصنّفہ "داستانِ جگت روپ" کے دیباچہ میں قلمبند کیا ہے۔

پنڈت ہرگوپال خستہ پٹیالہ کے ایک اسکول میں مدرس رہے۔ یہاں اپنے ایک شاگرد کی تعلیم کے لئے انہوں نے حافظ نذیر احمد کی "مراۃ العروس" کی طرز کا ایک مختصر قصہ "گلزارِ فوائد" کے نام سے لِکھا تھا۔ اس میں ایک مسن میاں بیوی اپنی

لڑکی خوش قسمت کو مکالموں کی شکل میں عام معلومات کا درس دیتے ہیں۔ یہ قصہ ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کے اختتام پر خستہ لکھتے ہیں :-

"اس بندۂ گوپال عبودیت افعال لد بہرہ مند رام چند ابن مہادیو کول خصوص خطۂ بے نظیر کشمیر وارد پٹیالہ نے ان سفید ورقوں کو حروفِ سیاہ کی پوشش دی۔"

اسی زمانے میں مہاراجہ رنبیر کی ہندو مذہب کی سرپرستی اور جیسا کہ سالک نے لکھا ہے۔ "دھرم کرم کے کاموں میں ان کی شہرت" کی خبریں اخباروں میں پڑھ کر، دونوں بھائیوں کو کشمیر لوٹنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور کشمیر لوٹ کر پنڈت ہرگوپال کچھ عرصہ ایک اسکول میں مدرس رہے اور مطبع "تحفۂ کشمیر" کے منیجر اور "تحفۂ کشمیر" کے اڈیٹر بھی رہے۔ لیکن یہ خدمت انہوں نے جلد ترک کر دی۔ اور دیوان اننت رام کی معرفت مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار میں باریاب ہوئے اور وقائع نگاری یا اخبار نویسی کی خدمت پر مامور ہو گئے۔ اس طرح انہیں رنبیر سنگھ کے قریب رہنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ میجر ہینڈرسن نے جو اس زمانے میں کشمیر میں تھے، ان کی سفارش کرنل ہنوی کے پاس کی۔ اور حسبِ ضرورت ان کی خدمات سے استفادہ کا مشورہ دیا۔ جس کے سبب خستہ کا رسوخ ریذیڈنسی میں پیدا ہو گیا اور اپنے اثر سے کام لے کر انہوں نے سالک کو ریذیڈنسی میں ملازم رکھوا دیا تھا۔

اس زمانے میں کشمیر میں سخت قحط پڑا تھا اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے خلاف یہ مخبری کی گئی تھی کہ وہ لوگوں کے لئے غلہ کا انتظام نہ کر سکنے کے سبب انہیں بوروں میں بھر کر، کشتی میں بھجواتے اور وُلر جھیل میں ڈبو دیتے ہیں۔ اس پر برطانوی ہند کی حکومت نے مہاراجہ سے باز پرس کی اور مقدمہ غیر قیدگی ان کے خلاف قائم ہو گیا۔ کسی نے مہاراجہ کو یہ سجھائی کہ انگریزوں کے پاس مخبری کا کام ہرگوپال خستہ کا ہے۔

جنہوں نے اپنے بھائی کے توسط سے جنہیں رزیڈنسی میں اس غرض سے پہلے ہی نوکر رکھوا دیا تھا۔ مہاراجہ کے خلاف مخبری کی ہے۔ اس پر مہاراجہ دونوں بھائیوں سے بدظن ہو گئے اور ان پر ایک مقدمہ قایم کر کے جموں میں باہو کے قلعہ میں قید کر دیا۔ لیکن سالک ایک ترکیب سے قید سے نکل بھاگے۔ اور سیالکوٹ پہنچے۔ جہاں ہرگوپال بھی رہائی کے بعد پہنچ گئے۔ اور ۱۸۸۲ء میں ایک ہفتہ وار "خیر خواہ کشمیر" کے نام سے جاری کیا۔ جس میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے خلاف مضامین لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہے۔ آخر ۱۸۸۵ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات کے بعد دونوں بھائی کشمیر لوٹے اور یہاں پنڈتوں کے سماج سُدھار، بیواؤں کی شادی اور تعلیم نسواں کے کاموں میں حصّہ لیتے رہے۔

خستہ اُردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے اور "گلزار فواید" کے علاوہ کشمیر کے ایک جغرافیہ اور ایک تاریخی تصنیف "گلدستۂ کشمیر" کے بھی مصنّف ہیں۔ شاعری میں خستہ تخلص انہوں نے غالب کے چہیتے شاگرد میرزا ہرگوپال تُفتہ کے اتباع میں اختیار کیا تھا۔ مولفین "بہارِ گلشنِ کشمیر" نے ان کا تذکرہ فارسی شاعر کی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن لکھا ہے کلام دستیاب نہ ہو سکا خستہ کے اُردو کلام کا ان مولّفین کو پتہ نہیں تھا۔ وہ غزل کہتے تھے اور کئی مثنویاں بھی لکھیں تھیں۔ ان کی غزل کے کچھ شعر ہیں:-

کیا بھروسہ ہے دم کا اے آدم! — دم تو ہر دم گیا ہوا دیکھا
صحبتِ پیرِ زال دُنیا میں — آشناؤں کو ڈوبتا دیکھا
خوب ڈھونڈا جہاں میں اے خستہ — خستگی کا نہ آشنا دیکھا

"گلدستۂ کشمیر" جو نثر میں ہے، خستہ کا اہم کارنامہ ہے۔ اس کی تکمیل ۱۸۸۲ء میں ہوئی۔ یہ تاریخ محمد حسین آزاد کے مُربّی کرنل ہالرائیڈ کی نظر سے گذری تھی جو اس زمانے میں پنجاب میں ناظم تعلیم تھے۔ یہ کشمیر کی ضخیم تاریخ ہے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ

کے حالات پر ختم ہوتی ہے۔ رنبیر سنگھ کے حال میں ان کی دلچسپیوں کا بیان لکھا ہے۔ اس سے ان کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

" چال چلن حضور ممدوح کا یہ ہے کہ روزِ اول سے آج تک اپنے مذہب ہندو میں نہایت پکے، ثابت قدم اور راسخ الاعتقاد ہیں۔ علی الصباح، اشنان، دھیان گیان سے فارغ ہو کر پوجا پاٹ نیت، دھرم کرم کرکے۔ . . . برہمنان بید خواں و شاستروں کے ساتھ گفتگو فرما کر اصل و دقایق و نکاتِ شاستر فرماتے ہیں۔ ایسا کوئی ہی علم ہوگا، جس کی ماہیت سے حضور والا ماہر نہیں۔ کشمیر و خاص جموں و پرمنڈل کوہستان جموں میں جہاں کوئی سادھو بیٹھ گیا، وہیں مندر اور دھرم ارتھ بنوا دیے۔"

"گلدستہ" کے دیباچہ میں انہوں نے اپنی اور تصانیف "گوپال نامہ" "چہار گلزار" "شگفتہ بہار" "حزن اختر" معروف بہ گل بہار" اور "سوانح عمری خستہ" کا تذکرہ کیا ہے۔ جو اب دستیاب نہیں۔ "گوپال نامہ" جو قلعہ باہو میں قید کے زمانے میں لکھی گئی تھی کے کچھ اشعار ان کے متبنی نواسے پنڈت شیو نارائن فوطیدار صدر قانون ساز کونسل ریاست جموں و کشمیر کے حافظہ میں محفوظ ہیں[1]۔ ذیل کے شعر انہیں کی زبانی سن کر یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔ اس میں اپنے باہو کے قلعہ میں قید کے لئے لے جانے کی تفصیل بیان کی ہے :-

سپاہی ہوئے پھر تو ہمراہ مرے	کچھ ادھر ادھر، کچھ ورے کچھ پرے
کوئی ہاتھ میں لے کے تیغِ دو دم	کوئی کر کے سنگین بندوق خم
چلا تھا نہ راہی جو فرسنگ بھی	تو چلنے میں گھبرا اٹھا اس کا جی

اس مثنوی میں مقدمہ غر قیدگی کی تفصیل بھی لکھی ہے اور اس کا آغاز کلاسیکی انداز میں اس طرح کیا ہے :-

---

[1] پنڈت شیو نرائن کا ۱۹۷۸ء میں انتقال ہو چکا ہے۔

پلا ساقیا مجھ کو جام شراب　　　　کہ ہوتی ہیں اب کشتیاں غرقِ آب

خستہ کی ایک اور مثنوی "ہیبہ مال و ناگ رائے" بھی تھی، جو چھپ چکی تھی، لیکن اب دستیاب نہیں ہوتی۔ اس کا ایک شعر جو مسٹر رام جو لائیبریرین، ریسرچ لائیبریری کے ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے اور انہوں نے مجھے سنایا، وہ یہ ہے:

رفیقو ہے یہ اب گوپال کا حال　　　　ہوا ہے خستگی سے سخت پامال

سالک کی مثنوی "سُندر برن" کے لئے انہوں نے تاریخ بھی کہی تھی جو اس کے مخطوطے میں شامل ہے۔

خستہ کا انتقال جنوری ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ صحافت سے ان کا گہرا تعلق رہا تھا۔ اور جس زمانے میں وہ کشمیر بدر کر دیئے گئے تھے اور بعد میں بھی کشمیر میں رہتے ہوئے کئی اخبار نکالے تھے۔ جو لاہور سے شایع ہوتے تھے۔ ان اخباروں کے نام حسب ذیل ہیں۔

تحفۂ کشمیر، راوی بے نظیر۔ ریفارمر۔ پبلک نیوز۔ دلیش پُکار۔ خیر خواہِ کشمیر

پنڈت سالگرام سالک، خستہ سے دو برس چھوٹے تھے اور ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اچھے شاعر، نثر نویس اور کئی قانونی کتابوں کے مصنّف تھے۔ انہوں نے ایک ضخیم دیوان، ایک مثنوی اور ایک نثری داستان یادگار چھوڑی ہے۔ دیوان غزلوں کچھ نظموں، قصیدوں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔ غزل وہ سلیقے سے کہتے تھے۔ ذیل میں چند شعر درج ہیں:

گرداب محبت سے ہوا کوئی نہ جاں بر
یہ بحر وہ ہے جس کا کنارہ نہیں ہوتا
بے وجہ نہیں کارِ زباں آنکھ سے لیتے
خالی کوئی علت سے اشارہ نہیں ہوتا۔

———

کعبۂ دل میں مرے گھر ہے بتوں کا سالکؔ
بُت ہے کعبہ میں مرے، کعبہ ہے بُت خانے میں

دھرتا ہے دیا قبر پہ مری کہ جلوں میں
اللہ رے کینہ مرے مکّار صنم کا

ایک نظم جس میں خدا کی قدرت کے کرشمے بیان کئے ہیں، کے چند شعر ہیں:-

ذرا دیکھو تو تم قدرت خدا کی زمیں کیسی بنائی اس نے خاکی
سجایا مہر و مہ سے کیا فلک کو ضیاء پروین کو کیسی عطا کی
کسی کو آب میں اس نے بسایا کسی کو مملکت بخشی ہوا کی
غرض چھوٹی بڑی جو شے ہے موجود نشانی ہے وہ شان کبریا کی
سمجھ کچھ بھی سمجھ سکتی نہیں ہے زباں گونگی ہے یاں فکر رسا کی

اُن کی مثنوی "سُندر بن" کشمیر میں لکھی ہوئی کلاسیکی انداز کی مثنویوں میں اہم ہے۔ یہ مثنوی انہوں نے قلعہ باہو میں قید کے زمانے میں لکھی اور اس کی تصنیف کے سلسلے میں انہوں نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن کسی کو میر حسن کی اس مقبول مثنوی کو آواز لے سے پڑھتے سُنا اور ان کے دل میں بھی اسی بحر میں مثنوی لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ سُندر بن اور من موہنی کی یہ داستان محبت ۱۸۸۱ء میں تکمیل کو پہنچی۔ سالکؔ اور پنڈت ہرگوپال خستہؔ دونوں نے تاریخیں کہی تھیں خستہؔ کی تاریخ "غرض ہی میں مطلوبہ کو لکا رئے" سے برآمد ہوتی ہے۔

مثنوی فوق الفطری عناصر سے پُر ہے۔ پری " دیو کے علاوہ " ناگ " اس کے انوکھے کردار ہیں، جو کشمیر کے کلاسیکی کارناموں کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں۔ کشمیر کی

دیومالا میں ناگ انسان بھی ہیں، ایک قوم اور سانپ بھی۔ جیسا کہ کشمیر کی مشہور کلاسیکی داستان "ہی مال و ناگرائے" سے ظاہر ہوگا۔ مثنوی کی زبان صاف اور اسلوب بیان دلچسپ ہے اور قصے کے ارتقاء کے دوران کئی دلکش مرقع اس میں آتے ہیں۔ مثال کے طور پر زنثوں پری سندر بدن پر عاشق ہوکر اسے پرستان اڑا لاتی ہے، لیکن بزرگوں کے خوف سے اسے ایک مور بنا کر پاس رکھتی ہے۔ مور ایک فقیر کے منتر کی مدد سے انسان بن کر گھر بھاگ آتا ہے اور اپنی رانی من موہنی کے ساتھ بیٹھا ہوا محفل سرور جماتا ہے۔ ایسے میں زنثوں پری کی جاسوس پریاں اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں پہنچیں اور اسے اڑا کر پرستان لے جاتی ہیں۔ اس موقع پر زنثوں پری کی شعلہ خوئی قابل دید ہے۔ کہتی ہے:

غضب سے ہوئی شعلہ سی شوخ رنگ
ہوا رشک سے اس کا دل سخت تنگ
پھر اس نے یہ سندر بدن سے کہا
کہ اے بدلحاظ اور اے بے حیا
وفا کی نہیں تجھ میں کچھ بو مگر!
ابھی خار رنجش سے ہے بے خبر
کلام بزرگاں نہیں بے اثر
یہ سچ ہے مرکب بہ شر ہے بشر
مرد اہجر میں میں ترے اور تو
مزے سے لگا دے گلے غیر کو

سانک کی ایک اور مثنوی "ہیسی پیژون" ہے۔

نثر میں انہوں نے "شاہنامہ" کے انداز کی ایک داستان "داستان

جگت روپ" کے نام سے لکھی تھی، جس میں جگت روپ اور روپ ونتی کی محبت کی روداد ہے۔ جگت روپ پر ایک ناگ کماری عاشق ہو کر اسے اپنے یہاں قید کر رکھتی ہے۔ یہاں بھی وہ ایک جوگی کے منتر سے قید سے چھوٹ کر بھاگتا ہے۔ داستان کے دیباچے میں سالک نے لاہور کی توصیف لکھی ہے۔ جس کا اقتباس درج ذیل ہے:-

"اللہ اللہ شہر لاہور ہے کہ تجلی زار کوہ طور ہے۔ جب اس کے گلی کوچوں کی یاد آتی ہے، بے ساختہ ایک آہ نکل جاتی ہے اور دردِ جُدائی سے آنکھوں سے آنسوؤں کی مالا گلے کا ہار ہو جاتی ہے۔۔۔ ہند کی آبادی کی طرح وضع کے ڈھنگ، یاروں کی دلشادی اور لنگوٹیہ یاروں کی بچپن کی صحبتوں کے رنگ، جب یاد آتے ہیں تو ہم کمبخت، ہم کمبخت کہہ کر بے تحاشا چلّاتے اور بے ہوش ہو جاتے ہیں۔"

اسی انداز سے پٹیالہ کی تعریف بھی کی ہے۔ کشمیر کے مناظر پر انہوں نے کئی انشائیے لکھے تھے، جن کا مجموعہ "گنجینۂ فطرت" یا "مناظرِ کشمیر" کے نام سے اکٹھا کیا تھا۔ ان انشائیوں کا انداز ماسٹر رام چندر اور ذکاء اللہ کے انشائیوں جیسا ہے۔ ان کی مزید تصانیف حسب ذیل ہیں:-

۱۔ سوانح عمری مہاراجہ گلاب سنگھ۔ ۲۔ جنگ یورپ کا عبرت ناک منظر۔ ۳۔ کشمیر کا مقدمہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی معزولی سے متعلق مضامین جو "خیر خواہ کشمیر" میں ضمیمہ کے طور پر شائع ہوئے تھے۔ ۴۔ تعلیم۔ ۵۔ شاستر ارتھ۔ ۶۔ مورتی مناظرہ۔ ۷۔ کتاب دیانندیوں کی مشکلات ۸۔ دھرم اُپدیشن۔ ۹۔ تردید الہام۔

۱۰۔ رسالہ حق پرستی۔ ۱۱۔ کشمیری ریڈر تین حصوں میں۔ ۱۲۔ اردو محاورات
۱۳۔ اردو قواعد۔ ۱۴۔ خطوط جو سالک نے اپنے عزیزوں اور احباب
کے نام لکھے تھے۔

ان کے علاوہ انہوں نے قانونی شرحیں بھی لکھی تھیں :۔

۱۔ شرح رنبیر ڈنڈ بدھی۔ (قانون تعزیرات ریاست)۔ ۲۔ شرح
ضابطہ دیوانی۔ ۳۔ شرح قانونِ میعاد سماعت۔ ۴۔ شرح قانون
رسوم اور اسٹامپ۔ ۵۔ شرح قانونِ مطالبات خفیفہ۔ ۶۔ شرح
قانون رسوم اور اسٹامپ۔ ۷۔ شرح قانون اجرائے ڈگری۔

صحافتی مساعی میں وہ اپنے بھائی کے ساتھ شریک رہے۔

کشمیر کے اہلِ فکر اور اہلِ نظر مصنفین میں، جنہوں نے اپنے ذاتی شوق
اور لگن سے علمی دنیا میں ایک اونچا مقام حاصل کیا۔ ابوالحامد منشی حسن ابن علی تھے۔
ان کے دادا محمد بٹ شیخوپورہ تحصیل بڈگام کے رہنے والے تھے اور سارا گاؤں ان کی ملکیت
میں تھا۔ سکھوں کی دار و گیر کے زمانے میں وہ اپنا گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اور سرینگر
میں محلہ نادپورہ میں مقیم ہوئے، جہاں اب تک یہ خاندان آباد ہے۔ جب سکھوں نے
اس گاؤں پر اپنا قبضہ کر لیا۔ تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ عزت و آبرو سے
نکل گئے۔ سرینگر میں اپنی گذر بسر کے لئے انہوں نے شالبافی کا کاروبار اختیار کیا۔
اور یہ کاروبار اس زمانے میں بھی منفعت بخش تھا۔ دادا کے انتقال کے بعد ان کے
دادا علی محمد کربلائی نے یہ کاروبار سنبھالا۔ کاروبار میں اتنی فراخی نصیب ہوئی کہ
وہ اپنے زمانے کے متمول لوگوں بلکہ رئیسوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ غالباً کشمیر
کے وہ پہلے مسلمان تھے جنہیں کربلائے معلیٰ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ اور کربلا
سے لوٹنے کے بعد، ان کے نام کے ساتھ خاندانی نسبت "بٹ" کی بجائے "کربلائی"

کی نسبت استعمال ہونے لگی تھی۔ حسن ابن علی اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں کہ مجھے شعور پیدا ہونے کے بعد، میں نے اپنے والد سے "کربلائی" کی وجہ تسمیہ دریافت کی۔ جواب کچھ مہمل سا ملا۔ اس سے میری تسلّی نہ ہو سکی اور میں اس معاملے کی تہہ تک جانے کے لئے اس قدر بے تاب ہوا کہ آخر الامر میری زندگی کی کش مکش کا یہی ذریعہ بن گیا اور یہیں سے اس کا آغاز ہوا۔"

حسن ابن علی کی ولادت ۱۲۶۸ھ میں ہوئی تھی۔ ابتدائی عربی اور فارسی کی تعلیم مکتب میں حاصل کی اور اپنے شوق سے اُردو سیکھی، انگریزی میں بھی تھوڑی بہت مہارت پیدا کر لی تھی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ لیکن اپنی ذہانت خداداد اور شوق سے علومِ نقلیہ اور عقلیہ میں اتنی استعداد پیدا کر لی تھی کہ کئی اہم تصانیف کے مصنف ہوئے۔ کشمیر کے مُسلمانوں میں غالباً وہ پہلے شخص تھے۔ جنھیں اپنی قوم کی علمی اور اخلاقی ذبُوں حالی کا احساس پیدا ہوا۔ اور انھوں نے سر سید احمد خان کی طرح اپنی قوم کی حالت سُدھارنے کے لئے اپنے بہت ہی محدود وسایل کے ساتھ وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کی، جو سر سید نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ، جد و جہد اور اپنے کئی ہم خیال اور مُخلص احباب کی مدد سے وسیع پیمانے پر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انجام دیا تھا۔ سر سید اور حسن ابن علی کی کوششوں کی سمتوں میں کئی نقاط مشترک ہیں اور شاید اپنے ترقی پرور رجحانات میں وہ سر سید احمد خان سے کچھ آگے ہی تھے۔ ان کے سوچنے کے انداز میں اشتراکیت کے تخم ملتے ہیں، چنانچہ اپنی خود نوشت میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ ہے اپنے والد سے "کربلائی"، کی نسبت کے بارے میں ناشافی جواب سُن کر، ان کے ذہن میں اس طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے تھے۔

" انسانوں میں سرمایے کی وجہ سے ہی درجہ بندی ہو سکتی ہے اور

نجات پات کا سارا دار و مدار اسی پر ہے۔ چونکہ میرے والد صاحب نے تجارت میں نمایاں ترقی حاصل کر کے بمبئی کلکتہ کے ساتھ درآمد برآمد کا کام جاری کیا۔ بینر ٹرانسپورٹ کی دقتوں کے باوجود "اہلیان کشمیر میں سب سے پہلے زیارت کربلائے معلیٰ کا شرف حاصل کیا۔ جس کی وجہ سے بٹہ تو درکنار، کربلائی کا خطاب نام کے ساتھ دم تارے کی طرح لگ گیا۔ جو کہ ایک غریب کو حاصل ہونا مشکل ہے۔"

آگے وہ سوچنے لگتے ہیں:

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ایک غریب کو جو دنیا میں برابر کا حصہ دار ہے اور کاروبار میں امیر سے کہیں زیادہ پیش پیش ہے۔ یہ مراعات نصیب نہیں؟ عام طور پر اس کے جواب میں لفظ قسمت آجاتا ہے جس کی معقولیت میرے ذہن و ذکاء سے باہر ہے، کیونکہ ایسے عقیدے کی رو سے خداوند کریم کے صفات ثبوتیہ اور عدالت میں نقص لازم ہوتا ہے، حالانکہ وہ عادل ہے، ظالم نہیں۔ دنیا میں سکھ ہو یا دکھ، سب انسانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ بہرحال میرے خیال میں امیر اور غریب دونوں طبقے اپنے اپنے اعمال کے لئے یکساں طور پر ذمہ دار ہیں۔"

یہ خیالات انیسویں صدی میں کشمیر کے ایک مسلمان کے قلم سے، بہت عجیب معلوم ہوتے ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد والد نے انہیں تجارت میں مشغول کرنا چاہا، لیکن لکھتے ہیں کہ میرے دماغ میں اس قدر انقلاب آچکا تھا کہ ایسے کاموں سے میں سخت متنفر ہو گیا تھا کہ اس زمانے میں کچھ انگریز پادری اور ڈاکٹر کشمیر آنے لگے تھے۔

درگجن میں، جہاں اب سینے کے امراض کا ہسپتال ہے، تبلیغی مشن کی جانب سے ایک ہسپتال بھی کھولا گیا تھا۔ حسن ابن علی کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا تو والد سے چھپ کر ہسپتال کے ڈاکٹر کے پاس گئے اور اس سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر اس شرط پر راضی ہوا کہ وہ خود اسے کشمیری زبان سکھائیں۔ غرض خفیہ طور پر وہ دو سال تک انگریزی سیکھتے رہے اور اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ انگریزی اچھی طرح لکھنے پڑھنے لگے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خود ان کے الفاظ میں "ملاؤں کے فتوے کے مطابق انگریزی بولی ہی کفر سمجھی جاتی تھی۔" کچھ لوگ جب ان کے پاس انگریزی میں خطوط یا تار لکھوانے اور پڑھوانے کے لئے آنے لگے۔ تو گھر کے لوگوں پر یہ راز کھلا، اور ہر طرف سے لتاڑ پڑنے لگی، لیکن حسن ابن علی نے سب کو یہ یقین دلایا کہ انگریزی پڑھنے کے باوجود اپنے عقاید میں پکے ہیں۔

اپنے انگریزی سیکھنے کے سلسلے میں جو زحمتیں اٹھانی پڑیں، اس کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"درحصولِ زبان انگریزی، بسیار تکلیف ہا برداشت کردہ ام کہ ذکرِ آن طولی میدارد . . . . . آن وقت بسبب عدمِ مدرسہ و سامانِ آن بسیار مشکل بود۔ چونکہ شوقِ کامل و ذوقِ تامہ داشتم بہ سببِ آن تحمل تکالیف و مصارف آن [برداشت کردہ]۔ چیزی حاصل کردہ ام۔"

حسن علی کی پہلی ملازمت، عدالتِ صدر کے محکمے میں ہوئی تھی، لیکن دو سال کے اندر یہ ملازمت ترک کرنی پڑی۔ اس کا واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ ایک مقدمہ میں ملزموں کی جانب سے رشوت آئی، جس میں سے پانچ سو روپیہ ان کے حصے میں بھی آئے۔ شام میں خوشی خوشی یہ رقم، لاکر جب والد کے سامنے رکھ دی۔ تو وہ ایسے

ناراض ہوئے کہ دوسرے دن سے ملازمت ترک کرنے کی ہدایت کی اور روپیہ لے جاکر کسی ملا کے حوالے کر دیا۔ اسی اثنا میں درگجن ہسپتال میں ڈاکٹر نے ایک پادری سے انہیں ملایا، جو سری نگر میں مشن اسکول قائم کرنے کے مقصد سے آئے تھے اور انہیں کسی اُستاد کی تلاش تھی۔ جب یہ خدمت حسن علی کو پیش کی گئی تو انہوں نے اسے خوشی سے قبول کر لیا۔ اب اسکول کے لئے مکان کی تلاش ہوئی۔ پادریوں کو کوئی مکان کرایہ پر نہیں دیتا تھا۔ حسن ابن علی نے مکان اپنے نام کرایہ پر لیا۔ اور مدرسہ قائم ہو گیا۔ ایسے مدرسے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ طلباء کی کافی تعداد اسکول میں داخل ہو گئی اور یہ سارے طلباء پنڈت تھے لیکن مہاراجہ رنبیر سنگھ کو مشنریوں سے جو نفرت تھی۔ اس کا ایک واقعہ بھی حسن ابن علی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک دن پنڈت سورج کول مہاراجہ کے بھیجے ہوئے ان کے پاس آئے اور یہ حکم سُنایا کہ مہاراجہ بہادر آپ کو فوراً بُلا رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

> "میرے حواس باختہ ہو گئے کیونکہ میں سری سرکار والا، مہاراجہ رنبیر سنگھ صاحب بہادر کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ ہر چند میں پنڈت صاحب موصوف سے سرکار کے مجھے یاد کرنے کی وجہ پوچھتا رہا، مگر وہ اپنی لاعلمی کا اس بارے میں اظہار کرتے رہے۔ الغرض مضطرب الحالی میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ اور افتاں و خیزاں کسی طرح محل شاہی تک پہنچ کر دربار جلالت آثار میں حاضر ہوا اور آداب شاہی بجا لایا۔ تو اشارتاً بیٹھنے کا حکم ہوا۔ تھوڑے وقفہ کی خاموشی کے بعد سرکار نے للکار کر مجھ سے کہا۔ "تم شیعہ ہو اور مابدولت نے بہتیرے احسانات تم لوگوں کے ساتھ کئے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم مابدولت کی احسان فراموشی کرتے ہو اور خلاف ورزی

ہمارے ہمارے احکام کی کہ کے، انگریزوں کو یہاں مدرسہ قائم کرنے میں مدد
دے رہے ہو۔ اگر تمہیں نوکری کی ضرورت ہے تو میرے مدرسے میں
یا کسی اور محکمہ میں، جہاں تمہاری مرضی ہو درخواست دے دو،
میں منظوری دے دوں گا۔"

یہ حکم سن کر انہیں کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی اور آداب بجا کر رخصت ہوئے تو سیدھے پادری صاحب کے بنگلے پر پہنچے اور یہ سارا واقعہ حرف بہ حرف ان کے سامنے دہرایا۔ پادری نے ریذیڈنٹ کی معرفت اس کا انسداد کروایا۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ـــــ "یہ آپ میری خوش قسمتی سمجھیں یا بدقسمتی۔ میرے سر پر انگریزوں کی تہذیب کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ اس لئے میں حسبِ دستور مدرسے میں کام سرانجام دیتے رہا۔" اسی انگریزی تہذیب کے شوق میں حسن علی نے انگریزی لباس بھی پہننا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ اس پر بھی ان کے کرسٹان بن جانے کا بہت چرچا ہوا۔

انگریزوں کے ساتھ رہ کر کام کرنے کی وجہ سے، حسن ابن علی، ان کی طرزِ معاشرت طریقہ کار اور مغربی علوم کی افادیت سے بخوبی واقف ہو چکے تھے اور اپنی تصانیف میں جگہ جگہ اس بارے میں اظہارِ خیال بھی کیا ہے۔ مثلاً "میزان التحقیق" کے ابتدائی حصے میں وہ لکھتے ہیں:

"یہ امر کالشمس فی النہار آشکارا ہے کہ اس زمانۂ شریف و عہدِ مسعود میں کہ بہترین جہود اور خوشترین سنین تصور کیا جاتا ہے کیسے علوم غربیہ و فنونِ شریفہ ظاہر ہو کر بنی نوع انسان میں عقلِ انسانی نے کیا عروج کیا ہے جس سے "ولقد کرمنا بنی آدم"، کی بہار جلوہ گر ہو گئی ہے۔ طالب علموں نے علومِ متنوعہ مثل ہندسہ

ہیئت وحکمت وکلام وغیرہ معقولات میں یہاں تک ترقی کی ہے

کہ ازبہ خلقت اشرف المخلوقات افراد بشر کے اجسام پر بہت اچھا

معلوم ہوتا ہے اور اس ترقی علم کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کیسے آلات

غریبہ واشیائے عجیبہ ایجاد ہو گئے ہیں جو کہ متقدمین کے جمہور

حکما کے ذہن ادراک سے خارج تھے۔ غرض وہ فوائد وعواید،

حکمائے یونان کو بھی کہاں نصیب ہوئے، جن سے آجکل انگریزی

حکومت کی بدولت .... لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ اس میں کچھ

جائے مبالغہ نہیں کہ اگر حکمائے سلف مثل سقراط و بقراط وغیرہم

آج دنیا میں ہوتے تو طالب علم بن کر انگریزی مدارس میں تعلیم

پاتے۔"

آگے علم کی اہمیت بتائی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ علوم عقلیہ کی ترقی نے لوگوں کے خیالات کو مرکز اعتدال سے منحرف بھی کر دیا ہے نئے علوم کی افادیت کے اسی شعور نے انہیں ان کے سیکھنے پر ابھارا تھا:

"درعلوم عقلیہ مثل ہندسہ و فلسفہ و ہیئت و نجوم ہم از شوق و

ذوق خود عبوری دارم چہ انسان بے علم حکم دواب است۔ و

آموختن زبان چیزی دیگر است و علم چیزی دیگر ....."

حسن علی کی ساری زندگی، اس طرح طلب علم اور اس کے ساتھ ساتھ قوم کی فلاح وبہبودی کے وسائل سوچنے میں گذری۔ خودنوشت میں لکھتے ہیں:

"مگر از دیدن حالات و زوال قوم خود بسیار کبیدہ خاطر ہستم،

چراکہ در لیاقت علمی و اخلاقی بسیار پست شدہ اند، چند بار

بذرایع مختلفہ در اصلاح قوم خود ساعی شدہ بودم لیکن

انسوس کسے بر سخن من گوش نکرد وہم خیال من نشدہ۔"

اس سے ایک سال پہلے خاص طور پر شیعان کشمیر کی ہدایت کے لئے انہوں نے مولوی حیدر علی کے ساتھ مل کر انجمن امامیہ قائم کی تھی جس کے بارے میں بتایا ہے کہ ۔۔۔ " از مخالفت سران قوم ترقی انجمن نشدہ۔" انہیں اس کا بھی احساس تھا کہ اصلاحی مساعی کی ہر زمانے میں مخالفت ہوتی رہی ہے۔۔ " ایں گونہ مخالفت در ہر زمانہ مصلحان را پیش آمدہ است ۔۔ " اس شعور نے انہیں آخری عمر تک فلاحی کاموں میں مصروف رکھا۔ چنانچہ ان کا تصنیفی سلسلہ بھی اسی سعی کا ایک اہم رُخ تھا۔

اُردو، فارسی اور کشمیری میں حسن ابن علی نے کئی قابلِ قدر تصانیف چھوڑی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی مضامین بھی لکھے تھے۔ خود نوشت میں رقمطراز ہیں:

" در علمِ کلام ومباحثہ بالنصاریٰ ہم زمانے صرف کردم و در دینیات مضامین متعددہ در اخبار و رسایل نوشتہ ام۔"

ان کی اہم تصنیف " میزان التحقیق " نصاریٰ کے اسلام پر اعتراضات کی متضمن تصانیف کے جواب میں لکھی تھی۔ ان تصانیف میں پادری فنڈر کی " میزان الحق " اور " مفتاح الاسرار " پادری عماد الدین کی " ہدایت المسلمین " اور " نغمہ طنبوری " " تواریخ محمدی " تحقیق الایمان " مولوی صفدر علی کی " نیا زمانہ " اور " نبی معصوم " اور ایک ہفتہ وار اخبار میں " خطوط بنام جوانانِ ہند " کے نام سے جو سلسلہ شایع ہوتا رہا ہے۔ ان سب کا مطالعہ حسن علی نے کیا تھا۔ اسلام پر معتبر تصانیف کے حوالے سے مذکورہ کتاب تین سال کی محنت سے پہلے کشمیری میں لکھی تھی اور بعد میں خود اس کا ترجمہ اُردو میں بھی کیا۔ یہ کتاب،

دو جلدوں پر مشتمل ہے اور عالمانہ کارنامہ ہے۔ اس کو پڑھ کر سرسید احمد خان کے "خطبات احمدیہ" اور تفاسیر احمدیہ کا خیال ذہن میں آجاتا ہے۔

حسن ابن علی کا دوسرا اہم کارنامہ ان کی یادداشتیں یا ڈائری ہے، جو "واقعات کشمیر" کے نام سے موسوم ہے اور ۱۳۰۵ ام (۱۸۸۶ء) سے لکھی جانے لگی تھی۔ اور ہر سال کے حساب سے ایک ایک جلد پر منقسم ہے۔ اسی طرح ۱۳۲۹ — ام ۱۹۱۱ء تک اس کی چوبیس جلدیں ہوتی ہیں لیکن ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۲ء سے ۱۳۲۱ھ ۱۶۰۳ء تک کی بارہ جلدیں خوشخط لکھی ہوئی اور باقی متفرق مسودوں کی شکل میں ملتی ہیں۔ ہر سال کے ارکان حکومت اور عہدیداروں کی فہرست درج کرنے اور اہم واقعات کو لکھ کر ان پر تبصرہ کرنے کا بھی التزام کیا ہے۔ اس طرح یہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغازی برسوں میں ریاست کے اہم سوانحات کا یادگار کارنامہ بن گیا ہے۔ جس سے ان برسوں میں کشمیر کی سماجی، سیاسی اور ذہنی زندگی کے بڑے مستند حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ڈائری میں جگہ جگہ ایسے اشارے بھی ملتے ہیں، جن سے انگریزوں کی حکومت کے قیام اور انگریزی تعلیم کی اشاعت سے نوجوان نسل کے ذہنوں میں جو نئے خیالات کی پرورش ہو رہی تھی، ان پر بھی بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہو سکا کہ حسن ابن علی روشن دماغ اور حساس دل انسان تھے اور انہیں ایک ٹوہ تھی۔ ہر نئے سال کی جلد کو سلسلہ کلام برقرار رکھنے کے لئے، وہ پچھلے سال کے واقعات پر نظر واپسیں سے شروع کرتے ہیں اور ان میں سے بعض میں سرسید احمد خان کے "تہذیب الاخلاق" کے بعض تبصروں کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ جلد ششم ۱۳۱۰- کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:-

"۱۳۰۹ ہجری جس کو سال مجموعہ آفات کہنا، موزوں نہ ہوگا، ہم سے

نکل گیا۔ اور سال ۱۳۱۰ شروع ہوا۔ اور ہماری زندگی کے برس اور ایام اسی طرح نکلتے جاتے ہیں اور ہم اس کے لئے کچھ خیال بھی نہیں کرتے۔"

اسی سال جولائی کے مہینے میں سپین کے سمندر میں ایک ستارے کے ٹوٹ کر گرنے کا واقعہ درج کیا ہے:۔

"کہتے ہیں کہ جب یہ ستارہ آسمان سے گرا تو بڑی سخت صدا ہوئی اور اس کے سفید گرم جسم سے بڑی دور تک زمین اور سمندر پر روشنی ہوئی۔ جب یہ پانی پر پڑا تو بڑی بھاری بھیانک بھاپ کے بادل اوٹھے اور اُبلنے کی آواز دور تک سنائی دیتی رہی۔ پانی کی بہت سی مقدار اونچی اُچھلی تھی اور دور سے دیکھنے والوں کے لئے عجیب خوبصورت نظارہ تھا۔ اتنی بڑی پانی کی مقدار، سفید بجلی کی روشنی سے چمکتی ہوئی۔ یہ ستارہ اتنا بڑا ہے کہ سمندر میں پانی سے ۱۲ فٹ ہے، دور سے یہ چمکیلے پتھر کی چٹان دکھائی دیتی ہے۔ عالموں کو اس سے بڑا فائدہ ہے اور تیاری کر رہے ہیں کہ اس کی تحقیقات کریں۔ مکہ معظمہ کا حجر اسود بھی اسی قسم کا ہے۔ فقط۔"

اس سال کے واقعات میں یورپ کے فلاسفر کی اس تحقیق کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ آفتاب کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے۔ ۲۳۔ اکتوبر ۱۸۹۲ء کے اندراج میں جموں سے کشمیر تک ریلوے لائن تعمیر کرنے کی تجویز کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔

پندرہویں جلد میں مرزا غلام احمد قادیانی کے عروج کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے عقاید پر بحث کرتے ہوئے اپنے ان خطوط کی نقل درج کی جو مرزا صاحب کو لکھے گئے تھے۔ اس ساری بحث کو پھیلا کر کئی صفحوں پر لکھا ہے۔

جولائی ۱۸۹۳ء کے ایک اندراج میں سیلاب کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مہاراجہ نے بڑی بے حسی دکھائی، ایک اگلے گورنر دیوان لچھمن داس کو یاد کیا ہے کہ اس وقت وہ ہوتے تو بہت اچھا انتظام کرتے۔ ۱۲۔ اکتوبر کی یادداشت میں عہدہ داروں کی لوٹ کھسوٹ پر تبصرہ کیا ہے۔ ۱۰ دسمبر کے اندراج میں فتح کدل کی تعمیر کی تکمیل کا ذکر کیا ہے اور اس کے مصارف کا تخمینہ دو ہزار سات سو روپیہ بتلائے ہیں۔ ماہ فروری ۱۸۹۴ء کے اندراجات میں ایک لطیفہ بھی لکھا ہے کہ:

"یورپ میں ایک منجم نے جس کا نام اوڈلف فارب ہے از روئے حساب علم نجوم یہ پیشین گوئی کی ہے کہ بتاریخ ۱۴ ماہ نومبر ۱۸۹۹ء کو دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اوس نے حال میں اپنے لکچر میں یہ بیان کیا کہ "ایک غضبناک سیارہ ۱۸۶۶ء میں وجود میں آیا تھا۔ اب ۱۸۹۹ء میں پھر ظاہر ہوگا اور ۱۳ نومبر ۹۹ء یا ایک آدھ دن کے پھیر میں کرہ دنیا سے آملے گا۔ اگر دنیا کا خاتمہ نہ ہوا تو یہ ضرور ہوگا کہ ۱۳، ۱۴، ۱۵ نومبر کے ۲ بجے سے ۵ بجے صبح تک ستارے بڑے بڑے برف کے ٹکڑوں کی مانند آسمان سے گریں گے۔"

بعد کے اندراجات میں یہ لکھا ہے کہ ۱۳۔ نومبر سے پہلے لوگ ایسے خائف تھے کہ راتوں کو نیند حرام ہوگئی تھی۔ خود مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنے محلات اور خدم و حشم کے ساتھ اس تاریخ سے پہلے کشمیر آگئے تھے، کیونکہ منجموں نے کشمیر کو قدرے محفوظ بتایا تھا۔ ۱۳۔ نومبر کا دن اور رات گذر گئی اور کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ اس پر منجموں کا بڑا مضحکہ اڑایا ہے۔ جون ۱۸۹۹ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ایک حکم کا تذکرہ کیا ہے، جس کی رو سے کشمیر کی ساری زمینیں اور جائیداد منقولہ و غیر منقولہ مہاراجہ کی ... قرار دی گئی تھیں۔ اور مالک صرف قابض بنائے گئے تھے اور اس

کا سبب یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ان کے دادا، گلاب سنگھ نے کشمیر کو روپوں کے عوض خریدا تھا۔ اس پر طرفہ یہ ہے کہ جتنے ہم عصر واقعات تحریر کرنے والے ہیں، مورخ یا اخبار نویس، سبھوں کی تحریرات اناپ شناپ سے۔ سبب یہ ہے کہ ہر ایک ان میں سے خواہ بہ سبب ملازمت یا بموجب طمع کسی نہ کسی نفسی غرض میں مبتلا ہے، اس واسطے ہر ایک لکھنے والا جس کا کھاتا ہے اوس کے راگ گاتا ہے۔"

۱۸۹۸ء کے سال کے واقعات میں پنڈت ہرگوپال خستہ کے مولوی یحییٰ شاہ کو پیٹنے اور قرآن کی مبینہ بے حرمتی اور ان کے خلاف مقدمہ کی تفصیلات لکھی ہیں، جن کی طرف اس کتاب کی اسی جلد میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ۹ ماہ اکتوبر ۱۸۹۹ کو انگریزی مشن اسکول کے سالانہ جلسہ کا ذکر لکھا ہے۔ جو گگری بل میں منعقد ہوا تھا اور جس میں لفٹننٹ گورنر پنجاب نے شرکت کی تھی۔ نومبر ۱۹۰۱ء کے اندراج میں کشمیر کی بدحالی پر آنسو بہائے ہیں کہ ——— "آجکل کشمیر و اہل کشمیر بسبب ظلم حکام اس قدر خراب احوال ہیں کہ خداوند کریم کسی ملک کو نصیب نہ کرے۔ ...... انگریز بھی تماشا دیکھ رہے ہیں اور ملازمان ریاست کو خوب دست تعدی دراز کرنے کا موقع ملا ہے۔" آگے اس بدحالی کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے:

۲۵۔ اگست ۱۸۹۸ء کے اندراجات میں ایک اندراج مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور راجہ امر سنگھ کے کونسل کے ارکان کے ساتھ، مشن اسکول کے معاینہ کے لئے جانے کے بارے میں ہے اور لکھا ہے کہ ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے مجھے افسر مدرسہ نے اُردو میں تقریر لکھ رکھنے کے لئے کہا تھا۔ کیونکہ مہاراجہ انگریزی میں ایک معمولی لیاقت رکھتے ہیں۔ یہ تقریر اس باب کے آخر میں درج ہے۔ ایک اور تاثر مہاراجہ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ:

"مہاراجہ صاحب کی طبیعت حکومت کے لائق نہیں کیونکہ جس

دن وہ انگریزی مدرسہ میں تشریف لائے تھے راقم الحروف کو ایک
عُمدہ موقع مِلا کہ رو در رو کھڑے ہو کر مشاہدہ عینی سے ان کے
حالات اور ان کی تقریر اور اُن کی حرکات پر ایک محیط نظر ڈالے۔
ان کی طبیعت سادہ وضع اور نہایت سیدھی سادی ہے اور اس
طبیعت اور اس مزاج سے حکومت کا انتظام ہرگز نہیں ہو سکتا۔"
اس کے مقابلے یہ لکھا ہے کہ ـــ " ہاں البتہ حوصلۂ حکومت راجہ امر سنگھ میں موجود ہے۔
مگر افسوس ہے کہ وہ رعایا پرور نہیں ۔"

اسی طرح کئی اندراج ایسے دِلچسپ اور معلومات سے پُر ہیں کہ ان کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اکثر تبصرہ دِلچسپ ہیں اور جہاں انہوں نے خود تبصرہ نہیں کیا ہے، واقعات خود تبصرہ بن جاتے ہیں۔ اس نوع کے کارنامے اور شخصی تاثرات بہت دِلچسپ ہوتے ہیں مگر ایسے کارنامے اُردو میں بہت کم ہیں۔

حسن ابن علی کی دوسری تصانیف میں ایک رسالہ " عصمت الانبیاء " بھی ہے۔ یہ رسالہ " نبئ معصوم " کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ شفاعت صرف حضرتِ یسوع مسیح کر سکتے ہیں جو نبی معصوم ہیں۔ اور بعض انبیاء کے معصوم نہ ہونے کے بارے میں قرآن سے دلیلیں پیش کی ہیں۔ پادری نے حسن ابن علی سے اس کا جواب چاہا انہوں نے عذر کیا کہ مجھے لکھنے کی فرصت نہیں، ہاں چند روز کچھ گھنٹے ساتھ بیٹھیں تو اس بارے میں بات چیت ہو سکے گی۔ لیکن پادری اس پر راضی نہیں ہوا۔ آخر انجیل اور دوسرے صحایف کی مدد سے یہ رسالہ تیار کیا گیا۔ "ہیئت" پر ایک کتاب فارسی میں " آئینہ ہیئت " کے نام سے لکھی ہے اور یہ بھی عالمانہ کارنامہ ہے۔ " جامع عباسی " کا ترجمہ بھی کشمیری میں کیا تھا اور کشمیری میں حافظ نذیر احمد کی " توبتہ النصوح " کا بھی ترجمہ کیا تھا۔

کشمیری زبان سکھانے کے مقصد سے بھی حسن ابن علی نے رسالے مرتب کئے تھے، اور ان میں خاص طور پر کشمیر کی مخصوص اصوات کے لئے فارسی حروف میں نقطے اضافے کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔

حسن ابن علی اُردو بہت صاف ستھری لکھتے تھے۔ اکثر جگہ ان کا انداز عالمانہ ہے اور کہیں کہیں ان کی تحریروں میں ادیبانہ جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ وہ کشمیر سے باہر نہیں گئے تھے اور کشمیر میں رہ کر ایسی اچھی اُردو لکھنے پر قدرت حاصل کرلی تھی کہ بعض وقت خود ہندوستان کے اُردو مرکزوں کے بہت سے لکھنے والوں کے یہاں بھی ایسی عبارتوں کے نمونے کم ملتے ہیں۔

حسن ابن علی کے فرزند، منشی محمد اسحٰق بھی اُردو میں کئی رسالوں کے مصنف ہیں۔ ان کا تذکرہ اگلے باب میں آرہا ہے۔ ان کا انتقال ۱۳۴۳ھ میں ۶۵ برس کی عمر میں ہوا۔ آخری زمانے میں حضرتِ علیؑ کے حالات پر ایک کتاب کی تصنیف میں مصروف تھے۔

اس زمانے میں کشمیر کے مسلم علماء میں، مولوی محمد عبداللہ وکیل بڑا پایہ رکھتے تھے۔ وہ عربی، فارسی اور اُردو کے عالم تھے لیکن ان کی بڑی اہم خصوصیت "ان کی آزادیٔ فکر تھی۔ چنانچہ پہلے وہ اہلِ حدیث کے مسلک پر چلتے تھے لیکن بعد میں مولوی نورالدین قادیانی کے شاگرد ہو گئے تھے۔ جن کا تذکرہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے "نورتن" میں گذر چکا ہے۔ مولوی نورالدین میرزا غلام احمد کے خلیفہ تھے۔ اور میرزا صاحب کے انتقال کے بعد وہ ان کے جانشین ہوئے۔ لیکن مسلک کی دو شاخیں ہو گئی تھیں۔ ایک قادیان کی شاخ، دوسری لاہور کی شاخ۔ مولوی محمد عبداللہ نے دوسرے مسلک کو اختیار کیا تھا۔ لیکن اس پر بھی وہ آخر تک قائم نہیں رہے۔ بلکہ آخری زمانے میں بہائی مسلک کے پیرو ہو گئے تھے۔ ان کا قیام پہلے سری نگر میں

کاہمگری مسجد کے قریب تھا جس کے ایک کمرہ میں وہ درس دیتے تھے۔ وہ بڑے فصیح بیان مقرر بھی تھے۔ کشمیری اور اُردو دونوں زبانوں میں بڑی روانی سے تقریر کرتے تھے۔ ان کے درسوں میں لوگوں کی بھاری تعداد شریک ہوتی تھی۔ بعض وقت جب مجمع زیادہ ہو جاتا تو لوگ سڑک پر بیٹھ کر ان کی تقریر سُنتے تھے۔

اس زمانے کی بعض تحریروں سے مولوی محمد عبداللہ کی گوناگوں مساعی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی قایدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے فطرتاً اجتماعی معاملات میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔ ۱۳ رجولائی ۱۹۳۱ء کے یادگار مقدمہ کی پیروی انہوں نے کی تھی۔ جس میں عبدالقدیر پنجابی[1] کے خلاف بغاوت کا الزام لگایا گیا تھا۔ عدالت میں مسلمانوں کے ہجوم کے ڈر سے ۱۳ جولائی کی سماعت سنٹرل جیل میں مقرر کی گئی تھی۔ لیکن وقت سے پہلے ہی مسلمان وہاں بھی بڑی تعداد میں پہنچ گئے تھے اور جیل میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ مولوی عبداللہ نے انہیں سمجھا بجھا کر، ظہر کی نماز ادا کرنے پر آمادہ کر لیا۔ لیکن اس دوران ہجوم جیل کا پھاٹک توڑ کر اندر گھس گیا۔ اس پر فوج نے گولی چلائی تھی اور کوئی سترہ اٹھارہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔ ۱۳ جولائی کا دن انہیں شہیدوں کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اس کے بعد جذبات جیسے مشتعل ہو گئے تھے اور جیسی افواہیں پھیلائی جا رہی تھیں ان کو فرو کرنے میں بھی مولوی عبداللہ نے بڑا کام کیا۔ امن کے مقصد سے رضاکاروں کی جماعت تشکیل دی اور جب ۱۵ اگست کو مہاراجہ نے مسلمانوں کی شکایات سننے کیلئے شیر گڈھی میں دربار منعقد کیا انہیں بھی دعوت دی گئی اور مہاراجہ کے برابر میر واعظ رسول شاہ[2] اور میر واعظ ہمدانی کے بعد انکی نشست مقرر کی گئی تھی۔

مولوی عبداللہ کے خاندان میں آزاد خیالی، تحریر اور تقریر کا ملکہ قومی خدمت کا جذبہ خداداد تھا۔ چنانچہ ان کے فرزند محمد ایوب[3] صابر اچھے انشا پرداز ہیں۔ وہ

---

[1] - عبدالقدیر کے زاد و بوم کے متعلق کئی بیانات ملتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ رام پور کے تھے، پشاور کے تھے یا امروہہ کے تھے۔ پنجاب سے اُن کی نسبت اس سلسلے کا نیا اضافہ ہے۔ [2] - میر غلام رسول شاہ اُس وقت برس ہا برس پہلے انتقال کر چکے تھے۔ یہ نشست میر واعظ یوسف شاہ کیلئے مخصوص تھی۔ [3] - صابر صاحب کئی برس پہلے پاکستان میں انتقال کر چکے ہیں۔ (ٹینگ)

جب سری نگر میں تھے ایک ہفتہ وار "البرق" کے نام سے نکالا کرتے تھے۔ مولوی عبداللہ کے پوتے شمیم احمد شمیم اڈیٹر "آئینہ" میں بھی دادا کے سارے اوصاف وراثتاً منتقل ہوئے ہیں[1]۔ مولوی عبداللہ اپنی قومی خدمات کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے کچھ رسالے بھی لکھے تھے۔

پیرزادہ محمد حسین عارف کا خاندان جموں سے تھا۔ انھوں نے لاہور میں تعلیم پائی تھی اور ریاست میں عدالت کے جج ہو گئے تھے۔ انہیں خان بہادر اور سی۔ آئی ای کے اعزاز بھی عطا ہوئے تھے۔ قانونی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ، انہیں شعر و ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ ان کی ایک نظم جو "آئینہ کشمیر" کے عنوان سے لکھی گئی تھی۔ بہت معرکتہ الآرا ثابت ہوئی۔ یہ نظم انھوں نے راولپنڈی سے اپنے سفر سری نگر، یہاں کے فطری مناظر اور عوام کے رہن سہن کے طریقوں کے بارے میں لکھی تھی۔ نظم کا عام انداز اخلاقی ہے۔ یہ نظم اکتوبر ۱۹۰۶ء کے "مخزن" (لاہور) میں اڈیٹر سر شیخ عبدالقادر کے ایک نوٹ کے ساتھ "خطۂ بے نظیر کشمیر" کے عنوان سے چھپی تھی۔ اڈیٹر کا نوٹ حسب ذیل ہے:

"ہمارے مکرم خاں صاحب پیرزادہ محمد حسین صاحب ام۔ اے حال میں ہی بہ عہدۂ ججی کشمیر میں مامور ہو کر تشریف لے گئے ہیں اور وہاں کے حالات اور مناظر کا جو اثر ان کے دل پر ہوا۔ اسے ذیل کی نظم میں ظاہر کیا ہے۔ گو یہ نظم اخبارات میں بھی اتفاق سے چھپ چکی ہے۔ لیکن صحیح نہیں چھپی۔ اب پیرزادہ صاحب نے اسے نظر ثانی فرما کر "مخزن" میں درج کرنے کیلئے روانہ فرمایا ہے۔"

نظم طویل ستر اشعار کی ہے۔ پیرزادہ نے تانگہ پر سفر کیا تھا، سفر جیسا تھا مخدوش اس کا حال اس شعر میں بیان کیا ہے:

---

[1] شمیم صاحب اول مئی ۱۹۸۰ء کو ۵۴ سال کی عمر میں سرینگر میں انتقال کر گئے ہیں۔

نہ پوچھو میری کیا حالت تھی اس دم دل کی دھڑکن کی
اگر تانگہ کوئی ٹوٹا ہوا کھڈ میں پڑا دیکھا

بارہمولہ سے آگے دریائے جہلم بڑے زور شور سے بہتا ہے۔ اس کا منظر بیان کرتے ہیں:

کبھی اس کے دہن میں جھاگ دیکھے مثلِ مستوں کے
کبھی چلتا ہوا خاموش مثلِ پارسا دیکھا

کشمیر کے "تیرتے کھیت" یہاں کی انوکھی چیز ہیں۔ عارف کو ان کھیتوں نے اچنبے میں ڈالا تھا۔ کہتے ہیں:

پڑھا تھا یہ کہ گھر اور کھیت ہیں سب غیر منقولہ
مگر گھر اور کھیتوں کو یہاں چلتا ہوا دیکھا

اس شعر میں "گھر" سے مراد "ہاؤز بوٹ" ہیں۔ اہلِ کشمیر کے حسن و خوبصورتی کے ساتھ ان کے لباس اور ان کے بعض طریقوں کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا ہے۔

ہیں حسن و رنگ میں مشہورِ عالم یہاں کے باشندے
لباس ان کا مگر میں نے بہت ہی بدنما دیکھا
سوا اک ڈھیلے کُرتے کے گلوں سے لے کے ٹخنے تک
بجز رومال سر کے اور نہ کوئی پارچہ دیکھا
نہ آسائش نہ زیبائش نہ پردہ اور نہ حفظِ تن
نہیں معلوم کیا واضع نے اس میں فایدہ دیکھا
رواں گھر گھر میں ہے پانی، اگر دھوتے ہیں کم کپڑے
ہزاروں میں کسی اک کے نہ کپڑوں کو صفا دیکھا
میسر ہو نہ کھانے کو تو کچھ پرواہ نہیں ان کو
مگر وہ باش و شہری کو فدائے آب چائے دیکھا[1]

---

[1] - شاید کشمیر کی مشہور نمکین چائے سے مراد ہے۔

پھر وہ وعظ و پند کی طرف مائل ہو جاتے ہیں:

علاوہ صرفِ بے جا کے ہے یہ نقصان اس چار میں
کہ چہروں پر جو رنگت تھی اسے بالکل اُڑا دیکھا
علاج اس ذلّت و افلاس کا پوچھ اگر مجھ سے
تو چلنت نسخہ اس کے واسطے تعلیم کا دیکھا

پنڈت سالگرام سالکؔ بہ حیثیت وکیل کے عارف سے مُتعارف تھے۔ یہ نظم جب چھپ کر آئی، تو عارفؔ نے رسالہ "مخزن" انہیں پڑھنے کو دیا۔ سالکؔ کو نظم کے وہ حصّے جن میں عارف نے لباس وغیرہ پر تنقید کی تھی، پسند نہیں آئے، اور اس کا جواب انہوں نے اسی زمین میں لکھا تھا۔ سالکؔ کی نظم بھی بہت طویل ہے۔ اس کے کچھ شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

تماشا حضرتِ عارفؔ نے جو کشمیر میں دیکھا!
بشکلِ نظم ہم نے اس کو مخزن میں چھپا دیکھا
لباسِ بد نما کا عیب کیوں ہم پر لگاتے ہو
کہیں جامۂ فقیروں کا کسی نے خوش نما دیکھا

سالکؔ کی نظم کا انداز آگے سیاسی ہو جاتا ہے اور وہ "لباسِ بدنما" اور افلاس کا الزام کشمیر کے مطلق العنان حکمرانوں کے سر تھوپتے ہیں۔ لیکن ڈوگرا راج کی ثناء خوانی کرتے ہیں۔ سالکؔ کی ڈائری میں اس نظم کے نیچے یہ جملہ بھی لکھا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایک شعر بھی:

"عارفؔ، پیرزادہ محمد حسین خان جج ہائیکورٹ کا تخلص تھا۔ اور یہ شخص متعصب تھا"

کر کے دور تعصب دل سے رہنا جب ہے حکمِ خدا عارف ہو کر قدر نہ جانے سالکؔ کی نوبت ہی کیا

کسی اور شاعر نے بھی اس کا جواب لکھا تھا جو "ح۔ د" کے نام سے منشی محمد الدین فوق کے "کشمیری میگزین" (اپریل ۱۹۰۸) میں شایع ہوا تھا۔ اس کے دو شعر ذیل میں منقول ہیں:

یہ نظارہ مگر کشمیر کا ہے اک رُخِ روشن
ہے عارف وہ رُخِ تاریک کو بھی جس نے پا دیکھا
ہے اس اجڑے نگر کا رنگ خونِ دل سا باطن میں
بظاہر سبز حضرت نے جسے مثلِ حنا دیکھا

عارف نے کشمیر کے مشہور صوفی بزرگ ، بابا داؤد خاکیؒ کے قصیدہ وردالمریدین کا اُردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ بابا داؤد خاکی حضرتِ مخدوم شیخ حمزہ کشمیریؒ کے معتقدین میں سے تھے اور خود اونچے درجے کے صوفی، عالم اور فارسی کے شاعر تھے۔ قصیدہ وردالمُریدین انھوں نے اپنے پیر کی منقبت میں کہا تھا۔ اور بعد میں اس کی شرح بھی فارسی میں لکھی تھی۔ عارف کا اُردو ترجمہ ادارہ سلطانیہ کے زیرِ اہتمام شایع ہو رہا ہے۔[1]

عارف نے لالہ سریرام کے تذکرہ اُردو شعراء "خمخانہ جاوید" پر ایک تقریظ بھی لکھی ہے۔ یہ ان کی نثر کا نمونہ ہے۔ یہ تقریظ ۱۹۰۸ء کی مرقومہ ہے اور دوسری جلد میں شامل ہے۔ لالہ سریرام کی محنت کو سراہتے ہوئے عارف لکھتے ہیں:

"سچ پوچھو تو مصنف نے اپنے دوست سید احمد دہلوی مصنف فرہنگِ آصفیہ سے کچھ کم کام نہیں کیا ہے بلکہ اس کتاب کو اس ڈکشنری کا ایک ضروری جوڑا سمجھنا چاہیئے۔"

---

[1] یہ اُردو ترجمہ بقعہ حضرت سلطان مخدوم سرینگر کے اہتمام سے کئی سال پہلے شایع ہو کر آ گیا ہے۔

اس عہد کے صاحب ذوق اصحاب ہیں، جن کا کشمیر کی ادبی زندگی پر بڑا اثر پڑا، منشی سراج الدین احمد خان بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق کشمیر کے ایک ممتاز خاندان سے تھا جو "ڈار" کہلاتا ہے۔ اس خاندان کے ایک فرد یحییٰ ڈار کی اولاد میں جعفر ڈار گذرے ہیں جن کا لڑکا رمضان ڈار کشمیر سے لاہور چلا گیا تھا۔ اس کے بڑے فرزند منشی محمد اسمٰعیل ڈار نے لاہور میں تعلیم حاصل کی اور وہیں وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ منشی سراج الدین اسی کے فرزند تھے۔ منشی محمد اسماعیل ڈار کا انتقال ۱۸۹۴ء میں ہوا۔

منشی سراج الدین احمد خان نے سیالکوٹ میں تعلیم پائی اور علامہ اقبالؒ کے ہمعصر رہے۔ اُسی زمانے سے اقبال میں اور ان میں راہ و رسم ہوگئی تھی جو آخر تک قائم رہی۔ منشی سراج الدین تعلیم ختم کرنے کے بعد کشمیر لوٹ آئے اور فارسی انشاء پردازی میں اپنی مہارت کی وجہ سے ریاست کے ریذیڈنٹ کے دفتر میں منشی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ منشی سراج الدین شعر و سخن کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ اس زمانے تک کشمیر میں اور خاص طور پر مسلمانوں کو عام طور پر کوئی انجمن قائم کرنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اس لئے ریذیڈنسی میں منشی صاحب نے ایک انجمن مفرح القلوب کے نام سے قائم کی۔ اتفاق سے اس زمانے میں ریزیڈنسی میں کئی منشی ایسے تھے، جو شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ وہ سب انجمن مفرح القلوب میں شریک ہو گئے اور ریذیڈنسی سے باہر کے اصحاب ذوق بھی اس کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ بعد میں انجمن کے جلسے ریذیڈنسی تک محدود نہیں رہے تھے بلکہ شہر میں، خود منشی صاحب کے مکان پر بھی منعقد ہوتے تھے۔ اور ان جلسوں میں میرزا سعد الدین سعد، چودھری خوشی محمد ناظر، اور دوسرے سارے صاحب ذوق ادیب اور شاعر شرکت کرتے اور اپنے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ انجمن ایک اچھا ثقافتی ادارہ بن گئی تھی اور اس کا محور اور اس کی روح رواں خود منشی صاحب تھے۔

اسی زمانے میں باہر سے جو علماء اور ادیب اور شاعر کشمیر آتے، ان کے اعزاز میں بھی انجمن کے جلسے منعقد ہوتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر سر محمد اقبال، سر شیخ عبدالقادر، سر محمد شفیع، جسٹس شاہ دین ہمایوں جب کبھی کشمیر آتے۔ انجمن کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ ملک نصراللہ عزیز نے جنہیں ان جلسوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا تھا، ایک موقع پر منشی سراج الدین کی سخن فہمی کی داد دیتے ہوئے لکھا تھا:

"بڑے سخن فہم، سخن سنج، وسیع المطالعہ اور زندہ دل انسان ہیں۔"

ملک نصراللہ نے ان محفلوں کے بارے میں جو تفصیل اپنے رسالے "ایشیا" میں لکھی تھی وہ آگے انجمن کے حالات میں درج کی جا رہی ہے۔ منشی سراج الدین احمد خان نے ۱۹۱۳ء میں چودھری خوشی محمد ناظر کی ایک نظم رسالہ "مخزن" میں اشاعت کے لئے ایک نوٹ کے ساتھ بھیجی تھی۔ نوٹ کا ایک حصہ منشی صاحب سے متعلق ہے۔ لکھتے ہیں:

"بندۂ حاضر، بیاض بردارِ انجمن مفرح الارواح، یادش بخیر انجمن مفرح الارواح کا زمانہ تھا، ناظر، حاضر، صادق، کاذب، مشک و عنبر کی مشک افشانی سے کشمیر معطر تھا۔ اربابِ ذوق کے رشحاتِ فیض سے آبِ ڈل پر سحابِ سخن اور یارانِ سرود برستا تھا۔ لدر ویلی اور سندھ ویلی کے سبزہ زاروں اور نسیم و نشاط اور شالامار کے گلزار، اوراقِ مخزن کو گلرنگ کرتے تھے۔ مگر دورِ ایام نے اس مجمع کو پریشان کر دیا اور آبِ ڈل پر سکون کا عالم چھا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرتِ ناظر کا ورود کشمیر جنتِ بے نظیر میں ہوا، مناظر کشمیر کی نگرانی ان کے سپرد ہوئی۔ سبزۂ و گلزار نے شکرانہ ادا کیا۔ اور سرو چنار نے خیر مقدم کیا۔"

"بیاض بردار" کا اشارہ خود منشی صاحب کی طرف ہے، جو انجمن کے معتمد تھے۔ انجمن کا نام مفرح الارواح بھی لکھا گیا ہے۔ اس کی محفلیں موسم بہار میں باغِ نسیم، باغِ نشاط

اور باغ شالامار میں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ اور بعض وقت شکاروں میں یا ڈونگوں میں منعقد کی جاتی تھیں، اور یہ "تیرتے ہوئے مشاعرے" کہلاتے تھے۔

منشی صاحب کا کلام اب دستیاب نہیں ہوتا، لیکن حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شعر کہتے تھے اور احمد تخلص کرتے تھے۔ وہ شیریں بیان مقرر بھی تھے اور نہ صرف کشمیر بلکہ باہر دور دور تک اور لاہور کے ادبی حلقوں میں ان کی جادو بیانی کی دھوم تھی اور لوگ انہیں شعری، ادبی اور علمی محفلوں میں صدارت کے لئے پکڑ پکڑ کر لے جاتے تھے۔ انجمن نصرۃ الاسلام کے بھی منشی صاحب سرگرم رُکن تھے اور اپنی خوش بیانی کی بدولت انجمن کے "ہزار داستان" مشہور ہو گئے تھے۔ تقریر کی طرح ان کی شعر خوانی کا بھی بڑا موثر انداز تھا۔ ساری محفل جھوم اُٹھتی تھی۔

شبلی منشی صاحب کے زمانے میں کشمیر آئے تھے۔ شبلی کے علاوہ اُردو کے مشاہیر ادب، جیسے حالی، نذیر احمد، وغیرہ سے بھی ان کے روابط تھے۔ میر ولی اللہ ایبٹ آبادی بھی ان کے گہرے دوست تھے، اور انجمن کے جلسوں میں شرکت کر چکے تھے۔ اقبال کے ساتھ منشی صاحب کی آخر تک مراسلت رہی۔ اقبال ان کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے اور اپنی ہر تصنیف کو شایع ہوتے ہی منشی صاحب کے پاس بھیجتے تھے۔ جب "اسرارِ خودی" شایع ہوئی اور منشی صاحب کے پاس پہنچی تو انہوں نے اس پر ایک مختصر سی تنقید لکھی اور اقبال کے یہاں بھیجی تھی۔ اسے مرزا غلام حسین بیگ عارف ایڈیٹر "گلریز" نے شایع کر دیا ہے۔ اس مختصر سی تنقید سے منشی صاحب کی علمیت، ادبی ذوق، اور تنقیدی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

"کوئی آٹھ دِن ہوئے، جب میں گلمرگ سے سری نگر آ رہا تھا "اسرارِ خودی" کا ایک نسخہ مجھے مِلا۔ میرے یہاں اربابِ ذوق کا خاصہ مجمع

رہتا ہے۔ چنانچہ ساری مثنوی کو بالاستیعاب چند مجالس میں
میں پڑھا گیا . . . . تصنیف، تصوف، اور تخیل کی سہ گونہ
شیرینی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے . . . . . "

" مثنوی کا موضوع گو عقاید متقدمین کے خلاف ہے، مگر نہایت
لطیف ہے اور جس خوش اسلوبی سے آپ نے اسے بنایا ہے، وہ
مصنف ہی کا حصہ ہے، قدم قدم پر مولوی رومی علیہ الرحمہ کے کلام
کا گماں ہوتا ہے۔ زمانے کی رنگت پہچاننے والے لوگ اس
مثنوی کو پڑھا کریں گے اور سر دھنا کریں گے۔"

" زمانے کے جدید فلسفہ کو جس نازک انداز سے کلام میں مصنف نے
خوبصورت اشعار کی صورت میں ظاہر کیا ہے، یہ کوئی کھیل نہیں ہے۔
اے کاش کوئی رہ شناس منزل اس زمانے میں روے معانی سے
پردہ اٹھا سکتا!"

منشی صاحب کے ان تاثرات کو پڑھنے کے بعد علامہ اقبال نے منشی صاحب کو جو خط لکھا
ہے، اس میں اس مثنوی کی تصنیف اور نئی مثنوی " رموزِ بے خودی " کی تجویز کا تذکرہ
کیا ہے۔ یہ خط عام طور پر شایع نہیں ہوا۔ اس لئے اس کے مختلف حصے یہاں
درج کئے جاتے ہیں :

" مخدومی، اسلام علیکم، آپ کا نوازش نامہ ملا، جس کو پڑھ کر
مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ الحمدُ للہ کہ آپ کو مثنوی پسند ہوئی۔ آپ
ہندوستان کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی
مناسبت ہے۔ اگر نیچر ذرا فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرۂ
شعراء میں پیدا کرتی۔ بہر حال شعر کا صحیح ذوق شاعری سے کم

نہیں۔ بلکہ کم از کم ایک اعتبار سے بہتر ہے، محض ذوقِ شعر رکھنے والا، شعر کا ویسا ہی لطف اُٹھا لیتا ہے۔ جیسا کہ خود شاعر اور تصنیف کی شدید تکلیف اسے اُٹھانی نہیں پڑتی۔"

"یہ مثنوی گذشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی۔ مگر اس طرح کہ کئی مہینوں کے وقفے کے بعد طبیعت مائل ہوتی رہی، چند انوار کے دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے۔ . . . . . اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اپنی موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔ اس کا دوسرا حصّہ بھی ہو گا۔ جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ اس حصّے سے زیادہ لطیف ہو گا، کم از کم مطالب کے اعتبار سے گو زبان اور تخیّل کے اعتبار سے نہیں کہہ سکتا، کیا ہو گا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے، جو اپنے اختیار کی بات نہیں۔"

خط میں اقبال نے مسلمانوں میں مروجہ تصوّف کے بارے میں اپنے ان خیالات کا اعادہ کیا ہے، جو وہ بعض اور موقعوں پر ظاہر کرتے رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشیل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں اس حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوئی۔ صوفیا لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے۔ اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ انشاء اللہ دوسرے حصّے میں دکھاؤں گا کہ تصوّف کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے اور صحابہ کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے۔"

اقبال کے اس خط میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جو کسی صاحب بصیرت انسان کے سوا دوسری کو نہیں لکھ سکتے تھے۔ ہندوستان کے جن صوفیوں کی مخالفت کی طرف خط میں اشارہ کیا ہے، ان میں خواجہ حسن نظامی شامل ہیں۔ جن کے ساتھ اکبر الہ آبادی بھی شامل ہو گئے تھے۔ اقبال کا یہ خط ۴۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کا مکتوب ہے۔ اقبال کے ایک اور خط سے جو ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۱۵ کا لکھا ہوا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ منشی سراج الدین کا خط جو اقبال کا موسومہ تھا، اخبار "زمیندار" میں چھپ گیا تھا۔ غالباً منشی صاحب کو اس کی اشاعت پسند نہیں تھی اور انہوں نے اقبال کی توجہ اپنے خط کے ذریعے اس طرف منعطف کرائی تھی۔ اس کے جواب میں جو ایک معذرت بھی ہے اقبال نے لکھا تھا :

"آپ کا والانامہ ملا، "زمیندار" میں آپ کا خط چھپ جانے کی غلطی کا ذمہ دار کسی حد تک میں خود اور زیادہ تر دفتر زمیندار ہے۔"

"میں نے وہ خط مولوی عمادی صاحب کی خدمت میں اس واسطے ارسال کیا تھا کہ وہ اپنے ریویو میں اس تحریر سے مدد لیں۔ مولوی عمادی اڈیٹر "زمیندار" خود ایک ریویو لکھ رہے ہیں، جو ہنوز ناتمام ہے، مقصد اشاعت نہ تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ غلطی سے وہ تحریر ہی چھاپ دی گئی۔ مجھے اس غلطی کے لئے سخت افسوس ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے ان کو یہ بھی لکھا تھا کہ یہ ریویو ایک پرائیویٹ خط ہے۔ اس میں بعض باتیں پتے کی تھیں، میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب کو ان کے پڑھنے سے مدد ملے گی۔ . . . . . بہر حال اس ندامت کا بوجھ مجھ پر ہے۔"

اقبال کے خط سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ منشی سراج الدین احمد کی رائے کو وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

منشی صاحب کے ذوقِ سلیم کا اندازہ کرتے ہوئے، اس بات کا افسوس ہوتا ہے۔ کہ ان کا تھوڑا سا کلام جو سر انجام ہوا تھا، وہ اب دستیاب نہیں ہوتا۔ اقبال کو غالباً منشی صاحب کی شعر گوئی کا علم نہیں تھا۔ اور اپنے خط کا شایع ہونا، انہیں جب ناگوار ہوا تھا اس کو دیکھتے ہوئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منشی صاحب کو اپنی اشاعت پسند نہیں تھی۔

پروفیسر نندلال کول طالب نے مجھے بتایا کہ منشی صاحب شعر کہتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں لالہ سریرام، مصنف "خمخانۂ جاوید" جب کشمیر تشریف لائے تھے، ان کے اعزاز میں سری پرتاپ کالج، سری نگر میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا اور مشاعرہ میں منشی صاحب نے غزل پڑھی تھی جس کا صرف ایک شعر طالب صاحب کو یاد رہ گیا ہے۔ شعر یہ ہے:

دکھائی ایسی ہمدردی کہ بے کھٹکے رقیبوں نے
سُنا دی داستاں اپنی سمجھ کر رازداں مجھ کو

ایک اور شعر پنڈت جیالال ناظر نے سُنایا:

صحنِ چمن سے اٹھ کر کے یوں بادِ بہاری آتی ہے
جیسے کے دریا سے نہا کر کوئی کنواری آتی ہے

مرزا کمال الدین شیدا پر منشی صاحب کی بزرگانہ شفقتیں تھیں۔ شیدا، منشی صاحب کے محبِ صادق مرزا سعد الدین کے بھتیجے تھے۔ اور انہوں نے اسی زمانے میں شعر گوئی شروع کی تھی۔ شیدا نے ایک نظم جدید انداز کی لکھی تھی۔ جو منشی صاحب کو سُنائی۔ اس پر منشی صاحب بہت خوش ہوئے اور اس کی تعریف بھی کی تھی۔ اصل میں منشی صاحب مرزا سعد الدین کی طرح، ایک ترقی پسند تصور کے عالم اور ادیب تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی ذہنی تربیت، پُرانی روایات میں ہوئی تھی۔ لیکن وہ اپنے عصر کے تقاضوں سے بھی بے خبر نہیں تھے۔

منشی سراج الدین کا انتقال ۱۳۶۰ میں ہوا۔ مادۂ تاریخ، محمد امین درابو داراب نے "قمری باغ ادب" نکالا تھا۔[1] حکومتِ برطانیہ کی جانب سے ان کی خدمات کے اعتراف میں منشی صاحب کو خان بہادر کا خطاب بھی مِلا تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد منشی صاحب اپنے تعمیر کردہ مکان واقع نائو پورہ، بشیر آباد میں مقیم رہے۔ اور ان کے ادبی مشاغل جاری رہے۔ منشی صاحب کے چھوٹے فرزند، امیر الدین کو بھی ادبی ذوق والد سے ورثہ میں مِلا تھا۔ منشی صاحب کے خاندان سے ایک لڑکی اردو شاعر تبسم فلندر کو بیاہی گئی ہے۔

شیخ غلام نقشبند، رسالہ "مخزن" (لاہور) کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں سے تھے۔ جموں ان کا وطن تھا۔ اور رزیڈنسی میں ملازم تھے۔ منشی سراج احمد کی انجمن مفرح القلوب کے یہ بھی سرگرم رُکن تھے۔ شعر و ادب کے علاوہ انہیں علم و فن سے بھی دلچسپی تھی۔ "مخزن" میں انہوں نے "علم" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ ۱۹۰۳ اور بعد کے چند شماروں میں شائع ہوا ہے۔ مضمون میں انہوں نے جدید علوم کی تاریخ کے آغاز کا سُراغ عربوں کی تحقیقات سے جوڑا ہے۔ اور پھر لکھتے ہیں:

"زمانہ کبھی ایک ڈھنگ پر نہیں رہتا۔ ان کی (عربوں کی) قومی ترقی کی بھی ایک عمر تھی، جب وہ عمر ختم ہوئی، زمانہ پلٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی ان کی عقل نے پلٹا کھایا۔ جو عادتیں ترقی کا زینہ ہوا کرتی ہیں، وہ ان سے چھِننے لگیں۔ جو خیالات خضرِ راہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اگر دولت کا سہارا رہتا تو ممکن ہے کہ کچھ دنوں اور اس سڑک پر لنگڑاتے، چلتے۔ مگر دولت پہلے ہی منہ موڑ چکی تھی۔ پھر کیا ہونا ہے۔"

---

[1] ۔ تختِ سلیمان کے دامن میں واقع . . . . مزار میں اُن کے مزار پر یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے . . .

صاحب زادہ محمد عمر جنہوں نے نور الٰہی کے ساتھ مل کر، اُردو ناٹک اور اسٹیج کے موضوع پر یادگار کارنامہ "ناٹک ساگر" لکھا تھا، ان کے اور سردار وزیر محمد خان کے ساتھ شامل ہوکر، نقشبند نے جموں میں بزمِ مشاعرہ قائم کی تھی۔ جس کا تذکرہ آگے اداروں کے ذیل میں آ رہا ہے۔

قاضی عبداللہ خان منظور، بندوبست کے گرداور تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ عرصہ تک لداخ میں بھی رہے۔ انہیں شعر و سخن کا ذوق تھا۔ اور اسی زمانے میں ان کی نظمیں کبھی کبھی رسالہ "مخزن" میں چھپتی تھیں۔ کچھ نظمیں محمد الدین فوق کے "کشمیری میگزین" میں بھی شائع ہوئیں۔ منظور کی ایک نظم جو "انجامِ بہار" کے عنوان سے "مخزن" کے شمارہ اگست ۱۹۱۰ میں شائع ہوئی تھی۔ ذیل میں درج کی جاتی ہے:

مئے بھی تھی، مینا بھی تھا اور ساقیِ میخانہ تھا
بزم تھی آراستہ اور جلوۂ جانانہ تھا
پھول کھلنے سے ہوا سارا چمن رشکِ جناں
بلبلوں کا اس لئے انداز کچھ مستانہ تھا
اپنی خوبی پر تھا اِتراتا ہر اک غنچہ دہاں
قمریوں کا سرو سے برتاو بے باکانہ تھا
جھولتے گل ہائے تر زلفوں کے جھولوں میں تھے
جب کہ خود گلچیں بھی ان کے حسن کا دیوانہ تھا
یک بیک جھونکا ہوائے تند کا آیا وہاں سے
کچھ نہ تھا گویا کہ اک مدت کا وہ ویرانہ تھا

دیکھتے اپنے وہ بکھرا ایسا شیرازہ وہاں
گُل ہوئی وہ شمع جس کا اک جہاں پروانہ تھا
آشیانِ بُلبلِ بیکس جو یوں درہم ہوا
زاغ کا اور بُوم کا اب خاص خلوت خانہ تھا
دیکھ کر یہ حال دِل منظور یوں گویا ہوا
جو کہ دیکھا خواب تھا اور جو سُنا تھا افسانہ تھا

پرتاپ سنگھ کے بھائی راجہ امر سنگھ جن کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ ان کی وفات پر منظور نے ایک مرثیہ لکھا تھا۔ جو کشمیری میگزین میں شایع ہوا۔ مرثیہ کا ایک بند ہے۔

فصل گُل اب ہو چکی رونق پہ ہے بادِ خزاں
ڈھونڈنے پر بھی نہیں مِلتا کسی گُل کا نشاں
شاخہائے تر ہوئی افسردہ خاطر نیم جاں
گویا اپنی بیکسی پر ہو رہی نوحہ خواں
ہے عجب عبرت فزا اس دم بہارِ گلستاں
یاسمن بھی اک طرف لیٹی ہے با آہ و فغاں

سر شیخ عبد القادر کے رفیق اور مخزن کے ابتدائی دور کے ادیبوں میں، چودھری خوشی محمد ناظر کا مقام بلند ہے۔ وہ کشمیر میں گورنر کے عہدہ پر عرصہ تک فائز رہے اور بعد میں وزیر مال بھی ہو گئے تھے۔ کشمیر میں ان کی ملازمت کا آغاز بلتستان کے علاقے سے ہوا۔ جہاں وہ مہتممِ مال تھے اور ڈوگرا حکومت نے انہیں اس عہدہ کے لئے منتخب کیا تھا۔

ناظر کا وطن گجرات (پنجاب) تھا۔ جہاں وہ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔

ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر مولوی نورالدین کے پاس ہوئی تھی اور اعلیٰ تعلیم علی گڈھ میں پائی تھی۔ بی۔ اے کا امتحان ۱۸۹۳ء میں کامیاب کیا تھا۔ علی گڈھ میں قیام کے دوران وہ سرسید احمد خان کی مساعی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ حالی سے اپنے کلام میں اصلاح لی تھی اور شبلی کی صحبتوں سے بھی فیض پایا تھا۔ لاہور لوٹنے کے بعد شیخ عبدالقادر اور سر محمد اقبال کی صحبتوں میں ان کا ذوق شعر و ادب پروان چڑھا۔ شاعری کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ اور ابتدا میں کچھ غزلیں فارسی میں کہی تھیں لیکن جب وہ اُردو میں کہنے لگے تو حالی اور آزاد کی شاعری کو اپنا نمونہ بنایا۔ غزل ناظر نے بہت کم کہی ہے۔ ان کی دو نظمیں "جوگی نامہ" اور "مرثیہ سرسید" ان کی معرکتہ الآرا نظمیں مانی جاتی ہیں۔ اور ان کی بدولت ناظر کی شہرت بام عروج کو پہنچی اور اُردو کے شعراء میں ان کے لئے مقام پیدا ہوا۔

کشمیر میں ناظر کے قیام سے یہاں کی ادبی اور شعری محفلوں میں ایک نئی روح دوڑ گئی تھی۔ منشی سراج الدین احمد خان کی انجمن مفرح القلوب رونق پر تھی۔ اور یہاں کے اچھے لکھنے والوں میں منشی صاحب کے علاوہ میرزا سعدالدین سعد، پنڈت ہرگوپال خستہ، پنڈت سالگرام سالک، مولانا عبدالصمد، مفتی محمد حسین کاشمیری موجود تھے۔ باہر سے بھی مشاہیر شعراء اور ادیب کشمیر آتے رہتے تھے۔ اس طرح شعر و سخن کی خاص طور پر گرم بازاری تھی۔ ناظر کے مراسم ان سب سے گہرے تھے۔ وہ گگری جل محلہ میں اس کوٹھی میں رہتے تھے۔ جس میں اس وقت جناب خواجہ غلام محمد صادق چیف منسٹر کا قیام ہے۔ ایک دفعہ سالک ان کے یہاں ملنے گئے تھے۔ ملازم نے ناظر کو ان کے آنے کی اطلاع دی وہ مصروف تھے اور معذرت چاہی لیکن شاید کسی غلط فہمی کی بناء پر ملازم نے ان سے دو تین منٹ توقّف کرنے کو کہا۔ آخر دو گھنٹے گذر گئے تو سالک گھر لوٹ آئے۔ اور یہ چند اشعار اس واقعہ پر اپنی ڈائری میں لکھے:

سالک جو پاس ان کے پاس ادب سے آیا
دربان ایک دیکھا استادہ ان کے در پر
ان سے رپورٹ ہوئی اندر سے حکم آیا
ہم کام کر رہے ہیں فرصت نہیں دم بھر
لیکن سنانے والا دیکھا عجیب انساں
پیغام لایا ٹھہرو دو تین لمحے باہر
دو تین گھنٹے گذرے پر لمحے دو نہ گذرے
باہر نہ کوئی پرساں ، پرساں نہ کوئی اندر

کشمیر اور کشمیر کے حسین مناظر خاص طور پر جھیل ڈل سے ناظر کو عشق تھا۔ چنانچہ انہوں نے مکان کوہِ تختِ سلیمان کے دامن میں ڈل کے کنارے بنوایا تھا۔ ڈل پر لکھی ہوئی ان کی ایک نظم مشہور و مقبول ہے۔ اس نظم کے کچھ شعر ہیں:

اللہ اللہ ہے کیا حُسن چمن پانی میں
سبزہ و لالہ و گُل سرو سمن پانی میں
تودۂ سیم ہے یہ ڈل کے خزانے میں نہاں
برفِ کہسار ہے یا عکس نگن پانی میں
اک طرف کوہ پہ ہے تختِ سُلیمان قایم
اک طرف سبز پری کا ہے وطن پانی میں
جلوہ برق سے ہے نور کا عالم شب کو
طور منظر ہے مہاراج بھون پانی میں
ہیں شکارے میں یہ چشم بتانِ کشمیر

یا اترتے ہیں غزالانِ خُتن پانی میں

لبِ ڈل آپ بھی کاشانہ بنالیں ناظر

موسم گُل میں رہے لُطف سخن پانی میں

آخری شعر میں، انہوں نے ان مشاعروں اور شعری محفلوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جو انجمن مفرح القلوب کے اہتمام سے کبھی کبھی ان کے مکان پر بھی منعقد کی جاتی تھیں۔ ان محفلوں میں منشی سراج الدین احمد خان کے علاوہ میرزا سعدالدین سعد، پنڈت سالگرام سالک اور مولانا عبدالصمد اور مفتی محمد حسین کاشمیری، جو اس زمانے کے سربرآوردہ صاحبِ ذوق عالم تھے۔ اور کبھی کبھی باہر سے آنے والے شعرا، شریک ہوتے تھے۔ منشی سراج الدین احمد خاں نے "آبِ ڈل پر سحابِ سخن اور بارانِ سرود برستا تھا" کے کنائے میں انہیں نیر نے مشاعروں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چودھری خوشی محمد کا مذاقِ سخن شُستہ تھا۔ حالی اور شبلی کے اثر سے وہ جدید انداز کی شاعری کو بہت پسند کرتے تھے اور سر شیخ عبدالقادر کے ساتھ مل کر "مخزن" کے ذریعے نئی شاعری کو مقبول بنانے میں۔ انہوں نے بھی ہاتھ بٹایا تھا۔ ان کی مشہور نظم "جوگی نامہ" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو جدید دور کی اچھی نظموں میں شمار ہوتا ہے۔

کشمیر سے ناظر کو جو دلی لگاؤ تھا۔ اسکا اظہار اُنکی کئی نظموں سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے ذیل کے اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں:

قسمت پہ اپنی مجھ کو گر اختیار ہوتا
میں گلشنِ جہاں میں نخلِ چنار ہوتا

خرمن سے عاشقوں کے شعلے بلند ہوتے
اور حُسن کی نظر میں برقِ شرار ہوتا

پیری میں میری ہوتا اک رنگِ نوجوانی
فصلِ خزاں بھی میرا رشکِ بہار ہوتا

ناظر نے کچھ غزلیں بھی کہی تھیں اور غزل میں بھی ان کا انداز نکھرا ہوا ہے۔ دو شعر

ذیل میں درج ہیں:

رعنائیٔ خیال کو ٹھہرا دیا گناہ
واعظ بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دور [۱]

اللہ رے حُسنِ یار کی خوبی کہ سر بسر
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام [۲]

ذیل کا اقتباس، کشمیر کی منظری رعنائیوں کا پس منظر رکھتا ہے۔

مستانہ ہوائے گلشن تھی، جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی، وادیٔ ایمن تھی، ہر کوہ پہ جلوہ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی، ہر شاخ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار رباب بنے، ہر سرو سمن پہ ظہور ہوا [۳]
سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزم نشاط سجائی تھی
بن میں، گلشن میں، آنگن میں فرشِ سنجاب و سمور ہوا

ناظر نے ایک نظم "نغمۂ فردوس" کے عنوان سے کہی تھی۔ جس میں شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے عہد کی ایک محفل سرود کا نقشہ کھینچتے ہوئے کشمیر کے بارے میں مشہور فارسی شعر:

اگر فردوس بر روئے زمین است!
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

کی تضمین بڑی خوبی سے کی ہے۔ نظم کے کچھ شعر ہیں:

ادھر اک وارثِ اورنگِ اکبر
جلوسِ خُسروی فرما رہا تھا
شہِ جم جاہ نورالدین جہانگیر
شکوہِ بزمِ جم دکھلا رہا تھا

۱ے، ۲ے:۔ ایسا لگتا ہے کہ سروری صاحب سے تسامح ہوا ہے۔ یہ دونوں اشعار حسرت موہانی کے ہیں۔ (ٹینگ)

۳ے۔ اصل مصرعہ ہے ع شمشاد و چنار تو [illegible] (ٹینگ)

ادھر نور جہاں کا جلوۂ حُسن | در و دیوار کو چمکا رہا تھا
ادھر محوِ نوا سرمست مُطرب | سرودِ آسمانی گا رہا تھا
یہ نقشہ دیکھ کر بزمِ شہی کا | سروشِ غیب یہ فرما رہا تھا

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اڈورڈ ہفتم کے انتقال پر ناظر سے ایک مرثیہ لکھنے کی فرمایش کی تھی۔ ناظر نے تیس شعر کا ایک مرثیہ کہا تھا جو "مرثیہ شاہ" کے عنوان سے رسالہ "مخزن" لاہور شمارہ دسمبر ۱۹۱۰ء میں شایع ہوا۔ مرثیہ کا تعارُف کرتے ہوئے سر شیخ عبدالقادر اڈیٹر نے ایک نوٹ لکھا تھا جو درج ذیل ہے:

"آنجہانی قیصرِ ہند ایڈورڈ ہفتم کے انتقال پر ہمارے دیرینہ کرم فرما جناب چوہدری خوشی محمد ناظر صاحب بی اے المتخلص بہ ناظر گورنر ریاست کشمیر نے حضور مہاراجہ صاحب بہادر والی جموں و کشمیر کے خاص فرمان سے یہ پُر درد مرثیہ لکھا ہے، جس میں انگریزی طرز مرثیہ گوئی کا تتبع کیا گیا ہے۔ چوہدری صاحب بہ سبب اپنے عالی شان عہدہ کے اہم فرائض کے اب شعر و سخن سے کم سروکار رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کے مشتاق مدت کے بعد ان کی نظم کو دیکھ کر ضرور مطمئن ہوں گے۔"

مرثیہ کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

ہائے یہ کیا سانحہ اے چرخ گرداں ہوگیا
جس سے نیلی پوش شرق و غرب یکساں ہوگیا

آفتابِ سلطنت جس کا نہیں ہونا غروب

آج وہ خورشید عالمتاب پنہاں ہو گیا

ہائے تیرے غم سے اے شیرازہ بندِ صلح کل

ناگہاں مجموعۂ ہستی پریشاں ہو گیا

ہے غم ایڈورڈ اعظم میں دلِ محزوں فگار

ہائے یہ کیا ہو گیا اے گردشِ لیل و نہار

جو قدوم شاہ نے بخشا تھا جموں کو شرف

خطۂ کشمیر کو بھی تھا اسی کا انتظار!

ناظر کے کلام کا مجموعہ "نغمۂ فردوس" کے نام سے ۱۹۳۳ء میں شایع ہوا۔ جو نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔

لالہ سری رام کے تذکرہ "خمخانہ جاوید" پر ناظر نے بھی ایک تقریظ لکھی تھی جو خط کے انداز میں ہے اور جلد اول میں شایع ہوئی ہے۔ ان کی نثر کے نمونے کم ملتے ہیں۔ اس لئے یہ اہم ہے۔ "تذکرہ کی تدوین پر رسمی توصیف و تحسین کے بعد آگے کی جلدوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں:

"فرمائیے اب اوقات کس طرح گذرتی ہے؟ اور خمخانہ کے کس قدر خُم اور تیار ہو گئے ہیں اور آنے والی جلدوں کی کب تک توقع ہو سکتی ہے؟ مجھے اندیشہ ہے کہ ناظر کا نمبر آنے تک کہیں ساقی کا نشہ ہرن نہ ہو جائے ــــ"

یہ تحریر ۱۹۰۸ء کی ہے اور اس وقت ناظر کشمیر ہی میں تھے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ وظیفہ پر

سبکدوش ہوئے۔ اور ۱۹۴۰ء میں ان کا انتقال ہوا، دفن اپنے ڈل کے کنارے والی کوٹھی میں ہوئے۔

ناظر کے دو فرزند تھے۔ چودھری حمید اللہ اور چودھری فیض اللہ۔ فیض اللہ نے باپ کی کوٹھی سے ملحق ہی اپنی کوٹھی بنوائی تھی۔ وہ مسلم کانفرنس کے سرگرم کارکن تھے اور تحریکِ آزادی کے بڑے جری سپاہی۔ ۱۹۴۷ء تک وہ جموں و کشمیر قانون ساز اسمبلی میں مسلم کانفرنس کے گروپ لیڈر رہے۔ بعد میں وہ لاہور چلے گئے تھے۔ جہاں ۱۹۵۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ فیض اللہ ۱۹۴۷ء تک بارہمولہ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ انہیں ایمرجنسی کے تحت گرفتار کرلیا گیا تھا۔ بعد میں وہ رہا ہوئے اور جموں میں کسٹوڈین کے عہدہ پر کام کرتے رہے۔ آخری زمانے میں وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ جہاں ان کا انتقال ہوا۔ ناظر کے بھتیجے نیاز احمد ریاست میں معتمد قانون کے عہدہ پر فائز رہے[۱]۔ ۱۹۴۷ء میں انہیں بھی ایمرجنسی کے تحت گرفتار کرلیا گیا تھا۔ رہائی کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ انہیں شعر و سخن سے دلچسپی ہے۔ لیکن کلام دستیاب نہیں ہوتا۔

جسٹس شاہ دین ہمایوں، جو لاہور میں عدالت کے جج رہے، صاحبِ ذوق ادیب اور شاعر بھی تھے۔ چودھری خوشی محمد ناظر اور پیرزادہ محمد حسین عارف سے تعلقات کی وجہ سے وہ ڈاکٹر اقبال اور سر شیخ عبدالقادر کے ساتھ اکثر کشمیر آتے اور یہاں قیام کرتے رہے۔ ان کی آمد پر شعر و سخن کی مخصوص محفلیں منعقد ہوئیں۔ ان کے فرزند میاں بشیر احمد نے اپنے ایک مضمون "کشمیر اور ہمارے ادیب" کے عنوان کے تحت کشمیر میں شاہ دین کی ادبی سرگرمیوں کا حال لکھا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

"جب کبھی وہ کشمیر جاتے، تو متعدد شعرا اور ادبا کو اپنے گرد جمع کرلیتے اور سیر و تفریح کے ساتھ ساتھ علمی گفتگو اور شعر و سخن میں اپنا

۱۔ وہ ۱۹۴۷ء میں ریاست کے چیف سیکرٹری تھے۔

وقت گذارتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید شالامار پر نظم لکھتے وقت ان کی محفل میں چودھری خوشی محمد ناظر اور شیخ عبدالقادر بھی موجود تھے۔ اور میاں صاحب کی خواہش تھی کہ ان کے دوست علامہ اقبال بھی اس میں شریک ہوں۔"

جسٹس شاہدین کی نظم "شالامار" کا اقتباس ذیل میں درج ہے:-

اے باغ لوگ کہتے ہیں تم شالامار ہو — اور عظمتِ گذشتہ کی اک یادگار ہو

کہتے ہیں تم سے کھلتے ہیں رازِ دروں کے پیچ — تم اک کلیدِ قفلِ درِ روزگار ہو

ہاں کچھ بتاؤ اگلے زمانے کی کیفیت — تم واقعاتِ دہر کے نامہ نگار ہو

خاموش کیوں ہو کچھ تو کہو اپنی داستاں — کس سرّ سربمُہر کے تم رازدار ہو

فوّارے کی زباں سے کہو کچھ تو اپنا حال — کیوں روتے زار زار تم اے آبشار ہو

اور تم بتاؤ پانی کی لہرو کہ کس لئے — مضطر ہو، پیچ و تاب میں ہو بیقرار ہو

کب سے جلا رہا ہے یہ سوزِ دروں تمہیں — دل دادہ کس کی یاد میں تم اے چنار ہو

ہاں اے مسافر، ایسے سوالوں سے فائدہ

زخموں پہ کیوں چھڑکتے نمک بار بار ہو

میرزا سعدالدین سعد کشمیر کے علم دوست رئیسوں میں سے تھے وہ اپنے زمانے میں کشمیر کے اچھے عالم اور فارسی کے شاعر تھے۔ لیکن کبھی کبھی اُردو میں بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ سعد کے اجداد ترکستان کے رہنے والے تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ میرزا قاسم بیگ شاہ جہاں کے عہد میں ترکستان سے ہندوستان آئے اور شاہ جہاں کے دربار میں رسائی حاصل کی، عہدہ اور منصب سے بھی سرفراز ہوئے ان کے فرزند اورنگ زیب کے دربار میں اعزاز و اکرام رکھتے تھے۔ ۱۰۷۵ھ میں جب اورنگ زیب

کشمیر کی سیر کو آئے تو میرزا عنایت اللہ بیگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہیں کشمیر کی آب و ہوا ایسی پسند آئی کہ یہیں بود و باش اختیار کرلی۔

میرزا عنایت اللہ بیگ کے پوتے، میرزا احد نے سکھ اقتدار کے آخری زمانے میں اپنے علم و فضل کی بدولت ترقی کی اور انگریزوں کی جانب سے کشمیر میں وقائع نگار کے عہدہ پر فائز رہے۔ یہ خدمت ان کی اولاد میں کئی پشت تک قائم رہی۔ میرزا احد کے پانچ فرزند تھے۔ میرزا سیف الدین، میرزا غلام محی الدین، میرزا عزیز الدین، میرزا قمر الدین اور میرزا بدر الدین۔ ان میں سے تین یعنی میرزا سیف الدین میرزا غلام محی الدین اور میرزا قمر الدین یکے بعد دیگرے اسی خدمت پر مامور رہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانے میں میرزا سیف الدین اس خدمت پر مامور تھے۔ ان کا رسوخ اور اثر انگریزوں کے یہاں بہت تھا۔ جس سے کام لے کر انہوں نے گلاب سنگھ کے تعلقات انگریزی حکومت سے بہتر بنانے کی کوشش کی۔ انگریز عہدیداروں اور یورپی سیاحوں سے ان کے تعلقات اچھے رہے۔ چنانچہ بیرن ہیوگل اور بعض اور سیاحوں نے جو کشمیر آئے تھے۔ میرزا کے علم و فضل کو سراہا ہے۔ ان کے مرتب کئے ہوئے وقائع یا اخبار ۱۸۴۶ تا ۱۸۴۸ء جو فارسی میں کئی جلدوں میں ہیں ریاست کی ریسرچ لائبریری، سری نگر میں محفوظ ہیں۔ میجر جان ہچر کی فرمائش پر میرزا سیف الدین نے کشمیر کی ایک مختصر فارسی تاریخ "خلاصۃ التواریخ" کے نام سے ۱۸۵۹ء میں لکھی تھی۔

میرزا سیف الدین کے بعد میرزا غلام محی الدین نے ۱۸۵۱ء کی روداد یں مرتب کیں اور ۱۸۵۸ء کی اخبار ان کے جانشیں میرزا قمر الدین نے لکھے ہیں۔ میرزا بدر الدین کے فرزند میرزا جلال الدین فارسی کے شاعر تھے اور کچھ غزلیں اور ایک مثنوی "حسن و گوہر" اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

میرزا سعد الدین سعد، میرزا غلام محی الدین کے فرزند تھے اور ریاست میں

ایک عہدہ پر فائز تھے۔ فارسی علم وادب کا ذوق انہیں خاندانی ورثہ میں ملا تھا۔ فارسی شعر وسخن سے دلچسپی کی بدولت شبلی نعمانی سے ان کے گہرے مراسم ہوگئے تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں شبلی جب کشمیر آئے تھے تو انہیں کے یہاں مہمان ٹھہرے تھے۔ قیام کشمیر کے زمانے میں شبلی کی طبیعت ناساز ہوگئی اور جلد کشمیر سے روانہ ہوگئے۔ وطن پہنچنے کے بعد جب طبیعت ٹھیک ہوئی تو ایک "قصیدہ کشمیریہ" لکھ کر سعد کے یہاں بھیجا۔ جس کا مطلع یہ ہے:

دوستاں ایکہ رہ ورسم وفا کیش شماست
ہیچ دانید کہ شبلی بچہ حال است وکجاست

اپنے کشمیر جانے کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے:

سوی کشمیر رواں گشت بداں گرم روی
کہ نمی خواست دراں رہ نفسی کردن راست

آگے کشمیر کی خوبصورتی کی تعریف کی ہے اور اپنی علالت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس قصیدہ کے جواب میں میرزا سعدالدین سعد نے ایک قصیدہ فارسی میں "قصیدہ سعدیہ درشکریہ قصیدہ کشمیریہ مصنفہ شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی در ۱۸۹۹" لکھ کر بھیجا تھا۔ جس میں ان کی صحت یابی پر مسرت کا اظہار کیا ہے۔ اور ان کے علم وفضل کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ قصیدے کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں:

گل بباغ آمد و گلبانگ نشاطی برخاست
شاہد آرایش ونائی فرنے وساقی میخواست
شکر احباب کہ آمیختہ باشکوہ تب
شکری بہر گوارا شدن تلخ دراست

او درآمد چو دریں گلکدہ گُل رخت بہ لبسنت
گلہ از گل بود شں، شکوہ نہ از آب و ہوا است

شبلی کے راسم کی وجہ سے، شبلی کی اصلاحی تحریکوں کا اثر سعد پر بھی پڑا تھا چنانچہ انہوں نے کچھ نظمیں فارسی میں اصلاحی انداز کی لکھی تھیں جو "نوحہ پرُنا شمیر کشمیر" کے نام سے موسوم ہیں۔ اور ان کی دوسری نظموں اور اُردو نظم "کشمیر کا دِلچسپ "فوٹو" کے ساتھ ۱۳۳۰ھ میں "تحفۂ سعد" کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ "تحفہ" میں شامل نظموں میں "کشمیر کا دِلچسپ فوٹو" بہت اچھی نظم ہے۔ اس میں نوحۂ کشمیر کی سی المناکی اور مایوسی کے جذبات نہیں ہیں، کہیں کہیں کشمیر کے حسن و رعنائی کے پس منظر میں آثارِ سلف کی یاد ضرور آجاتی ہے لیکن دو چار آنسو بہا کر وہ آگے بڑھ جاتے اور فضا کے اہتزاز میں محو ہو جاتے ہیں۔

نظم میں کشمیر کے تقریباً سارے ہی دلچسپ گوشوں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ اس کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے :

خاک پاکِ گلشنِ کشمیر اے فخرِ دیار
رحمتیں ہوں فضلِ حق سے دمبدم تجھ پر نثار
تجھ میں یہ گلزار یہ گلشن، یہ جھیلیں یہ بلاق
ایک دفتر میں نہو جن کے بیاں کا اختصار
مثلِ دل پہلو میں ترے جھیل ڈل ہے موجزن
ہمچو روئے حور عیں تاباں ہیں تجھ میں چشمہ سار

آگے دوسرے قابلِ دید مقامات مثلاً مانسبل، چشمہ شاہی، باغ نسیم، شالمار، سونہ مرغ گلمرغ، پہلگام، اولر، سندھ ویلی، ویری ناگ، اچھ بل وغیرہ کی خوبصورتی کا حال لکھتے ہیں۔ جب عہدِ ماضی کی طرف خیال جاتا ہے تو آثار کی موجودہ ویرانی پر افسوس کرتے ہیں۔

تجھ میں شاہی یادگاریں ایسی ایسی بے بدل
جن کی ویرانی سے ہے اب چرخِ ظالم شرمسار
تجھ میں ہیں موجود اب تک ایسے آثارِ سلف
رو رہے ہیں پانیوں کو جو بہ چشمِ اشکبار
یہ مساجد، یہ منادر یہ عماراتِ رفیع
ہر جگہ باقی ہیں اب تک پانیوں کی یادگار

بانیوں کی یاد آتے ہی، ان کے شاندار عہد کا نقشہ ان کے ذہن میں آجاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آجاتا ہے کہ اسلاف پر فخر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جب تک اخلاف میں، علم و ہنر موجود نہ ہوں۔ نظم کے آخری شعر میں وہ غالب کی طرح اپنی فارسی پر اس طرح فخر کرتے ہیں:

آج اُردو میں لکھا ہے حال کچھ کشمیر کا
گو زبانِ فارسی پر سعد کا ہے افتخار

اس زمانے کے ایک اور پاکیزہ ادبی ذوق رکھنے والے عہدہ دار لالہ کنور سین تھے، جو کشمیر میں عدالت العالیہ کے چیف جج تھے۔ اُردو شعر و ادب کا وہ نفیس ذوق رکھتے تھے اور اس زمانے کی علمی اور ادبی محفلوں کی رونق تھے۔ اکثر محفلوں میں وہ ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ لالہ اُردو میں تصنیف و تالیف کا بھی شوق رکھتے تھے، چنانچہ انہوں نے کچھ ناٹک لکھے تھے۔

منشی امیر الدین امیر، جن کا کشمیر کے نوجوانوں میں شعر و سخن کا ذوق پھیلانے اور مذاق کو سنوارنے میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔ منٹو خاندان سے تھے۔ یہ خاندان تجارت پیشہ تھا۔ اور امرتسر میں ان کے دادا کی دکان تھی جہاں کشمیر سے پشمینہ منگواتے اور ہندوستان بھیجتے۔ اور ہندوستان سے کپڑا آتا اور فروخت ہوتا تھا۔ اس تعلق

سے ان کے خاندان کو "کبرہ" بھی کہنے لگے تھے۔ ان بزرگ کے بڑے صاحب زادے کی شادی ایک کشمیری لڑکی سے ہوئی تھی، جس کے بطن سے، امیرالدین پیدا ہوئے۔ امرتسر میں میر کرامت اللہ امرتسری سے تعلیم حاصل کی اور کشمیر کے مشہور شاعر اور انشاء پرداز خواجہ حسن شعری سے، جو اس زمانے میں امرتسر میں مقیم تھے، فن شاعری سیکھا امیر تخلص اختیار کیا تھا۔ اور ابتدائے عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ امیر نے معانی، عروض۔ اور بیان کے علاوہ، حکمت یا طب، منطق اور فلسفہ میں بھی دستگاہ پیدا کرلی تھی۔ کہتے ہیں انہیں کیمیا بنانے کا بھی شوق تھا، جسے بعد کو دوستوں کے سمجھانے سے ترک کر دیا۔

امیر نے تعلیم سے فارغ ہو کر، تجارت شروع کی، لیکن، اس کام میں جی نہ لگا، پھر دو ڈھائی سال ایک اخبار میں کام کیا۔ آخر یہ کام بھی ترک کر کے کشمیر چلے گئے اور وہاں وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کی۔ لیکن امیر اپنی ذہنی اور تخیلی افتاد کے ساتھ، اس طرح کے کام کے لئے نہیں موزون تھے۔ ان کا قیام کشمیر کے مشہور دینی پیشوا، میر واعظ حافظ غلام رسول شاہ کے مکان کے قریب تھا اور وہ امیر کے علم و فضل اور صلاحیتوں سے واقف تھے۔ انجمن نصرت الاسلام کے زیر اہتمام میر واعظ ایک مدرسہ کھولنے کی تجویز بنا رہے تھے۔ انہوں نے امیر کو اپنے اسکول میں جو اسلامیہ ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہوا، فارسی اور اردو پڑھانے کے لئے متقرر کرلیا۔ یہاں امیر کی طبیعت کے اصلی جوہر نمایاں ہوئے۔ وہ آخر تک اسکول میں اردو و فارسی کے معلم اول رہے، لیکن تعلیم کے ساتھ ساتھ بہت سے نوجوان طالب علموں کے شعری مذاق کی تربیت بھی کی، جن میں محمد امین درابو داراب اور امیر زا کمال الدین شیدا نمایاں ہیں۔

مدرسہ کی ملازمت کے دوران ایک موقع پر امیر کی ہیڈ ماسٹر سے کسی بات پر بگڑ

گئی تھی۔ وہ سبدوش ہو کر گھر گئے اور فغانی کی مشہور غزل —— "فغانی گر دلے داری تو باش ایں جا کہ من رفتم"! کی مخمس میں تضمین متضمن بہ استعفا لکھی اور میر واعظ کی خدمت میں روانہ کر دی۔ یہ تضمین حسبِ ذیل ہے:

بحالِ اضطرار اندر بہاراں از چمن رفتم!
چو گلبرگ از خزاں در خاک بے گور و کفن رفتم
ز لطفِ سر مدرّس آہ، از ایں انجمن رفتم
چو بر تن خاتمم دامن گرفت از خویشتن رفتم
بخاطر لغزش پای دریں رہ ماند و من رفتم

مکن ای بے بصر از بادِ غم دری جبہہ را پرچیں
مگر ای خارِ صحرا دامنم بگذار دشتِ کیں
ترحّم بر گُل زخمِ جگر اے پنجۂ گلچیں
تو اے گل، بعد ازیں با ہر کہ بنواہد و لت بنشیں
کہ من چوں لالہ داغِ جگر از ایں چمن رفتم

نمودہ ناکسی افسوس ضایع روزگارم را
غلط تاثیر طالع ریخت در شورہ شرارم را
شکستہ سنگ ظالم خاطرِ آئینہ دارم را
کہ مرہم میتواند لبت زخمِ دلفگارم را
برنگِ شمع در ہر بزم بہرِ سوختن رفتم

خدای داند و ہم مدرسہ ہم انجمن کارش!
پس از عمری سُبک کردیم ما دوش خود از بارش
مرا تابی امیر اکنوں نماندہ بہرِ ابدالیش

دلی می بابار وجبری کہ آرد تاب آزارش

نعانی گر دلی داری تو باش اینجا کہ من رفتم

مخمّس کو پڑھ کر مبر واعظ نے آہیر کو سمجھا بجھا کر استعفا واپس لینے پر آمادہ کیا۔

آہیر انجمن نصرت الاسلام کے بھی بڑے سرگرم رکن تھے۔ انجمن کے سالانہ جلسوں میں ان کی نظمیں جو حالی اور شبلی کی قومی نظموں کا انداز رکھتی تھیں، پڑھی اور بہت پسند کی جاتی تھیں۔ ان کی نظم کے بغیر انجمن کے جلسے پھیکے رہ جاتے تھے۔ ایک جلسے میں اپنی نظم کا آغاز انہوں نے اس انداز سے کیا تھا:

نوا سنجی میں میرا کوئی ہمتا ہو نہیں سکتا
میں چپ بیٹھا رہوں جلسے میں ایسا ہو نہیں سکتا

حالی کی ایک غزل پر مخمّس لکھا تھا، جس کا ایک بند ہے:

بات ایسی نہیں کرتے ہیں کبھی دانشمند
پہنچے جس سے کہ کسی دل کو ذرہ بھر بھی گزند
کس کا ہم شکر کریں کس کا کریں شکوہ پسند
آنکھ سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک کو بند

اس میں مسلم بھی ہیں، ہندو بھی ہیں عیسائی بھی

آہیر اکثر مزاحیہ کہتے تھے۔ اور ان کے مزاح میں ابتدائی بعد جدید دور کے اردو شعراء کا سا انداز ہوتا تھا۔ مزاح کا انداز پیدا کرنے کے لئے وہ فارسی، انگریزی، کشمیری سب زبانوں کے الفاظ سے کام لیتے ہیں۔ ان کی ایک نظم کے چند شعر ہیں:

جب کبھی دلبر سے کھٹ پٹ ہو گئی — صلح کی تدبیر جھٹ پٹ می کنم
جس کو آئینے سے آتا ہے حجاب — جو کہ ہے مشہور اب عصمت مآب
آج ہے آنے کو وہ مست شباب — اس لئے گھر کی سجاوٹ می کنم

با

بادہ خوری میں بھی ہوں یکتائے فن
سینکڑوں گیلن پیوں اے جانِ من
چلینۓ وسکی برانڈی سیمپین
منہ لگاتے ہی صفا چٹ می کنم

اس زمین کے مشکل ہونے کا امیر کو اعتراف ہے اور اس کے ساتھ اپنی قادر طبیعت پر بھی گھمنڈ۔ چنانچہ کہتے ہیں:

کیسی ہی مشکل سے مشکل ہو زمیں — طبع موزوں میری رکتی ہی نہیں
روز میدانِ سخن اے ہم نشیں — فکر کے ٹٹو کو سرپٹ می کنم

ایک نظم میں اپنی کما حقہ قدر نہ ہونے کا شکوہ کرتے ہیں:

گھر کی جو ہے مرغی تو وہ ہے دال برابر
کیا نظمیں لکھیں صاحبو ہر سال برابر
دیتا ہی نہیں داد کوئی بال برابر
فرماتے ہیں آیا نہیں یہ سب قال برابر
بکتا ہے یہ کیا "وچھ اہس اُڈ ژلس کُن"

ایک اور مخمس کا بند ہے جو قومی اصلاح کا انداز رکھتا ہے:

تعلیم سے نفرت ہے مسلمان کو ہیہات — اصرار ہے واعظ کو پڑھو علم ہی دن رات
سکھلاتے ہیں اخوانِ وطن اور ہی کچھ بات — منعم کنم از خواہش دِل پیر خرابات
زاں رو کہ غذا کاہش جاں است نبس پیچھ

میر واعظ کے انتقال کے بعد انجمن کا جو سالانہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس میں امیر نے جو

نظم پڑھی تھی، وہ مرثیہ کا سوز رکھتی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

آج اس بزم میں احباب ہیں سارے آئے
قوم کے جتنے ہیں ہمدرد ہمارے آئے
سوجھتا مجھ کو نہیں یاکہ حقیقت میں امیر
بانیٔ مدرسہ اب کے نہ ہمارے آئے

امیر کے ایک بھائی میاں حسام الدین بھی امرتسر سے تجارت چھوڑ کر کشمیر آگئے تھے۔ اور ریاست میں مدارس کے مددگار انسپکٹر رہے۔

منشی امیر الدین کے ایک رفیق کار منشی صادق علی خاں صادق بھی اچھی ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ بھی اسلامیہ ہائی اسکول، سری نگر میں مُدرّس تھے پہلے وہ سرکاری ملازمت میں تھے، لیکن قومی خدمت کے جذبے نے انہیں سرکاری ملازمت چھوڑ کر، اسلامیہ ہائی اسکول کی مُدرّسی اختیار کرنے پر مائل کیا۔ منشی امیر الدین کے دوش بدوش صادق بھی، انجمن نصرۃ الاسلام کی سرگرمیوں میں حصّہ لیتے تھے۔ ان میں اور منشی صاحب میں چشمک ہوگئی تھی۔ چنانچہ کبھی کبھی ایک دوسرے پر تعریض بھی کر بیٹھتے تھے۔ انجمن کے سالانہ جلسوں میں صادق کی نظمیں بہت پسند کی جاتی تھیں ان کی ایک نظم کے شعر ہیں:

ہوگیا سرسبز نخلِ آرزوے ملک و قوم
دامن کشتِ تمنا گُل بداماں ہوگیا
تھا دلوں میں دردِ اخواں، سوزِ مخفی کی طرح
آشکارا آج پھر یہ رازِ پنہاں ہوگیا
ہو رہی ہے نصرتِ اسلام کے جلسے کی دھوم
ہر زبان و دل میں، درد دردِ اخواں ہوگیا

صادق کی ایک اچھی نظم جو اقبال کے انداز میں لکھی گئی ہے، ادبی اعتبار سے عمدہ نظم ہے
اس کے چند شعر ہیں:

کتاب لالہ و سنبل پہ ہے مراقبہ　　زبانِ نرگس و سوسن ہے ترجمان میری
ہے شمع آتش سوزِ جگر کا پرکالہ　　دہانِ قمری و بلبل ہیں ہے فغاں میری
اسی سے میرے سخن کی ہے گرمئی بازار　　اسی متاع سے ہے رونق دکاں میری

میر واعظ رسول شاہ کے انتقال پر صادق نے بھی ایک مؤثر نوحہ لکھا تھا۔ جو انجمن کی
سالانہ روداد میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے دو شعر حسبِ ذیل ہیں:

صاف کہتا ہے زبانِ حال سے احوالِ دل
اک کتاب وا شدہ اس کا در و دیوار ہے
چشم بینا ہے تو دیکھ اور گوش بینا ہے تو سن
تو ہی تو اے قوم، اس تعمیر کی معمار ہے

رسالہ "مخزن" لاہور کے شمارہ اگست ۱۹۰۶ء میں صادق کی ایک نفیس نظم
"سفرِ زندگی" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، جس میں زندگی کی کٹھن منزلوں کا ذکر
کیا ہے۔ نظم ذیل میں درج ہے:

کیا کہوں کیسا کٹھن ہے زندگانی کا سفر
ہر قدم پر جان کا نقصان تو ایماں کا ضرر
آفتوں سی آفتیں اور مشکلوں سی مشکلیں
الحذر اس زندگی سے، اے عزیزو الحذر
اک طرف خندق کھلی تو دوسری جانب کنواں
اور ان میں راہ ہے اک بال سے باریک تر
ہے یہی منزل وہ شاید جس کو کہتے ہیں صراط

دھار پر تلوار کے ہے نوع انساں کا گذر

پہنچیے جاناں تلک یا جان سے ہاتھ دھوئیے

رہتی ہے ہر گام پر یہ چیستاں مدِ نظر

اس قدر دشوار گھاٹی ہے کہ کچھ پوچھو نہیں

بیٹھ جاتے ہیں سبھی اس راہ میں جی چھوڑ کر

عقل کہتی ہے نہ رکھ وادی وحشت میں قدم

عشق کہتا ہے کہ عقلِ نکتہ رس کو کیا خبر

آ کے صادق پھنس گئے اس جال میں انجام کار

جال اپنے ہاتھ سے بنتے رہے جو عمر بھر

صادق کے کچھ مضامین بھی "مخزن" کے مختلف شماروں میں شایع ہوئے ہیں۔ ایک مضمون "پیداوار اور دولت" کے عنوان سے ۱۹۱۰ء کے ایک شمارہ میں شایع ہوا تھا جس میں یورپی مصنفین کے خیالات کی روشنی میں دولت اور اس کی پیداوار کے معاشی مسایل پر بحث کی گئی ہے۔

صادق ۱۹۱۳ء میں پونچھ چلے گئے تھے۔ جہاں اسلامیہ ہائی اسکول پونچھ کی صدارت ان کے تفویض ہوئی تھی۔ ان کا انتقال پونچھ ہی میں ہوا۔

منشی محمد صادق ایک اور خوش فکر شاعر ہیں جو انجمن ہی کے ایک سکول میں مدرس تھے۔ ان کا کلام معاصر اخباروں اور رسالوں میں چھپتا رہا۔ انجمن کے سالانہ جلسوں میں بھی ان کی نظمیں پڑھی جاتیں اور پسند کی جاتی تھیں۔ ایک نظم جو ۱۹۱۰ء کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی تھی، اس کے دو شعر ذیل میں درج ہیں:

جانتے ہیں آپ ہم میں کیا گفتگو کہنے کو ہوں — نیک و بد جو کچھ ہے، وہ سب روبرو کہنے کو ہوں

مثلِ شانہ مو بمو کہتا نہیں ہوں پشت پر — آئینہ کی طرح سب کچھ روبرو کہنے کو ہوں

انجمن کے اصلاحی کام کی نوعیت کے لحاظ سے، اکثر اساتذہ میں ایک جذبۂ عمل اُبھر آیا تھا۔ انجمن کے سالانہ جلسوں کے لئے خاص طور پر جو نظمیں لکھی جاتی تھیں۔ ان کا انجمن حمایت اسلام، لاہور کے سالانہ جلسوں میں پڑھی جانے والی نظموں، خاص طور پر حالی کی اخلاقی، اصلاحی اور قومی نظموں کا سا لب و لہجہ اور اپیل ہوتی تھی۔ منشی صادق کی ایک طویل نظم کا آغاز، اس طرح ہوتا ہے:

سلمانو، ذرا سوچو جو ہے فہم و ذکا باقی!
سوا آپس کے جھگڑوں کے رہا ہے تم میں کیا باقی

آگے وہ انہیں عمل پر اکساتے اور اُبھارتے ہیں:

منشی غلام محمد خادم، منشی محمد الدین فوقؔ کے چچا ہوتے تھے۔ ان کو شعر و شاعری کا بڑا شوق تھا۔ گو ان کا ادبی پایہ بہت بلند نہیں تھا۔ اپنے زمانے کے اکثر اہم واقعات پر انہوں نے تاریخی قطعے لکھے ہیں۔ خادم کا خاندان زینہ گیر کے زمینداروں میں سے تھا۔ اور ان کا قیام زیادہ تر تحصیل سوپور کے موضع سیمپور میں ہی لیکن یہ اکثر سری نگر میں رہتے تھے۔ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی وہ شعر کہہ لیتے تھے۔ اپنے ایک بیٹے کے بے وقت انتقال پر انہوں نے ایک مرثیہ کہا تھا جس میں اپنے رنج و غم کے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

جس کی پیدائش کی خوشیوں میں لٹایا مال و دھن
جس کے بچپن اور جوانی پہ تھا میں سایہ فگن
جس کو بننا تھا عصائے پیر پیری میں مرا
آج اس نے زندگی میری بنا دی ہے کٹھن

خادم کی نظموں کی اہمیت ادبی سے زیادہ تاریخی ہے۔ اپنے زمانے کی اکثر قابلِ ذکر شخصیتوں کے انتقال پر نظمیں اور تاریخیں کہی تھیں۔ سوپور کے ایک مشہور قومی

خدمت گزار، رحمن ڈار، خادم کے دوست اور ایک مخیر انسان تھے۔ ان کے انتقال پر خادم نے ایک مرثیہ کہا تھا، جس کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں:

وہ عزیز قوم وہ سردارِ قوم! — خادمِ قوم اور وہ غمخوارِ قوم!

ہوگیا ہم سے جدا وا حسرتا! — ہائے وہ زر بخش اور زردارِ قوم

زینتِ محفل جو تھا وہ چل بسا — آج بے رونق ہوا دربارِ قوم

اے خدا جنت میں ہو انکا مقام — ہے دعاگو ان کا خدمت گارِ قوم

سوپور ہی کے ایک اور رئیس عبدالغنی وکیل، جو قومی خدمت میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان کے انتقال پر بھی خادم نے مرثیہ کہا تھا، جس میں ان کی قومی خدمات کی طرف اشارے کئے ہیں۔ مرثیہ کے کچھ شعر ہیں:

تیرے دم سے قصبہ سوپور کی تنظیم تھی!
اب ہے وہ بے سر کہ تو ہی چل بسا عبدالغنی
جب کبھی سوپور میں آیا کوئی قومی سفیر
تیرے دم سے اس کو چندہ مل گیا عبدالغنی

پنڈت شیام لال ریونیو افسر مقرر ہوئے تو خادم نے ایک نظم کہی تھی، جس کے دو شعر ہیں:

ہوگئے جب نہال سر گوپال[1] — بن گئے شیام لال افسرِ مال

دوستوں کو ہوا ہے عیش و طرب — دشمنوں کو ہوا ہے رنج و ملال

فارسی میں بھی ان کی کچھ نظمیں ہیں۔ صوفی محمد اکبر کے مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہونے کے موقع پر انہوں نے فارسی اور اردو ملی جلی ایک نظم کہی تھی۔ جس کے چند شعر یہاں درج ہیں:

تو مسخر کردہ با خلق خود دلہای قوم — قوم ہی نازد بتو، تو دلبری یا ساحری

---

[1] سر گوپالا سوامی آینگر۔ وزیر اعظم کشمیر (۱۹۳۶ء — ۱۹۴۱ء)

گوہر افشانی تری جلسوں میں ہم نے دیکھ لی — دیکھیں گے پر جا سبھا میں اب گہرریزی تری

آج دورِ اولیں کا پھر سماں آیا نظر — پھر غلامانِ محمدؐ کو ملی ہے سروری

کشمیر کے ایک بزرگ، جنہوں نے کشمیری میں کافی کلام چھوڑا ہے، مولانا عبد القدیر بدری تھے۔ بدری کی نسبت مولانا کے اسلاف میں ان صحابی سے ہے جنہوں نے جنگِ بدر میں حصہ لیا تھا۔ مولانا کے جدِ امجد حضرتِ مراد اللہ نقشبندی، خواجہ ہلال نقشبندی کے ہمراہ ۹۷۱ھ میں بلخ سے کشمیر آئے تھے۔ حضرتِ مراد اللہ کا قیام سوپور میں رہا۔ لیکن مولانا عبد القدیر کے پردادا عبد الرزاق بدری، سری نگر آ گئے تھے۔ مولانا عبد القدیر کی ولادت سری نگر ہی میں ۱۲۸۶ھ (م ۶۳-۱۸۶۲ء) میں ہوئی۔ سری نگر ہی میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ مولانا عبد السلام درابو سے انہوں نے ظاہر علوم کے علاوہ علوم روحانی میں بھی استفادہ کیا اور اپنے زمانے کے نامور صوفیوں میں شمار ہونے لگے۔ ان کی زندگی گوشہ نشینی اور علوم دینی کے اکتساب اور استغراق میں بسر ہوئی۔

فارسی میں مولانا کو بڑی دستگاہ حاصل تھی اور شعر بھی کہتے تھے۔ کشمیری میں انہوں نے کئی مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان مثنویوں کا مطالعہ ڈاکٹر سید اسد اللہ کامل استاد شعبۂ اُردو، کشمیر یونیورسٹی نے کیا تھا اور ایک مضمون بھی شعبہ کے ترجمان "ادبیات" (شمارہ ۱۹۶۶) میں شایع کیا ہے، جس میں ان کی تین کشمیری مثنویوں، "مُشکل کشا"، "تحفۂ عشق"، "شکر ریز" اور فارسی مثنویوں "چشم بکشا" اور "روح القدیر" اور ایک قصیدہ "روضۃ الجنات" کی تفصیلات لکھی ہیں۔ قصیدہ حضرتِ نقشبند کی نعت[1] بھی ہے۔

مولانا کی ایک اور مثنوی "دُرِ یتیم" میں جو تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے حضرتِ پیغمبرِ اسلامؐ کے کچھ معجزات اور ایک صحابی حضرتِ ہبابؓ کا قصہ بیان کیا ہے۔ اسی مثنوی کے کچھ حصے اُردو میں بھی نظم کئے ہیں۔ اس حصے کا آغاز اس

---

[1] منقبت کی جگہ غلط استعمال ہوا ہے۔

طرح ہوتا ہے:

کروں میں بیاں قصہ ہباب کا ـــ مدح خواں ہوا جوں میں اصحاب کا

صحابی تھے ہباب بہت نامور ـــ محبت تھی حضرت کی انہیں تیز تر[1]

گوارا نہ کرتے تھے فرقت کبھی ـــ نہ خدمت سے ملتی تھی فرصت کبھی

دل ان کا محبت سے بھرپور تھا ـــ اور عشق محمدؐ سے معمور تھا

حکیم فیروز الدین طغرائی فیروز، اپنے عہد کے اچھے علماء میں شمار ہوتے تھے اور شاعری میں انہیں اُستادی کا مرتبہ حاصل تھا۔ ان کا خاندان کشمیر سے تھا، لیکن ان کی نشو و نما پنجاب میں ہوئی تھی اور دہلی میں بھی کافی گذارا تھا۔ ایک شعر میں اپنے کشمیری نژاد ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں:

شک نہیں اس میں کہ ہے فیروز کشمیری نژاد
لگ گئی مٹی مگر اس کو جہانِ آباد کی

کچھ زمانہ تک وہ امرتسر میں بھی رہے تھے، اس کے بعد جموں آئے جہاں وہ اکبر ہائی اسکول میں عربی اور فارسی کے مُدرّس مقرر ہوئے تھے۔ جموں وہ ۱۹۱۸ء میں آئے تھے اور اپنے ساتھ نکھرے ہوئے شعری مذاق کا سرمایہ لائے تھے۔ اس لئے وہ جلد ہی شعر و سخن سے ذوق رکھنے والے نوجوانوں کا مرجع بن گئے۔ فیروز طغرائی کُل ہند شہرت کے اُستاد تھے۔ چنانچہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے، ان کے پاس کلام کی اصلاح لینے آتے تھے۔ مدراس کے مشہور اُستادِ سخن شیخ عبدالقادر شاکر مدراسی، ان سے استفادہ کے لئے اکثر جموں آیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں وہ کافی عمر رسیدہ تھے۔ شاعری میں طغرائی کی دستگاہ کی بدولت ہندوستان بھر کے چوٹی کے شعراء سے ان کے مراسم قایم ہو گئے تھے۔ ان کا مکان شعر و سخن کی دلچسپیوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ انہیں کی سرپرستی میں ہر سال جموں میں ایک مشاعرہ وسیع پیمانہ پر

[1] ۔ ؟

منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرہ میں کلام سنانے کے لئے ملک بھر سے سربرآوردہ شاعر مدعو کئے جاتے تھے۔ ان معرکتہ الآرا مشاعروں کا اثر، نو عمر شعراء کے ذوق کی آبیاری میں بہت معاون ثابت ہوا۔

طغرائی غزل کے استاد تھے اور غزل میں ان کا اپنا مخصوص انداز تھا۔ طغرائی کی زندگی میں رنج و غم کی بہت سی کٹھن منزلیں آچکی تھیں، جس کا پرتو ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کی غزل کے کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں۔

اس چمن میں ہم رہینِ گریہ پیہم رہے
سر سے پا تک آبدیدہ صورتِ شبنم رہے
شمع ساں اک دم نہ رونے سے ہمیں فرصت ملی
عمر بھر گویا رہینِ حلقۂ ماتم رہے
کوئی حالت ہو نہ چھوٹے ہاتھ سے دامانِ صبر
پائے استقلال ہر منزل پہ مستحکم رہے

کھالئے سیلِ حوادث کے تھپیڑے فیروز　　آرمیدہ صفتِ ساحلِ دریا ہو کر

نہ ہوئی پر نہ ہوئی صبحِ شبِ غم فیروز　　ورنہ ہر شام کی ہوتی ہے سحر کہتے ہیں

طغرائی کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ لیکن ان میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ملک محی الدین قمر قمرازی، حسن محمد منہاس، ہرکشن حبیب، کشن سمیل پوری، پنڈت اقبال کشن اور نرسنگھ سہائے شوق، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

پنڈت داسہ کول ادگرہ بلبل فارسی کے شاعر تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔

اور سری نگر میں خانقاہ معلی کے قریب، اپنے آبائی مکان میں رہا کرتے تھے۔ فارسی میں بلبل پنڈت ست رام مجرم کے شاگرد تھے، پنڈت ست رام اپنے زمانے کے مستند فارسی علماء میں شمار ہوتے تھے۔ اور شعر و شاعری کا بھی اچھا مذاق رکھتے تھے۔ بلبل فارسی میں صاحبِ دیوان ہیں۔ اس کے علاوہ کئی مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ جن میں سے بعض بہت ضخیم ہیں۔ "گلشنِ عندلیب" "گلزارِ بلبل" اور "چہار درویش" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ انہوں نے ایک ناٹک بھی "ہریش چندر" کے نام سے فارسی میں لکھا تھا۔ جس میں ان کی کچھ اردو غزلیں بھی شامل ہیں۔ یہ ناٹک اب کمیاب ہے۔

پنڈت سہج رام نکو مجرم اردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کا ذکر "بہارِ گلشنِ کشمیر" کے مولفین نے کیا ہے لیکن حالات نہیں لکھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے انتقال پر ایک مرثیہ کہا تھا جس کے چند شعر تذکرہ میں درج کئے ہیں۔ شعر یہ ہیں:

چل بسا وہ سب کو تنہا چھوڑ کر	مجھ سے فرزندی کا رشتہ توڑ کر
میری آنکھوں سے وہ پنہاں ہو گیا	یوسف مصری تھا، کنعاں میں گیا
کیا کرے اس درد کا مجرم بیاں	سخت درد انگیز ہے یہ داستاں
یہ وہ غم ہے جس کے لکھنے میں قلم	خوں بہاتا ہے اپنا دمبدم

دیوان پرشاد کول، فارسی کے شاعر تھے اور ایک دیوانِ فارسی کا چھوڑا ہے۔ وہ اردو میں فکرِ سخن کرتے تھے۔ لیکن کلام اب دستیاب نہیں ہوتا۔

پنڈت شیو نراین بھان، عاجز تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد پنڈت سروپ نراین بھان عاصی فارسی کے اچھے سخن سنج تھے۔ عاجز محکمۂ تعلیم سے وابستہ رہے اور عرصہ تک جموں کے ہائی اسکول میں مدرسی کی خدمت انجام دی۔ "بہارِ گلشنِ کشمیر" میں ان کے کلام سے صرف ایک قطعہ تاریخ نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے ہمدم اکبر آبادی کے

ناول "حیرت" پر لکھا تھا۔ اس قطعہ کے چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ جن سے عاجز کی شعری دسترس پر روشنی پڑتی ہے۔ شعر ہیں:

کیا نثر تمہاری دلکشا ہے	اور نظم تمہاری بے بہا ہے
کیا کہنا تمہارا واہ ہمدم	ہر بات میں اک نیا مزا ہے
مضمون رنگیں، عجیب بندش	ہر فقرہ تمہارا چلبلا ہے
حاصل کرتے ہیں لوگ عبرت	ہر قول نصائح سے بھرا ہے
پڑھ کر "حیرت" کو سب ہیں حیراں	ہر لب پہ تمہاری واہ وا ہے

قطعہ میں "اچھا یہ گلشن فضا ہے" سے ۱۳۲۱ کی تاریخ برآمد کی ہے۔

پنڈت جانکی ناتھ کول ضیاء کا خاندان دہلی چلا گیا تھا۔ لیکن وہ خود سری نگر آ گئے تھے۔ اور خزانہ صدر سری نگر میں کلرکی کے عہدہ پر مامور تھے۔ شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتے تھے اور ایک مثنوی "گلزار عرفان" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کا موضوع بھگوت گیتا کا مشہور قصہ کرشن سداما ہے۔ زبان صاف ستھری اور اساتذہ قدیم کے انداز کی ہے دیباچہ میں مصنف نے مثنوی کی تصنیف اور خود اپنے بارے میں مختصر سے حالات لکھے ہیں۔ دیباچہ کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

"یہ عاجز خاکسار، عقیدت آیات بندۂ جانکی ناتھ کول مہر لال دہلوی المتخلص بہ ضیا مشتاقانِ ابدی اور عاشقانِ بارگاہ ایزدی سے ہو کر مژدہ دیتا ہے کہ ایک روز میں ترجمہ سری بھاگوت گیتا کر رہا تھا کہ اس میں ذکر سداماں برہمن اور کرشن اوتار نہایت دلچسپ معلوم ہوا۔ چنانچہ اسی وقت خیال پیدا ہوا کہ اس تذکرہ کو پیرایہ نظم میں لے آؤں۔ ..."

مثنوی کی ابتداء، سری کرشن جی کی توصیف سے ہوتی ہے، پھر آغاز داستان ہے اور داستان کئی عنوانوں پر منقسم ہے۔ اختتام مناجات پر ہوتا ہے۔ آغازِ داستاں کے حصے

سے ایک اقتباس یہاں منقول ہے۔

ہے مشہور جہاں جو شہر متھرا — برہمن نیک تھا اک اس میں رہتا

سُداماں نام تھا اس برہمن کا — عجب یہ گُل تھا متھرا کے چمن کا

تھی الیشور کی جو اس پر مہربانی — ہوا وہ واقف سرِّ نہانی

بجز یادِ خُدا کرتا نہ کچھ کام — ہمیشہ جپتا وہ نامِ سری رام

مناجات میں اپنے انجام بخیر کی دُعا کرتے ہیں:

بخیر انجام ہو یا کرشن میرا — صبا ہے بندہ بے دام تیرا

مثنوی کی تاریخ پنڈت جے رام گھڑیالی عیاشؔ نے کہی تھی اور "گلزارِ عارفاں شدہ تازہ را

ز ابرِ رحمت" سے ۱۹۵۵ء بکرمی (م ۱۸۹۹ء) برآمد ہوتا ہے۔

پنڈت شیو پرشاد کنجور، محبت تخلص کرتے تھے۔ ان کے حالات دستیاب نہیں

ہوتے۔ ان کی غزل کا صرف ایک شعر حسبِ ذیل ملا ہے:

عجب کیا وہ آئیں اگر ہنستے ہنستے — مثل ہے کہ بستے ہیں گھر ہنستے ہنستے

اہلِ کشمیر میں خاص طور پر مسلمان، کشمیر سے باہر جانا بہت کم پسند کرتے ہیں، لیکن جب

کشمیر سے نکلتے ہیں تو ان میں آفاقیت اُبھر آتی ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال عبدالسلام رفیقی

تھے، جو سری نگر کے باشندے تھے۔ اور تجارت کی غرض سے اطراف کے ملکوں کا سفر اختیار کرتے

تھے۔ اسی سلسلہ میں وہ جاوا اور انڈونیشیا بھی گئے تھے۔ ان کا انتقال بھی وہیں ہوا اور

وہیں دفن ہوئے۔ وہ محض تاجر ہی نہیں تھے بلکہ بعض باشعور قوموں کے افراد کی طرح اپنی

دوسری مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ، کچھ علمی دلچسپیوں کو بھی جاری رکھتے تھے۔ ان کی

انہی دلچسپیوں کا نتیجہ، کشتواڑ کا کچھ حال تاریخی حصے میں نقل کیا جا چکا ہے مغلوں

کے اس علاقے پر تسلط کے بعد یہاں سے فارسی کے کئی اچھے شاعر اُٹھے، راجہ

ملہا سنگھ اور راجہ عنایت اللہ سنگھ کا کلام بھی پچھلے باب میں نقل کیا گیا ہے

کشتواڑ میں علم و ادب کا ذوق یہاں کے مذہبی پیشواؤں کی دلچسپیوں کا نتیجہ تھا۔ مغلوں کے آخری زمانے میں جب فارسی کا اثر گھٹنے لگا، اردو علم ادب کے میدان میں آگے بڑھنے لگی تو جموں اور کشمیر کی طرح، کشتواڑ میں بھی اچھے شاعر اُبھرنے لگے۔ انہیں میں ضیاء الدین ضیاءؔ ایک بزرگ تھے، جو علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں کلام چھوڑا ہے۔ فارسی میں ان کی ایک تصنیف "روضۃ العارفین" بھی قابل ذکر ہے۔ ضیاء کا انتقال ۱۳۱۱ھ میں ہوا۔ تاریخ انتقال سری نگر کے ایک مشہور بزرگ شاہ احمد علوی، ساکن محلہ ملک یار، فتح کدل نے کہی تھی:

رضوانِ خلد گفتہ　　　آمد ضیاء بہ جنت

اِس خاندان میں تین پشت تک شعر و سخن کا مذاق رہا۔ چنانچہ ضیاءؔ کے فرزند غلام محی الدین جو محیؔ تخلص کرتے تھے اور ان کے پوتے بہاء الدین بہائیؔ، فارسی اور اُردو کے اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ محیؔ کو تصوّف سے لگاؤ تھا۔ ان کے کلام میں تصوّف کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی ایک نعت کے چند شعر ہیں:

چشمِ الفت میں روشنائی ہے　　　پرتوِ نورِ والضحائی ہے
خود تماشا ہے اور تماشائی　　　سرِّ حق نورِ مصطفائی ہے
پادشاہوں سے بڑھ کے عزت ہو　　　اس گلی کی اگر گدائی ہے
مرحبا، مرحبا ہو بختِ رسا　　　کوئے جاناں میں اب رسائی ہے

کشتواڑ کی انجمن اسلامیہ کے سالانہ جلسوں کے لئے محیؔ قومی نظمیں لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۱۸ء کے جلسے میں انہوں نے جو نظم پڑھی تھی۔ اُس کے چند شعر ہیں:

آج دادِ بزمِ عشرت ملکے دینا چاہیئے　　　گوہرِ یکتائے اُلفت پرونا چاہیئے
عشق اگر اسلام کا ہو تو ہے وہ عشقِ تمام　　　بوالہوس ہرگز نہ نام عشق لینا چاہیئے

بندۂ اسلام تھا میں جب کہ تھا عالم غلام ‏ ‏ ‏ ‏ اب مری حلقہ بگوشی پر تو رونا چاہیئے
المدد اے ہمت پرواز، بال و پر مدد ‏ ‏ ‏ ‏ اب قفس کی قید سے مجھ کو چھڑانا چاہیئے

محی کا ایک مُستزاد بھی دستیاب ہوتا ہے، جس میں ان کا متصوفانہ طرزِ خیال نمایاں ہے۔
کہتے ہیں:

دِل پہ سوزِ زخم، بدن پر کوئی آثار نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ اس کو کیا کیجیۓ دوا
اس عجب زخم سے خالی کوئی بیمار نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ یہ تمہ ہے عین شفا
ترکِ خوں ریز، کماندار، ستمگر، سفّاک ‏ ‏ ‏ ‏ دونوں چشمانِ سیاہ
قتلِ عاشق کے سوا یار تجھے کار نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ ہے زِنگہ تیرِ قضا
محی کنگال کا تکیہ ہے کہ شاہِ اسرار ‏ ‏ ‏ ‏ منہ سے مت بول تو کچھ
سب ہیں اغیار تجھے غیرِ خدا یار نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ حق کرے تیرا بھلا

کشتواڑ کے مرغزار، چوگاں کی تعریف میں بہت سے اُردو اور فارسی شعراء نے لکھا ہے۔ محی کے ایک مُخمس کے دو بند ہیں:

دِل کو بھاتی ہے چناروں کی ہوا ساون کی
آج شب کاٹ لیں چوگاں میں بِتا ساون کی
میری جاں! مہر تمہارے دیکھیں گے فضا ساون کی
جھوم جھوم آتی ہے گھنگھور گھٹا ساون کی
ٹھنڈی ٹھنڈی چلی آتی ہے ہوا ساون کی

عالم پھر کر ہے گلرنگ کو آج اے ساقی
مجھے پلوائے ہے رہی دِل کو علاج اے ساقی
لیکے تانیں کہیں اِس بیت کو آج اے ساقی
صورت ابر ہوا پر ہے مزاج اے ساقی

لے اُڑی مجھ کو مئے ہوش رُبا اے ساقی

تھی کا انتقال ۱۳۳۷ھ میں ہوا۔ ان کے فرزند بہاء الدین بہائی باپ کے علم و فضل کے ساتھ ان ذوقِ شعر و سخن کے بھی وارث بنے، لیکن عین عنفوانِ شباب میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے افکار سے کچھ غزلیں اور چند نظمیں باقی رہ گئی ہیں۔ جن میں لطفِ سخن سے زیادہ تصوف کی چاشنی نمایاں ہے۔ فارسی میں انہوں نے ایک نظم لکھی تھی، جس کے عُنوان پر تحریر ہے: نقل عریضہ الیست کہ بہ برادر صاحب سید نجم الدین حسن مدظلہ ۱۱۔ رجب ۱۳۳۵ھ نوشتہ شُدہ یوم جمعہ۔" اس نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہائی نے ان سے کسبِ فیض کیا تھا۔ اس کے کچھ شعر ہیں:

هوشیار از دم کلام توام! مست صهبای جامِ جامِ توام
تربیت یافته زِ حضرتِ تو بندۀ کمتر و غلامِ توام
شُد بهائی عزیز و تلمیذت برگزیده زِ خاص و عامِ توام

بہائی کی ایک اُردو نظم جو "دعوتِ دار" کے عنوان کے تحت لکھی گئی ہے اس کے دو شعر حسبِ ذیل ہیں:

مطرب نو ساز پر گا وہ نغمۂ حجازی عشاق کو سکھا دے آئینِ عشقبازی
فرصت ہے بس غنیمت، دے دادِ عیشِ جاناں پیرِ فلک مبادا دکھلادے حقہ بازی

یہ ۱۹۱۶ء کی لکھی ہوئی ہے۔ اسی زمانے کی ایک اور نظم "دعوتِ صلح" کے عُنوان سے ملتی ہے۔ اس کے کچھ شعر یہ ہیں:

ہندوستاں میں ہر اک بھائی ہے اور بہن ہے
بیگانگی ہے کیسی اک مادرِ وطن ہے
مسلم ہیں اور ہندو آپس میں بھائی بھائی
اک جان ہے یہ گویا ظاہر بدو بدن ہے

ہے اختلاف مذہب عالم ہیں کیا ہوا تو
گُل تو ہیں رنگ برنگی پر ایک ہی چمن ہے

محمدالدین فوق کا نام کشمیر کی تاریخ اور ادبی اور صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہے۔ اُن کا خاندان کشمیر سے تھا۔ لیکن پنجاب سے ان کے تعلقات قائم تھے۔ چنانچہ ان کی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ ان کے والد پونچھ کے ایک قصبہ میں پٹواری تھے۔ فوق کی ولادت ۱۸۷۷ء میں ہوئی۔ تعلیم واجبی حاصل کی تھی کہ ان کا تقرر جموں کے گورنر دیوان امرناتھ نے ۱۸۹۴ء میں محکمۂ پرمٹ میں کر دیا تھا۔ لیکن اپنی صحافتی دلچسپیوں کی بدولت وہ ملازمت ترک کر کے لاہور گئے اور "پیسہ اخبار" کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس طرح انہیں تربیت حاصل کرنے کے موقعے مل گئے۔ اخبار "کوہ نور" کی ادارت بھی ان کے تفویض رہی۔ پھر ۱۹۰۱ء میں انہوں نے اپنا اخبار "پنجۂ فولاد" جاری کیا۔ ۱۹۰۲ء میں میاں جان محمد گنائی نے کشمیری گزٹ نکالنا شروع کیا تو اس کی ادارت کے لئے فوق کی خدمات حاصل کیں۔ ۱۹۰۶ء میں جب یہ اخبار بند ہو گیا تو فوق نے کشمیر میں پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کے لئے ۱۹۱۳ء میں راجہ امر سنگھ مدارالمہام کے پاس درخواست دی، جو نامنظور کر دی گئی۔ اس کے بعد لاہور سے انہوں نے اپنا مشہور ماہنامہ "کشمیری میگزین" جاری کیا۔ جس میں کشمیر اور اہلِ کشمیر کی دلچسپی اور مفاد کے مضامین اور خبریں شائع ہوتی تھیں۔ بعد میں اسے ہفت روزہ کر دیا تھا، اور اس کا نام "اخبارِ کشمیر" رکھا تھا۔ ان کا تعلق ماہنامہ "طریقت" اور "کشمیری اخبار" سے بھی رہا۔ کشمیری پنڈتوں کی طرح، جو ریاست میں اخبار جاری کرنے کی اجازت نہ ملنے کے سبب، لاہور یا پنجاب کے کسی اور شہر سے اخبار اور رسائل نکالتے رہے۔ فوق نے بھی ساری مساعی لاہور سے جاری رکھیں۔ کچھ ادارے بھی انہوں نے کشمیر کے مسلمانوں کے اغراض و مفاد کو آگے

بڑھانے کے مقصد سے قائم کئے تھے۔ چنانچہ لاہور میں ایک انجمن جو کشمیری انجمن کے نام سے قائم تھی، وہ ۱۹۰۹ء میں انہیں کی کوششوں سے مسلم کشمیری کانفرنس میں تبدیل ہو گئی۔

فوق اچھے شاعر بھی تھے۔ لیکن کشمیر کے اُردو ادب میں ان کے بڑے کارنامے ان کی تاریخی اور سوانحی تصانیف ہیں۔ ان کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ بعض وقت گنتی مشکل ہو جاتی ہے۔ خود انہوں نے اپنی تصانیف کی تعداد ستر بتائی ہے۔ ذیل کی تصانیف خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں:

تاریخ اقوام مشرق، جو تین جلدوں میں ہے۔ مکمل تاریخ کشمیر، تاریخ بڈشاہی۔ راجہ سُکھ جیون مل، کشمیر کا نادر شاہ (رنجیت سنگھ) کشمیر کی رانیاں۔ تذکرہ مصنفین و مولفین کشمیر، تذکرۂ مُفتیانِ کشمیر، خواتینِ کشمیر، سیاست کشمیر، غنی کاشمیری، للہ عارفہ، تاریخ حریتِ اسلام، تاریخ کا روشن پہلو، مزار الشعراء، شالامار، شبابِ کشمیر، سفر نامۂ کشمیر، سرگذشتِ فوق، رہنمائے کشمیر۔

ان تصانیف کے ہزاروں اوراق میں فوق نے اپنی ان تھک سعی سے، کشمیر کی لازوال خدمت انجام دی اور آنے والے عہد کے مُورّخین اور تذکرہ نگاروں کے لئے اتنا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں کہ ان کے مطالع کے لئے بھی فرصت چاہیئے۔

کشمیر کے اکثر رئیسوں، عہدہ داروں اور پہاڑی سرداروں سے فوق کے مراسم تھے۔ اور بعضوں سے ان کی تصانیف کی اشاعت میں مالی مدد ملی۔ ان سرداروں سے تعلقات اور صحبتوں نے ان میں سے بعض کو شعر گوئی یا افسانہ نگاری کی طرف بھی مایل کیا۔ ان کے دورے مختلف علاقوں میں ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں سلطان

محمد متولی خان رئیس کٹھائی کے یہاں گئے تھے۔ جن کا محل دریائے بہجامہ کے کنارہ پر تھا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک نظم کہی تھی، جس کے دو شعر ہیں:

بہار جنت و کوثر کے نظارے نظر آئے
کنارِ آبِ بہجامہ میں گلگشتِ کٹھائی میں
جہاں نیرنگیِ حسنِ ازل ہے بے نقاب اے دل
مجھے لے چل اسی خطے کے دامانِ ہوائی میں

غزل گوئی میں بھی انہیں مہارت تھی۔ ان کی ایک غزل کے شعر ہیں:

کس ہستیٔ موہوم پہ غافل یہ تکبر — اتنا تو سمجھو کوئی ہے گا نہ رہا ہے
میں وہ کہ ترے ظلم و ستم پر بھی دعا گو — تو وہ کہ مرے عجز و وفا پر بھی خفا ہے
آ، اور مری چشمِ تصور میں سما جا — آئینہ ترا دیر سے بے عکس پڑا ہے
کشمیر جسے کہتے ہیں سب غیرتِ فردوس — جب تو ہی نہیں پاس تو دوزخ سے سوا ہے

کشمیر میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے سلسلے میں بھی فوقؔ کی ساعی یادگار ہیں۔ انہوں نے اس عنوان سے ایک نظم ہی لکھی تھی، جس میں کشمیر میں یونیورسٹی قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس نظم کے کچھ شعر درج ذیل ہیں:

میرا کشمیر بھی ہندوستان بھر میں غنیمت ہے
جہاں علم و ہنر کے دیر تک چشمے رہے جاری
اسی کشمیر میں بڈشاہ وہ شاہِ معظم تھا
کہ جس کے دور میں تھی علم و فن کی گرم بازاری
یہیں رنبیر سنگھ سا علم پرور تھا مہاراجہ
جلو میں جس کے چلتی تھی حکومت اور سپہ داری
بنے کشمیر سے باہر تو ہیں دار العلوم اکثر

الٰہی آئے گی کشمیر کی بھی کیا کبھی باری
مگر کشمیر کی یونیورسٹی ہو تو ایسی ہو
کہ جس کے دم قدم سے قومیت کی لہر ہو جاری
نہ حسرت شائقینِ علم کے دِل میں رہے کوئی
اگر یونیورسٹی کا ہوئے جاری حکم سرکاری

فوق کے کلام کا مجموعہ بھی "کلامِ فوق" کے عنوان سے شایع ہو چکا ہے۔

صحافت کے شوق کی طرح، جموں اور کشمیر میں ذوقِ ادب اور شعر کو فروغ دینے میں فوق کی ساعی کو دخل رہا۔ اس سلسلے میں ان کے جموں کے ایک شاعر اور رفیق کار عاقل سے بڑی مدد ملتی تھی۔ ادب اور شعر کے ذوق پھیلانے اور ترقی دینے کے لئے وہ ادبی محفلیں بھی منعقد کرتے تھے۔ ادبی اور شعری انجمنوں اور اداروں کے قایم کرنے کا، طریقہ ابھی ریاست میں عام نہیں ہوا تھا۔ اپنے اور اپنے ساتھیوں کا کلام سنانے کے لئے وہ اجتماع کا انتظام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ محرّم میں مراثی سننے کے لئے جو اجتماع ہوتے ان میں بھی اپنا کلام سناتے رہتے تھے۔

راجہ بشیر علی خاں بسمل کشمیر کے رئیسوں میں سے تھے۔ ان کے اور فوق کے گہرے مراسم تھے۔ اسی تعلق نے غالباً ان میں بھی شعر و سخن کا مذاق پیدا کر دیا تھا۔ بسمل کے والد راجہ اکبر علی خان تحصیل اوتر مچھی پورہ کے جاگیردار تھے۔ بسمل ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے اور فارسی اور اردو میں اپنے عہد کے اقتضا کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ انہیں شعر و سخن کا ذوق فطری تھا۔ اور شعر کہتے تھے۔ وہ شاعروں اور عالموں کے قدردان بھی تھے۔ اور نوعمر شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی میں کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ محمد الدّین فوق سے ان کے گہرے مراسم تھے اور فوق اکثر ان کے یہاں مقیم رہتے تھے۔ اپنی تاریخ اقوام کشمیر میں انہوں نے بسمل اور ان کے خاندان کے حالات

لکھتے ہیں۔

بسمل عموماً غزل کہتے تھے اور کبھی کبھی کوئی نظم بھی کہہ لیتے تھے۔ شاعری میں وہ آداب اظہار اور فن کا لحاظ رکھتے تھے۔ ان کے ایک مخمس کے دو بند ذیل میں درج کئے جارہے ہیں، جن سے ان کی فکر اور اسلوب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

نہ نیلوفر ہوں نا خورشید خاور جلوہ افگن ہو
نہ مانند کتاں ہوں ماہِ انور جس پہ روشن ہو
نہ ہوں شمشاد نا قمری مرے سر پر نوازن ہو
نہ پروانہ ہوں محفل میں کہ میرا نام روشن ہو
مجھے دانہ بنایا کس لئے دنیا کے خرمن میں

نہ بوئے زلفِ عنبر ہوں کہ کام آؤں صبا کو میں
نہ سرمہ ہوں کروں روشن کسی چشم وفا کو میں
نمکداں بھی نہیں تازہ کروں رسم جفا کو میں
نہ ہوں بادِ صبا، چھیڑوں جو پردے میں حیا کو میں
نہ شاعر ہوں کہ لکھوں شعر ہی کشمیری مخزن میں

یہ نظم "کشمیری میگزین" میں چھپی تھی۔ بسمل نے راجہ امر سنگھ کی وفات پر ایک مختصر سا مرثیہ بھی لکھا تھا جسے ایک نوٹ کے ساتھ محمد الدین فوق نے کشمیری میگزین شمارہ مئی ۱۹۰۸ میں بسمل کے ذیل کے نوٹ کے ساتھ شایع کیا تھا۔

"جنرل سر مہاراجہ امر سنگھ بہادر آنجہانی کے بے وقت انتقال سے جو صدمہ رعایائے جموں وکشمیر کو ہوا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ اسی صدمہ سے میری زبان سے بھی چند شعر نکل گئے جو بغرض اندراج ارسال خدمت کر رہا ہوں۔"

نظم کے چند شعر ہیں:

ہے کسی غم میں مگر نالۂ بلبل امروز | ہے کسی غم میں مگر چاک گریباں گُل کا
گُل و گلزار پہ چھائی ہے اُداسی کیسی | کیوں پریشاں ہوا بال ہر اک سنبل کا
چشمِ نرگس سے ہے اشکوں کی روانی ہر دم | داغ ہے لالہ کو دل خستہ جگر ہے گُل کا
ہائے افسوس ہے گھر گھر میں یہ ماتم کیسا | آخری وقت ہے شاید کسی پیارے گُل کا

فوق کے دوستوں میں ایک اور رئیس راجہ بلند اقبال خاں بھی تھے، جو پونچھ کے کھکھہ قبیلے سے تھے اور ادبی ذوق رکھتے تھے۔ وہ فوق کے "اخبار کشمیر" کی اعانت کرتے تھے۔ ان کی فرزند راجہ محمد افضل خاں بھی افسانے اور مضامین لکھتے تھے۔

اس زمانے کے نوخیز شعرا میں میرزا مُبارک کا بھی تذکرہ ملتا ہے، لیکن ان کا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ رائے بہادر اننت رام بی۔ اے ڈائریکٹر لینڈ ریکارڈ تھے۔ اس کے علاوہ وہ کمشنر مردم شماری بھی رہے۔ انہیں بھی شعر وسخن سے لگاؤ تھا۔ ایک اور صاحبِ ذوق ہیرا نند رینہ بھی تھے، جو شعر کہتے تھے۔ کاوش لاہوری بھی اس زمانے کے صاحبِ ذوق اہلِ قلم میں سے تھے۔

کاوش کے ہم عصروں میں شیخ غلام حیدر خاں چشتی نے ایک نمایاں مقام پیدا کر لیا تھا۔ وہ جموں کے رہنے والے تھے، شعر وسخن کے پاکیزہ ذوق کے علاوہ تصنیف و تالیف اور صحافت سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔ اُردو میں غلط الفاظ اور ان کے استعمال کے بارے میں انھوں نے ایک کتاب "اصلاحِ ادب" کے نام سے لکھی تھی۔ جموں سے وہ ایک ماہوار رسالہ "پاسباں" نکالا کرتے تھے۔ انہیں ڈراما سے بھی دلچسپی تھی اور ایک ڈراما بھی لکھا تھا۔

پیرزادہ غلام احمد مہجور، جو جدید دور میں کشمیری کے سربرآوردہ شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کی ابتداء اُردو اور فارسی سے ہوئی تھی۔ ان کا تعلق رُشد ہدایت کے ایک خاندان سے تھا۔ اور ان کے اسلاف میں کئی عالم اور فاضل گذرے۔ محمد الدین فوق کا بیان ہے کہ ان کے "اخبار کشمیر" کی ترغیب سے کشمیر کے بعض ایسے خاندان، جن کا دارومدار پیری مریدی پر تھا، اپنے دست وبازو کی سعی سے روزی کمانے پر مائل ہوئے ان میں مہجور کا خاندان بھی تھا۔ مہجور کے والد پیرزادہ عبداللہ شاہ فارسی اور عربی کے عالم تھے، اور قصبہ ناگام ان کا وطن تھا۔ لیکن شادی کے بعد وہ متر گام منتقل ہوگئے تھے۔ یہیں مہجور ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں گھر پر والد کے پاس تعلیم پائی، پھر نرال میں حضرت علی گنائی عاشق کے مکتب میں شریک ہوئے۔ کچھ عرصہ اسلامیہ ہائی سکول سری نگر میں بھی زیرِ تعلیم رہے۔ عاشق فارسی کے شاعر تھے، ان کے اثر سے مہجور کو بھی فارسی میں شعر کہنے کا شوق ہوا۔ اور سری نگر میں اسلامیہ ہائی سکول کے استاد حُسین شاہ زیرک کو کلام دِکھلاتے رہے۔

۱۹۰۵ء میں مہجور نے پنجاب کا سفر کیا اور امرتسر اور قادیان میں کچھ عرصہ گذارا جہاں ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ امرتسر میں وہ مولانا بسمل کی صحبتوں میں شریک ہوتے رہے۔ انہیں صحبتوں میں مہجور کی ملاقات علامہ شبلی سے بھی ہوئی تھی۔ قادیان میں قیام کے زمانے میں مہجور "البدر" کی مجلس ادارت میں بھی شامل رہے۔ اور اخبار کی کتابت بھی وہی کرتے تھے۔ کشمیر لوٹنے کے بعد، محکمۂ بندوبست میں وہ پٹوارگری کی خدمت پر مامور ہوئے۔ ۱۹۴۵ء تک ملازمت میں رہے۔ اس کے بعد وظیفہ حاصل کیا۔ اپنے آبائی گاؤں جاکر شعر وادب کی خدمت میں مشغول ہوگئے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا انتقال بعارضہ فالج ہوگیا۔

مہجورؔ اُردو میں قدیم انداز پر غزل کہتے تھے۔ کچھ نظمیں اور ایک آدھ قصیدہ بھی ان کی یادگار ہے۔ ۱۹۱۱ء میں قصبۂ ترال کے قریب ایک جنگل میں انہوں نے ایک غزل کہی تھی:

آج مجھ پر پھر ستم ہونے لگا	دور جب سے وہ صنم ہونے لگا
گُل رخوں کی بے وفائی دیکھ کر	بارِ غم سے سر و خم ہونے لگا
جب سے وہ دلبر جُدا مجھ سے ہوا	ہم نشینِ رنج و اَلم ہونے لگا
دیر سے رُخ پھیر کر مجبورؔ[1] آج	داخلِ بیتُ الحرم ہونے لگا

اسی زمانے میں وہ لدھیانہ گئے تھے، جہاں ایک مشاعرہ میں غزل پڑھی تھی۔ غزل کے کچھ شعر ہیں:

تشنۂ غم کے لئے وصل کا جام اچھا ہے!
عندلیبوں کے لئے گُل کا پیام اچھا ہے
دِل سے بہتر ہے کہ آنکھوں پہ بٹھائیں ان کو
اوج پر ہوئے اگر ماہ تمام اچھا ہے
زُلف اور خال کو مہجورؔ یہ سمجھا ہیں نے
طائرِ دِل کے پھنسانے کو یہ دام اچھا ہے

مہجورؔ کی یہ شعری دلچسپیاں بیس پچیس برس تک جاری رہیں۔ اس درمیان میں وہ کشمیری میں بھی شعر کہنے لگے تھے۔ کشمیر میں اور کشمیر سے باہر وہ اُردو مشاعروں میں غزل سناتے اور داد پاتے رہے۔ کچھ غزلوں کے منتخب شعر ذیل میں درج ہیں:

دلبرِ طنّاز کی اس خاک پر منزل نہیں	شاہِ خوباں کے لئے اک کاخ و ایوان اور ہے
باغِ شالامار کا سودا مرے سر میں نہیں	جس چمن میں ہے مرا گُل وہ گلستاں اور ہے
مثلِ سکندر نہیں ظلمات کا سودا مجھے	جس کا ہوں میں تشنہ لب وہ آبِ حیواں اور ہے

---

[1] مہجورؔ؟

دلِ دردآشنا میرا کسی سے ہم زباں کیوں ہو
عیاں انجام ہو جس کا وہ میری داستاں کیوں ہو
بدل دی رُخ کی زردی غازہ مغرب کی سُرخی نے
قدیمی وضع کا پابند اب ہندوستاں کیوں ہو
رہ کوئے صنم گوشہ نشیں زاہد بتائے کیا
جو منزل سے ہو ناواقف وہ میرِ کارواں کیوں ہو

مہجور نے کچھ تضمینیں بھی کی تھیں۔ سودا کی غزل" نے بُلبُل چمن نہ گُل، نو دمیدہ ہوں" کی جو تضمین انہوں نے کی تھی، اچھی تضمینوں میں سے ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ غزل میں وہ نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے۔ مہجور کا فطری رجحان قومی اور اخلاقی شاعری کی طرف تھا۔ چنانچہ ان موضوعات پر انہوں نے جو شاعری کی ہے اس میں جذبات کا خلوص اور روانی قابلِ توجہ ہے۔ ان کی ایک نظم "خطاب بہ مُسلم" کے عنوان سے "اخبارِ کشمیر" امرتسر (جون ۱۹۲۴ء) میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کا اقتباس درجِ ذیل ہے:

بتا اے مُسلمِ کشمیر سوچا بھی کبھی تو نے
تو ہے کس گلشنِ رنگیں کا برگِ شاخِ عریانی
ترے اسلاف وہ تھے، جن کے علم و فضل کے آگے
ادب سے جھکتے تھے دانشورانِ ہند و ایرانی
شہنشاہِ معظم زین العابدین بڈشاہ
کیا اکبر نے جس سے کسبِ آئینِ جہانبانی
بخوبی یاد ہے اب تک سخن سنجانِ عالم کو
غنی کی نکتہ سنجی، شیخ صرفی کی سُخن دانی

غرض بے مثل تھے اسلاف تیرے حسن و خوبی میں

مگر اب قابلِ ماتم ہے تیری خانہ ویرانی

شکستہ حالئ بغداد پہ تھے، نوحہ خواں سعدی

پئے اسپین ہے اقبال محوِ مرثیہ خوانی

مگر کشمیر میں ویراں ہوا اسلام کا گلشن

کوئی کرتا نہیں ہے مثلِ شبنم اشک افشانی

نہیں باقی رہا اسلاف کا کوئی نشاں تجھ میں

وہ تھے محنت کے عادی اور تو محوِ تن آسانی

عید کی مسرت کے موقع پر انہوں نے ایک نظم کہی تھی، جو ہفتہ وار "ہلال" مئی ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کے چند شعر ہیں:

بام گردوں پر نظر آتے ہیں آثارِ ہلال!

عید کا پیغام لاتا ہے سدا کارِ ہلال

ہے دلیلِ کامیابی جہد و سعیٔ روز و شب

ہم کو یہ زریں سبق دیتی ہے رفتارِ ہلال

بدر کامل بن کے چمکے گا ستارہ قوم کا

مومنوں کو آسماں دیتا ہے اخبارِ ہلال

ایک اور نظم عید اور ہولی کی تقریبوں کے موقع پر کہی ہوئی، اخبار "مارتنڈ" (سرینگر ۱۹۲۵ء) میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں اخوت اور اتحادِ قومی کی تبلیغ کی ہے۔ کچھ شعر ہیں:

اب کے آیا موسمِ گل لے کے پیغامِ نشاط — عید ہے، نوروز ہے، ہولی ہے انعامِ نشاط

سبزہ نوخیز پر رقصِ عروسِ نوبہار — جھومتا پھرتا ہے گویا بادہ آشامِ نشاط

ساکنانِ گلشنِ کشمیر کو مہجورؔ آج
پیش کرتا ہے مبارکبادِ ایامِ نشاط

اے خوشا روزی کہ خوش دل ساکنانِ کاشمر
عید اور ہولی منائیں مل کے باہم بے خطر

مہجورؔ نے کچھ قصائد بھی کہے ہیں۔ ان کا ایک قصیدہ جو مہاراجہ ہری سنگھ کے راج تلک کے موقع پر قصیدہ کے صوری لوازم کی پابندی کرتا ہے۔ قصیدہ بہاریہ تشبیب سے شروع ہوتا ہے:

بُلبلِ شیریں بیاں لائی پیامِ نوبہار
صد مُبارک آگئی فصلِ بہارِ خوشگوار

قصیدہ میں مہاراجہ کے اسلاف کا بھی تذکرہ ہے۔ اس تقریب کی شان و شوکت اور اس میں شریک ہونے والے راجوں مہاراجوں کی طرف اشارے، قصیدہ کے اہم حصے ہیں۔ کہتے ہیں:

دیکھنا کس ٹھاٹ سے نکلی سواری شاہ کی
ساتھ ہے فوجِ گراں با نیزہ ہائے آبدار

پُشت پر پیر و جواں کے ہو دج نازکار ہیں
خسروِ خاور ہے دوشِ ابر پر گویا سوار

ہند کے اعلیٰ مہاراجے بشانِ سروری
مشرق و مغرب کے شاہنشاہ کے سب رازدار

قصیدہ دُعائیہ پر ختم ہوتا ہے:

یا الٰہی جب تلک دورِ مہ انجم رہے
جب تلک باقی رہے یہ گردشِ لیل و نہار

سر مہاراجہ بہادر تا ابد پائندہ باد

زندہ باد، پائندہ باد، تابندہ تا روزِ شمار

ختم کر مہجور مدحِ خسروِ فیروز بخت

کر دُعا، پھولے پھلے یہ نونہالِ سایہ دار

مہجور نے ۱۹۳۵ء میں سودا کی غزل کی تضمین کی تھی جس کا عنوان تھا "میں کون ہوں"
اس مخمس میں رمز و استعارہ کے انداز میں اپنے بارے میں کہتے ہیں:

گلزارِ کاشمیر کا سرو خمیدہ ہوں   صحنِ چمن کا سبزہ دامن کشیدہ ہوں

خاموش مثلِ غنچہ خاطر، کبیدہ ہوں   نے بلبلِ چمن نہ گُل نو دمیدہ ہوں

میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں

ناواقفِ حیات و ممات اور گرم و سرد   نا آشنائے فرقِ سفید و سیاہ و زرد

مہجور سُن یہ نکتہ احوالِ نیک مرد   میں کیا ہوں اور کون ہوں سودا بقولِ درد

جو کچھ بھی ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

مہجور علامہ اقبال سے بہت متاثر رہے۔ اور یہ اثر ان کی اُردو اور کشمیری شاعری میں نمایاں رہا۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کشمیری میں شعر کہتے ہوئے بھی، اُردو شاعری کی محبت ان کے دل سے نہ جا سکی تھی، چنانچہ پروفیسر ٹی۔ این۔ پشپ، جنہوں نے ان پر ایک تعارفی کتابچہ مرتب کیا ہے، لکھتے ہیں:

"کشمیری غزل کی طرف رجوع کرنے کے باوجود مہجور کے لئے فارسی اور اُردو کی کشش ابھی باقی تھی۔"

مقبول احمد سید نے مہجور کی ایک کشمیری نظم کا نفیس منظوم ترجمہ کیا ہے، جو ہفت روزہ "آئینہ" (سری نگر) کے سالنامہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ ذیل میں منقول ہے۔ اس کشمیری ترجمے میں مہجور کے اندازِ فکر پر روشنی پڑ سکتی ہے:

بیاہی شبِ ہجراں کا زور ورٹ گیا

اُفق سے جھانک رہی ہے نگارِ صبحِ جمال

قدم قدم پہ ہیں لالہ کی مشعلیں روشن

نظر نظر سے عیاں ہے سکون و صبر و قرار

چمن کا دامن صد رنگ ہے بہارِ نظر

روش روش پہ کھلے ہیں کنول محبت کے

سُنا ہے سیرِ گل و لالہ کے بہانے سے

ہماری دید کو آئے گا وہ بہار خیال!

مہک رہی ہے جو بوئے حنا سے وادیٔ دل

ہٹا چکے ہیں دِلوں سے غبار جورِ خزاں

فسانہ شبِ ہجراں بھی لوگ بھول گئے

کچھ اس طرح سے ہوئی ہے طلوع صبح بہار

مہجور اُردو میں ایک نثری تصنیف کے بھی مُصنّف تھے۔ یہ حضرت سلطان الفقراء عبدالرحیم شاہ صاحب قلندر صفا پوری کے حالات اور کشف و کرامات کی تفصیلات پر مشتمل ہے اور "حیاتِ رحیم" کے نام سے ۱۳۳۸ھ میں مرتب اور ۱۳۴۰ھ میں راوی پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپی ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہجور سلیس اُردو نثر پر پورا قابو رکھتے تھے۔ کتاب ایک دیباچہ، تمہید اور حالات پر مشتمل ہے، تمہید میں مہجور نے کشمیر میں علماء اور اولیاء اللہ کی کثرت کا تذکرہ کیا ہے اور اپنی ترتیب کتاب کی خواہش کے بارے میں لکھا ہے:

"میرے دل میں عرصہ سے یہ تمنا چلی آتی ہے کہ سلف و متقدمین کشمیر کے حالاتِ زندگی کو فرداً فرداً کتابی صورت میں مروجہ زبان اُردو کا لباس

پہنا کر اہلِ دنیا کے آگے پیش کردوں"۔

لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اس لئے کہتے ہیں:

"سب سے پہلے قدرت نے مجھے معاشرت کی طرف سے ایسا مجبور کر رکھا ہے کہ مجھے ایسی تمناؤں کی تکمیل کا موقع ہی نہ ملا۔"

حضرت عبدالرحیم کے حالات لکھنے کی طرف زیادہ تر توجہ اس لئے بھی ہوئی کہ یہ ان کے سلسلے کے بزرگ تھے۔ حالات مختلف عنوانات کے ماتحت اکٹھے کئے ہیں اور آپ کے کشف و کرامات کی تفصیلات بھی جمع کردی ہیں۔ کتاب کا آغاز، مہجور نے اپنی فارسی نظم "نامۂ مہجور" سے کیا ہے جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

اے صباء رفتارِ پیکِ خوش خرام اے امین لعل و دُر ہائے کلام

نظم ایک مناجات کا انداز رکھتی ہے اور مہجور پر مثنوی معنوی کے ردّ عمل کا نتیجہ ہے۔

مرسل سلطانِ خوبانِ جہاں موردِ الطاف ہائے بیکراں

اے کرا طاقت کہ بنویسد جواب بر پیامت سوی آں عالی جناب

دُر کش دغواص دریای علوم عاشقِ سرباز مولانائی روم

خواست چوں دادن جواب یک پیام ہفت دفتر گفت ماندش ناتمام

مہجور نے کتاب کے دیباچہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ انہیں شعرائے کشمیر کے بارے میں بھی لکھنے کا خیال تھا اور اس مقصد سے انہوں نے تلاش اور جستجو سے بعض شعراء کے غیر مطبوعہ کارنامے بھی فراہم کئے ہیں۔ لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

پنڈت تیج ناتھ تکو ناز تخلص کرتے تھے اور انگریزی اور اُردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کی ولادت اہلِ کشمیر کی نو آبادی، امرتسر میں ہوئی تھی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ ریاست منڈی میں ملازم ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ مہاراجہ منڈی کے اے ڈی کانگ بھی رہے۔ بعد میں وہ ریاست جموں و کشمیر میں افسر حسابات ہو گئے تھے۔ ناز کے والد پنڈت

برج موہن لال تکو کو بھی شعر و سخن سے لگاؤ تھا۔ اور وہ زیبا تخلص کرتے تھے۔ وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ایک دفعہ باپ اور بیٹے دونوں میں غالب کی شاعری زیر بحث تھی۔ غالب کے مصرعہ ۔" دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔" دونوں کے لئے جاذبِ توجہ تھا، اور دونوں اس زمین شعر موزوں کرنے کی کوشش میں تھے۔ اتفاق سے ناز کو ایک اچھا شعر فوراً سوجھ گیا:

تم اگر بام پہ آجاؤ تو جھگڑا مٹ جائے
دیکھیں تم اچھے ہو یا ماہِ کمال اچھا ہے

ناز غزل اچھی کہتے تھے۔ ان کے چند شعر ہیں:

ہم وفا پیشہ تو دن رات انہیں یاد کریں
اور وہ لُطف سے اغیار کا دِل شاد کریں
دین مسجد میں ہے، دنیا ہے بتوں کے بس میں
وائے مشکل انہیں پوچھیں کہ انہیں شاد کریں
ناز وہ ناز کہاں، اس کو یہ ملتا ہے جواب
جائیں اور آپ بھی اللہ کی اب یاد کریں

اُردو شعر و سخن کا شُستہ مذاق رکھنے والی کشمیری خواتین میں شریمتی سوشیلا تکو بلیغ شعر کہتی تھیں۔ وہ برج کشوری کے نام سے مشہور تھیں اور سوشیلا تخلص کرتی تھیں۔ ان کے والد پنڈت کِدار ناتھ اوگرہ لاہور چلے گئے تھے۔ اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔ سوشیلا خود الٰہ آباد میں ۱۸۹۸ میں پیدا ہوئی تھیں اور پنڈت اوتار کشن تکو سے بیاہی گئی تھیں۔ ان کا کلام رسالہ" بہارِ کشمیر" میں شائع ہوتا تھا۔ ان کی ایک نظم کے ذیل کے شعر ان کے معیار کو ظاہر کرتے ہیں جو کسی شاعر کے جواب میں کہے گئے تھے۔ سوشیلا نے خواتین کی عظمت پر ایک نظم کہی تھی، جس پر شاعر نے چند شعر

ایراد کئے تھے سوشیلا جواب دیتی ہیں:

بحث تھی یہ تو اصولی مُشفقِ شیریں زباں
اشتعالِ طبع کا باعث ہوا کیا مہرباں
یہ سُنا تھا آپ کا طرزِ بیاں دلچسپ ہے
شاعری کا آپ کی ہے معتقد سارا جہاں
ساری کوشش کی ہے صرفِ داستانِ حسن و عشق
بُتکدہ کا آپ نے چوما ہے سنگِ آستاں
مرحبا شانِ سلاست حبّذا ذوقِ سلیم
خوب دی دادِ فصاحت آپ نے اے مہرباں
یہ فصاحت، یہ بلاغت یہ سلاست آپ کی
اس پہ سونے پر سہاگا اکبر آبادی زباں
چشم بد بیں دور، مطلع، مطلعِ انوار ہے
جوہرِ پاکیزگی ہے، دونوں مصرعوں سے عیاں
ٹھنڈے دل سے آپ نے سوچی کبھی یہ بات بھی
کیا ہیں وصفِ اردھنگنی[1] کیا ہیں اسمیں خوبیاں

. . . .

. . . .

اے سوشیلا جس بلندی پر نشیمن ہے ترا
طبع موزوں کی وہاں پہنچیں گی کیا طغیانیاں

پنڈت بشمبر ناتھ رینہ سب جج کی صاحب زادی، پران کشوری کچلو بھی شعر کا اچھا مذاق رکھتی تھیں۔ ان کی شاعری کا رُخ زیادہ مذہب اور اخلاق کی طرف تھا۔ ان کے

---

[1] سنسکرت لفظ اردھانگنی یعنی نصف بہتر

چند شعر ہیں:

غور سے دیکھا جو میں نے ہر جگہ پایا تجھے
پھر نہ کیوں امید رکھوں تو ہی تارن ہار ہے

پران ہے چرنوں کی داسی غرض اسکی ہے یہی
مجھ کو بھگتی اور مکتی دے تو بیڑا پار ہے

کرتے ہیں جو سب سے بھلائی وہ ہی بھلا پھل پائیں گے
کرپا اگر ہوگی تیری وہ پھر نہیں بھٹکے کھائیں گے

پران کا انتقال ۱۹۱۳ میں ہوا۔

پنڈت آنند لال رتن، ملازمت کے سلسلے میں بھدرواہ میں رہے۔ اُردو میں اچھے شعر کہتے تھے۔ ایک موقع پر جب انہیں کشمیر کی یاد ستاتی ہے۔ تو جذبات ایک غزل کی صورت میں اس طرح ظاہر ہوتے ہیں:

کشمیر ہے پیارا جنت نشاں ہمارا
ہر اک کی جان جاں ہے، روح رواں ہے

اپنے وطن کی لکھیں تعریف ہم نہ کیونکر
پھولے پھلے ہیں اسمیں ہے گلستاں ہمارا

آگے کشمیر کے حکمراں راجگاں کی مدح سرائی کی ہے۔

خواجہ سعدالدین چشتی کشمیر کے مشہور "ناتت" علماء کے خاندان سے تھے۔ خواجہ یعقوب ناتت، خواجہ علی ناتت، اور خاص طور ملا جوہر ناتت اپنے عہد کے سر برآوردہ علماء ہوئے ہیں۔ خواجہ یعقوب ناتت سلطان قطب الدین کے قائم کئے ہوئے مدرسہ قطب الدین پورہ کے صدر تھے۔ ملا جوہر ناتت اسی مدرسہ کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کی علوم باطنی کی تربیت، شیخ داؤد خاکی کی خدمت میں ہوئی تھی، جو مخدوم شیخ حمزہ کے خلفاء میں تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ فریضہ حج ادا کرنے کے لئے گئے اور قیام مکہ کے زمانے میں ملا علی قاری اور ابن حجر مکی سے استفادہ کیا۔ اس خاندان میں علم و فضل اور درس و تدریس کی روایات حال تک باقی رہیں، چنانچہ سکھوں کے دورِ حکومت میں

خواجہ سعد الدین کے دادا خواجہ محمد یوسف نانت، اپنے زمانے کے سربرآوردہ علماء میں شمار ہوتے تھے اور اس زمانے کے کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین کے اُستاد تھے خواجہ سعد الدین چشتی، فارسی کے عالم تھے اور فارسی اُردو اور کشمیری میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کی ولادت سری نگر میں ۱۸۸۹ء کے لگ بھگ ہوئی تھی اور ۷۷ برس کی طویل عمر پائی اور ۱۹۶۶ء میں انتقال کیا۔

سعد الدین چشتی کی زندگی درس و تدریس میں بسر ہوئی۔ میر واعظ مولوی رسول شاہ نے ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر انجمن نصرۃ الاسلام کے مدرسہ واقع نوشہرہ میں ان کا تقرر ۱۹۰۹ء میں کیا تھا۔ اسی سال یہ مدرسہ بھی قائم ہوا تھا۔ اُن کے جیسی ضرورت پڑی، رینہ داری اور صفاکدل کے اسکولوں میں بھی ان سے فارسی درس تدریس کا کام لیا جاتا رہا۔ انجمن کے مرکزی ہائی اسکول میں اوپر کی جماعتوں کو فارسی کا درس دیتے رہے۔ کچھ عرصہ میر واعظ کے دفتر میں مُنشی کی خدمت بھی انجام دی۔ ۱۹۶۲ء میں کئی اور اساتذہ کے ساتھ، انہیں بھی خدمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اپنی یادداشت میں وہ لکھتے ہیں کہ دوسرے اساتذہ نے منت سماجت کر کے اپنے آپ کو پھر سے بحال کرالیا، لیکن خود اپنے بارہ میں لکھا ہے کہ

"بندہ نے وقار سے کام لیا اور نہ پیر صاحب کے پاس گیا اور نہ منت سماجت کی۔"

خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ پیری کی عمر میں فریضہ حج ادا کرنے کے لئے گئے اور کشمیر واپس لوٹنے کے بعد سے مطالعہ اور عبادت میں زندگی گذار دی۔ اپنی یادداشتوں میں، انہوں نے اپنے زمانے کے کئی اہم واقعات درج کئے ہیں۔ جن میں عبدالکبیر پنجابی کے مقدمہ ۱۹۳۱ء کے واقعات بڑی تفصیل سے درج کئے ہیں۔

"آج بتاریخ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء، ۲۶ صفر ۱۳۵۰ھ، سوموار عبدالقدیر

پنجابی کا مقدمۂ اہتمام بغاوت کی تاریخ تھی۔ میجسٹریٹ عدالت نے باستصواب اعلیٰ اختیارات، ظاہراً اس اندیشے سے کہ مبادا حسب معمول تاریخ ملاحظے گذشتہ پھر ہجوم مسلمانان سری نگر ہو، بجائے عدالت کے مقام پیشی سنٹرل جیل مقرر کرلیا تھا۔ اور کل ۱۲ جولائی کو ہی عبدالقدیر مذکور بہ سواری لاری پولیس وہاں بھیجا گیا تھا۔ مسلمانان سری نگر کو مقام ہذا کا پتہ چلا تھا۔ اور وہ دس بجے صبح سنٹرل جیل کی بیرونی گذرگاہوں پر جمع ہونا شروع ہوئے۔ میجسٹریٹ عدالت ۱۱ بجے پہنچا۔ وہاں محمد عبداللہ وکیل موجود تھے۔ لوگوں نے زبردستی خاص جیل کے صحن میں بمقام پیشی گھسنا چاہا۔ پولیس نے جس کی کافی تعداد آگے ہی سے وہاں موجود تھی۔ ان کو روکنا چاہا۔ لوگوں نے نہ مانا اور وہ بدستور ضد کرنے لگے۔ . . . ."

یہ تفصیل بڑی طویل ہے، جیل میں مسلمانوں پر بندوق چلانے اور اس کے بعد سترہ اٹھارہ مسلمان شہداء کی لاشوں کو جامع مسجد میں لاکر رکھنے اور مابعد واقعات اور آخر میں مسلمانوں کی شکایتوں کو سننے کے لئے شیرگڈھی میں مہاراجہ کے دربار کی تفصیلات سب درج ہیں۔ ۱۳ جولائی کا دن آج بھی کشمیر میں آزادی کی جدوجہد میں یادگار دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔

سعدالدین نے فارسی میں کافی کلام چھوڑا ہے، جس میں زیادہ تر اپنے عزیزوں، احباب، اور کچھ ملنے جلنے والوں کی فرمائش پر لکھے ہوئے قطعاتِ تاریخ، ایک فارسی شہر آشوب، ملاؤں کے خلاف ایک[۵] شامل ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور جو جموں کشمیر یونیورسٹی میں اردو اور فارسی شعبوں کے صدر اور ڈین رہے تھے، ان کے انتقال پر ایک مرثیہ لکھا تھا۔ جس کا آخری شعر ہے:

۵۔ یہ مقام اصل مسودے میں خالی ہے۔

چستی از فرطِ عقیدت جذبۂ دل بر نگاشت
گرچہ اندر شعر گوئی نیستش اصلا شعور

حج اور زیارت مدینہ منوّرہ کے موقع پر انہوں نے ایک مناجات بھی کشمیری میں لکھی تھی۔ میر واعظ رسول شاہ بانیٔ انجمن نصرت الاسلام کے یادگار دن کے موقع پر انہوں نے ایک نظم لکھی تھی، جس کے چند شعر ہیں:

ابرِ کرم کے تھے وہ سایہ ہمارے سر پر — افتادہ قوم مسلم کے تھے وہ پیر و رہبر
کشمیر کے مسلیں کی دیکھی جو حالتِ زار — کڑھتے رہے کہ کیونکر ...
الہامِ ایزدی سے یہ مدرسہ بنایا — نخلِ مُراد کیا ہی کشمیر میں لگایا
چستی ہے جان و دل سے مدحت سرا انہیں کا — یا رب طفیل ان کے دے اس کو خیرِ عقبیٰ

اسد میر، کشمیری کے مشہور شاعر تھے اور فارسی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ وہ کبھی کبھی اُردو میں بھی طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے۔ وہ انت ناگ کی ایک تحصیل کے رہنے والے تھے۔ اسد میر نے کشمیری میں کلام کا کافی ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

نگارا با دل پُر خوں کہاں جاؤں کدھر جاؤں
پنیس فکرن گئیس مفتوں کہاں جاؤں کدھر جاؤں

نیاز کشمیری، تحصیل کولگام موضع کامبرن کے متوطن، غلام محی الدین راتھر زمیندار کے فرزند ہیں۔ ان کی تعلیم شوپیان میں ہوئی۔ اس کے بعد لاہور جاکر تعلیم کی تکمیل کی۔ اور منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے بعد سٹیٹ پرایویٹ کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ شاعری سے لگاؤ تھا۔ اور اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔

؟ - ۵ا

ان کے کچھ شعر فوق نے نقل کئے ہیں :شعر حسبِ ذیل ہیں :

متاعِ بے بہا تھی اک جوانی سو لٹا دی ہے
نہ جانے اہلِ اُلفت اب کسے کہتے ہیں قربانی
گھٹائیں کالی کالی میکدے پر جھوم کر آئیں
چلو، اے ہم نشینو، پھر کریں، اک بار نادانی

مشیر حسین "قدوائی کا ذہنی تعلق کشمیر سے گہرا رہا تھا۔ وہ کشمیر کئی دفعہ آئے، اور ہر بار یہاں سے توصیفی جذبات لے کر گئے۔ ستمبر ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ایک نظم کہی تھی۔ جو ان کے اس نوٹ کے ساتھ شایع ہوئی :

"کشمیر کا حال، وہاں کی آب و ہوا کا اثر جو میرے دل و دماغ پر ہوتا تھا۔ یہ سب اس خط میں مفصل بیان ہوئی ہے ...... ایک نظم غزل ہی کی طرح ردیف و قافیہ کے التزام سے تین سو اشعار سے زیادہ فلسفہ محبت کے عنوان سے ہوئی تھی۔ بعد میں اور کئی غزلیں اور نظمیں لکھیں۔"

یہ ساری نظمیں ان کے مرتب کردہ مجموعے میں شامل ہیں۔ ایک نظم کے چند شعر ہیں :

وہی سنمرگ ہونا، وہی دلفریب وادی
جہاں شاعری کا سودا مجھے بار بار ہوتا
وہی رنگ رنگ کے گُل، وہ حبیبِ گلبدن بھی
وہ نشاط باغ ہونا، وہی شالامار ہوتا
وہی زعفران کے تختے، وہی یاسمن کی خوشبو
وہی گُل کنول کے ڈل پر، وہی لالہ زار ہوتا
وہ سفیدے ایستادہ وہ اِدھر اُدھر سڑک کے

چند تواریخ

اس دور میں کئی اچھی تواریخ بھی لکھی گئیں، جن میں مولوی حشمت اللہ کی تاریخ جو "مختصر تاریخ جموں و ریاست مفتوحہ" کے نام سے موسوم ہے، ہم سے قریب تر زمانے کی اہم تواریخ میں سے ہے۔ اس تاریخ میں جیسا کہ اس زمانے میں رواج ہو گیا تھا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کی تفصیلی سوانح حیات اور ان کی فتوحات کی تفصیل بھی شامل کی گئی ہے۔ مولوی حشمت اللہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے، لیکن ملازمت کے سلسلے میں وہ عرصہ تک جموں اور کشمیر میں رہے۔ برطانوی سرکار کی جانب سے وہ گلگت کے ایجنٹ مقرر ہوئے تھے۔ اس طرح انہیں ریاست اور خاص طور پر ریاست کے علاقوں گلگت، چترال، کافر، کرغز (قرغز)، یارقند، بدخشاں اور دوسرے ملحقہ مقامات میں دورہ کرنے اور وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے کافی مواقع ملے تھے۔

وہ عالم اور صاحب قلم بھی تھے۔ اس لئے ان علاقوں میں گھومنے کے دوران وہ ان کی تاریخ اور دوسری تفصیلات کے بارے میں معلومات بھی فراہم کرتے رہے، جنہیں بعد میں انہوں نے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔

مولوی حشمت اللہ ۱۸۹۸ء میں ریاست کی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے اور اس وقت بھی وہ عرصہ تک گلگت میں رہے اور گلگت کے علاوہ مظفر آباد، راجوری، کرگل، لداخ میں بھی متعین رہے۔ لداخ میں وہ وزیر وزارت یا گورنر کی حیثیت سے متعین ہوئے تھے۔ جب وہ وظیفہ حسن خدمت پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو

تو انہیں اپنی فراہم کی ہوئی معلومات کو ترتیب دینے کے زیادہ مواقع نصیب ہوئے اور اپنی تاریخ مرتب کی۔ یہ تاریخ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر، جامعہ ملیہ نے اس پر تقریظ لکھی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

"یہ کتاب تاریخ جموں، ہماری زبان کی چند واقعی علمی تصانیف میں سے ایک تصنیف ہے۔"

مصنف نے اس تاریخ کو ڈوگرا خاندان کی مفصل تاریخ کے علاوہ سکھوں کے عہد اور کشتواڑ کے راجاؤں کی تاریخ، ان کی علمی سرگرمیوں کے حالات، تبت اصلی اور تبت خورد یعنی لداخ کے حکمرانوں کے سلسلے میں، غرض اس حصہ ملک سے متعلق بڑی مفید تفصیلات فراہم کردی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس وسیع مواد کے تجزیہ اور ترتیب کا طریقہ، ان کا اپنا ہے، تاہم ان علاقوں سے تعارف اور یہاں کے حالات جاننے میں اس تاریخ سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔

ٹھاکر کاہن سنگھ بلاوریہ، جموں کے قصبہ بلاور کے رہنے والے تھے۔ بلاور قدیم زمانے میں چھوٹے راجاؤں کی راجدھانی رہی تھی۔ جسے بعد میں گلاب سنگھ نے فوج کشی کر کے اپنی ریاست میں شامل کر لیا تھا۔ ٹھاکر کاہن سنگھ کی تعلیم و تربیت جموں ہی میں ہوئی تھی۔ اور انہیں تصنیف و تالیف کا بھی شوق رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دو تصانیف چھوڑی ہیں۔ ایک، مہاراجہ رنبیر سنگھ کی سوانح عمری ہے جس میں ان کے خاندان کے حالات، گلاب سنگھ کی فتوحات اور رنبیر سنگھ کے عہد کے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کی ایک اور تصنیف "تاریخ راجپوتان پنجاب" بھی ہے۔ رنبیر سنگھ کی سوانح عمری "سوانح عمری مہاراجہ رنبیر سنگھ بہادر" کے نام سے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔

اہل کشمیر کو، کشمیر اس قدر پسند ہے کہ وہ عام طور پر، باہر جانے کو کم ترجیح

رہتے ہیں۔ لیکن جب ضرورت، ان کو کشمیر سے نکلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان میں، ایک آفاقی احساس اُبھر آیا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال عبدالسلام رفیقی کی ہے، جو سری نگر کے باشندے تھے۔ اور تجارت کی غرض سے وہ ہندوستان اور اطراف کے ملکوں کا دورہ کرتے تھے۔ تجارت ہی کے سلسلے میں وہ انڈونیشیا بھی گئے تھے۔ جہاں وہ عرصہ تک رہے اور وہیں، ان کا انتقال بھی ہوا۔

عبدالسلام رفیقی محض تاجر ہی نہیں تھے بلکہ علم و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ اور یورپ کے بعض باشعور اقوام کے افراد کی طرح اپنے پیشے کی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ، وہ علمی مشاغل کو بھی جاری رکھتے تھے۔ انہیں مشاغل میں، جاوا کے حالات کی فراہمی بھی تھی۔ انہیں جاوا کی تاریخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ جس کے لئے انہوں نے اپنے قیام جاوا اور انڈونیشیا میں مواد اکٹھا کیا اور کتاب مرتب کر لی تھی۔ یہ تاریخ "تاریخ جاوا و ملحقاتِ واندونیشیا" کے نام سے موسوم ہے۔ اس تاریخ کا ایک مخطوط جو غالباً خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، ریسرچ لائبریری، سری نگر میں محفوظ ہے۔ (۵۱۹ ع)۔

ابتداء میں جاوا کے نام سے بحث کی ہے اور اسے سنسکرت لفظ "جاوا دوبیا" سے ماخوذ بتایا ہے۔ ان جزایر پر پُرتگیزیوں کے تسلّط کا حال لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"۱۵۱۱ء سے پُرتگیزیوں نے اس طرف اپنا رسوخ جمانا شروع کیا لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ پھر ۱۵۲۰ء یا ۱۵۲۱ء میں اس کا دوسرا مشن اس طرف آیا، جسے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ ان جزائر میں اپنے تجارتی تعلقات قائم کئے۔ وہ بھی اس طرح پر کہ چونکہ مسلمانوں کا زور تھا۔ ایک نامسلمان راجہ نے مصلحت اس میں دیکھی کہ پرتگیزوں

کے ساتھ دوستی کے تعلقات قائم کرے اور اس طرح مسلمانوں کی تعدّی سے امن میں رہے۔ چنانچہ پرتگیزی تاجروں نے اس کی خواہش کے مطابق اس کے لئے ایک قلعہ بھی تعمیر کیا۔ جس کے معاوضہ میں راجہ نے ان کو سالیانہ ایک ہزار بوری سیاہ مرچوں کی دینی مقرر کی۔"

یہ تاریخ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ لکھی گئی۔ تاریخی حالات کے علاوہ اس سے انڈونیشیا اور جاوا کے طرزِ معاشرت، رسم و رواج، عقاید وغیرہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

پیر نجم الدین عشرتؔ، کشمیر کے دیوانی خاندان کے بزرگوں میں اپنی علمی اور قومی خدمات کی بدولت ممتاز رہے۔ وہ کئی قومی اور ملی اداروں سے منسلک رہے۔ انجمن خادم الخلق کے اور انجمن فلاحُ المسلمین کے وہ جنرل سیکرٹری رہے۔ ان کے ایک رفیقِ کار، پیر حسام الدین، قومی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ وہ بھی دیوانی خاندان کے عالموں میں سے تھے۔ عشرتؔ کو شعر و سخن سے گہرا لگاؤ تھا اور کچھ کلام ان کی یادگار رہے۔ اپنے ایک دوست کو انہوں نے منظوم خط لکھا تھا۔ جس میں خود اپنے بارے میں اشارے کئے ہیں۔ خط کا اقتباس حسبِ ذیل ہے:

بجا ہے گر کہوں نازک ہے قسمت نارسا میری
کہ میرا بے خطا ہونا ہی ٹھہرے جب خطا میری
عبث مصروف ہو اے چارہ ساز و فکر درماں میں
بڑھے گا درد جب حد سے بنے گا خود دوا میری
مرا نخلِ تمنا پھر زمانے میں پھلے پھولے
خبر پہنچائے اس گُل تک اگر بادِ صبا میری!

اس زمانے کے مورخین کشمیر میں مفتی محمد شاہ سعادتؔ کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔

وہ فارسی کے سربرآوردہ عالم تھے اور کشمیر کی تاریخ سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ چنانچہ انھوں نے کشمیر کی تاریخ پر کئی کتابیں لکھیں اس لئے عام طور پر وہ "مورخ کشمیر" کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ مفتی سعادت کی ولادت سری نگر میں ۱۸۸۱ء میں ہوئی۔ ان کے والد مفتی غلام محی الدین بھی پانداری خاندان سے تھے اور عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ مفتی سعادت کی ابتدائی تعلیم، انہیں کے یہاں ہوئی تھی۔ بعد میں وہ میر واعظ رسول شاہ سے مستفید ہوئے۔ سعادت کے معاصر علماء میں مفتی عزیز، خواجہ اسداللہ، مولوی غلام مصطفےٰ امرتسری، مفتی شریف الدین، مولوی صدرالدین اور مولوی وفائی، سربرآوردہ مانے جاتے تھے۔ مفتی سعادت نے ان سے بھی استفادہ کیا تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۱۷ء میں انجمن نصرت الاسلام کے مدرسۂ عربیہ میں معلم مقرر ہو گئے تھے۔ میر واعظ یوسف شاہ سے ان کی رشتہ داری بھی تھی۔ کشمیر کی تاریخ اور آثارِ قدیمہ سے سعادت کی دلچسپی کے مدنظر، کشمیر کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے ان کی خدمات حاصل کرلیں۔ اس زمانے میں محکمہ کے ناظم ڈاکٹر ہیرانند شاستری تھے۔ جن کی ہدایت پر سعادت نے کشمیر کے آثارِ قدیمہ کے بارے میں ایک کتابچہ تیار کیا تھا۔ اس کے علاوہ کشمیر کی تاریخ اور مشاہیر کی سوانح حیات پر، ان کی کئی تصانیف اردو میں ہیں۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے ان کی جملہ تصانیف کی تعداد پچیس[۲۵] بتائی ہے اور اپنی تاریخ "کشمیر" میں ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی فہرست بھی دی ہے۔

سعادت صاف ستھری زبان لکھتے تھے۔ بابا داؤد خاکیؒ، جو کشمیر کے صاحبِ باطن بزرگ اور فارسی کے شاعر ہوئے ہیں۔ ان کی حیات، سعادت نے "مقدس زندگی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں کتاب کی تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نیاز مند ماتم محمد سعادت گذارش پرداز ہے کہ میں نے مدت سے ارادہ کیا تھا کہ اللہ میرے ارادہ کو پورا کرنے والا ہے اور ہم کو خطاؤں اور گناہوں کی گرفت سے نجات دینے والا ہے کہ حضرت سلطان العارفین محبوب العالم شیخ حمزہؒ اور ان کے خاص خاص خلفا، خصوصاً جناب شیخ المشایخ بابا داؤد خاکیؒ کے بہترین تبرک آمیز حالات ایک کتاب کی صورت میں تالیف کرکے شائع کردوں . . .

آخر الامر خدا کے فضل و کرم سے سال رواں ۱۳۶۲ھ میں میرا ارادہ عرضِ وجود میں آیا اور یہ کتاب تحریر میں آئی جو کہ موثق حوالہ جات سے نقل کرکے صحیح حالات کا مجموعہ پیش کرتی ہے۔ کتاب کا نام مقدس زندگی" رکھا گیا ہے۔ متعدد کتابوں کے علاوہ اس مجموعہ کا خاص ماخذ وہ باتیں ہیں جو "ورد المریدین" "دستور السالکین" اور "قصیدہ" میں موجود ہیں۔"

"مقدس زندگی" چھپ چکی ہے۔ سعادت کی دوسری تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ بیانِ واقعی، جس میں سری نگر کی جامع مسجد کی تعمیر کے بارے میں تفصیلات شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۵۱ھ میں شیام پرنٹنگ ورکس سری نگر میں چھپی ہے۔

۲۔ حالات سلطان سکندر اور خانقاہ معلی۔ شہمیری خاندان کے حکمران سلطان سکندر کے حالات پر مشتمل یہ کتاب ۱۳۵۵ھ میں صابر الکٹرک پریس لاہور میں شائع ہوئی۔

۳۔ اطباق مشیر حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے حالات، مطبوعہ یادگار پریس سری نگر ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۱ء)

۴۔ تذکرۃ المتقی۔ کشمیر کے بیہقی سید صاحب کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ بھی صابر

الکٹرک پریس سے ۱۳۵۶ھ میں چھپی۔

۵۔ مناقب السادات۔ کشمیر کے اندرابی سیدوں کے حالات میں،

جو مذکورہ بالا مطبع میں ۱۳۵۷ھ میں چھپی۔

۶۔ یادگارِ عجایب۔ سید الدین صاحب کے حالات پر مشتمل یہ رسالہ

مارتنڈ پریس، سری نگر سے شایع ہوا۔

۷۔ فتوحاتِ ربانی۔ کشمیر کے علما کے حالات پر یہ رسالہ ۱۳۵۲ھ میں مسلم پرنٹنگ

پریس سری نگر میں چھپا تھا۔

۸۔ حیاتِ یوز آسف۔ نیشنل پرنٹنگ پریس، سری نگر میں چھپی تھی۔

۹۔ حیاتِ صرفی۔ حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کے حالات اور شاعری پر یہ کتاب

صابر الکٹرک پریس میں ۱۳۵۲ھ میں چھپی۔

۱۰۔ بلبل شاہ صاحب۔ حضرت شرف الدین سید عبدالرحمٰن بلبل شاہ کے حالات

پر رسالہ مقبول عام پریس لاہور میں ۱۳۶۰ھ میں چھپا۔

۱۱۔ مسجد عالی اور عیدگاہ سری نگر کے بارے میں ایک رسالہ جو نشاط الکٹرک

پریس، سری نگر ۱۳۶۰ھ میں "کلام عالی" کے عنوان سے چھاپا گیا تھا۔

سعادت کی کئی اور تصانیف، جن کا ذکر صوفی نے اپنی تاریخ میں

کیا ہے، شایع نہیں ہو سکیں۔ اپنی تصانیف کے لحاظ سے مفتی سعادت

کشمیر کے کثیر التعداد مصنف ہوئے۔

"تاریخ جموں" کے نام سے ایک مخطوطہ ریسرچ لائبریری سری نگر میں محفوظ ہے۔

اس کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسی تاریخ کا اردو حروف میں

ترجمہ ہے جو ڈوگری میں لکھا گیا تھا لیکن اس کی زبان ٹھیٹھ اردو ہے۔ اس کے مصنف

سے شروع ہوتی ہے اور مہاراجہ ہری سنگھ کی ولی عہدی کے زمانے کے کچھ حالات بھی اس میں شامل ہیں۔ اس طرح یہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے راج تلک اور ان کے عہد کے واقعات تفصیل سے درج ہیں۔ مولوی حشمت اللہ کی تاریخ جموں کے مقابلے میں اس کی زیادہ اہمیت نہیں لیکن اس میں کچھ تفصیلات لکھی ہیں۔ جو حشمت اللہ کی تاریخ میں نہیں ملتیں۔ ترجمہ کرنے والے نے بعد کے واقعات غالباً خود اضافہ کئے ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے راج تلک اور ان کے عہد کے واقعات تفصیل سے درج ہیں۔ جن کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"مہاراجہ بہادر نے پنڈتوں اور جوتشیوں کو بُلا کر راج تلک کا مہورت کیا تو ماہ پھاگن بسنت رتوں سمت ۱۹۱۲ کا مہورت قرار پایا تو مہاراجہ گلاب سنگھ جی بڑی دھوم دھام سے جشنِ راج تلک کی تیاری کرنے لگے۔ اس موقع پر دیگر ریاستوں سے راجہ مہاراجہ بُلائے گئے . . . . . دیگر ملکوں سے راج تلک کی خبر سُن کر کے طرح طرح کے تماشا کرنے والے لوگ بھی جموں آئے اور جشن راج تلک کی رسوم خوب دھوم دھام سے ہونے لگیں۔ منڈپ کو اچھی طرح سجایا گیا۔ جب راج تلک دینے کا مہورت عنقریب پہنچا تو مہاراجہ گلاب سنگھ نے منڈی مبارک میں دربار کیا۔ اور اپنے ہاتھ سے سری رنبیر سنگھ جی کو راج تلک دیا۔ اور پھر منڈی مبارک سے سواری سجائی گئی۔ ہاتھیوں کو خوب سجایا گیا اور فوج اردل میں تھی۔ توپ خانہ اور رسالہ وغیرہ بھی اردل میں تھے۔ بہت سے باجے اور بندوقی چوبدار وغیرہ بھی اردل میں تھے۔ جب جلوس راجہ بالدیو جی کی منڈی یعنی پرانی منڈی

پہنچا تو دہیں .... ادا کی گئی ....."

زبان پر سفارسی اثرات مفعولوں اور جملوں کی ساخت میں بھی نظر آتے ہیں :

حکومتی کونسل کی کاروائیوں کی ایک مسل

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں حکومتی کونسل کی کاروائیوں کی کچھ مواد بھی ہم کو ملتی ہیں۔ بعض اجلاسوں کی کاروائی کی نقل جو مسلوں سے دستیاب ہوئی ہے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اس سے دفتری زبان کی ترقی پر روشنی پڑتی ہے۔

حاضرین جلسہ

سری مسٹر کارڈلڈ	جی سی ایس آئی
راجہ سر امر سنگھ	کے سی ایس آئی
رائے صاحب راجہ نرند داس	ام پی
خان بہادر غلام احمد خان صاحب	ملٹری ڈپارٹمنٹ

مسودہ قواعد چھاؤنی راجہ صاحب ملٹری اڈوائیزر

ہمراہ اجرائی کمانڈر ریاست بعد منظوری باضابطہ کونسل کی پیش ہوا۔

قواعد چھاؤنی ہنس راج ہیں، جو نو فصلوں اور (۷۵) دفعات پر مشتمل ہیں :-

قاعدہ اول۔ قاعدہ اول کو اس طرح پر بیان کیا جا سکتا ہے :

"جنرل کمانڈنگ سری نگر کسی شخص کو جو اندرون چھاؤنی یا کسی بازار یا سرکاری جگہ میں کسی جرائم ذیل کا مرتکب معلوم ہو سزا ئے جرمانہ جو ۵۰ روپیہ سے زیادہ نہ ہو یا قید محض جو ہفتہ سے زیادہ نہ ہو یا ہر دو دے سکتا ہے

ڈگری سماۃ منورتھو بابت معہ گانو   حق بسوئے ونڈ گلو بے دھادرکی۔ . . . . . (یہ تفصیل طویل ہے)۔

"سرکار والا نے جہاں تک دیکھا ہے اور سرکار بکنٹھ باشی جی سے سُنا ہے۔ یہ اقوام چارک وکوال لنگیہ سلساریہ اندو دترجیح اور دیگر اقوام جو کہ ۱۳ یا ۱۴ نمبر کے قریب ہیں، ان کی عورتیں خاوند ثانی نہیں کر سکتیں ہیں، کیونکہ یہ اقوام ساریہ کہلاتی ہیں اور شاہی خاندان واقوام راجپوت کو لڑکیاں دیتی ہیں۔ اگر کوئی عورت اقوام مذکور میں گھر سے نکل جاوے یا دوسرا خاوند کر لیوے تو اوس کو کوئی استحقاق جائیدادِ شوہری پر نہیں ہوتا۔"

آگے لکھا ہے کہ عدالتوں نے اپنے فیصلے میں اس امر کو ملحوظ نہیں رکھا اور اگر سرکار والا میں اس مسئلے کو پیش کیا جاتا تو سرکار ضرور نوٹس لیتے۔"

مشیر مال خان بہادر غلام احمد خان صاحب نے "اصلاح یہ محکمۂ کاہچرائی افشا تغلب، مبلغ چار ہزار روپیہ" ۹ ستمبر کو مرتب کر کے ۴ ستمبر ۱۹۰۱ء کو کونسل میں پیش کیا تھا۔ جس کی تفصیل دی ہے:

"محصول کاہچرائی کی مختصر تاریخ۔

محصول کاہچرائی سرکار مہاراجہ گلاب سنگھ صاحب سورگباشی کے عہد سے قلمرو جموں کشمیر میں نافذ ہے۔ اس محصول کا لگایا جانا اس خیال پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف زمین کی سلطنت بلکہ بالعموم اس کی ملکیت بھی قلمرو جموں کشمیر کے فرماں روا کا حق ہے۔ علاوہ بریں قلمرو ہٰذا زیرِ بحث قریب تا پہاڑی و میدانی علاقہ جات پر مشتمل ہیں

جہاں نہ صرف رعایا ریاست ہے بلکہ وہ لوگ بھی جو حدود ریاست سے باہر بود و باش رکھتے تھے۔ جہاں اپنے مویشی چرایا کرتے لہذا ریاست بلا شک مستحق تھی کہ چرانے والے جو چراگاہ کے استعمال سے بے انتہا فائدہ اٹھا رہے ہیں اس میں سے کم از کم کچھ حصہ لے۔"

اس تمہید کے بعد دیہاتوں کی تفصیل سے کاہ چرائی کی شرح دی ہے اور نقشے اور جدول بھی دیئے گئے ہیں۔ ساری کارروائیاں ایک ضخیم مثل کی صورت میں کچھ دلیسی، کشمیری، اور سیالکوٹی کاغذ پر اور کچھ جدید مشینی کاغذ پر نیلی روشنائی سے لکھی ہوئی ہیں۔ ہر کارروائی کے نیچے کونسل کے سیکرٹری کے دستخط ثبت ہیں۔ مثل کی ضخامت کوئی ڈیڑھ ہزار صفحات کے قریب ہے۔ ہر صفحے کے پہلے نصف صفحے پر کارروائیاں درج ہیں اور باقی نصف کونسل کی تجویز کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ کونسل کی تجویزیں اور فیصلے اسی دوسرے نصف حصے میں درج ہیں

ایک روبکاری کی نقل

یہ روبکاری راجہ امر سنگھ کی جانب سے ۱۰ر جولائی ۱۸۹۹ء کو راجہ رام سنگھ کے انتقال کے بعد ان کے منصب کا جائزہ اپنے تفویض کئے جانے کے بارے میں جاری کی گئی تھی۔ یہ منشی حسن ابن علی کی ڈائری سے ماخوذ ہے۔

از پیشگاہ حضور راجہ امر سنگھ صاحب بہادر کے سی۔ ایس آئی کمانڈر ان چیف افواج جموں وکشمیر۔ جنرل آرڈر نمبر ۵۔

حضور لفٹننٹ کرنل راجہ سر رام سنگھ صاحب بہادر کے سی۔ بی، کمانڈر

انچیف افواج جموں و کشمیر کے سُرگباشس ہونے سے وہ رنج والم شاہی خاندان و اہلیان ریاست و ملازمانِ جنگی و ملکی اور رعایا کو ہوا کہ جس کا بیان کرنا ناممکن ہے خصوصاً فوج کو جس قدر صدمہ حضور سرگباشی کی ناگہانی وفات سے ہوا۔ اس کا علاج طاقتِ بشری سے باہر ہے لیکن بغرضِ انتظام و بہبودی فوج پیشگاہ حضور سری سرکار والا سے بتوسل ارشاد مصدرہ ۸ ماہ ساون ۵۶ء بحوالہ رزولوشن اسٹیٹ کونسل مورخہ ۵ ماہِ ساون ۵۶ء مطابق ۱۶ ماہ جولائی ۱۸۹۹ اس عہدہ عظیم کے مراتب کا انجام دینا سپرد اینجانب ہوا۔ اس میں ذرّہ بھی شک نہیں کہ حضور با بدولت اس کمی کو جو حضور راجہ صاحب کے اس جہانِ فانی سے رحلت کر جانے کی وجہ سے ہوئی پورا کرنا ناممکن خیال فرماتے ہیں۔ اِلّا اس موقع پر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان تمام اصول اور قواعد کو جو فوجِ ریاست میں رائج ہیں یا بعد ازاں وقتاً فوقتاً جائز طور پر نفاذ پذیر ہوں گے، مدنظر رکھ کر مفائد اور حقوق ہر کہ و مہہ ملازم فوج کا حفاظت کرنا یا قایم رکھنا ہم سب سے اعلیٰ فرض سمجھیں گے۔ ہم کو فوج کے ساتھ قدرتی طور پر بوجہ پیدائش در قوم راجپوت محبت اس کی بہتری میں دلچسپی اور اس کی حالت کی ترقی اور بہبودی کی ازبس خواہش ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ وہ محبت، اعتبار، بھروسہ جو فوج کو حضور کمانڈر انچیف سرگباشی کے ساتھ تھا۔ وہی ہم پر بھی رکھیں گے اور آج حضور ممدوح نے چارج لے لیا۔ فقط۔

ایک خیر مقدمی تقریر

منشی حسن دین علی نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور راجہ امر سنگھ کے میکن سکول میں تشریف لانے کے موقع پر جو خیر مقدمی تقریر کی

تھی اور جس کی طرف ان کے حالات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ذیل میں

درج ہے : منشی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تقریر سادہ انداز میں

اس لئے لکھی ہے کہ انگریز بھی اسے سمجھ لیں ،

اعلیٰ حضرت، خوش آمدید و صفا آوردید۔

امروز شاہِ شاہاں مہمان شُدہ است مارا

اقبال و عز و دولت وہاں شدہ است مارا

ہم تمام اُستاد اور طلباء مشن اسکول کے اس مبارک موقع پر، جس کا نصیب ہونا غایت درجے کی خوش قسمتی سے ہے، حضور انور کی تشریف آوری کے شکرگذار ہیں۔ یہ چند شکستہ الفاظ نہایت خاکساری اور حق شناسی کی دلی جوش سے پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ہم شکستہ زبانوں کے پاس وہ الفاظ موجود نہیں جن سے اس نعمتِ عظمیٰ کا شکریہ قرارِ واقعی ادا کیا جاتا، اما بہ سبب جوشِ سرور کچھ کہنے کے بغیر ہمارے دلوں کو تسلی نہیں ہوگی۔ اس لئے الطافِ شاہانہ سے یہ توقع ہے کہ ہمارے اس ناقص شکریہ کو درجہ اجابت عنایت کریں۔ اعلیٰ حضرت کی تشریف آوری سے جو مسرت اور خوش وقتی ہم کو نصیب ہوئی وہ حدِ بیان سے باہر ہے اور اس خوش نصیبی اور خوش وقتی سے اس قدر ہمارے حوصلے بڑھ گئے جس کا اندازہ کرنا صرف روشن دماغ اور دقیق النظر اشخاص کا کام ہے اور اس اسکول کو جو دس بارہ سال سے اس سرزمین میں کام کر رہا ہے حضورِ انور کے قدومِ مبارک سے اعلیٰ درجے کی رونق اور ترقی ہوگی اور ہمارے خیالات وسیع اور ہمارے حوصلے فراخ اور ہمارے ارادے بلند ہوں گے۔ فی الواقع یہ امر ایک چھوٹا امر نہیں بلکہ اگر ہم آبِ زر سے صفحۂ تواریخ پر اور اپنے کارناموں میں لکھ لیں۔ زیبا ہے کہ قرناً بعد قرناً اور نسلاً بعد نسلٍ ایک عالی شان یادگار ہوگی اور ہمارے اس اسکول کی

وقعت بھی اس وقت سے اہلِ نظر کے سامنے چند در چند ہو جائے گی۔ اس کام کا پودا اگرچہ ابتدا میں مسٹر ڈاکسے نے اس گلزمین میں لگایا تھا مگر اوس نے زیادہ تر مسٹر نولس اور ان کے لایق وفایق رفیق کی عرق ریزی اور جانفشانی سے سرسبزی اور غایت درجے کی نشوونما پائی اور اس قدر شاخ و برگ نکالے کہ جس کے نظارہ کے لئے اعلیٰ حضرت نے بھی شوق ظاہر فرمایا۔ اوایلِ وقت میں جب مسٹر ڈاکسے نے اس اسکول کو جاری کیا، صرف چار لڑکے موجود تھے۔ مگر اوس وقت سے پایہ بہ پایہ یہاں تک ترقی کرتا گیا کہ اب اوسکی کئی شاخیں اس ملک میں واقع ہیں۔ اور طلبا، جو ہمارے ان اسکولوں میں تعلیم پارہے ہیں، قریب تین سو شمار میں ہیں۔ الحق اتنی مدت میں جو کچھ عجیب و غریب کاروائی اس سکول کے لایق وفایق منتظموں سے حضورِ انور کی قلمرو میں ظاہر ہوئی وہ مثلِ آفتاب روشن ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔ جس کی صداقت پر اس محفلِ عالیہ کا انعقاد ایک بینہ قاطع ہے، جو کچھ مُدعا اور علت غائی اس اسکول کے سرگرم اور جاں فشاں منتظموں کی کاروائی سے ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اطفال اور افراد جو ہماری تعلیم و تربیت کے ماتحت ہیں۔ ان کے دِل دیانتداری و نیکوکاری وغیرہ صفات حسنہ کے نور سے مثلِ آئینہ روشن ہو کر خُدا کے نیکوکار بندے اور ریاست کی خیر خواہ رعایا ہو جائیں۔ اور اپنے ہمشہریوں کے حق میں برکات و بہبودی کا باعث ٹھہریں۔ کیونکہ جس عنوان پر اون کو دینوی تعلیم دی جاتی ہے اوسی عنوان پر اون کی شائستگی اور درستی اخلاق پر بھی حتی الامکان توجہ مصروف ہوتی ہے۔ ہم اس اسکول کی ترقی میں جہاں تک ہماری معلومات میں گنجایش ہے بڑی سرگرمی اور غایت درجے کی توجہ سے کوشش کرتے ہیں اور لڑکوں کو یونیورسٹی کے امتحان کے لئے تیار کررہے ہیں۔ جس میں اون کے فوایدِ ذاتیہ اور صفاتِ علیہ شامل ہیں۔ بالخصوص ہم بڑی

خوشی سے اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ چھ لڑکے مڈل اور پانچویں کے لئے
طاقتوری اور ہنرمندی سے اون کو جسمانی
لحاظ سے آراستہ کرتے جاتے ہیں۔ مثلاً فٹ بال، کرکٹ
فن کشتی رانی، مشقت والی، فن مصارعت،
بلائے کا فن وغیرہ امورات میں ہماری کوشش سے مہارت پیدا کرتے جاتے ہیں۔
جس سے اون کے دلوں میں ہمت کا مادہ جو انسانی طبیعت کا خاصہ ہے، پیدا ہو کر
اون کے طبایع اور حواس و قوای انسانیت میں اعلیٰ قسم کے خواص بروز کریں۔
جن کے باعث سواد انگلستان اس وقت روئے زمین پر چمک رہا ہے، اور اس
تمام کاروائی کا باعث اور محرک وہی ہمدردی ہے، جس کا بہت سا مادہ اس
اسکول کے مہتمموں اور منتظموں کے دلوں میں رکھا ہوا ہے اور اُمید قوی ہے کہ
اوس کے نتایج اور فوائد حضور انور کی قلمرو میں دور دور تک پھیلتے جائیں گے۔
اور آئندہ یہ ملک بھی جس کو جنت نظیر کہا جاتا ہے۔ اسم بامسمّٰی ہو جائے۔ اخیر
میں ہماری یہ التماس ہے کہ جس طرح یہ اسکول اعلیٰ حضرت کے سایہ حکومت
میں اب تک رہا ہے اور رہے گا۔ اوسی عنوان پر اپنے الطاف شاہانہ کے خاص
ظل توجہ اس پر ڈال کر وقتاً فوقتاً مشمول عنایات و مشکور یادآوری فرمادیں۔

ہم اس موقع پر حضور راجہ رام سنگھ صاحب بہادر بالقابہ اور حضور
راجہ امر سنگھ صاحب بہادر بالقابہ کا بھی شکریہ بھی تہہ دل سے ادا کرتے ہیں۔
جنہوں نے وقتاً فوقتاً اس اسکول کی امداد پر اپنی توجہ مبذول فرمائی ہے۔
انتہی ——

لہ ۔ باکسنگ کا یہ ترجمہ شاید قبول خاطر نہ ہو۔

ادارے

ریاست کے مختلف حصوں میں علمی اور ادبی ذوق جیسا جیسا پھیلتا گیا، صاحب شعور اور صاحب ذوق اصحاب کو، جن میں کئی شعر اور ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے، آپس میں مل بیٹھنے اور علمی اور ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیال کے مواقع فراہم کرنے کی خواہش فطرتاً اُبھرتی گئی۔ ڈوگرا مطلق العنان حکمرانوں کو ایسے اجتماع پسند نہیں تھے۔ اس لیے یہ خواہش دل کی دل ہی میں رہ جاتی تھی۔ آخر اس کی ایک صورت اس طرح نکل آئی کہ ریاست کے رزیڈنٹ کے دفتر میں کچھ صاحب ذوق منشی جو اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے پہل کی۔ کیونکہ رزیڈنسی کے علاقہ میں مہاراجہ کا حکم نہیں چل سکتا تھا۔ خاں صاحب منشی سراج الدین احمد خان، میر منشی رزیڈنسی نے اس خواہش کو عملی جامہ پہنایا۔

انجمن مفرح القلوب

منشی صاحب کے حالات کے سلسلے میں انجمن مفرح القلوب کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ یہ انجمن ہم مذاق، ہم نشینوں کے ایک آزاد ادارہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ابتدا میں اس کا دائرہ تفریحی مشاغل تک محدود رہا اور یہ اس زمانے کی سیاسی فضا کے مد نظر مناسب بھی تھا۔ لیکن اس کے ارکان میں ادبی ہو گا انجمن نمایاں تھیں۔ اس لئے جلد ہی اس کے اہتمام سے شعری محفلیں منعقد ہونے لگی تھیں۔

انجمن مفرح القلوب کے اجتماع دلچسپ متنوع انداز کے ہوتے تھے۔ ابتداء میں رزیڈنسی کا احاطہ ان کے لئے منتخب ہوا تھا لیکن بعد میں منشی سراج الدین احمد خاں کے مکان پر بھی اس کی محفلیں منعقد ہونے لگی تھیں لیکن اس کی وہ محفلیں دلچسپ ہوتی تھیں، جو موسم بہار میں شالامار اور نشاط اور کبھی کبھی رواں ڈونگوں اور شکاروں میں منعقد ہوتی تھیں۔ حبیب کیفوی اپنے مضمون "جموں وکشمیر کا شعری محفلیں" (صحیفہ، لاہور شمارہ ۱۹۶۶ء) میں ان محفلوں کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

"معمول یہ تھا کہ ہفتے کو اس کے اراکین ڈونگوں میں سامان خورد و نوش لے کر ڈل کی طرف نکل جاتے۔ رات ڈونگوں میں ڈل کے کنارے بسر کرتے، صبح کو نشاط، شالامار، نسیم باغ یا چشمہ شاہی میں ڈیرے لگا لیتے اور تمام دن ہنسی مذاق اور شعر خوانی میں گذار دیتے ۔۔۔"

انجمن مفرح القلوب رفتہ رفتہ ریاست کے اور باہر سے آنے والے ادب دوستوں کا مرکز بن گئی تھی۔ چنانچہ باہر سے جو صاحب ذوق ادیب اور شاعر کشمیر کی سیاحت کو آتے، وہ بھی انجمن کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے ان میں سر محمد اقبال، سر عبدالقادر، سر محمد شفیع، جسٹس شاہدین ہمایوں اور دوسرے بہت سے مشاہیر قابل ذکر ہیں۔ مشہور صحافی ملک نصراللہ عزیز ۱۹۲۳ء میں جب کشمیر آئے تھے، انجمن کی ایک محفل میں شریک ہوئے تھے چنانچہ "ایشیا" شمارہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے اس انجمن کا تذکرہ یاد ماضی کے طور پر اس طرح کیا ہے:

"میں جاتے ہی اس انجمن کا عارضی ممبر بن گیا۔ مجھے غالب حسرت

اور اقبال کی غزلیں ترنم کے ساتھ پڑھنے کا شوق تھا اور اس انجمن

کے ارکان اِن کے دِلدادہ تھے۔"

اس انجمن کے ایک غیر معمولی اجتماع کے بارے میں ملک عزیز نے جو لکھا ہے اس سے

بھی اس کی متنوع دِلچسپیوں پر روشنی پڑتی ہے:

"عید کی نماز ہم نے اس عیدگاہ میں پڑھی، جو بعد میں تحریکِ آزادی

کشمیر کی جلسہ گاہ بن گئی۔ اور نماز کے بعد، انجمن مفرح القلوب کا

اجلاس منشی سراج الدین احمد خاں کے مکاں پر منعقد ہوا۔

تفریح و مسرت کا ہنگامہ برپا تھا۔ غم عشق تھا نہ غم روزگار، لطائف

نظمیں اور قہقہے جاری تھے......"

انجمن کے دوسرے سرگرم ارکان میں چودھری خوشی محمد ناظر،

پیرزادہ محمد حسین عارف اور سعد الدین سعد بھی شامل تھے۔ اس انجمن نے

جوانوں میں شعر و ادب کے مذاق کو پھیلانے اور اسے نکھارنے کے ساتھ ساتھ،

ایک اور بڑی خدمت یہ انجام دی کہ اس کے اجتماعوں کی بدولت، دوسرے

سیاسی، سماجی، تعلیمی اور ادبی اداروں کے قیام کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔

منشی سراج الدین احمد خان نے خود ایک نوٹ میں، جو "مخزن" میں شائع

ہوا تھا، اس انجمن کا تذکرہ انجمن مفرح الارواح کے نام سے کیا ہے اور اپنے آپ

کو اس کا علمبردار بتایا ہے۔

انجمن نصرتُ الاسلام

مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت اور ان کی سماجی اصلاح کے

مقصد سے کشمیر کے مشہور دینی پیشوا امیر واعظ مولوی غلام رسول شاہ کی کوششوں

سے یہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے نمونے پر ۱۹۰۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ میر واعظ نے نئی تعلیم کو کشمیر کے مسلمانوں میں رائج کرنے کے لئے وہی کام کیا تھا۔ جو سر سید نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے انجام دیا تھا۔ وہ کشمیر کے میر واعظوں کے برگزیدہ خاندان میں ۱۲۷۱ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد میر واعظ محمد یحییٰ سربرآوردہ عالم تھے۔ حافظ غلام رسول شاہ بھی اپنے زمانے کے علماء میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ انجمن کے تعلیمی کارناموں میں مدرسوں اور سکولوں کا قیام خاص اہمیت رکھتا ہے، انجمن کی بدولت، وادی کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت عمل میں آسکی۔ ان اسکولوں کے مدرسین میں کئی صاحبِ ذوق ادیب اور شاعر بھی تھے ان میں سے منشی امیر الدین آمیر اور صادق علی خان صادق کا ذکر ہو گزر چکا ہے۔ انجمن نصرت الاسلام کا قیام جس زمانے میں عمل میں آیا۔ لاہور میں انجمن حمایت اسلام مسلمانوں کے تعلیمی اور سماجی مسائل کے حل کے لئے ایک باوقار انجمن کے طور پر کام کر رہی تھی۔ انجمن نصرت الاسلام کے بانیوں کے پیش نظر انجمن حمایت اسلام ہی کا کام تھا۔ انجمن نصرت الاسلام کے سالانہ جلسے بھی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں کی طرح جن میں حالی اور اقبال بھی اپنی نظمیں سناتے رہے، بڑے تزک و احتشام سے منعقد کئے جاتے تھے اور ان جلسوں میں سربرآوردہ مسلمانوں کے علاوہ، پنڈت، علماء اور کبھی کبھی انگریز عہدہ دار بھی شرکت کرتے تھے۔ کشمیر کے اساتذہ شعراء میں منشی امیر الدین آمیر اور منشی صادق علی خاں صادق ان جلسوں میں اپنی قومی نظمیں سنا کر داد حاصل کرتے تھے۔ منشی محمد الدین فوق بھی بعض سالانہ جلسوں میں شرکت کی تھی۔ انجمن کی سالانہ روداد یں، ان ساری نظموں اور مضامین اور تقریروں کے ساتھ جو ان جلسوں میں پیش ہوتی تھیں ہر سال کی جاتی تھیں۔

انجمن کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے۔

۱۔ مسلمان بچوں خصوصاً یتیموں کی (جو تعلیم میں بالکل پیچھے ہیں) دینی

اور دنیوی تعلیم کا انتظام کرنا اور حتی الوسع تعلیم میں مدد دینا۔

۲۔ اہلِ اسلام کو اصلاحِ طرزِ معاشرت اور تہذیب اور باہمی اتحاد اور اتفاق و خیر خواہی ریاست کا شوق دلانا۔

انجمن کے تعلیمی اور سماجی مقاصد کی وجہ سے ملک کے رئیس اور راجے مہاراجے بھی اس کی رقمی امداد کرتے تھے۔ چنانچہ چھٹے سالانہ جلسے کی جو روداد ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی تھی اس میں، مہاراجہ گائیکواڑ، بڑودہ کی جانب سے "چندۂ خطیر" کے عطا ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔ انجمن کے سرپرستوں میں سوپور کے رحمٰن ڈار، خواجہ عبد الغنی وکیل کے علاوہ جن کے انتقال پر کہی ہوئی منشی غلام محمد خادم کی نظم کے کچھ شعر، گذشتہ صفحات میں نقل کئے جاچکے ہیں، بارہ مولہ کے رئیس خواجہ عبد الصمد ککرو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس سال کی روداد میں اس بات پر اظہارِ طمانیت کیا گیا ہے کہ انجمن کی سرپرستی میں جو سکول قائم کیا گیا تھا۔ وہ خدا کے فضل سے ترقی کر رہا ہے۔ روداد کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

"ہم کیا، ہماری بضاعت کیا کہ خداوند کریم کے فضل و احسان کا شمار کر سکیں یا تو وہ دن تھا کہ بڑے زور شور سے ہمارے اپنے ہی مہربان ہم وطن یہ پرشن اٹکاتے تھے کہ کشمیری مسلمانوں کا سکول چلنے کا نہیں۔ کیونکہ یہاں برادرانِ اسلام میں نہ شوقِ تعلیم ہے نہ ایسے کاموں میں دلچسپی، پھر چلے تو کیونکر۔ مگر خدا کی مہربانیوں کے قربان کہ جس نے بانیانِ مدرسہ کے ہاتھوں سے اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔"

۱۹۱۰ء کی سالانہ روداد میں اس بات پر بھی مسرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ عام مسلمان انجمن کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

کہ لوگ سالانہ روداد کے چھپنے کے منتظر رہتے ہیں۔ اس جلسے میں، خواجہ امیر الدین نے ایک مسدس سنایا تھا۔ ان کے علاوہ منشی صادق علی خان صادق، سکنڈ ماسٹر مدرسۂ نصرۃ الاسلام، منشی غلام محمد صادق، منشی غلام محمد خادم نے بھی نظمیں سنائی تھیں۔ ان شعراء کا حال لکھا جا چکا ہے۔ سالانہ جلسے کی تقریروں میں، اختتامی تقریر خواجہ عبد الصمد ککرو کی ہے، جس کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں:

"جناب صدرِ مجلس و معزز حاضرین۔ آپ جانتے ہیں کہ میری عادت ہمیشہ سے ہر ایک تقریر کو بسم اللہ اور حمد و نعت سے شروع کرنے کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو حدیث میں آیا ہے،

"کُلّ اَمرٍ ذی بالٍ یبدا فیہ بِسمِ اللّٰہ فہو ..."

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ عبد الصمد مشّاق مقرر تھے۔ ایک اور تقریر مولوی احمد شاہ صحاف، مدرس برانچ سکول، سٹیٹ ہائی سکول اور سیکرٹری گرلز سکول سری نگر کی ہے، جس میں انہوں نے مولوی رسول شاہ میر واعظ کے تعلیمی اور قومی کاموں کو سراہا ہے:

"ہر کہ و مہ پر روشن ہے کہ جناب مولوی رسول شاہ صاحب میر واعظ مرحوم، خدا اُن کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، اتباعِ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے ثابت قدم تھے کہ انہوں نے اپنے وجودِ مبارک کو بہ تابعت افعال و اعمال سنت نبویہ علیہ افضل الصلوٰۃ والتحیۃ مہذب و مذہب بنایا تھا۔"

سنہ ۱۹۱۱ء کی سالانہ روداد میں پہلی تقریر خواجہ عبد الصمد ککرو کی درج ہے جس میں انہوں نے پنجاب، ہندوستان اور کشمیر میں کی ہوئی اپنی تقریروں کا ذکر کیا ہے۔ اقتباس ہے:

"مجھے جب کبھی پنجاب و ہندوستان اور کشمیر میں بولنے کا اتفاق ہوا، تو میں اسے حمد کبریا، اور نعتِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کیا۔ . . . گویا میں نے وسیلۂ نجات نعت سرورِ کائنات جان کر، ایک مضمون اپنے لئے خاص کر رکھا ہے . . . . . . "

اس روداد میں ایک تقریر مولوی احمد شاہ کی بھی شامل ہے اور ایک اور تقریر نذیر احمد بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی، جج عدالت مطالبہ خفیفہ، کشمیر کی ہے، جنہوں نے آیاتِ طیباتِ قرآنی سے تقریر کا آغاز کیا تھا لیکن چونکہ ان کی وضع قطع مغربی تھی۔ اس لئے معذرت کے طور پر کہتے ہیں:

"صاحبان، آپ مجھ جیسے شخص کی زبان سے آیاتِ طیباتِ قرآن مجید سُن کر تعجب کرتے ہوں گے۔ مگر آپ میری صورت وشکل و شباہت نظر انداز کر کے میری تقریر کی طرف متوجہ ہوں . . . اُنظر ما قال۔"

اس روداد میں سب سے اہم ریزیڈنٹ فریزر کی تقریر ہے۔ اس سلسلے میں روداد میں لکھا ہے کہ فریزر ۱۸ ماہ اپریل ۱۹۱۲ء کو مدرسۂ نصرت الاسلام کے معائنے کو گئے تھے۔ اس موقع پر، ایک ایڈریس انہیں پیش کیا گیا تھا۔ روداد میں لکھا ہے کہ ایڈریس کے اختتام پر "حضور محتشم الیہ سرود را ستادہ ہوئے اور ایک مختصر سی تقریر اردو میں فرمائی۔ امیر الدین صاحب آہبر نے شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد گورنر صاحب نے بھی صاحب موصوف (ریزیڈنٹ) کی تقریر کو دہرایا:

ریزیڈنٹ کی تقریر حسب ذیل ہے:

"صاحبان، میں میر واعظ اور ممبرانِ انجمن کی ملاقات سے نہایت محظوظ ہوا ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہونے پر کہ یہاں عرصہ پانچ سال سے باہمی ناراضگی ہے، سخت افسوس ہوا، مگر خدا کا شکر ہے

کہ دو سال سے ان میں صلح ہوگئی ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ
ایک ہی پیغمبرؐ کے پیروؤں میں باہمی نفاق ہے۔ میں یہ معلوم کر کے
سخت متحیر ہوں کہ اسلامیہ سکول کو جو مدت سے جاری ہے، تمام
قوم سے بوجہ نفاق مدد نہیں ملتی۔ زمانۂ حال میں تمام ہندوستان
تعلیم کے واسطے بیدار ہو رہا ہے۔ مگر یہاں بوجہ نفاق ہنوز خواب
غفلت طاری ہے۔ تمہارے لئے یہ سخت ضرورت ہے کہ آپس میں
اتفاق رکھو اور پرانی رنجشوں کو بالکل بھول جاؤ اور اپنے بچوں کو
عمدہ تعلیم دینے میں آپس میں مل جاؤ۔ اس نصیحت میں میرے ساتھ
ممبرانِ انجمن اور میر واعظ شامل ہیں۔"

فریزر، حیدر آباد میں پہلے مددگار رزیڈنٹ اور کچھ عرصہ رزیڈنٹ بھی رہے۔ حیدر آباد بھی کشمیر کی طرح اُردو کا بڑا مرکز تھا۔ اور کشمیر ہی کی طرح وہاں کی سرکاری اور عام طور پر بولی اور سمجھی جانے والی زبان اُردو تھی۔ اس اعتبار سے فریزر کا اُردو سے واقف ہونا، برطانوی مصالح کے مناسب تھا۔

منشی ہرگوپال خستہ پنڈت لڑکوں کی تعلیم اور پنڈتوں میں سماجی اصطلاح کے کام کے لئے اس زمانے میں نمایاں تھے۔ ان کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ وہ بھی ۱۹۱۰ء کے سالانہ جلسہ میں شریک ہوئے تھے۔ اور تقریر کی تھی:

"میرا گوشت پوست تمام مسلمانوں کے روپیہ سے پرورش یافتہ ہے، کیونکہ میرے کل موکل مسلمان ہیں۔ اس لئے مجھے سخت افسوس ہے کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں نے کچھ بھی تعلیم نہیں پائی۔ سٹیٹ سکول کے سالانہ جلسہ انعامی میں مسلمان طلباء پانچ فیصد سے زیادہ نہیں تھے بحالیکہ ان کی آبادی ۹۴ فیصد ہے"

اراکین میں میرزا مبارک بیگ، شیخ غلام حیدر خان چشتی اور عبدالحکیم پیش پیش تھے۔ بزمِ سخن کی محفلیں ہفتہ وار منعقد ہوتی تھیں، اور عموماً مصرعہ طرح پر غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ اس بزم کا مرکز ابتدا میں چراغ شاہ کی حویلی تھی، لیکن بعد میں یہ محفلیں غلام حیدر خان چشتی کے مکان پر بھی منعقد ہوتی تھیں۔ یہ بزم ۱۹۴۷ء تک قائم رہی اور اس کی سرگرمیوں کی بدولت جموں اور کشمیر کے نوجوانوں میں شعر و سخن کا ذوق پھیلتا گیا۔ ان نوجوانوں میں مسلمان، ڈوگرے اور دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔

بزمِ سخن نے اُردو شعر و ادب کے ذوق کے پھیلانے میں ایک اور طرح سے بھی مدد دی۔ اس کی ہفتہ وار محفلوں کے علاوہ، سالانہ مشاعرے بھی منعقد ہوتے تھے۔ یہ مشاعرے بڑے اہتمام سے منعقد کئے جاتے تھے۔ اور ان سے لوگوں کو اتنی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کہ لوگ سال بھر اس کے انتظار میں رہتے کہ اپنے پسندیدہ اور محبوب سخنوروں کا تازہ کلام سُننے کا انہیں ملے گا۔ اس کے پہلے ہی مشاعرہ میں اُردو شاعری کے سربرآوردہ ستارے، جیسے حفیظ جالندھری، سیماب اکبر آبادی، تاجور نجیب آبادی، ہری چند اختر، سوہن لال ساحر، اثر صہبائی، عابد علی عابد نے شرکت کی۔ یہ مشاعرہ مندر دیوان جوالا سہائے میں ۱۹۲۷ء میں منعقد ہوا تھا۔ اور صدارت رچھپال سنگھ شیدا نے کی تھی۔ جو شعر کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔

ان مشاعروں کے موقعوں پر بڑی ادبی چہل پہل پیدا ہو جاتی تھی۔ مشاعرے کے زمانے ہی میں دوسری تعلیمی، ثقافتی اور ادبی محفلوں کے انعقاد کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مذکورہ بالا مشاعرہ کے دوسرے دن انجمن اسلامیہ کا سالانہ جلسہ مسلم ہال میں منعقد ہوا۔ اور رات میں مشاعرہ بھی ہوا۔ بزم کے دوسرے سالانہ مشاعروں میں چودھری خوشی محمد ناظر، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

یاس یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، جگر مراد آبادی، احسان دانش، عبدالحمید عدم، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، نواب جعفر علی خاں اثر اور فیض احمد فیض بھی شریک ہوتے رہے۔

اسی طرح ایک اجتماع میں مولانا علیم الدین سالک موجود تھے۔ انہیں اس کا احساس ہوا کہ بزم کے مفید کام کو جموں تک ہی محدود نہیں رہنا چاہئے۔ چنانچہ ان کی تحریک پر بزم کی رکنیت اور ضوابط میں وسعت دے کر اس میں کشمیر کو شامل کر لیا گیا اور جموں کی طرح کشمیر میں بھی بزم کا ایک عضو کام کرنے لگا۔ جس سے اہلِ کشمیر کے ذوق کی تشفی کے اسباب مہیا ہو سکے۔ لیکن بزم کا نام بدل کر بزمِ اردو، جموں و کشمیر رکھا گیا۔ نام کی تبدیلی، سری نگر میں منعقدہ اس جلسے میں کی گئی، جس میں مشہور کشمیری قائد اور صحافی پنڈت پریم ناتھ بزاز، یوسف خان، عبداللہ قریشی اور شعراء میں پنڈت دینا ناتھ چکبن مست اور قلیس شیروانی موجود تھے۔ بزمِ اردو کے پہلے صدر پنڈت دینا ناتھ مست منتخب ہوئے اور ایک شاندار مشاعرہ مشن اسکول سری نگر کے وسیع احاطے میں منعقد ہوا۔

بزم اردو عرصہ تک مفید خدمات انجام دیتی رہی۔ اس کے مشاعرے موسم بہار میں، کشمیر میں منعقد ہوتے تھے اور سردیوں میں جموں میں۔ سری نگر میں کچھ مشاعرے ریاست کی صنعتی نمائش کے موقع پر بھی منعقد ہوتے تھے۔ ایک یادگار مشاعرہ ۱۹۳۹ء میں منعقد ہوا تھا، جب کل ہند ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بھی سری نگر میں منعقد کیا گیا تھا۔ کانفرنس کے اجلاس سری پرتاپ کالج میں ہو رہے تھے اور اس میں شرکت کے لئے مشاہیر تعلیم اور علم و ادب، جیسے ڈاکٹر ذاکر حسین، بابائے اردو مولوی عبدالحق، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر امر ناتھ جھا، میاں بشیر الدین احمد اور علامہ کیفی سری نگر آئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر جو مشاعرہ منعقد ہوا، اس کی صدارت سر تیج بہادر

انجمن معین الاسلام

۱۹۱۵ء کے لگ بھگ سوپور میں قائم ہوئی تھی۔ اس انجمن کا مقصد زیادہ تر مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو دینی امور اور علوم کی تعلیم دینا تھا۔ اس کے بانیوں اور سرگرم کارکنوں میں مولوی میرک شاہ اندرابی، خواجہ عمہ جو بچہ، قاضی محمد احسن، خواجہ غلام محمد ذہنو، خواجہ حبیب اللہ تنتلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان اصحاب کی مساعی سے سوپور میں، کئی مدارس قائم ہوئے تھے، جن میں، قرآن، دینی احکام اور مسایل کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ سکولوں کا مروجہ نصاب بھی پڑھایا جاتا تھا۔ انجمن کا قایم کیا ہوا مرکزی سکول اب ہائی سکول تک ترقی کر گیا ہے اور سوپور کے اکثر نوجوان اسی سکول سے فیض پاکر نکلے ہیں۔ اور ان میں سے کئی انجنیر، ڈاکٹر ہیں اور کچھ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہیں۔

انجمن نے سوپور شہر کے علاوہ اطراف و اکناف کے قصبوں اور گاؤں میں بھی سکول قایم کئے ہیں۔

سری نگر کی انجمن ہمدانیہ نے بھی نوعمر بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے سکول اور مکتب قایم کئے ہیں، جن میں، حکومت کے مروجہ نصاب کے علاوہ، دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

بزمِ سخن

جموں میں اس صدی کے اوائل میں، ۱۹۰۹ء کے قریب، شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے کئی نوجوانوں نے مل کر ایک بزم سخن کی طرح ڈالی تھی۔ جس کے سرگرم

سپرو، صدرِ انجمن ترقی اُردو نے کی تھی۔ سر سپرو نے اپنی صدارتی تقریر میں اُردو کی ہمہ گیری اور افادی اہمیت کے بارے میں جو تقریر کی تھی، وہ اب تاریخی اہمیت حاصل کر چکی ہے۔ دوسرے دن آب ڈل پر ایک "سیلانی مشاعرہ" ترتیب دیا گیا اور پندرہ سولہ سجے سجلائے شکاروں میں یہ تقریب بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام کو پہنچی۔ اس کی کچھ دلچسپ تفصیل حبیب کیفوی نے دی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"رات چاندنی تھی، فضا میں خوشگوار خنکی سی تھی۔ ڈل کے سینے پر آرام دہ اور نظر نواز شکاروں کا بیڑا رواں تھا۔ ہانجیوں (ملاحوں) نے شکاروں کو کچھ اس طرح ترتیب دیا۔ کہ ایک حلقہ سا بن کر رنگ و نور کا بنیر نا ہوا حلقہ نظر آنے لگا۔ جس شاعر کے پڑھنے کی باری آتی وہ درمیان کے شکارے میں آجاتا، اپنا کلام سناتا اور پھر اپنی جگہ پر چلا جاتا۔ کسی کو محسوس ہی نہ ہوا کہ یہ بزم سطح آب پر تیر رہی ہے۔"

بزم اُردو کے دوسرے صدر، پنڈت وشوناتھ ماہ منتخب ہوئے تھے۔ جو اُردو کے خوش فکر شاعر تھے۔

بزمِ مُشاعرہ

جموں کے اہلِ ذوق اصحاب کی کوششوں سے ۱۵-۱۹۱۴ء میں قائم ہوئی تھی، جس کے آغاز اور تنظیم میں صاحب زادہ محمد عمر، شیخ غلام نقشبند، سردار وزیر محمد خاں اور شیخ غلام قادر کی مساعی کو بڑا دخل تھا۔ شیخ غلام نقشبند اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے تھے اور اراکین میں، مہر خورشید احمد، جو گلگت میں مددگار رزیڈنٹ رہ چکے تھے۔ سردار عالم خان، ملک محی الدین قمر قمرازی، غلام علی حسرت، غلام حیدر خاں غوری رموز، پنڈت امرناتھ شہید اور منشی غلام نبی گکین

قابلِ ذکر ہیں۔ اس بزم کے زیرِ اہتمام پندرہ روزہ مشاعرے منعقد ہوتے تھے اور جموں کا عجایب گھر مشاعروں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ مشاعروں میں جو غزلیں پڑھی جاتی تھیں، ان کو گلدستہ کی صورت میں شایع کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ مہاراجہ کی ممانعت اور مخالفت کے باوجود، اس بزم نے ایسا وقار قایم کر لیا تھا کہ سرکاری عہدہ دار بھی اس کے مشاعروں اور مجلس انتظامی میں شریک ہوتے تھے۔ بزم کے سرپرستوں میں پنڈت اودے چند گورنر جموں، پنڈت اقبال کشن در، افسر خزانہ اور پنڈت بہاری لال بھاگری، سیشن جج شامل تھے۔ ان سب کو اردو زبان اور شاعری سے لگاؤ تھا۔ لیکن یہ بزم دو تین برس سے زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکی، اور اس کا سبب حبیب کیفوی نے یہ بتایا ہے کہ اس کے اراکین میں زیادہ تر سرکاری عہدہ دار شامل تھے۔ جن کا تبادلہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ صاحبزادہ محمد عمر، سردار وزیر محمد خان جو بزم کے روحِ رواں تھے، خود سرکاری عہدوں پر فایز تھے۔ تاہم ان تین چار برسوں کے اندر بزم کے زیرِ اہتمام ایسے معرکتہ الآرا مشاعرے منعقد کیے، جن کی یاد لوگوں کے دلوں میں باقی رہ گئی۔ ایک یادگار مشاعرہ کا تھوڑا سا حال حبیب کیفوی کے مضمون سے اخذ کر کے یہاں درج ہے:

اس میں مشہور شاعر سہا کی جموں میں آمد اور مشاعرہ میں شرکت کا حال بیان کیا ہے:

"سہا جموں کے ایک مشاعرے میں اتفاقاً آ پہنچے۔ یہ مشاعرہ بڑے اہتمام سے عجائب گھر میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں حفیظ جالندھری بھی شریک ہوئے تھے۔ مشاعرے کے دوران جب سامعین کو یہ معلوم ہوا کہ سہا بھی مشاعرے میں موجود ہیں تو ان کی خوشی کی کوئی

انتہا نہ رہی۔ جب ان کے پڑھنے کی باری آئی تو ان کے لئے سٹیج پر ایک میز رکھا گیا، جس پر کھڑے ہو کر انہوں نے اپنا کلام سنایا۔ اس مشاعرے میں ان کے بعد پھر کسی کا رنگ نہ جما۔۔۔۔۔"

"بزمِ مشاعرہ اور بزمِ سخن کے اراکین اور مؤیدین کی آپس میں چشمک پیدا ہو گئی تھی۔ ایک بزم سے متوسل شعراء، دوسری بزم کے سخن دروں کے کلام پر معاندانہ تنقیدیں لکھتے اور انہیں چھاپ کر لوگوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اس طرح کی چشمک اور اعتبار سے یقیناً نامطبوع ہے، لیکن جموں میں اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ شعراء کو زبان کی درستی، محاورہ اور روزمرہ کی پابندی کا زیادہ خیال رہنے لگا۔ اس طرح مخالفتوں نے بھی ریاست میں ذوقِ ادب اور شعراء اور اردو زبان کے درست استعمال کی سعی میں بڑی مدد دی۔

جموں میں شعر و ادب کے ذوق کی نشوونما کے سلسلے میں اللہ رکھا ساغر کی کوششوں کو بھی دخل تھا۔ وہ خود خوش فکر شاعر تھے۔ اس کے علاوہ پُرجوش انشاء پرداز بھی تھے۔ اپنی مساعی کو وسیع تر کرنے کے لئے، انہوں نے ایک اخبار "جمہور" بھی جاری کیا تھا۔ جو اس زمانے کے قابلِ اعتنا اخباروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس طرح ساغر خود ایک ادارہ بن گئے تھے۔ اپنے اخبار کے ذریعہ سے وہ نہ صرف اپنے خیالات کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے، بلکہ بہت سے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی بھی کرتے رہے لیکن انہیں جلد ہی گرفتار کر لیا گیا اور اخبار بند کر دیا گیا۔ بعد میں انہوں نے "جاوید" بھی نکالنا شروع کیا تھا جو ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔

محرّم کی مجالس

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو کے ذوق کو پھیلانے اور سنوارنے میں، کئی

اور عناصر کا بھی ہاتھ رہا۔ ان میں اداروں کے علاوہ، محرم کی مجلسیں بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ مجلسیں جموں اور کشمیر میں بڑے اہتمام اور سلیقہ سے منعقد کی جاتی تھیں، اور ان میں مرثیہ پڑھنے اور سوز خوانی کے لئے خاص طور پر لکھنؤ سے شاعر اور ذاکر مدعو کئے جاتے تھے۔ یہ مجلسیں خانقاہ، پیر مٹھا میں منعقد ہوتی تھیں اور شہر کے سارے پڑھے لکھے لوگ اور شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے ہندو مسلم اور سکھ حضرات ان میں شرکت کرتے اور نہایت خوشگوار تاثر ساتھ لے جاتے تھے۔ محرم میں پہلے دس دن تک یہ مجلسیں جاری رہتیں۔ ان مجلسوں کا جو اثر لوگوں پر پڑتا ہے۔ وہ مذہبی سے زیادہ شعری اور ادبی ہوتا۔ چنانچہ مرثیوں کے بند، شعر اور مصرع زبان زد ہو جاتے تھے۔ یہ تاثر صلاحیت رکھنے والے اصحاب کو خود شعر کہنے پر ابھارتا تھا۔

ناٹک کمپنیاں

ناٹک کمپنیاں تجارتی ادارے رہے ہیں۔ لیکن ان کے کام کا ایک تہذیبی اور ادبی پہلو بھی ہے۔ اہل جموں کے ذوق و شوق کی بدولت، اکثر پارسی ناٹک کمپنیوں کو بار بار وہاں آنے اور اپنے تماشے پیش کرنے کی خواہش رہتی تھی ان تماشوں میں عوام اور خواص بڑے شوق سے شریک ہوتے اور اس وسیلے سے بھی ان کے ذوق شعر و ادب کی آبیاری ہوتی اور وہ پروان چڑھتا۔ یہ ایک معنی خیز بات ہے کہ اردو میں ناٹک، ڈراما اور اسٹیج کے موضوع پر سب سے پہلی یادگار تصنیف "ناٹک ساگر" جموں کے ہی کے دو صاحب ذوق اہل قلم، محمد عمر اور نور الٰہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔

صحافت

گذشتہ باب میں، ریاست کے پڑھے لکھے عوام کے اخبار جاری کرنے کی خواہش اور مطالبے کو نظر انداز کر کے، مہاراجہ رنبیر سنگھ کی حکومت کی جانب سے ایک سرکاری اخبار "بدیا بلاس" ہفتہ وار کے اجراء کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، اور ان اخباروں کا بھی ذکر کیا جا چکا ہے، جو عوامی مطالبے اور ان کی ضرورتوں کی تکمیل کے مقصد سے ریاست کے باشندے، باہر جا کر، لاہور یا امرتسر سے جاری کرتے تھے۔ اور مہاراجہ کے نظم و نسق پر تنقید کرنے کے مواقع فراہم کر لیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ اس دور میں بھی جاری رہا۔ چنانچہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ابتدائی دور میں لاہور سے بابو غلام محمد نے "آئینہ ہند" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار ۱۸۸۵ء میں جاری کیا تھا۔ اور اس میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور ان کے نظم و نسق پر تنقید کی جاتی تھی۔ ایک اور اخبار "ہمدرد" ۱۸۹۴ء میں جاری ہوا تھا۔ اور اس کا مقصد مہاراجہ کے خلاف تنقیدوں کا جواب دینا تھا لیکن اس میں زیادہ تر اشخاص کو چن چن کر ان کے خلاف لکھا جاتا تھا۔ یہ طریقہ ریاست کے اکثر صحیفہ نگاروں کا رہا۔ چنانچہ پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور پنڈت سالگرام سالک کا بھی یہی طریقہ رہا۔

"کشمیر پرکاش" ماہنامہ تھا، جسے ۱۸۹۸ء سے پنڈت منکا لیشور نکالا کرتے تھے۔ "کشمیر درپن" سرتیج بہادر سپرو کی ادارت میں الہ آباد سے ۱۸۹۸ء سے نکلنے لگا تھا اور ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔ یہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شایع ہوتا تھا۔ سرتیج بہادر کے علم و فن اور سیاسی صداقت شعاری نے اس کے لب و لہجہ کو بہت بلند کر دیا تھا۔ اسی سنہ میں پنڈت ہرگوپال خستہ نے "اخبار شمالی" کے نام سے راولپنڈی سے ایک ہفتہ وار جاری کیا جو دو سال بعد بند ہو گیا۔

پنڈت گوپی ناتھ گرٹو نے جو پہلے "بدیا بلاس" کے اڈیٹر تھے۔ اس کے بند ہونے کے بعد انہوں نے "اخبارِ عام" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا جسے ان کے فرزند، پنڈت بال کرشن گرٹو ترتیب دیتے تھے۔ یہ اخبار ۱۹۲۸ء تک جاری رہا۔

بیسویں صدی کے اوائل کے اخباروں میں "راجپوت گزٹ"، "گلشنِ کشمیر"، "پنجۂ فولاد"، "کشمیری گزٹ"، "کشمیری مخزن" اور "کشمیری میگزین" قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب ہفتہ وار اخبار تھے۔ "راجپوت گزٹ" لاہور سے ۱۹۰۰ء میں ٹھاکر سکھ رام داس نکالنے لگے تھے اور کشمیر کے معاملات پر لکھتے تھے۔ کچھ عرصہ اس کے مدیر پنڈت راج نرائن ارمان بھی رہے۔ یہ اخبار ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ "گلشنِ کشمیر" ۱۹۰۱ء میں مولانا تاج الدین احمد تاج لاہور سے نکالنے لگے تھے۔ کچھ عرصہ جاری رہنے کے بعد یہ کبھی مسدود ہو گیا۔ اسی زمانے میں محمد الدین فوق بحیثیت صحیفہ نگار منظرِ عام پر آئے اور سب سے پہلے اپنا ہفتہ وار "پنجۂ فولاد" لاہور سے ۱۹۰۱ء میں جاری کیا۔ اور اس کو کشمیر کے مسائل تک محدود کر دیا۔ یہ اخبار ۱۹۰۶ء میں بند ہو گیا۔ اس سے ایک سال پہلے خواجہ کمال الدین مسلم مبلّغ انگلستان کے ساتھ مل کر انہوں نے ماہنامہ "کشمیری مخزن" جاری کیا تھا۔ بعد میں جب خود اس کو نکالنے لگے تو اس کا نام "کشمیری میگزین" رکھا تھا۔

پنڈت دیا کرشن گردش، جن کے ایک مضمون کا حوالہ گذر چکا ہے، سری پرتاپ سنگھ کے عہد میں، اردو کی ترقی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

مہاراجہ شری پرتاپ سنگھ جی کے عہدِ حکومت میں دفتری زبان اردو قرار دی گئی، ڈوگری زبان کا ٹاپ پے اور فوٹاری فروخت کر دی گئی اور اس زمانے میں اردو کتابیں طبع ہونا شروع ہوئیں اور اس طرح ڈوگری، سنسکرت اور فارسی کا دور اختتام پذیر ہوا۔ مہاراجہ

پرتاپ سنگھ جی کے عہدِ حکومت میں چھاپہ خانہ کا نام بھی تبدیل کر دیا گیا، نیا نام رنبیر پرکاش برقی پریس رگھوناتھ تجویز ہوا۔ ایسی تبدیلی قدرت کا ایک اٹل قانون ہے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ جی کے عہدِ حکومت میں ان تینوں زبانوں کی ترقی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔

اہلِ کشمیر کی صحافتی جدوجہد کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے کشمیری پنڈتوں کو اپنے مفاد کی حفاظت یا عوامی رائے کو منظم کرنے کے مقصد سے اخبار جاری کرنے کی خواہش پیدا ہوئی ہے اور اس کا سبب ان میں مغربی تعلیم کا پہلے رواج تھا۔ ڈوگرا راجا بھی بعض وقت ان سے کام لیتے رہے۔ چنانچہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی معزولی کے زمانہ میں پنڈت ہرگوپال خستہ اور پنڈت سالگرام سالک کی صحافتی مدد مہاراجہ کے مفاد کے لیے رہی۔ سالک رام جب پرتاپ سنگھ سے کسی بات پر ناراض ہو گئے یا ان کی وہ توقعات پوری نہ ہو سکیں، جو انہوں نے اپنی خدمت کے معاوضہ کے طور پر قائم کر رکھی تھیں تو پھر وہ مہاراجہ کی مخالفت پر اتر آئے تھے اور اس کی طرف اپنی ایک نظم میں اشارہ بھی کیا ہے کہ مہاراجہ کے کہنے سے انہوں نے یہ خدمات انجام دیں۔

ان حالات نے مسلمانوں کو بھی چوکنا اور بیدار کیا اور اس میں محمد الدین فوق کا بڑا حصہ رہا۔ چنانچہ اس صدی کے دوسرے دہے کے دوران مسلمانوں نے بھی کئی ہفتہ وار جاری کر دیے۔ اخبار ہفتہ وار اس لیے نکالے جاتے تھے کہ وہ باہر چھپتے تھے۔ گو ان کی ترتیب جموں یا کشمیر میں عمل میں آتی تھی۔ ان کے ریاست میں پہنچنے تک خبریں پرانی ہو جاتیں۔ اس کے علاوہ اخبار فرقے کے مفاد کے لئے

یا اپنے ذاتی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے نکالے جاتے تھے۔ اس لئے ہفتہ وار ہی ان کے لئے موزوں تھے۔ پھر بھی یہ ہوتا تھا کہ وہ پابندی سے نہیں نکلتے تھے اور اکثر مقصد حاصل ہو جانے یا اس کے لئے سعی کا موقع گذر جانے کے بعد بند ہو جاتے یا طویل وقفوں کے بعد چھپتے تھے۔

مذکورہ بالا اخباروں میں "کشمیر" "انقلاب" "کشمیری مسلمان" "مظلوم کشمیر" "مکتوب کشمیر" قابلِ ذکر ہیں۔ "کشمیر" ہفتہ وار امرتسر سے ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیر خواجہ غلام محی الدین تھے۔ یہ ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔ "کشمیری مسلمان" "مظلوم کشمیر" اور "مکتوب کشمیر" لاہور سے جاری ہوئے تھے۔ "انقلاب" ۱۹۲۹ء میں جاری ہوا۔ یہ کشمیر میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے لئے مسائل جماعتِ احرار کا ترجمان تھا۔ یہ ۱۹۳۱ء میں بند کر دیا گیا۔ اصل میں مذکورہ بالا سارے اخباروں کا ایک سلسلہ ہے اور ان کو حکومت جب بند کر دیتی، تو ان کی جگہ دوسرا اخبار جاری ہوتا۔ لیکن انتظام پُرانا ہی برقرار رہتا۔ یہ جدوجہد زیادہ تر مہاراجہ ہری سنگھ کے زمانے میں جاری رہی۔ اس لئے ان اخباروں کی مزید تفصیل آئندہ باب میں دی جا رہی ہے۔

محمد الدین فوق نے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے اس صدی کے اوائل سے جو جدوجہد شروع کی تھی، اس کی طرف مجمل اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔ "پنجہ فولاد" مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی مفاد کا علمبردار تھا اور ان موضوعات پر خود فوق کے علاوہ ان کے چچا منشی غلام محمد خادم اور بھائی رحیم بخش لکھا کرتے تھے۔ ماہنامہ "کشمیری میگزین" جو ۱۹۰۶ء میں فوق اور خواجہ کمال الدین مبلغ اسلام، انگلستان کی مشترکہ ادارت میں لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اخبار میں ڈوگرا راج کے تحت مسلمانوں کی زبوں حالی کو پیش منظر میں لایا جاتا تھا۔ اس کے

اغراض و مقاصد میں حسبِ ذیل شامل تھے:

۱۔ برادرانِ قوم میں اتفاق، یک جہتی اور ہمدردی پیدا کرنا۔

۲۔ شادی اور غمی کے رسومات میں اصلاح کرنا۔

۳۔ باہمی خصومات کا آپس میں بذریعہ ثالثی فیصلہ کرنا۔

۴۔ صنعت و حرفت اور تجارت کی طرف مائل کرنا۔

۵۔ بزرگانِ قوم کے حالات شایع کرنا۔

۶۔ قوم کے ہونہار لڑکوں کی تعلیم و تربیت پر زور دینا۔

۷۔ قومی خبریں اور دلچسپ اخلاقی و تواریخی اور علمی مضامین بذریعہ نظم و نثر پیش کرنا۔

"کشمیری میگزین" کو ۱۹۱۲ء میں ہفتہ وار کر کے "اخبار کشمیر" نام تجویز ہوا۔ اس کے اغراض و مقاصد بھی وہی تھے۔ جو "کشمیری میگزین" کے تھے، لیکن اس میں مضامین کی بجائے خبروں اور خبروں پر تبصرہ پر زور دیا جاتا تھا۔ یہ اخبار ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔

پنڈت اہلِ قلم نے ایک ماہنامہ ۱۹۱۴ء میں "سفیرِ کشمیر" کے نام سے جاری کیا تھا، جس کے مدیر پنڈت لچھمی نرائن کول تھے اور اس میں پنڈتوں کے مفاد اور ان کی دلچسپی کے مضامین شایع ہوتے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں یہ رسالہ بند ہوگیا اور پنڈت لچھمی نارائن کول اور پنڈت دینا ناتھ چکن مست کی مشترکہ ادارت میں ایک اور ماہ نامہ "صبحِ کشمیر" کے نام سے جاری کیا گیا۔ یہ رسالہ بھی کچھ عرصہ جاری رہنے کے بعد بند ہوگیا۔

پنڈتوں کے اخباروں اور رسالوں کے مقابلے میں جموں کے ڈوگروں کی جانب سے بھی کئی رسالے اور اخبار نکالے گئے۔ ان میں سب سے پہلا رسالہ "مہاجن پتریکا"

۱۹۱۱-۱۲ء میں جاری کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ اور "ڈوگرہ گزٹ" دونوں لالہ ہنسراج مہاجن کی ادارت میں نکلتے تھے۔ "ڈوگرہ گزٹ" ۱۹۱۱ء میں جاری ہوا تھا اور اس کے پہلے ایڈیٹر پنڈت لکھی چند مستگوتہ تھے۔ اور اسے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ اس کے نومبر ۱۹۱۱ء کے شمارہ کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے، جو عموماً ہر رسالہ میں شایع ہوتی تھی۔

"یہ رسالہ ماہواری زیر سایہ سری سرکار والا مدار دائم اقبالہ
دھرم مورت مہاراجہ صاحب بہادر سر پرتاپ سنگھ جی سی۔ ایس
آئی، والی جموں وکشمیر د تبت شایع ہوتا ہے۔"

اس تعلق سے ظاہر ہے کہ اس میں عام طور پر ڈوگرہ اور خاص طور پر مہاراجہ کے مفاد کے مضامین شایع ہوتے تھے۔ رسالہ سرکاری پریس میں چھپتا تھا اور اس میں عام علمی اور ادبی مضامین کے علاوہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور ان کے عہدیداروں کی توصیف کے مضامین شایع ہوتے تھے۔ کچھ قصیدے بھی اس میں شایع ہوئے ہیں۔ مہاراجہ کے دربار سے اس رسالے کی مالی اعانت بھی کی جاتی تھی۔ اس کے مضامین اور زبان کی نوعیت کا اندازہ مذکورہ بالا شمارے کے حسب ذیل عنوانات سے ہو سکے گا:

"عورت کمزور ہے یا مرد (ایڈیٹوریل)۔ فغان سیتا جی (نظم)، طالب علم کے فرائض۔ "یدعشر"، کبت شراب، میلہ جھڑی، اشتہاری حکیموں کا کچا چٹھا۔

کشمیر سے باہر

گذشتہ صفحات میں سیالکوٹ اور اہلِ کشمیر کے تعلق پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ہماری صدی کے عظیم ترین شاعر اقبالؒ اسی سرزمین سے اُٹھے تھے، لیکن اقبال کشمیر کے تعلق سے جتنے عظیم شاعر اور عالم ہیں، عام تاریخ ادب اُردو کا بھی وہ ایک اہم باب ہیں۔ تاریخ ادب سے ہٹ کر ان کی فکر و نظر کی عظمت اور گوناگونی اور اُس کے علمی پہلوؤں کی وجہ سے ان کے بارے میں نہ صرف اُردو بلکہ فارسی، انگریزی، عربی اور یورپ کی کئی زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

اقبال اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کا سلسلہ کشمیری پنڈتوں کے خاندان تک پہنچتا ہے۔ یہ خاندان بہت عرصہ پہلے اسلام قبول کر چکا تھا۔ ان کی ولادت سیالکوٹ ہی میں ۱۸۷۵ء[1] میں ہوئی تھی۔ والد شیخ نور محمد ایک دیندار بزرگ تھے جن کے دادا کشمیر کے سپرو خاندان سے تھے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ ہی کے ایک مکتب میں حاصل کی۔ اسکاچ مشن کالج میں بھی ان کی تعلیم ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں داخل ہوئے، جہاں انہیں پروفیسر آرنالڈ کی سرپرستی کے مواقع نصیب ہوئے۔ پروفیسر آرنالڈ فلسفہ کے اُستاد تھے اور ایم۔ اے۔ اور کالج میں قیام کے زمانے میں شبلی سے ان کے اچھے مراسم ہو گئے تھے۔ اور ان سے عربی بھی پڑھی تھی۔ آرنلڈ نے اقبال پر جو گہرے اثرات چھوڑے تھے، ان کا کچھ اندازہ ان کی نظم "نالۂ فراق" سے ہوتا ہے، جو آرنالڈ کی انگلستان

---

[1] اقبال کے سنِ ولادت کے سلسلے میں ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۶ء کا ذکر ہوتا رہا ہے لیکن ۱۸۷۵ء سروری صاحب کا اضافہ ہے۔

کو روانگی کے موقع پر لکھی گئی تھی۔

اقبال نے بھی اپنے عہد کی روایت کے مطابق شاعری غزل سے شروع کی تھی اور سب سے پہلے وہ شمس العلماء سید میر حسن اور مرزا ارشد گورگانی سے مشورہ کرتے رہے۔ اسی زمانے میں غزل کے استادالاساتذہ داغ سے بھی انہوں نے رجوع کیا جو حیدرآباد میں تھے۔ لیکن یہ اقبال کی ابتدائی مشق کا زمانہ تھا۔ شعر کے فن پر دسترس حاصل ہو جانے کے بعد ان کی خوصلہ مندی کے لئے ان اساتذہ کی شاعری میں کوئی بات ایسی نہیں تھی، جو اس طرز شاعری سے ان کی دوامی وابستگی کا باعث ثابت ہوئی۔ اقبال کی شاعری میں نیا موڑ اس وقت آیا، جب وہ غالب کی شاعری سے روشناس ہوئے۔ یہی آئندہ ان کی عظیم شاعری کی بنیاد ثابت ہوئی۔

اقبال بنیادی طور پر قوم پرست اور وطن پرست شاعر تھے۔ چنانچہ ابتداء میں بہت سی نغمیں قومی اور وطنی نظمیں لکھیں۔ لیکن ان کے ارتقاء کے ساتھ، ان کے حب وطن اور ان کی قوم پرستی، فلسفیانہ تعقّل پسندی کی بنیادیں تلاش کرنے لگی۔ اصل میں ان کا ابتدائی قومی اور وطنی تصوّر، یورپ کی مخصوص فکر کا نتیجہ تھا۔ یورپ میں قیام کے زمانے میں اس تنگ نظرانہ تصور کی خامیاں انہیں شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگیں اور وہ انسانی برادری کی تنظیم اور خوش حالی کے لئے بہتر اور روحانی بنیادوں کی ٹوہ میں لگ گئے۔ یہ بنیادیں انہیں اسلامی عالمی برادری میں نظر آئیں جس کی توضیح اور تشریح کے لئے انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو وقف کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں ایک عالمی اپیل مضمر ہے۔ اسی لئے ان کی فکر کے گوشوں کی چھان بین یورپی مفکرین کو دعوتِ عمل دینے لگی۔ اس پہلو سے اقبال کا شمار

دنیا کے عظیم مفکر شاعروں میں ہوتا ہے۔

اقبال کو کشمیر کے ساتھ نسلی ربط کے علاوہ گہرا ذہنی ربط بھی رہا۔ جہاں وہ کشمیر کے فطری مناظر کے حُسن اور ان کی رعنائی کے گیت گاتے ہیں، اہلِ کشمیر کی مظلومی اور بے بسی پر بھی آنسو بہاتے ہیں۔ کشمیر کے حُسن کو دیکھنے میں ان کی ژرف بین نظریں، عام شاعروں کے روایتی انداز سے متاثر نہیں ہوئیں چنانچہ کشمیر کے حُسن کے روایتی موضوعات، گلمرگ، پہلگام، ڈل یا وُلر پر انہوں نے کوئی نظم نہیں لکھی بلکہ کشمیر کی حقیقی زندگی اور اہلِ کشمیر کے بعض بنیادی مسائل، ان کی توجہ کا مرکز رہے۔ جیسے ان کے حُسنِ فطرت اور ان کی ذہانت کے باوجود، ان کی سیاسی بے چارگی اور سماجی درماندگی پر اقبال کا دِل کڑھتا ہے۔ چنانچہ۔ ان کی مشہور فارسی نظم کا یہ مصرعہ " قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند" زبان زد ہو گیا ہے۔ جس سے انگریزوں کے گلاب سنگھ کے ہاتھ کشمیر کے بیع و شرعا کے قابلِ نفرین معاملے کے بارے میں ان کی گہری دلسوزی ظاہر ہوتی ہے۔ حُسنِ مناظر کی تلاش کے لئے ان کی نظریں لولاب جیسے حسین گوشوں اور ان کے حسنِ دوشیزہ کی طرف جاتی ہیں اور ایسے مرصع شعر نکلتے ہیں:

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب ، اے وادیِ لولاب

اس عہد کے سربرآوردہ اُردو ادیبوں میں، جن کا کشمیر سے تعلق تھا لیکن وہ کشمیر سے باہر رہ کر لکھتے رہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا درجہ بہت بلند ہے انہوں نے اُردو داستان کو ایک نیا موڑ عطا کیا اور ناول کے موجد بنے۔ سرشار لکھنؤ میں رہے اور حیدرآباد میں ان کی زندگی کے آخری ایام بسر ہوئے، لیکن کشمیر کے اور بہت سے مشاہیر کی طرح، کشمیر سے ان کی وابستگی برقرار رہی، بلکہ ذہنی طور پر، وہ کشمیر

کی زندگی اور سیاسی اور ادبی تحریکوں کے ساتھ رہے، لکھنو یا اور مقامات میں کشمیر سے متعلق جو تحریک اُٹھتی، وہ اس میں حصّہ لیتے۔ رِشی پیر، کشمیر کے ایک بزرگ گزرے ہیں، جن کا آستان، مسلمانوں اور ہندوؤں، دونوں کا مرکز بنا رہا۔ اور اب انتقال کے بعد بھی ان کا مزار زیارت گاہ انام ہے۔ سرشار کو ان سے جس قدر عقیدت تھی اس کا اندازہ ذیل کی رباعی سے ہوسکے گا۔

مداح جناب رشپیر آیا ہے　　وصاف شدِ عرش سر بر آیا ہے
خورشید کی آنکھ کیوں نہ جھپکے سرشار　　ہاں ذرّہ خاک کاشمیر آیا ہے

رشی پیر، اہلِ کشمیر کی بول چال میں محض "رشپیر" ہو جاتا ہے۔
ایک کشمیری کانفرنس کے لئے انہوں نے جو قصیدہ لکھا تھا۔ اس کے دو شعر ہیں :-

نہ آب و تاب وہ اگلی سی ہے نہ وہ رنگ و روپ
نہیں وہ شاہدِ مضمون کے پھول سے رُخسار
کمال کے لئے لازم جو ہے زوال ضرور
اب قطرہ ہے، پہلے تھا، قلزم ذخّار

ان اشعار میں اپنے آخری زمانے تصویر پیش کی ہے۔ "فسانہ آزاد" کے ایک کردار کی زبانی، انہوں نے کشمیری کے شعر بھی کہلوائے ہیں۔

سرشار پنڈت بیج ناتھ در کے فرزند تھے، لکھنو میں پیدا ہوئے اور مشہور استاد سخن منشی مظفر علی اسیر سے مشورہ سخن کیا۔ داستان کا انہیں شوق تھا۔ اور بامحاورہ اُردو زبان سے انہیں عشق۔ اسی عشق نے انہیں لکھنو کے شُرفاء کے گھرانوں میں بیٹھ کر، زبان اور اس کے حسن اظہار پر قابو حاصل کرنے پر مائل کیا تھا۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد" اودھ اخبار" سے منسلک ہو گئے تھے۔ جب یہ

لکھنے کی ذمہ داری نے ان سے " فسانۂ آزاد " جیسا شاہکار تصنیف کروایا۔ " اودھ پنچ " " اودھ اخبار " کا مدِ مقابل تھا، جس کے مشاہیر لکھنے والوں میں اکبر الہ آبادی، تربھون ناتھ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف اور خود اس کے اڈیٹر منشی سجاد حسین اپنے عہد کے سربرآوردہ مزاح نگار تھے۔ سرشار اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بدولت ان سب کے مدِ مقابل ثابت ہوئے۔

آغا حشر کاشمیری، جنہوں نے خاص طور پر پارسی ناٹک کمپنیوں کے لئے ڈرامے لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی اور اپنے زمانے کے عوام کے مذاق کے مطابق ڈرامے عطا کرکے، ان کمپنیوں کو مقبول بنانے میں حصہ لیا، اپنے اعلان اور اصل دونوں اعتبار سے کشمیری تھے۔ ان کے والد سید غنی شاہ شال کا کاروبار کرتے تھے اور سری نگر سے ۱۸۶۸ء میں ہندوستان چلے گئے تھے۔ آغا حشر، جن کا اصلی نام آغا محمد شاہ تھا، غالباً غنی شاہ کے بنارس میں قیام کے زمانے میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ شعر و سخن کا مذاق ابتدا سے تھا۔ لیکن ڈراما سے بھی انہیں ابتداء سے لگاؤ رہا تھا۔ اسی کی پیش رفت میں ڈرامے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن جب وہ ناٹک کمپنیوں کی خاطر لکھنے لگے تو ان کے ڈراموں کا وہ خاص انداز متعین ہوا جو ان سے پہلے کے کچھ لکھنے والوں نے اختیار کیا تھا۔ ان میں طالب بنارسی، احسن لکھنوی رونق بنارسی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سر تیج بہادر سپرو کا تذکرہ بہ حیثیت ادیب یا مصنف کے نہیں بلکہ اس لئے ضروری ہے کہ کشمیر کے ایک عظیم فرزند ہونے کے ناطے، جسے اُردو سے بحیثیت زبان کے، اس کی وسیع صلاحیتوں اور اس کے ہمہ گیر مزاج کے امکانات سے جیسی واقفیت تھی۔ بانی فورٹ ولیم کالج، ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو چھوڑ کر،

شاید ہی کسی اور کو ہوگی۔ اُردو کے حق کو منوانے میں انہوں نے جو سعی کی، وہ ان
کی کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ خود مقصد تھی۔ اسی لئے انجمن ترقی
اُردو غیر منقسمہ ہند کے وہ سالہا سال تک صدر رہے۔ سر سپرو اُردو کے عالم اور
بڑے اچھے مقرر بھی تھے۔ ان کی مشہور تقریر جس میں انہوں نے یہ تاریخی اعلان
کیا تھا کہ اُردو ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ اور ناقابلِ تقسیم میراث ہے، کشمیر ہی
میں اور سری پرتاپ کالج کے پلاٹ فارم پر ہوئی تھی۔ یہ اعلان الہامی ثابت ہوا۔ چنانچہ
ملک تقسیم ہوگیا، لیکن اُردو تقسیم نہ ہو سکی۔

کشمیر سے سر سپرو کے سرکاری ربط سے قطعِ نظر، اہلِ کشمیر اور اُردو
سے ان کے گہرے ربط کی نشانی، ان کا رسالہ "کشمیر درپن" بھی تھا۔ جس میں کشمیر
اور اہلِ کشمیر کی دلچسپی اور فلاح و بہبودی کے مضامین اور نظمیں شایع ہوتی
رہیں ؛؛

کشمیر کے اُردو دوستوں اور ہمدردوں میں مولانا علیم الدین سالک بھی ایک
ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ بھی حسب و نسب کے کشمیری تھے۔ لیکن اقبال اور فوق کے
مانند پنجاب میں رہتے تھے۔ انہیں اپنے کشمیری ہونے پر فخر تھا اور انہوں نے کشمیر کی
ثقافت و تواریخ پر بڑے اہم مضامین لکھے۔ جن میں میسور کے حیدر علی کے بارے میں ان کا وہ
مضمون مشہور ہوا جس میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا۔ کہ وہ بنیادی طور کشمیری تھے۔ علم الدین سالک
۱۹۳۰ء سے کشمیر آتے رہے اور یہاں کی بیداری کی تحریک سے منسلک رہے۔ وہ یہاں آکر مولود
شریف کی مجلسوں میں دینی اور تواریخی موضوعات پر نہایت عالمانہ تقریریں کرتے اور
لوگوں کا دل گرماتے تھے۔ وہ کشمیر کے کوائف کی لاہور کے اخباروں میں تشہیر کراتے
رہے۔ حبیب کیفوی کے بیان کے مطابق تحریک کشمیر کے سلسلے میں وہ لاہور کی دیوار دولہا

پر اپنے ہاتھوں سے پوسٹر چسپاں کرتے تھے۔ سری نگر کے قیام میں وہ ادبی
علمی محفلوں کی جان ہوتے۔ انہوں نے انارکلی کے زندہ دیوار میں چنوائے جانے
مفروضے کو شکست تواریخی دلائل سے باطل ثابت کر دیا۔ مولانا کا انتقال ۱۹۳۷ء
میں لاہور میں ہوا۔

نیا عہد، نئی تحریکیں

اس صدی کے اوایل میں، ہندوستان کے اور حصوں میں نئے عہد کی جو شروعات ہو چکی تھیں، ان کا اثر اس دور افتادہ ریاست میں مطلق العنان شخصی اقتدار کے دباؤ اور بندشوں کی وجہ سے کوئی ربع صدی بعد محسوس ہونے لگا اور اس میں انگریز عہدہ داروں کی مداخلت کا بھی حصہ تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ، جن کے عنانِ حکومت سنبھالنے کے زمانے سے یہ دور کم و بیش مطابقت رکھتا ہے، نئی تعلیم سے فی الجملہ مستفید تھے، اور ہندوستان میں جو سیاسی شعور پرورش پا رہا تھا اور جو ثقافتی تحریکیں برپا تھیں، اس سے نا واقف نہیں تھے، تاہم کچھ تو ڈوگرا راج کی جاگیردارانہ روایات ان کے ہاتھ پیر باندھے ہوئے تھیں۔ اور کچھ یہ بھی تھا کہ رعایا کے بعض طبقے، کسی طرح کی جمہوری اصلاحات کو اپنے مفاد کے منافی دیکھتے اور اُن کی راہ میں حایل آتے تھے۔ اس کے باوجود زمانے کی رفتار کو نہ تو روک سکتے تھے اور نہ اس کو پیچھے کی طرف لوٹانے پر قدرت رکھتے تھے۔ انگریزی تعلیم کی اشاعت اور ریاست کے باہر کے حالات سے آگہی اور مغربی طرزِ زندگی اور اس کے سیاسی، سماجی اور ادبی اداروں سے قلبی اور ذہنی لگاؤ کے نتیجے کے طور پر پڑھے لکھے نوجوانوں میں نئی زندگی کی اُمنگیں کروٹیں لے رہی تھیں، اور ایک عیانشی دور اُبھر رہا تھا۔ اس نئے شعور کو عام کرنے میں نئی تعلیم اور وسیع تر ذہنی ربط کے علاوہ رسالوں کا زور تھا

اِشاعت کو بھی دخل تھا۔ ریاست سے اخبار جاری کرنے کی کوششیں جو اُنیسویں صدی کے وسط سے ہو رہی تھیں، ان کے عملی صورت اختیار کرنے کا موقع اس صدی کے ربع اوّل میں نصیب ہوا، جیساکہ اس باب کے آخری حصّے میں اخباروں کے اجراء اور صحافتی مساعی کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوگا۔ غرض ریاست کے اطراف کی متحرک اور ترقی پسند زندگی کے درمیان، یہ ریاست، قرونِ وسطیٰ کی جاگیردارانہ روایات کو سینے سے چمٹائے اور ایک موج سمندر کے بیچ میں ساکت و صامت ٹاپو ہمیشہ کے لئے نہیں رہ سکتی تھی۔

۱۹۲۴ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے عنانِ حکومت سنبھالی۔ پچھلے سوا سو برس تک حکومت کی روایات اس خاندان میں جاری و ساری رہنے کی وجہ سے، ہری سنگھ جہانبانی کے آداب سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ گدی پر بیٹھنے سے کچھ پہلے انہوں نے بعض عوامی تحریکوں میں بھی حصّہ لینا شروع کر دیا تھا اور جو گوناگوں مسائل خاص طور پر ریاست کے سامنے تھے، انہیں سلجھانے کے لئے وسیع نظری سے بھی کام لینا چاہا۔ اس کے باوجود یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ وہ ایک ایسی ریاست کے سربراہ تھے، جس کی رعایا میں ممیّز نسلی، مذہبی اور تہذیبی گروہ تھے۔ وہ اپنے مخصوص لگاؤ کے تحت، ان مسائل سے بلند ہو کر معروضی انداز میں سوچنے سے قاصر رہے۔ خاندان سے حکومت کے تسلسل کے سبب سے ان میں فطرتاً امارت پسندی کی ذہنیت موجود تھی، تاہم جب وہ مناسب سمجھتے، حوصلہ مندی بھی دکھاتے۔ لیکن یہ محدود حوصلہ مندی ان کے آگے کے پیچ در پیچ مسائل سے نبرد آزما نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لئے ان کا نئے ٹھہر سے آدھے راستے پر ملنے کا اقدام بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا۔

ان حالات میں ان کی حکمتِ عملی ریاست کی اکثریت کے بعض اور ترقی پرور اندازِ نظر رکھنے والوں کے لئے تشفّی کا باعث نہیں ہو سکی۔ چنانچہ ان کے عہد میں ذمہ دار حکومت کی تحریک زور پکڑنے لگی۔ ان تحریکوں کو مدد دیتے ہیں، ان کے بعض رجعت پسند وزیروں اور ناعاقبت اندیش مشیرین کا

بھی حقیقت تھا۔ جو مہاراجہ کو عوامی مطالبات کو قبول کرنے کے خلاف مشورہ دیتے تھے۔ اور جبر و استبداد سے ان تحریکوں کو کچل دینے پر انہیں ابھارتے تھے۔ نظم و نسق کو جمہوری بنیادوں پر قائم کرنے میں ناکامی کے سبب بغاوت کے جذبات بھی دلوں میں پرورش پانے لگے تھے۔ اسی ماحول نے کشمیر کے قائدین شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ، مولانا محمد سعید مسعودی، بخشی غلام محمد، چودھری غلام عباس، خواجہ غلام محمد صادق، پریم ناتھ بزاز اور کچھ اور سیاسی کارکنوں کو ابھارا، جو اپنی تعلیم و تربیت کی بدولت جہاں بانی کے لئے اصولوں سے روشناس تھے اور جب یہ میدان میں آئے تو انہیں تادیب کے شکنجے میں پھنسایا گیا۔ احرار تحریک دراصل اسی استبداد کا نتیجہ تھی، جس نے ڈوگرا قصر حکومت کے در و دیوار ہلا دیئے۔ ریاست کے اندر ان تحریکوں پر پابندی کے سبب، ان کو ملحقہ علاقوں میں منظم کیا جاتا، اور جب اس کے کارکن ریاست میں داخل ہوتے تو انہیں گرفتار کر کے جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا۔ یہ ساری تفصیلات جناب خواجہ غلام محمد صادق نے اپنے کتابچے "کشمیر چھوڑ دو" میں بڑی وضاحت سے درج کی ہیں۔

بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق اور تحریک آزادی کے کئی مخلص کارکن، حکومت کی دار و گیر سے بچنے کے لئے لاہور چلے گئے تھے اور وہاں کے عوامی اخباروں سے ربط پیدا کر کے، یا خود اپنے اخبار جاری کر کے تحریک کو چلانے میں کامیاب ہوتے۔[1] حکومت کی سخت گیریوں کے خلاف روزنامہ "انقلاب" میں کئی مضامین شائع ہوتے رہے جس کی وجہ سے ریاست میں اس کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ اس اخبار کی بجائے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۱ء تک کئی اخبار یکے بعد دیگرے جاری کئے گئے جن میں "کشمیری مسلمان" "مظلوم کشمیر" "مکتوب کشمیر" قابل ذکر ہیں۔ جب صورتِ حال قابو سے باہر ہونے لگی حکومت نے گلانسی کمیشن قائم کیا، تاکہ شکایتوں کا جائزہ لے اور سفارشات مرتب کرے۔ اسی کمیشن کی سفارشات کی بنا پر کچھ اصلاحات نافذ کئے گئے جو ریاست کے کشمیر طبقے کے لئے قابل قبول

---

[1] اس کے متعلق مرتب کے دیباچہ کو دیکھئے۔

نہیں تھے۔

اخبارات کی اجرائی کا حق منوانا بھی اس عوامی جدوجہد کا ایک نتیجہ تھا، چنانچہ مہاراجہ کو اخبار کی اجرائی کی اجازت دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے بعد ریاست کے عوام کو اپنی شکایات اور مطالبات حکومت کے سامنے پیش کرنے کے لئے ریاست کے باہر کے شہروں سے اخبارات جاری کرنے کا جو طریقہ تھا، وہ مسدود ہوگیا ہے اور ریاست کے مختلف حصوں جیسے جموں، سری نگر، پونچھ، میرپور اور مظفرآباد سے اخبار شائع ہونے لگے۔

ریاست میں ایک منظم سیاسی تنظیم مسلم کانفرنس کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ لیکن اس زمانے میں یہ محسوس ہوا کہ یہ تنظیم ایک محدود اپیل رکھتی ہے۔ اس کے ایک اہم اجلاس میں جو ۱۹۳۹ء میں خواجہ غلام محمد صادق کی صدارت میں منعقد ہوا ہے، اسے وسیع تر بنیادوں پر قائم کرنے کی تجویز منظور ہوئی اور اس کا نام بدل کر نیشنل کانفرنس رکھا گیا۔ اس کے پہلے صدر بھی صادق صاحب ہی منتخب ہوئے یہ صحیح ہے کہ انفرادی گروہوں کے لحاظ سے دلچسپیاں اب تک باقی رہیں، لیکن ریاست کی اس وسیع سیاسی تنظیم کو صحت بخش راہوں پر ڈالنے میں نئے تصفیے نے ملک کی شایستہ رہنمائی کی اور ایک حاوی لائحہ عمل کے ساتھ مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کر دیا۔ اس نئی تنظیم نے نوجوانوں کو تعمیری مقاصد کی طرف رجوع کرنے میں بیش بہا خدمت انجام دی۔ سیاست سے ہٹ کر سماجی اصلاح اور ادب اور فن میں ترقی پرور رجحانات کو جگہ دینے کے مقصد سے ایک وسیع لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ لیکن ان ساری مساعی کو بارآور ہونے کے لئے مکمل آزادی کا انتظار تھا۔

۱۹۳۱ء میں، جموں و کشمیر میں نمایندہ ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے مقصد سے 'احرار' تحریک شروع کی گئی، اور پنجاب سے ہزاروں احرار ریاست میں داخل ہونے لگے لیکن جوں ہی وہ ریاست کی سرحدوں میں داخل ہوتے، انہیں گرفتار کرکے جیل میں بند کر دیا جاتا۔ رفتہ رفتہ ان سیاسی

نظربندوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی کہ ریاست کی جیلیں ان کے لئے ناکافی ثابت ہونے لگیں۔ اس لئے کوئی پانچ ہزار نظر بندوں کو حکومتِ پنجاب کے تفویض کر دیا گیا۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی حکومت نظم و نسق میں تبدیلی لانے پر مائل ہوگئی۔

جموں میں ایک اور تحریک روٹی ایجی ٹیشن کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شروع ہوئی جس کا مقصد غذائی اجناس کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی طرف حکومت کی توجہ منعطف کرنا تھا۔ تحریک میں حصہ لینے والے گروہ جلسے منعقد کرتے اور جلوس نکالتے تھے۔ ان جلوسوں پر لاٹھی چارج کیا گیا جس سے عوام میں حکومت کے خلاف بددلی پھیلتی گئی۔

ڈوگرا حکمرانوں کے مذہبی معاملات میں غلو کی طرف اشارے گذر چکے ہیں، جس کی تفصیل ہندو دھرم ارتھ کے قیام، سنسکرت تعلیم کی اشاعت اور اس کے فروغ، مذہبی اداروں اور پیشواؤں کی فراخ دلی کے ساتھ سرپرستی میں پڑھی جا سکتی ہے۔ اسی رجحان کا ایک پہلو ۱۹۴۳ء میں گائے کے تحفظ کے قانون کا نفاذ تھا۔ اس اقدام کے معاشی مضمرات سے قطع نظر ریاست کا اکثریتی طبقہ اس سے متاثر ہوتا تھا۔ اس لئے ریاست بھر میں سخت بے چینی پھیل گئی اور جموں کے مسلمانوں نے پورے پینتیس ۳۵ دن تک مکمل ہڑتال منائی۔ یہ اور اس طرح کے کئی واقعات حکومت کی مطلق العنان آمریت کے مظہر تھے، اس لئے ریاست میں ذمہ دارانہ حکومت کی تحریک کو تقویت حاصل ہوتی گئی۔

ریاست میں نمائندہ مجلس[1] کا قیام ۱۹۳۴ء میں عمل میں آیا تھا۔ لیکن اس کی ہیئت ترکیبی ایسی تھی کہ ذمہ دار حکومت کی تحریک کے قائدین کی توقعات کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے کل ۷۵ ارکین میں سے ۴۲ حکومت کے نامزد تھے اور صرف ۳۳ منتخب۔ اس کا صدر بھی سرکاری عہدہ دار تھا۔ اس لئے کشمکش برابر جاری رہی، تا آنکہ ۱۹۴۳ء میں مزید اصلاحات دینے کے مقصد سے ایک آئینی تحقیقاتی کمیشن قائم ہوا۔ مہاراجہ کے اعلان نے جس کی رو سے یہ کمیشن قائم ہوا تھا، شیخ محمد عبداللہ صاحب

[1] اس کا نام پرجا سبھا تھا۔

کے الفاظ میں "ذہن نشین کرایا کہ کمیشن مقرر کرنے میں ہز ہائی نس مہاراجہ بہادر کی یہی حریت پرورانہ خواہشات کارفرما ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہمیں اس امر پر مائل کیا کہ ہم کمیٹی کے اجلاس میں اپنے ممبروں کو شامل ہونے کی اجازت دینے کا فیصلہ کریں۔ چنانچہ خواجہ غلام محمد صادق اور مرزا محمد افضل بیگ کو نیشنل کانفرنس نے کمیشن کے کام میں حصہ لینے کے لیے اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ لیکن اس کمیشن کی طرز روش سے بھی نیشنل کانفرنس کے قائدین کو سخت مایوسی ہوئی جس کا اظہار شیخ محمد عبداللہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"سب سے پہلی دقت یہ دکھائی دی کہ اتنی بڑی اہمیت کا کمیشن بغیر کسی قابل سیکریٹری اور دفتری انتظام کے چلایا جا رہا ہے۔ کاروائیوں کو قلمبند کرنے کا کوئی انتظام نہیں ـــــ"

اس کے علاوہ کمیشن نے بعض اہم امور پر گفتگو کی اجازت نہ دے کر سارے حریت پسند عناصر کو مایوس کر دیا، اور نیشنل کانفرنس نے اپنے نمائندوں کو کمیشن سے واپس بلا لیا۔

اسی اثنا میں سر بی۔ این۔ راؤ ریاست کے وزیر اعظم مقرر ہو کر آئے، اور اس دعویٰ کے ساتھ کہ وہ اس ریاست کو نمونہ کی ریاست بنانے کی تمنا رکھتے ہیں، لیکن وہ اپنی یہ تمنا دل ہی میں لئے جلد ریاست سے رخصت ہو گئے۔ مہاراجہ اور ان کی حکومت کی طرف سے مایوس ہو کر آخر کار نیشنل کانفرنس نے یہ محسوس کیا کہ ریاست کے نظم و نسق کو آئندہ عہد میں جس ڈگر پر چلنا ہے، اس کا ایک خاکہ مرتب کیا جائے، چنانچہ ۱۹۴۴ء میں وہ اہم دستاویز تیار ہوئی، جو "نیا کشمیر ــــ سیاسی آئین اور اقتصادی منصوبہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اور کشمیر کے حریت پسند ذہنوں کے لئے اصول رہنما کا کام کرتی آئی ہے۔ یہ ایک نہایت حاوی دستاویز ہے، جس کے پچاس دفعات اور ضمیموں میں، سیاست، نظم و نسق، سماجی اور اقتصادی مقصد و منہاج غرض زندگی کے سارے اہم

شعبوں کی تفصیلات شامل ہیں۔ اس کے اہم عنوانات حسبِ ذیل ہیں:۔

قومی اعلان، وطنیت اور اس کے حقوق، قومی اسمبلی، ریاست کا حکمران، انتخابات، عدلیہ، ریاست کی قومی زبانیں، اقتصادی، زرعی، صنعتی منصوبے، مزدوروں کے حقوق، تقسیم دولت و پیداوار، تعلیم، سکہ و مالیات، عورتوں کے حقوق۔

کشمیر کے حکمران زین العابدین بڈشاہ کے بارے میں بعض جگہ کہا گیا ہے کہ اس کے نظم و نسق نے اکبر اعظم کو راستہ دکھایا۔ اس دستاویز کو پڑھنے کے بعد ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس کے مختصر آئین نے آئندہ کے عظیم ہندوستانی آئین کی رہنمائی کی۔ ریاست کی قومی زبانوں کی تفصیل دفعہ ۲۲ میں اس طرح دی گئی ہے:۔

"ریاست جموں و کشمیر کی قومی زبانیں، کشمیری، ڈوگری، داردی، بلتستانی، پنجابی، ہندی اور اردو متصور ہوں گی۔ اردو زبان کو ریاستِ جموں و کشمیر کی بین الاقوامی زبان کی حیثیت حاصل ہوگی۔"

ان زبانوں اور ان کے ادب کو ترقی دینے کے بارے میں ہدایتیں آگے درج کی گئی ہیں۔

اس عہد کا ادب انہیں تحریکوں کا ردِ عمل ہے۔ ترقی پرور اندازِ فکر و نظر رکھنے والے قائدین کی مساعی اور رہنمائی نے اردو کے واسطے سے ریاست کے اہلِ فکر، سیاسی اور سماجی کارکن اور علم و ادب کے میدان میں کام کرنے والوں کو ملک کے دوسرے حصوں کے اردو ادیبوں کے قریب لاکر، ان کی فکر اور اسالیب کو ملک کے اور حصوں سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی، اور نئے عہد کے حالات نے نوعمر نسل میں جس کی تشکیل کی، اس کا نمایاں اثر اس عہد کے لکھنے والوں کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی ایک نظم میں وادی لولاب کے حسن کی طرف اشارے کرتے ہوئے نظم کے ساتھ ایک خیالی سرخی "ملائے[۱] لولاب کی بیاض کو دیکھ کر" کی بھی قائم کی ہے۔ اس سے بعض لوگوں کا خیال مولانا محمد انور شاہ کی طرف گیا۔ جن کا آبائی وطن یہ وادی تھی۔ اقبالؒ کے معاصر علماء میں مولانا کا بڑا مرتبہ ہے۔ وہ دیوبند میں شیخ الحدیث رہے۔ اور خدمت کے جذبے نے انہیں

۱؎ "ملا زادہ ضیغم لولابی کی بیاض" ۔ اصل سرخی ہے۔

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے شعبہ دینیات میں لیکچراری کی خدمت قبول کرنے سے باز رکھا۔ مولانا شاہ کا وطن وادی لولاب کا قصبہ ورنو تھا، جہاں ان کی ولادت ۱۲۹۲ھ میں ہوئی تھی۔ ان کا خاندان کشمیر کے سربرآوردہ علماء کا ایک خاندان تھا۔ ان کے جدِ امجد شیخ مسعود، بغداد سے ملتان آئے تھے، اور ملتان سے لاہور گئے اور پھر کشمیر آ گئے۔ کشمیری سلاطین، سلطان حسن شاہ، سلطان محمد شاہ اور فتح شاہ کی خانہ جنگیوں کے زمانے میں وہ کشمیر ہی موجود تھے، اور سلطان نازک شاہ کا عہد بھی انہوں نے دیکھا تھا۔ میر سید احمد کرمانی سے انہیں ارادت تھی اور علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ شیخ کا سلسلہ امام ابو حنیفہ تک پہنچتا ہے۔

کشمیر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا محمد انور شاہ نوعمری میں دیوبند گئے، اور فلسفہ، ہیئت، تفسیر حدیث، صرف و نحو اور معانی و بیان کی تحصیل کی اور فارغ ہونے کے بعد، دیوبند ہی میں شیخ الحدیث کے عہدہ پر مامور ہو گئے اور کوئی تیس برس تک سینکڑوں تشنہ گان علم ان سے فیضان پاتے رہے۔ مولانا محمد انور شاہ، دیوبند میں مولانا محمود الحسن کے جانشین تصور ہوتے تھے۔ ۱۳۲۲ھ میں مولانا حج بیت اللہ کے لئے گئے اور فریضہ حج سے فارغ ہونے کے بعد مصر، طرابلس، بصرہ اور دوسرے اسلامی ممالک کے علمی مرکزوں کا دورہ کیا اور وہاں کے علماء سے ملاقات کی۔ بعض علماء نے انہیں سند فضیلت بھی عطا کی تھی۔ تعلیم و تدریس میں انہیں ایسا انہماک تھا کہ کوئی چالیس سال کی عمر تک، تاہل کا خیال ہی نہ آیا۔ آخر مولانا حبیب الرحمن دیوبندی کے اصرار پر گنگوہ کے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی، جن سے انہیں غالباً تین لڑکے ہوئے تھے۔ منجھلے لڑکے کا نام عبدالرشید تھا۔ ان صاحبزادے کی ہدایت کے لئے، انہوں نے حضرت سید شاہ یوسف حسینی شاہ راجو کی طرح، جنہوں نے اپنے فرزند حضرت محمد حسینی گیسو دراز کے لئے دینی اور اخلاقی ہدایتوں کا ایک رسالہ "تحفۃ النصائح" کے نام سے لکھا تھا، ایک نظم فارسی میں "رشید نامہ" کے عنوان سے لکھی تھی۔ اس نظم میں وہ فرزند کو

ہدایت کرتے ہیں:

بہر کاری کہ دست انداز باشی | طلبگار رضای حق بباشی
روایات سلف از دست مگذار | خلف با ہر سلف مانام بردار
تعالی اللہ چہ خوش نیکو شگفتہ | گل انور بباغ بو حنیفہ

علوم دینی کے ساتھ مولانا کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ اردو اور فارسی میں انھوں نے کچھ نعتیں اور نظمیں لکھی تھیں۔ ایک فارسی نعت کے شعر ہیں۔

امی لقب و ماہ عرب مرکز ایمان | ہر علم و عمل راتو مداری تو مدیری
عالم ہمہ یک شخص کبیر است کہ اجمال | تفسیر نمودند دریں دیر سدیری
آن عقیدۂ تقدیر کہ از کس نہ شدہ حل | حرفی تو کشیدہ کہ خبیری و بصیری

اردو میں کچھ نظمیں جو ان کی باقیات الصالحات سے ہیں، ان میں سے ایک نظم دنیا کے ناپائیداری کے بارے میں ہے۔ اس کے چند شعر ہیں۔

سفر کی منزل ہے دار دنیا ذرا تو اس کا خیال سا کر
سدا نہیں ہے یہ دیس تیرا ضرور جانا ہے دن بتا کر
وہ چل بسے سارے یاری یاری یہ باقی خلقت بھی چل بسے گی
تو چشم عبرت سے دیکھ غافل، کبھی تو اپنی نظر اٹھا کر
چلے ہی جاتے ہیں قافلے سب یہاں کا ٹھیرا ہوا ہے یہ ڈھب
کسی کا آنا، کسی کا جانا، کبھی ہنسا کر، کبھی رلا کر

مولانا کو عربی تقریر میں بھی بڑی مہارت تھی۔ جامعہ ازہر کے کچھ علماء دیوبند آئے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے جو خیر مقدمی تقریر کی تھی اس کو سن کر ازہر کے علماء کو بڑا اچھنبا ہوا تھا۔ مولانا کا

انتقال ۱۹۴۳ء میں ہوا۔

اِس صدی کے ربع ثانی کے اواخر میں، جموں و کشمیر کے نوجوانوں میں نئے ادبی ذوق کو ترقی دینے میں، جن سر برآوردہ ادیبوں کا حصہ رہا، ان میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ تاثیر کشمیری نژاد نہیں تھے، لیکن وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے، اور ملازمت کے سلسلے میں کشمیر میں رہ چکے تھے۔ کشمیر میں آنے سے پہلے وہ پنجاب اور لاہور میں بھی اپنے عہد کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں سے نئے معیاروں کو روشناس کرانے میں کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں وہ سری نگر کے سری پرتاپ کالج کے پرنسپل مقرر ہو کر آئے اور یہاں کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں شعر و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے اور اس کو ترقی دینے میں امکان بھر کوشش کی۔ کالج کی بزم ادب، ان کے زمانے میں بڑی کارکردہ انجمن بن گئی تھی، جس کی سرپرستی میں ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد ہوتے اور ان میں اپنی تخلیقات پیش کرنے کیلئے نوجوان طلباء کو مدعو کیا جاتا اور ان کی ہمت افزائی کی جاتی۔ کالج کی ادبی انجمن اُردو سبھا کے نام سے موسوم تھی۔ تاثیر کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے اُردو کی تعلیم فارسی کے اساتذہ کے تفویض کرنے کی پُرانی روایت کو ترک کر کے، اُردو کی تربیت پائے ہوئے اساتذہ کو مقرر کیا۔ کالج کے طلباء کا رسالہ "پرتاپ" اس نوع کے اہم رسالوں میں شمار ہونے لگا تھا، جس میں اساتذہ کے علاوہ تخلیقات طلبا کی شامل ہوتی تھیں۔

تاثیر کا وطن، اہل کشمیر کی بار آبادی، امرتسر تھا۔ جہاں وہ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی دو سال ہی کے تھے کہ ان کے والد اور والدہ دونوں کا انتقال ہو گیا، اور ان کے خالو میاں نظام الدین نے ان کی پرورش کی۔ میاں نظام الدین کا شمار لاہور کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ انہوں نے تاثیر کی تعلیم پر خاص توجہ کی چنانچہ تاثیر نے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کا امتحان کامیاب کیا اور ۱۹۲۶ء میں اسلامیہ کالج، لاہور میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہو گئے۔ اسی اثنا میں انہوں نے انگریزی میں ڈاکٹریٹ

بھی حاصل کی۔ کچھ عرصہ انہوں نے محکمہ اطلاعات میں بھی کام کیا۔ ۱۹۳۶ء میں ان کا تقرر ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر کی پرنسپلی پر ہو گیا۔ جہاں وہ تین سال تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ ایس۔ پی کالج کے پرنسپل مقرر ہو کر سری نگر آئے۔ ان کی پرنسپلی کے دوران کالج کو بڑی ترقی ہوئی اور طلباء کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ ایک نیا کالج 'امر سنگھ کالج' کے نام سے قائم کیا گیا جس کے پرنسپل تاثیر خود مقرر ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد حکومت کی پالیسی سے اختلاف کے سبب وہ سری نگر سے چلے گئے اور حکومتِ ہند میں مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ریاست کی حکومت نے انہیں ناظمِ تعلیمات کی حیثیت سے مدعو کیا، لیکن حکومت کی ریشہ دوانیوں اور پالیسی کے تلوّن نے انہیں اس خدمت کو قبول کرنے پر مائل نہیں کیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد تاثیر کچھ عرصہ آزاد کشمیر میں محکمہ اطلاعات کے ناظم بھی رہے۔ لیکن جلد ہی اس خدمت سے سبکدوش ہو کر، اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہو گئے جہاں ۱۹۵۰ء میں اپنے انتقال تک وہ کارگزار رہے۔

تاثیر، ادب اور شعر کا ستھرا مذاق رکھتے تھے، اس کے ساتھ ان کا تحقیقی اور تنقیدی شعور بھی رچا ہوا تھا۔ ادب کے مقصد اور مصرف کے بارے میں وہ ترقی پرور خیالات کے حامل تھے۔ اپنے صحت بخش ذوق کی بدولت تاثیر نے پنجاب اور کشمیر دونوں مقامات کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو نئی راہیں سجھائیں۔ خود ان کی شاعری کا آغاز اس میں شک نہیں کہ اپنے عہد کی عام روایت کے مطابق غزل گوئی سے ہوا، لیکن جلد ہی وہ ادب اور شعر کی نئی بنیادیں تلاش کرنے کی طرف مائل ہو گئے۔ ادب میں ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے میں تاثیر کا بھی بڑا ہاتھ رہا۔ اقبال کی صحبتوں میں اٹھنے بیٹھنے سے انہیں شاعری کا نیا عرفان بھی حاصل ہوا تھا۔ ان کے تغزل کے انداز کو سمجھنے میں ذیل کا اقتباس مدد دے سکتا ہے:-

حضورِ یار ہیں آنسو نکل ہی آتے ہیں   کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

جفائے تاشمن پا ہو کہ حلقۂ سرِ زلف — چھپائیں بھی تو یہ جادہ نکل ہی آتے ہیں

جنابِ شیخ، وضو کے لیے سہی، لیکن — کسی بہانے لبِ جُو نکل ہی آتے ہیں

فنائے عشق، وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے — ذہن کا وزن جو آنسو نکل ہی آتے ہیں

حسرت موہانی نے اپنی مخصوص افتادِ روحانی، فکر اور رجحان کے نتیجے کے طور پر اردو غزل کو ایک نیا موڑ عطا کیا تھا، اور یہ ارتقا غزل میں سالہا سال سے ہوتا رہا تھا، لیکن جدید عہد میں حسرت نے اسے اپنے روایتی راستے سے ہٹا کر جس ڈگر پر ڈال دیا تھا، اس سے وہ نئے افق سے روشناس ہونے لگی تھی۔ ہم نے قریب تر زمانے میں ڈاکٹر تاثیر اور ان کے رفقاء نے غزل کو ایک اور نیا شعورِ حیات عطا کیا۔ خود ڈاکٹر تاثیر نے غزلیں بہت کم کہی ہیں۔ ابتدائی غزلوں سے ہٹ کر جو غزلیں انھوں نے کہیں، ان میں اپنے عہد کے مخصوص رجحانات کو راہ دے کر اسے رومانی نظم سے قریب تر لاتے ہیں، تاثیر کی کاوشیں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود تاثیر کا اصلی سرمایہ ان کی نظمیں ہیں۔ اور ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے، پھر بھی ان کی فکر کی مخصوص افتاد کی بدولت اور ان نظموں کے تاریخی موقف کی وجہ سے انہیں ایک امتیاز حاصل ہے۔ بحروں کے انتخاب مصرعوں کی نئے انداز کی ترتیب اور موضوع کے لحاظ سے کچھ نئے عناصر کے شمول نے تاثیر کو نئی نظم کے پیش رو کا مقام عطا کر دیا ہے۔

تاثیر کی نظم "یدِ بیضا" کو بعض حلقوں میں ان کی شہ کار نظم سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہ صحیح ہے کہ فکر کی ندرت اور اظہار کے مخصوص سانچوں کی وجہ سے تاثیر کی اس نظم نے پنجاب کے نوعمر شعراء کو اور ہند اور کشمیر میں بھی نئی نظم کی راہ دکھانے کا حق ادا کیا ہے۔ نظم میں خیالات کا تسلسل انتخاب کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ نئے شعور کے طلوع ہونے کے ابتدائی آثار میں سے ہے، اس لیے پوری نظم یہاں نقل کی جا رہی ہے۔

مجھے تلاش رہی ہے
نہیں، تلاش نہیں
تلاش میں تو طلب
جستجو بھی ہوتی ہے
دبی دبی سی سہی
آرزو بھی ہوتی ہے

نہ آرزو، نہ طلب ہے، نہ جستجو نہ تلاش
ذرا سی ایک جراحت ذرا سی ایک خراش

میانِ قلب و نظر اک مقام ہے اِس کا
مقام؟ مرحلہ؟ جو کچھ بھی نام ہے اِس کا

جہاں خیال کے پیکر بنائے جاتے ہیں
نگاہ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں

وہ طورِ جلوہ معنی
وہ کارگاہ خیال

تصورات کی آلایشوں سے پاک خیال
تعینات سے بیباک واردات جمال

جمال، تابشِ رو، گرمی خرام نہیں
ہزار ایسی ادائیں ہیں، جن کا نام نہیں

یہ جھلکیاں

یہ ادائیں

یہ پُرفشاں سائے

یہ جھلملاتے

اُبھرتے

دبے ہوئے سائے

مواد قوسِ قزح و گردش و نشور و سرور

یہ کائنات مری کائنات ہو، یہ نہیں

ہر ایک بات مگر میری بات ہو، یہ نہیں

میں دن کو رات بتاؤں، وہ رات ہو، یہ نہیں

نہیں، مجھے یہ خلش، یہ ہوس نہیں ہوتی

بقدرِ جام یہاں اذنِ عام ہے سب کو

یہ میکدہ ہے، یہاں پیش و پس نہیں ہوتی

مگر کبھی کوئی گم گشتہ، رہ نوردِ غزل

مری کمند نظر کا شکار ہو جائے

حریم ناز کا پردہ صبا الٹ ڈالے

کسی کا رازِ دلِ دل آشکار ہو جائے

یہ مدعا طلبی، یہ نظر کی آلائش

یہ حسنِ رہ گذری، یہ سرود نشترگی

یہ شمع طاقِ حرم، یہ شرار بولہبی

یہ منتہائے نظر، یہ مآلِ کار نہیں
نہیں، نہیں کہ یہ تکرار ہر جگہ پہ نہیں
کہ جیسے علم و عمل میں تضاد ہو جائے
کہ جیسے قلب و نظر میں فساد ہو جائے
کہ جیسے یہ نہیں، یہ تشبیہیں کیا میں کہوں
یہ اعتقاد کے اثبات کی نفی سے نہیں
وفورِ شوق کے جذبات کی کمی سے نہیں
بساطِ کیف ہے ایک کارنارِ جوششِ نمود
دوش، دوش ہمہ رامش، چمن چمن ہمہ رنگ
خطوطِ نسخ و تباشیر و سنبل و ریحان
نوائے بربط و طنبور و دف و نائی و چنگ
نمود ستر بہ اظہار و کوہکن یک تن
ہزار پیکرِ شیریں فسردہ در رگِ سنگ
کسی نے مست سنگِ سیہ پہ لی کروٹ
بہ رنگ موج ابھرنے لگے نشیب و فراز
کھلا ہے ضربتِ تیشہ سے اک دریچہ سرخ
قطار بستہ ہیولے کھڑے ہیں محو نیاز
عمود ہمت و قوسِ نیاز و محورِ عذر
بدن ڈھلے ہوئے انگڑائیوں میں بے سر و مست

تنے کسے ہوئے، سینے بلند، سر بدمست
شکارِ ماہ کہ تسخیرِ آفتاب کروں
میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

تاثیر کی مساعی فکرِ شعر تک محدود نہیں تھی، بلکہ وہ اچھے عالم اور سربلند نقاد بھی تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا بھی اُردو میں ایک پایہ ہے۔ کشمیر میں قیام کے دوران تاثیر نے کئی نظمیں لکھی تھیں، جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں کشمیر پر لکھی ہوئی نظموں میں ان کو ایک امتیاز حاصل ہے۔

تاثیر کے معاصرین میں دو بھائی، امین حزیں اور عبدالسمیع پال اثر بھی اُردو شاعری میں مقام پیدا کر چکے ہیں۔ امین حزیں بڑے بھائی تھے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ لاہور چلے گئے تھے۔ لاہور ہی کے ادبی حلقوں میں ان کے ذوقِ سخن کی پرورش ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے خاص انداز کو نشوونما دیا، جس میں روحانیت، فلسفہ اور نئے شعری اسالیب ملے جلے نظر آتے ہیں۔ اس صدی کے ربع اول کے بعد ان کی نظمیں اکثر ادبی جریدوں میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کی غزل میں بھی نئے انداز کی رعایت ملتی ہے۔ ان کی ایک نظم جو "نفسیات" کے عنوان سے "ہمایوں" کے شمارہ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی، دراصل عہد نو کی غزل بھی ہے۔ اس کے کچھ شعر ہیں:۔

نثارِ غمزہ ناز و ادائے یار ہوئے — جب اہلِ دل میں کہیں جا کے ہم شمار ہوئے
تہورِ رخِ گلگوں کا دیکھے اعجاز — وہی جو داغ تھے سینے کے لالہ زار ہوئے
نگاہِ شوق کا پڑنا تھا روئے سادہ پر — ادائیں آپ سے آپ آ گئیں سنگار ہوئے
کیا نہ ہمتِ عالی نے اعترافِ شکست — ہم اپنی ہمت سے زمانے میں کامگار ہوئے
تخیلاتِ امین ہیں غلافِ کعبہ دل — تمہاری خیر نہیں، گریہ داغدار ہوئے

امینؔ کی ایک طویل نظم "سخن ہائے گفتنی" کے عنوان سے "ہمایوں" (لاہور) کے شمارہ جون ۱۹۲۸ئ میں شایع ہوئی تھی۔ یہ قومی نظم کا انداز رکھتی ہے اور ایک تجویز کے ماتحت لکھی گئی ہے۔ اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔ ؎

امینؔ سے ایک دن پوچھا کسی نے
ترقی کیوں نہیں کرتے مُسلمان

اس بات میں کئی متبادل پہلو پیش کیے گئے ہیں کہ مسلمانوں میں کیا نقصِ باطنی ہے؟ ان کو بحیثیت مجموعی تنزل کیوں ہے؟ ان میں جمود ہے؟ کیا یہ قوم اب مغضوب فطرت تو نہیں بن گئی ہے۔؟ ان سوالات کے جواب میں شاعر نے مسلمانوں کی صلاحیتوں کو سراہا ہے، لیکن بدلے ہوئے حالات اور نئے عہد میں کسی مُتعین راہ کے اختیار کرنے میں ان کے تذبذب پر تنقید کی ہے۔ جواب چھ حصّوں پر مشتمل ہے: تذبذب، سہ راہا، مفہوم ترقی، رہِ روحانیت، رہِ دنیاے دوں، بشر۔ ان چھ عنوانوں کے تحت شاعر نے تنزل کے اسباب و علل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظم اقبال کے اثر کی نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن اس میں خیالات کی رفعت نہیں ہے، صرف کہیں کہیں کچھ اشارے ملتے ہیں۔
امینؔ کے جوابات کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: ؎

نہیں فطرت میں اس کے کوئی بھی نقص
حریفِ برق ہے اس کی رگِ جان

پھر کہتے ہیں: ؎

تغافل کیش ہے بے حس نہیں ہے ۔ دلِ مُسلم ابھی تک ہے مسلمان

اس میں اقبالؔ کے خیال "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی" اور "کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی" کی صداے بازگشت سُنی جاسکتی ہے۔ آگے اپنی توجیہ پیش کرتے ہیں:۔

سنہ راہے پہ رُکی ہے قوم کی قوم ۔ کہ ہر جا نقی، مذہب ہے مسلمان

ان تین راہوں کی شرح کی ہے ۔

رہ رُوحانیت دائیں طرف ہے ۔ مگر بائیں طرف جو راستہ ہے

وہی ہے جادۂ دُنیائے فانی ۔ فضا جس کی بظاہر دلکشا ہے

مگر جو سامنے تیرے سڑک ہے ۔ اسی کا نام سیدھا راستہ ہے

اس سیدھے راستے، صراطِ مُستقیم کی وضاحت کی ہے اور آخر میں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ :-

بشر تنہا نہیں، یہ جسمِ خاکی
خُتن ہی میں ہے آہوے خُتن بھی
سمجھتا ہے مکان کو بے مکیں تو
ارے ناداں، اسی تن میں ہے مَن بھی

اور یہی من ہے، جس سے زندگی عبادت ہے۔ نظم' انجام میں کسی بلند مقام کو چھوئے بغیر ختم ہو جاتی ہے تاہم یہ اس عہد کی ان نظموں میں سے ہے، جو ایک مُعیّن تجویز کے تحت لکھی گئی ہے۔

عبدالسمیع پال' ادبی دنیا میں اثر صہبائی کے نام سے مشہور ہیں۔ اور ۱۹۳۰ء کے بعد عرصہ تک وہ مقبول شاعروں میں شامل رہے۔ ان کی ولادت بھی سیالکوٹ میں ۱۹۰۱ء میں ہوئی تھی۔ پال کی نسبت ان کے ایک راجپوت قبیلے سے ہونے کی یادگار ہے۔ سیالکوٹ سے میٹرک کا امتحان کامیاب کر کے، اثر لاہور گئے، جو اس زمانے میں شمال مغربی علاقے میں علوم مشرقیہ کا مکّہ مانا جاتا تھا۔ اسلامیہ کالج سے انہوں نے بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا، قانون کی تعلیم بھی حاصل کی اور کچھ عرصہ وکالت کرتے رہے۔ اس کے بعد فلسفہ میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ شعر و سُخن سے نہیں زمانہ ہی سے دلچسپی رہی، اور لاہور کی ادبی صحبتوں میں ان کے ذوق کی جِلا ہوئی۔

اثر کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی، اور یہ اُن کی شاعری میں اختر شیرانی کی سلمیٰ کے مقابلے میں اکثر "راحت" کے استعاری نام سے ظاہر ہوتی تھیں۔ اِس بیوی کا جلد انتقال ہو گیا، جس کا اثر ان کی زندگی سے گذر کر ان کی شاعری پر بھی گہرا پڑا، اور ایک المیہ کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا۔

اثر ۱۹۴۶ء میں جموں آ گئے تھے، جہاں ان کا تقرر وکیل سرکار کے عہدہ پر ہوا تھا۔ کچھ عرصہ وہ ہائی کورٹ میں مددگار ایڈووکیٹ بھی رہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں اثر سیالکوٹ چلے گئے اور مددگار کسٹوڈین کے عہدہ پر مامور رہے، پھر وکیل سرکار ہو گئے۔

جموں میں قیام کے زمانے میں اثر کیفی کی محبتوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ فن شعر میں وہ اپنے بھائی امین اور تاجور نجیب آبادی کے شاگرد تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور ابو الکلام آزاد ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے متاثر تھے۔ اثر پر کلاسیکی شاعروں میں میر اور غالب کا اثر تھا، لیکن وہ جدید عہد کے شاعر تھے، اور اپنے عہد کی تحریکوں سے وہ بیگانہ نہیں رہ سکتے تھے۔ غزل، رباعی، قطعے کے علاوہ انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں، جن میں ابتدائی دور کی اردو نظموں کی سی سادگی اور سلاست ہے۔ ان کی ایک نظم "پھول اور ستارہ" سے ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

میں لالۂ صحرا ہوں — تو عرش کا تارہ ہے

چاہوں کہ پہنچ جاؤں

اڑ کر تیری محفل میں

پھر میری تگ و دو کیا

کچھ دور ذرا اڑ کر

پھر خاک پہ گر جاؤں

گرتے ہی فنا ہو جاؤں

میں لالہ صحرا ہوں   تو عرش کا تارا ہے

اثر کی نظمیں عموماً "تجلیات" اور "جامِ صہبائی" کے عنوانوں کے تحت شائع ہوئی تھیں۔ ان کے کلام کے دو تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مجموعہ "خمستان" کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا جس پر سید سلیمان ندوی اور پنڈت کیفی نے مقدمہ اور تاثرات لکھے ہیں۔ "جامِ طہور" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اور رباعیات کا ایک مجموعہ "راحت کدہ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اثر کی رباعیاں فلسفیانہ اندازِ فکر سے ممتاز ہیں۔ ایک رباعی ہے :-

آزاد طلسم رنگ و بو ہی نہ ہوا
نیرنگ جہاں کا راز جو ہی نہ ہوا
دنیا سے عبث رہی شکایت تجھ کو
افسوس کہ اپنا دوست تو ہی نہ ہوا

اثر کے قطعات میں ستھری رومانیت کی جھلک ملتی ہے۔ ایک قطعہ کے شعر ہیں :-

ترا حسن بہار آرا گلستانوں پہ چھایا ہے
ترے جلووں نے دامانِ بیاباں کو بسایا ہے
نہاں رہتی ہے جیسے برگِ گل میں بوئے جاں پرور
ترا سوزِ محبت میری رگ رگ میں سمایا ہے

مولانا غلام سرور نے "اثر صہبائی کی نظموں پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے مضمون "ہمایوں" (شمارہ جون ۱۹۳۲ء) میں شائع کیا تھا۔ مضمون میں انجمن اربابِ علم کے ایک جلسے کا تذکرہ کیا ہے، جس میں مولانا عبدالمجید سالک، مولانا صہبا، راجہ نریندر ناتھ، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ جیسے صاحبِ ذوقِ سخن سنج

اور سخن فہم شمر یک تھے۔ اشر کی پہلی نظم جس کے دو شعر یہاں درج ہیں اِسی جلسے میں پڑھی گئی تھی:۔

انجام کی کیا کہیئے، آغاز نہیں معلوم — ہستی کے معمے کا کچھ راز نہیں معلوم
کب ٹوٹ کے رہ جائے یہ ساز نہیں معلوم — پی اور پلا ساقی، پی اور پلا ساقی

اشر کی نظموں میں "ذوقِ نظارہ" "تری دعوت کے گیت گاتا ہوں" "شبابِ کیف آفریں" "تاروں بھری رات" نفیس نظمیں ہیں۔ ذوقِ نظارہ سے ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے:

ماہ میں حسن ترا، مہر میں تنویر تری — سنگ میں نور ترا، خاک میں اکسیر تری
کاکلِ سنبل پیچاں میں ہے زنجیر تری — اور ہر ذرے پہ منقوش ہے تصویر تری

اِس قدر وادیٔ نظارہ میں کھو جاتا ہوں
خود بھی اک چشمۂ حسن کا بن جاتا ہوں

اشر آہنگ اور تکرارِ صوت سے اظہار میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت بھی ابتدائی دور کے نظم نگاروں میں زیادہ نمایاں ہے۔ مثلاً ان کی ایک نظم کا اقتباس ہے:۔

بہار ہے نگار ہے — کنارِ جوئبار ہے
فضائے کوہسار ہے — ربابِ آبشار ہے
نسیم خوشگوار ہے — جہانِ روزگار ہے

پلائے جا، پلائے جا
غمِ جہاں مٹائے جا

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ کشمیری پنڈتوں کے ایک خاندان سے تھے، جو دہلی منتقل ہو گیا تھا۔ کیفی نے عرصہ تک ریاست میں ملازمت کی اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے معتمد امور خارجیہ کے عہدہ پر فائز رہے۔ ان کے قیام ریاست سے، کئی نوجوان شاعروں کو ان کی صحبتوں سے فائدہ اٹھانے

کا موقع فراہم کیا۔ کیفیؔ اپنی ذکاوت، اُردو زبان کے مسائل اور کلاسیکی شعری معیاروں پر قدرت کے سبب اپنے عہد میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی وِلادت ۱۸۶۶ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ ان کے نانا، فارسی کے عالِم تھے، جن کے پاس کیفیؔ نے فارسی کی تکمیل کی۔ ان کے بزرگوں میں پنڈت نرائن داس ضمیرؔ، صاحبِ ذوق شاعر تھے، کیفیؔ نے فنِ شعر میں انہیں سے تربیت حاصل کی تھی۔ لیکن وہ اپنے عہد کی تحریکوں سے بھی متاثر تھے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کیفیؔ کچھ عرصہ لاہور میں رہے، اور وہاں کی ادبی صحبتوں سے استفادہ بھی کیا۔ ۱۹۱۵ء میں وہ یورپ کے سفر کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں کے کچھ علما سے بھی ملاقات کی۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد، وہ ریاست کی مُلازمت میں داخل ہوئے۔ ریاست چمبی میں جنہی مجسٹریٹ اور کلکٹر کے عہدہ پر مامور رہ چکے تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مولوی عبدالحق کے دوش بدوش وہ اُردو کی ترقی اور اس کے مسائل کو سُلجھانے کی کوشش کرتے رہے انجمن ترقی اُردو کے وہ شریکِ معتمد بھی رہے اُردو زبان اور قواعد کے مسائل پر کیفیؔ نے لکھنؤ یونیورسٹی میں جو توسیعی تقریریں کی تھیں انہیں بعد میں منشوراتِ کیفی اور کیفیہ کے نام سے کتابی صورت میں شایع کیا۔ حیدرآباد میں قیام کے زمانے میں ریاست کے وزیرِ اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ کی شعری محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔ شادؔ نے اپنے ایک شعر میں اُن کی سخنوری کی داد دی ہے شعر ہے:۔

کہتا ہے شادؔ بھی یہی کیفیؔ سے باخلوص
مشہور خاص و عام ہے ان کی سخنوری

کیفیؔ کی شاعری میں لطفِ سخن سے زیادہ، خیال اور شعری اظہاروں پر ان کا قابو نمایاں ہے۔ الفاظ کی تلاش میں، وہ اِنشاؔ اور ہمارے زمانے کے اساتذہ میں مولانا ظفر علی خان کی راہوں پر چلتے ہیں۔

نظم اور نثر دونوں میں کیفیؔ نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ نثر میں "منشورات" اور "کیفیہ" کے

علاوہ دو ڈرامے "راج دُلاری" اور "مُراری راجا" اور ایک نیم تاریخی ڈرامہ "نہتنا رانا" ان کی یادگار ہیں۔ شاعری کی طرح اِنشا میں بھی ان کا اپنا ایک انداز تھا۔ منظوم کارناموں میں "جگ بیتی" اور ایک مجموعہ "چند نظمیں" قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کئی نظمیں جو رسالوں میں شایع ہوتی ہیں، کتابی شکل میں مدوّن نہ ہو سکیں۔ کیفی کے اسالیب کی طرح ان کے موضوعات میں بھی جدت اور تنوع نمایاں ہے۔ ایک نظم انہوں نے "روپ چالیسا یا حُسنِ فطرت" کے عنوان سے لکھی تھی، جس میں ورڈسورتھ کی طرح حُسنِ فطرت کی دلکشیوں سے نقاب اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا آغاز ہوتا ہے۔

بزمِ حُسنِ فطرت کیا بے خودی کی دُنیا ہے
ذرہ ذرہ شاعر ہے، قطرہ قطرہ صہبا ہے
غور سے اگر دیکھو، کائنات کا عالم
حُسن کا ہے اِک طوفان جو ازل سے برپا ہے

"حسن کی دنیا" میں بھی وہ کائنات میں حُسن کی جلوہ گردی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کی دوسری.. "طلوعِ سحر" "کیف بہار" "برسات کی بہاریں" بھی فِطرت کے حُسن کی تفسیریں ہیں۔ کشمیر سے ان کے دوہرے تعلق نے، اور شاعروں کی طرح، اس کے حُسن اور رعنائیوں پر طبع آزمائی پر مائل کیا، جس کا نتیجہ ان کی وہ نظم ہے، جس میں انہوں نے ایک ڈراماتی انداز میں کشمیر کے حُسن کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک افکار زدہ انسان کو وہ مشورہ دیتے ہیں :سے

سرنگوں کب تک رہو گے رنج اور افکار میں
آؤ، تم کو لے چلیں اِک پُر فضا گلزار میں

یہ پُر فضا گلزار ظاہر ہے، ان کے اسلاف کے وطن کے سوا کوئی اور نہیں۔ اپنے ساتھی کو وہ اس گلزار میں پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں :۔

ہے یہ وہ گلشن ہے بُلبُل جس کی ہر اہلِ نظر
ہے ثنا جس کی برابر یار اور اغیار میں

پھر اس کے سرچشموں، چشموں، سبز بفلک کوہساروں، جوشِ بہار کی رعنائیوں کو پیش کر چکنے کے بعد، ان شاعروں پر تعریض کرتے ہیں، جو کشمیر کو جنت نظیر کہتے ہیں۔ کیفی کہتے ہیں، جنت ایک افسانہ ہے اور کشمیر ایک حقیقت۔ شعر ہے: ؎

ہے ہلک کشمیر کی کہنا اسے جنت نظیر — سامنے آنکھوں کے ہے وہ بس دل افگار میں

اس اجمال پر اگر کسی کو انتقاد شہ آئے تو وہ تفصیل سے اسے قائل کرتے ہیں:

تم نہ پاؤ گے کہیں جو ہے یہاں جوشِ بہار — پھوٹتی کونپل ہے چوبِ دستۂ نجار میں

ہے آب ایک گلشن اور ہے اک زیرِ آب — ڈل بھی لاثانی ہے دنیا کے دیار امصار میں

مارتا ہے کیا سفیدہ آب در کو ٹھوکریں — روندے جاتے ہیں گہر اس بزم گوہر بار میں

دست افشاں ہے چنار اس درجہ ہے جوشِ نمو — ہے بھرا خون حنایا قوت دست افشار میں

برف کی یہ چوٹیاں، الماس کے سرپیچ ہیں — ان بزرگوں کو ملے قدرت کے جو دربار میں

ایک سے اک بڑھ کے ملتے ہیں عناصر دلفریب — دیکھو وادی میں جدھر جاؤ جہاں کہسار میں

پھول ہیں، چشمے ہیں، میووں کے شجر ہیں اور مرغزار — چپہ چپہ دب رہا ہے لطف حق کے بار میں

یہ ساری تفصیل سنانے کے بعد بھی کیفی کو اس کا احساس ہوتا ہے، تو صیف کا حق ادا نہ ہو سکا، اس لئے کہتے ہیں ؎

گلشنِ کشمیر کے اوصاف قابلِ دل پہ ہیں — ہو سکیں کیونکر بیاں کیفی وہ چند اشعار میں

کیفی نے غزل کا سرمایہ بھی چھوڑا ہے، لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ان کی غزل لطفِ اظہار سے زیادہ اُستادانہ استعمال الفاظ کی جادوگری کا سہارا لیتی ہے۔ غالب کی زمین میں اُن کی ایک غزل کے شعر ہیں:

حسنِ جلباب عدم سے جو درخشاں نکلا — وجد میں کون و مکاں بیخود و رقصاں نکلا

حُسن ہر شکل میں، ہر آن میں رنشاں نکلا
برق کا ہے وہ تبسم کہ شگر خندہ گُل

رنگ بھی سینہ سے غنچے کے پُر افشاں نکلا
حُسن کا ہے یہ وفور اس کو نہ کہہ دہ تنگی

"ادب اور شعر کی تجدید" کیفی کی اہم نظموں میں سے ہے، جس میں وہ حالی کی نظم "شعر سے خطاب" کی طرح شاعری کے مروجہ انداز میں اصلاح کی طرح توجہ دلاتے ہیں:۔

الٰہی ترجمانِ دل نگاہ واپسیں ہوتی
گذاری عاشقی میں عمر، پھر بھی یہ تمنا ہے

نگاہِ آخریں یارب نگاہِ اوّلیں ہوتی
اسی مجہول و عاطل عشق پر دل سے نکلتا ہے

ان استفادوں میں گفتگو کے بعد وہ حالی کی طرح مسائل سے نپٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کہ بزم شعر میں برپا صلائے آخریں ہوتی
سخن سنجی کی بس ہم یہ غرض نہایت سمجھتے ہیں

نہ کیوں بے ربط اس سے اپنی تحریرِ جبیں ہوتی
اثر اغلاق پہ جو اس سخن سنجی کا پڑتا ہے

طبیعت کیوں نہ درد انگیز باتوں سے حزیں ہوتی
مذاقِ شعر بگڑا اور طرزِ معشرت بگڑی

حالی کی ہمنوائی اور مجددین اور مصلحین ادب کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے وہ اپنے شعری آدرش کی وضاحت کرتے ہیں:۔

یہاں بھی ان کی وقعت کاش مانوسِ یقیں ہوتی
ادب اور شعر سے جو کام دنیا میں نکلتے ہیں

بجائے نکتہ چین گر طبع اپنی خوشہ چیں ہوتی
بھرے ہوتے یہاں خرمن حقائق اور معانی کے

جو چھپنے میں قلم کے عظمتِ روح الامیں ہوتی
حقیقی کھینچتا جذبات و محسوسات کی شکلیں

اُردو ادب اور شاعری بلکہ خود اُردو زبان کی اپیل محدود ہونے کا سبب کیفی ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے اسی انجذاب گدایانہ کو سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے عقل و حکمت کا ایسا بہت کم سرمایہ ہمارا ادب اکٹھا کر سکا، جس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کسی کو اُردو زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہو سکتا۔

زباں فن میں اگر اُردو کو جا ملتی تو کیا ملتی — نہ کیوں وقعت جہاں میں اپنی کم سے کمتریں ہوتی
تمنا ہے یہ کیفی کی یہی اس کی دعا تجھ سے — ادب اور شعر کی تجدید ربّ العالمیں ہوتی

یہ معاندانہ تعریف نہیں، بلکہ اردو ادب اور زبان کو بلند سے بلند تر پایہ پر دیکھنے کی کیفی کی تمنا کا اظہار ہے۔ کیفی جو اردو حقیقی قومی اتحاد کے کردار کو سمجھتے تھے۔ اپنے ایک کشمیری نثراد عالم، سر تیج بہادر سپرو کے ساتھ اردو کے صحیح موقف کو سمجھانے اور اس کے تحفظ میں ساری عمر گذار دی۔

کیفی نے "رگ وید" کے کچھ حصوں کے ترجمے بھی کئے تھے، جن میں تخلیق عالم والا حصہ اہم ہے۔ اس کے علاوہ گیتا کے فلسفۂ عمل کو بھی انہوں نے نظم کا جامہ پہنایا تھا۔

کیفی کے قیام ریاست کے موقع سے کشمیر کے کئی نوعمر شاعروں نے فائدہ اٹھایا اور ادیبوں نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ شعراء میں سب سے پیش پیش، پنڈت نندلال کول طالب ہیں، جن کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔ صاحب زادہ محمد عمر سے بھی ان کے دوستانہ مراسم تھے، چنانچہ ان کے "ناٹک ساگر" پر کیفی نے ایک بسیط مقدمہ تحریر کیا تھا۔

ماسٹر زندہ کول ثابت کشمیر کے بزرگ شعراء میں سے ہیں۔ وہ کشمیر میں عام طور پر "ماسٹر جی" کے لقب سے مشہور تھے، کیونکہ انہوں نے اسکول میں مدرسی کی تھی۔ ثابت کی ولادت ۱۸۹۰ء میں قصبہ مٹن کے قریب سیر گاؤں میں ہوئی تھی۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم پائی تھی کہ گھر کے نامساعد حالات کی وجہ سے نوکری تلاش کرنی پڑی۔ پہلے ایک فوٹو گرافر کی دکان میں ملازم ہوئے۔ لیکن دل میں پڑھنے کا شوق تھا، دکان میں بیٹھے پڑھا کرتے تھے، آخر ۱۹۰۱ء میں دسویں جماعت کا امتحان کامیاب کیا، اور آخر پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ کشمیر لوٹنے کے بعد، ایک دفتر میں ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ لیکن تعلیم و تدریس کا بہت شوق

تھا، لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے، اس لئے ماسٹر جی مشہور ہو گئے۔

ثابت کی زندگی اور شاعری کے بارے میں پنڈت ترلوکی ناتھ کندن نے ایک دلچسپ مضمون "کوہ نگہ پوش" (سرینگر۔ جون ۱۹۵۴ء) میں شائع کیا تھا۔ ماسٹر جی کی شاعری کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ سکول کے زمانے سے وہ شعر کہنے لگے تھے اور پہلے پہل فارسی میں کہتے تھے۔ شعر سُن کر بعض اساتذہ نے ان کی ہمت افزائی کی، لیکن بعضوں نے شاعری ترک کرکے، پڑھائی کی طرف توجہ کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن ثابت کا ذوق ترقی ہی کرتا گیا۔ وہ سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں انداز میں لکھتے تھے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ کشمیری اور اُردو میں وہ شعر کہتے تھے۔ بھگتی اور تصوف سے انہیں گہرا لگاؤ تھا، تاہم وہ اپنے عہد کے مسائل سے بیگانہ نہیں تھے۔ چنانچہ اپنے عہد کے جاگیردارانہ سماج اور اس سے پیدا ہونے والی بُرائیوں کی مذمت کی اور ایک کلرک کی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے اس کا اچھا مزاحیہ خاکہ اڑایا ہے۔ اس نظم کے کچھ شعر ہیں :۔

ہے بچپن سے دودھ اور انڈے سے نفرت
ہے گھی اور مکھن کی ہرگز نہ عادت
سمجھتے اسی کو ہیں اعلیٰ ضیافت
کٹوری جو مل جائے آلو مٹر کی
اوہو ہو کلرکی، اہا ہا کلرکی

پنڈت کندن نے لکھا ہے کہ پنڈت ثابت، مہجور کی شاعری سے خاص طور پر متاثر تھے۔ ۱۹۳۱ء میں آزادی کی جو تحریک برپا ہوئی تھی پنڈت جی اس کے مؤید اور ہمنوا ہو گئے تھے، اور اپنے عہد کے اور شاعروں کی طرح مُطلق العنانی کی چیرہ دستیوں اور ظلم و استبداد کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ اسی زمانے میں جب کشمیری میں شعر کہنے کی تحریک چلی تو ماسٹر جی نے

کشمیری میں بھی کہنا شروع کیا اور کافی کلام چھوڑا۔ اردو اور فارسی میں شادی بیاہ، خوشی اور غم کے موقع پر کہی ہوئی اُن کی بہت سی نظمیں موجود ہیں۔ پنڈت کُندن نے ماسٹر جی کا بڑا اچھا حُلیہ بھی لکھا ہے :-

کشمیر کے کہنہ مشق شاعر ماسٹر زندہ کول کی صحت اگر اس وقت اچھی ہوتی اور بڑھاپا ان پر پوری طرح غالب نہ آتا، تو وہ آپ کو کہیں نہ کہیں شیروانی پہنے، پگڑی باندھے، لکڑی کے سہارے چلتے ہوئے نظر آتے۔ اور آپ بڑھاپے میں بھی ان کی بچوں جیسی معصوم صورت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ گھر میں ماسٹر جی اکثر آنکھیں بند کئے بیٹھے رہتے ہیں اور دل کے تاروں پر سرمدی نغمے چھیڑ کر اپنے آپ ہی جھومتے رہتے ہیں ... عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر آپ کو کافی عبور حاصل ہے۔"

ماسٹر ثابت کی ایک مشہور نظم جو "ارتقا" کے نام سے موسوم ہے، ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

ہر ذرۂ امکاں میں ہے جلوہ ترا اے لامکاں ظاہر ہے تو، باطن ہے تو، دونوں جہاں کے جسم و جاں

تجھ سے ازل کی ابتدا، تجھ سے ابد کی انتہا موجود تجھ سے ہے عیاں، معدوم ہے تجھ میں نہاں

اجسام کی ترکیب میں، ذرات کی ترتیب میں حکمت ہے تیری ہر جگہ قانونِ قدرت میں عیاں

گلزارِ ہستی میں جو ہر دیکھے کوئی صاحب نظر ہیں صاف ہر گل برگ و بر اس کلک صنعت کے نشاں

اک ذرۂ مہر حُسن کا بنجر میں ہے چمکا ہوا گل میں وہ رنگ و بو بنا، بلبل میں وہ شیریں زباں

تیرا ارادہ ارتقا تکمیل کو ہے راہنما ناسوت سے لاہوت تک تدریج کی ہے نردباں

عالم میں ہیں گر بیش و کم عیش و خوشی یا رنج و غم ہمدردی و ہمت میں ہے مطلب فسلوں کا امتحاں

تعریف ذات پاک کی، دیدوں نے بھی جرأت نہ کی اول صفت میں رہ گئی حیراں یہ عقلِ نکتہ داں

تو گیانیوں کا گیان ہے، تو جوگیوں کا دھیان ہے تو برہم و یزداں ہے، معبود و مقصودِ جہاں

توفیق دے یارب ہمیں سب راہ معنی پر چلیں مندر تیری پوجا کا ہو پیارا وطن ہندوستاں

باطل کی ظلمت سے بچا، نورِ حقیقت کر عطا   اور مرگ روحانی سے لا، سوے بقائے جاوداں

ماسٹر زندہ کول، کو ترتیب، تدوین اور تنقید سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ سنہ ۱۸۹۰ء میں پرمانند کے انتقال کے بعد، انہوں نے ان کی تصانیف کو جمع کر کے اپنے بسیط انگریزی مقدمہ کے ساتھ تین جلدوں میں شایع کیا۔

پنڈت وشوا ناتھ درجو ماہؔ تخلص کرتے تھے اور درؔ کاشمیری اور ماہ جموی دونوں ناموں سے لکھتے تھے، وادی کے اچھے صاحبِ ذوق ادیبوں میں سے تھے۔ اُردو شاعری سے انہیں جو گہرا لگاو تھا، اس کا اندازہ ہم کو پروفیسر ارجن ناتھ رینہ کے ایک مضمون سے ہوتا ہے، جو انہوں نے ایس۔ پی۔ کالج کے ادبی رسالہ "پرتاپ" (اگست سنہ ۱۹۵۰ء) میں ماہ کے بارے میں لکھا تھا۔ مضمون کی ذیلی سُرخی دی ہے۔ "ایک شاعر جسے اُردو شاعری سے بہت لگاو تھا"۔

ماہؔ کشمیر کے ایک مُتمول گھرانے سے تھے۔ ان کے والد پنڈت درگا پرشاد وزیر لدارخ رہے۔ ماہؔ کو اچھی تعلیم حاصل کرنے کے موقعے نصیب ہوئے۔ بی۔ اے کی تعلیم ایف۔ ایس۔ سی۔ کالج لاہور میں پائی۔ اس کے بعد وہ دہلی چلے گئے اور یونیورسٹی میں ایم۔ اے کی تعلیم فلسفہ میں پائی۔ دہلی میں قیام کے زمانے میں، ان کا تعارف مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت کیفی سے ہوا۔ کشمیر میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے کشمیر آنے کے بعد، ماہؔ ان سے بھی متعارف ہوئے۔ پنڈت کیفیؔ کو کلام بھی دکھاتے تھے۔ لاہور میں قیام کے زمانے میں، اقبال کی خدمت میں بھی وہ حاضر ہوتے تھے۔ اپنے زمانے کے کئی اہم شعرا سے اُن کے مراسم گہرے تھے۔

ماہؔ کی ملازمت محکمہ تعلیم میں رہی۔ شعر و سخن کا ذوق ان کو فطری تھا۔ چنانچہ پروفیسر رینہ ان کے ذوقِ ادب کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ماہؔ کمسنی ہی سے شعر و شاعری کا شوق رکھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ سکول میں وہ چھوٹی چھوٹی

ٹولیوں میں، بڑی میٹھی آواز سے شعر پڑھتا تھا۔"

ماہ کی طبیعت غزل اور نظم دونوں میں رواں تھی۔ ان کی نظموں میں حُبِ وطن کا جذبہ اور ہندو مسلم اتحاد کا درد نمایاں ہیں۔ کچھ نظمیں مناظرِ فطرت پر اور کئی نظمیں مذہبی موضوعات پر بھی کہی تھیں۔ ان کی ایک نظم "نوشہ روز اور عروسِ بہار" کشمیر میں آمدِ بہار کے موقع پر لکھی گئی تھی۔ اس کے دو بند ہیں:۔

گلشن ہستی کا عارض کس لئے ہے لالہ فام
آج کیوں مہکا ہوا ہے باغِ جنت کا مشام
ہم کو فطرت دے رہی ہے، آج کیوں بھر بھر کے جام
دیکھ ہمدم چشم باطن سے تو عالم کا نظام
ہے عروسِ دہر کے رُخ پر بہار آئی ہوئی
مُردنی، زالِ خزاں کے چہرہ پر چھائی ہوئی

رخصت اے بادِ زمستاں، رخصت اے بادِ خزاں
اب کہ ہے بادِ بہاری سبزہ زاروں پر رواں
کانپتی ہے بید کے اشجار پر فصلِ خزاں
نوشہ نوروز بالائے بہاراں کی ہے شاں
دی ندا ہاتف نے شاید آگیا نوروز ہے
یا خزاں کے سینے پر اک برقِ خرمن سوز ہے

ماہ کی مذہبی موضوعات پر لکھی ہوئی نظموں میں "کرشن جنم" پر لکھی ہوئی نظمیں اس موضوع پر کہی ہوئی اردو نظموں میں جذباتِ عقیدتمندی سے مملو ہیں۔ ایک نظم کا اقتباس ہے:

زمیں سے آسماں تک شور ہے جس حسنِ تاباں کا
شجر جس نے اکھاڑا بیخ و بن سے ظلم وعصیاں کا
مشامِ جاں معطر کر دیا تھا، اس گلِ تر نے
جھکایا اس کی گیتا کے مقابل سر جہاں بھر نے
ثنا لکھئے کہاں یہ حوصلہ ہے حدِ امکاں کا
ہے ناممکن کوئی پردہ الٹ دے روئے جاناں کا

اسی عنوان کی ایک اور نظم کے چند شعر بھی پڑھنے کے قابل ہیں:۔

چمک اٹھا جو اندھیرے میں نورِ یزدانی | کہ لیٹا دیوکی کی گود میں خود ظلِ سبحانی
ادا اِک اِک برج کی تاریوں کی آج بانکی تھی | زمین کیا، آسمان بھی موہنی صورت سے جھانکی تھی
اُفق سے ملاء انور نے بھی ڈر کر سر نکالا تھا | کہ آدھی رات کو سورج زمین پہ آنے والا تھا

ماہ کی مذہبی موضوعات پر لکھی ہوئی نظموں میں ایک اور اچھی نظم "شیو سمادھی" ہے جو ۱۹۳۸ء میں شایع ہوئی تھی۔ اس نظم میں کشمیر کی برف پوش پہاڑیوں کے پس منظر میں شاعر کے جذبات عقیدت کا چھلکاو ایک مخصوص کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اِس نظم کے کچھ شعر ہیں:

زمیں پر برف اپنا فرش چاندنی کا بچھاتی ہے | گگن میں چاند لیکن چاندنی سی چھائی جاتی ہے

چھپی ہے برف کے تودوں میں ہستی ایک یزدانی | فرشتوں سے کہیں بڑھ کر رُخِ پُرنور نورانی
جلال ایسا کہ مانگے مہر تاباں جس سے تابانی | جمال ایسا کہ حُسنِ اپسرا ہو شرم سے پانی
نہ ہے صورت فقیرانی، نہ ہے تیری جہانبانی | یہی در ہے عناصر کر رہے ہیں جس کی دربانی

مقبول شیروانی کشمیر کے قوم پرست فرد تھے، جو ۱۹۴۷ء کے قبائلی ہنگاموں میں بے دردی سے مارے گئے تھے۔ ماہ نے ایک نظم میں ان کو سراہا ہے:-

مِٹا بُلبلِ زار اپنے چمن پر | فدا ہو گیا شیروانی وطن پر

اقبال کی نظم "زوالِ حُسن" کے جواب میں ماہ نے ایک نظم لکھی تھی جس میں حُسن کو لازوال ظاہر کیا تھا۔

علامہ صدیقی سانبوی کا تذکرہ ان صفحات میں آیا ہے۔ وہ "مارتنڈ" کے ادبی شماروں کے لئے کبھی کبھی ادیبوں اور شاعروں کے خاکے لکھا کرتے تھے۔ ماہ کا خاکہ بھی انہوں نے لکھا تھا۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے:-

"نام وشوا ناتھ، تخلص کبھی دَر، کبھی ماہ۔ جب جموں چلے جاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو ماہ جموی کہلاتے ہیں، جن دنوں کشمیر میں قیام رہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو اپنے آپ کو دَر کاشمیری سے موسوم کرتے ہیں۔ غرض دَر کاشمیری اور ماہ جموی مترادف ہیں۔"

"نئے جوان ہیں، قد کسی قدر پست، خوبصورت، بانکے بانکے، چُست بدن، عینک پہننے کے عادی، انگریزی وضع پر فریفتہ، سگریٹ اور پان کے دلدادہ، راگ و رنگ کے مشتاق، خوش گو، خوش تمیز، صاحبِ ہمت اور ملنسار۔"

"آپ شاعر بھی ہیں، ناثر بھی ہیں، ڈراما نویس بھی، مزاح نگار بھی۔"

"آپ کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ انکشاف حقیقت، تلاش حقیقت، اب سنتے ہیں طبیعت ڈراما نگاری کی طرف خصوصیت کے ساتھ جھک گئی ہے۔"

ماہ نے کچھ ڈرامے بھی لکھے تھے۔ اور کچھ مضامین اور انشائیے بھی ان کی یادگار ہیں۔ انشائیے ادبِ لطیف کا انداز رکھتے ہیں۔ ان کا ڈراما "شہزادی نوشابہ" جو "مارتنڈ" کے ۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء کے ادبی شمارہ میں شایع ہوا تھا، اچھا مختصر ڈراما ہے، سکندرِ اعظم کی نوعمری کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے اور اس سے سکندر کی حوصلہ مندی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا ایک کردار ارسطو بھی ہے۔ سکندر کا باپ فلپ یونانی فتوحات کے بعد مقدونیہ لوٹ رہا ہے۔ شہر میں چراغاں ہو رہے ہیں۔ سکندر کی ماں، خوش خوش ہنگامے میں مصروف ہے۔ شہزادہ سکندر اپنے کمرہ میں مغموم بیٹھا ہے۔ ملکہ سکندر کو بلانے کے لئے خادمہ کو بھیجتی ہے:۔

"نوکرانی — حضور ملکہ بلا رہی ہے (جواب نہیں ملتا۔ رعبِ سکندری سے نوکرانی واپس جاتی ہے۔ (ملکہ سے) شہزادہ صاحب چپ چاپ بیٹھے ہیں، میں بولی، جواب نہ دیا۔ ملکہ — کیا وجہ ہے؟ (سوچ کر) اچھا، ان کے استاد، ارسطو کو فوراً بلا بھیجو میں بھی چلتی ہوں۔

(شہزادہ کا کمرہ — ایک طرف ارسطو ذرا فاصلے پر بیٹھے ہیں، دوسری طرف ملکہ سکندر کے بہت

نزدیک بیٹھی ہے۔ تین چار نوکرانیاں پاس کھڑی ہیں)

ملکہ — آج یہ اداکیسی بیٹا! فاتح گھر آرہے ہیں، شہر دُلہن بن رہا ہے۔ شہری خوشیاں منا ...

ہیں، میرا لختِ جگر غمگین ہے، یہ کیوں ؟

سکندر — خوب امی جان، خوب

ملکہ — مطلب نہیں سمجھی بیٹا...... میری جان، دشمنوں کو کیا تکلیف ہے ؟

ارسطو — ایسی غمگین صورت ہمیں بھی بھلی نہیں معلوم ہوتی، بیٹا تمام یونان آج ہمارا ہو چکا ہے۔

سکندر — یہی تو رونا ہے۔ (ملکہ سمجھی نہیں، لیکن ارسطو سمجھ گیا ہے مسکراتا ہے)

ارسطو — بتاتے کیوں نہیں بیٹا۔

سکندر — یہ سلسلہ جاری رہا تو میرے فتح کرنے کو کیا رہ جائیگا !

ماہ کے انشائیوں کے موضوع زیادہ تر مذہبی ہیں۔ "پریم کی آہوتی" "بھکشا" اچھے پارے ہیں۔

ماہ کے بھائی جیون نے فلمی دُنیا میں بڑی شُہرت حاصل کی۔

ماہ کی اہلیہ بھی پاکیزہ اَدبی ذوق رکھتی تھیں۔ ان کی ہندی آمیز مذہبی موضوعات پر لکھی ہوئی کچھ نظمیں "مارتنڈ" میں شایع ہوئی تھیں۔ ان نظموں میں بھکتی کی جھلک ہے۔ ایک نظم "بھکتی کے چند پھول — بھگوان شیو کے چرنوں میں" اچھی نظم ہے۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے

مستی کے شنکر پیارے — پیارے، پیارے ہیں بلہاری

نندی پیٹھ چڑھائے — گنگا بنتی، سیس میں رہتی

شنکر کنٹھ لگائے — اس جیون سے خاک ہی بنتی

شنکر بھسم رمائے — لکڑی بن میں راکھ ہوجاتی

وایو چرن دھلائے — ورشا ہوتی، چرن میں دھوتی

یہ تن تیاگ، سنکھ بن جاوں | بھولا جیسے بجائے
روروکر سب رین گذاروں | بھٹک بھٹک دن سارے
بھکتی دان کر داب شنکر | درشن پاوں تمہارے

ان کی دوسری نظمیں جیسے "پریم بھکشا" وغیرہ بھی اسی طرح کے نرم جذبات اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہیں۔

وشوناتھ ماتہ کے معاصرین میں قیس شیروانی، شاعری اور انشأ میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ جموں ان کا وطن تھا، اور وہیں تعلیم بھی حاصل کی۔ انشاء پردازی کے علاوہ شاعری کا بھی ان کو ذوق تھا، اور کچھ کلام ان کی یادگار ہے۔ قیس ایک سکول میں مُعلّم تھے، لیکن ان کو انشأ پردازی اور شاعری کی بدولت کافی شہرت حاصل تھی۔ اس زمانے کے کچھ نوجوان شعرا، قیس سے مشورہ سخن بھی کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں فانی وِچار ناگی کا تذکرہ آگے آرہا ہے، جو اچھے شاعر اور انشار پرداز تھے۔ قیس اور غلام حیدر خاں چشتی دونوں کی مشترکہ ادارت میں "پاسباں" شایع ہوتا تھا۔

قیس کی ایک نظم جو یوراج کرن سنگھ کی ولیعہدی کے زمانے میں سالگرہ کے موقع پر لکھی گئی تھی، اس کے کچھ شعر حسبِ ذیل ہیں۔ یہ گویا اصل موضوع کی تشبیب ہے، جس سے ان کی منظر نگاری کی صلاحیت پر روشنی پڑتی ہے۔

دیدنی ہیں دھر کی زیبائشیں | ہر طرف ہے حسنِ فطرت کا نکھار
ہر قدم پر حُسن، ہر منظر حسین | کیوں نہ ہو چشمِ تمنّا کامگار
گُل ہیں ہر جا کارواں در کارواں | صحنِ گلشن ہو کہ اوجِ کوہسار
باغ میں اِترا کے چلتی ہے نسیم | دامنِ موجِ صبا ہے مُشکبار

بن گیا ہے غُلزار رنگ و بو ہر چمن، ہر گلستاں ہر لالہ زار
ہیں جلو میں مستیوں کے قافلے آ رہی ہے فصلِ گل مستانہ وار

قیس کی ایک غزل کے دو شعر حسبِ ذیل ہیں :۔

ترے پردہ کا سایہ پڑ گیا شائد تمنا پر یہ لیلیٰ اب نکلنے کی نہیں اس محمل دل سے
کہانی؟ پھر تمہارے عشق کی، وہ بھی مرے لب پر یہ مے چھلکی، نہ چھلکے گی کبھی پیمانہ دل سے

صاحب زادہ عبدالرحمن ذکی، صاحب زادہ محمد عمر کے چھوٹے بھائی، شعر و ادب کے ذوق میں اپنے بھائی سے پیچھے نہیں تھے ان کا انتقال کم عمری ہی میں ہو گیا۔ انتقال کے وقت وہ ریاست کی قانون ساز مجلس کے انڈر سیکریٹری تھے۔ ان کی سنجیدہ فکر اور پاکیزہ مذاق نے انہیں، اپنے عہد کے ادبی حلقے میں ایک نمایاں مقام عطا کیا تھا۔ میرزا کمال الدین شیداؔ کے، جن کا ذکر آگے آ رہا ہے، وہ گہرے دوست تھے، اور دونوں میں دلچسپ شعری صحبتیں رہا کرتی تھیں۔ ان کا زیادہ کلام دستیاب نہیں ہوتا، لیکن ان کی ایک کسی قدر طویل نظم سے، جو انہوں نے میرزا شیدا کی نظم "احساسِ منظر" کے جواب میں لکھی تھی، ان کی سلاست طبع اور شاعرانہ بالغ نظری پر روشنی پڑتی ہے۔ ذکی کی نظم کا عنوان ہے۔ "سوزِ منظر"۔ "سوزِ منظر" کا ایک جواب پھر شیدا نے "ماحصلِ منظر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ تینوں نظمیں ایک رسالے کی صورت میں ذکی کے مقدمہ کے ساتھ مرتب کی ہوئی، مجھے شیدا نے عطا کی تھی، جسے میں نے مجلس تحقیقات اردو، سری نگر کشمیر سے ۱۹۶۷ء میں شایع کیا۔

"سوزِ منظر" میں ذکیؔ نے صبح کی جان بخش فضا سے کچھ معنوی تاثرات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوئی پینتیس اشعار کی نظم ہے، اور اسی بحر میں لکھی گئی ہے، جس میں شیدا نے "احساس منظر" لکھی تھی۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

صبح کا منظر یہاں ہر سو اداس جذبۂ قلب و نظر ہے وقفِ یاس

اس میں گریہ کا ہے اِک طوفاں نہاں　　　تم سمجھتے ہو جسے آبِ رواں

یاس کے یہ جذبات شاعر کے دل میں "انجام کارِ گُل" کے خیال سے پیدا ہوتے ہیں اور شاعر کو سوزِ غم عطا کرتے ہیں، کہتے ہیں :-

دِل کے تاروں پہ ہے غم مضراب زن　　　سوزِ نغمہ میں ہے دوزخ کی جلن

آنسوؤں کے تار، نغمہ سازِ دل　　　سوز جن کا ترجمانِ رازِ دل

ان کی ہم آہنگ جانِ کائنات　　　کامگاران سے نہاں دردِ حیات

سیلِ اشک زندگی ہے آبجو　　　یا ضمیرِ آرزو کا ہے لہو

سوزِ دل کی کمی کا شاعر کو قلق ہے۔ حالانکہ یہ نقش بندِ کائنات ہے اور :-

اس سے ہے ناموسِ دل تابندہ تر　　　اس سے سعیِ عرش میں سوز و اثر

اس کے ہی دو قطرہ مہر و ماہ ہیں　　　روز و شب اس سے تجلی خواہ ہیں

حُسن، شاعر کو ہر جگہ پیدائی دکھائی دیتا ہے، لیکن عشق کی نایابی کا اسے افسوس ہے۔ کہتا ہے :-

حسن وافر، عشق اب نایاب ہے　　　آب جوئے ذوقِ دل پایاب ہے

کامگاریِ عشق کی اب ختم ہے　　　نام داریِ عشق کی اب ختم ہے

زندگی میں سوزِ پنہائی نہیں　　　روح درد و ذوق وجدائی نہیں

آرزوئے دردِ فریادی نہیں　　　دِل میں ذوقِ غم کی آبادی نہیں

جو خلش کی زندگی تھی جستجو　　　مِٹ چکی عالم میں اس کی آرزو

قصہ پارینہ جوئے شیر ہے　　　روئے عشقِ یار بے تنویر ہے

آگے شیدا کو دعوت دیتے ہیں :-

آؤ، شیدا عشق کا ماتم کریں ۔۔۔ یہ جہاں کافِ نون برہم

نظم غزل پر ختم ہوتی ہے ۔

عشق پھرتا خانماں برباد ہے ۔۔۔ سردِ سعیٔ تیشۂ فرہاد ہے

عشق کی ہوتی عزاداری ہے آج ۔۔۔ حسن محوِ نالہ و فریاد ہے

عشق عنقا باغِ عالم میں ہوا ۔۔۔ دامِ بار بازوے صیاد ہے

میں بھی تو دیکھوں ذرا شیدا جہاں ۔۔۔ کس کا سینہ عشق سے آباد ہے

عشق رخصت ہو چکا محروم حال ۔۔۔ سوزِ دل، فریاد ہے، فریاد ہے

ذکی کی یہ نظم، اپنے عہد کے بو کھٹے ہیں، غیر رسمی تصورات اور اظہار کی اُپج کی وجہ سے کچھ اجنبی تصویر سی لگتی ہے ۔

ذکی اچھے انشا پرداز بھی تھے ۔ ان کی انشا کا صرف ایک نمونہ اس مقدمہ کی صورت میں باقی رہ گیا ہے، جو انہوں نے ان تینوں نظموں کے مجموعے کے لئے لکھا تھا، اور جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے ۔ اس مقدمہ میں ادبیت ہے اور اس کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے ۔ اس میں انہوں نے کشمیر میں اُردو ادب کی تحریک کے ارتقاء کی طرف بھی کچھ اشارے کئے ہیں ۔ مقدمہ سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے :

"کشمیر میں اردو ادب کا دورِ اولین عملی طور پر چودھری خوشی محمد ناظر، مولانا عبد الصمد، مفتی محمد حسین کاشمیری، محی الدین قمر قمرازی اور خاں صاحب منشی سراج الدین کی ادبی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے ۔ ان ایام میں مشاعرے اور ادبی محفلیں عام طور پر خاں صاحب منشی سراج الدین کے دولت کدہ یا نشاط باغ اور شالیمار میں منعقد ہوا کرتی تھیں ۔ ان محدود ادبی اجتماعوں نے کشمیر کی اس نئی پود پر بھرپور اثر کیا، جو حصول تعلیم میں مصروف تھی ۔"

ابھرنے والی نئی پود کے شاعروں میں ذکی نے شیخ غلام حیدر خان چشتی، میرزا مبارک بیگ مبارک اور پنڈت اقبال کشن درکا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ذکی نے اُس زمانے کے ادبی ذوق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اِس وقت نہ صرف کافی اَدبی شعور بیدار ہو چکا تھا، بلکہ معیارِ کلام بھی بلند اور دلکش تھا۔"

تیسرے دور میں کالج میں پڑھنے والے ان ہونہار طلباء کو شامل کرتے ہیں جو جلد ہی منظرِ عام پر آگئے۔ انہیں میں میرزا کمال الدین شیدا کو بھی شامل کیا ہے۔ ذکی نے میرزا شیدا کی شاعرانہ صلاحیتوں پر بھی روشنی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ پنڈت نندلال بے غرض بھی اُس زمانے کے نمایاں لکھنے والوں میں سے تھے۔ ذوقِ شعر انہیں اپنے والد پنڈت ٹیکالال در فائق سے وراثتاً ملا تھا۔ ان کے دادا پنڈت واسہ کاک بھی شاعر تھے اور باسکر تخلص کرتے تھے۔ اس طرح اس خاندان میں تین پُشت تک ادبی اور علمی ذوق چلا آیا۔ بے غرض سری پرتاپ سکول میں مدرس تھے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، اور ایک تاریخ بھی فارسی نثر میں لکھی تھی، جو غالباً ان کے فرزند لالہ جی کنٹھ کے قبضے میں ہے۔ لیکن بے غرض کا زیادہ کلام اردو میں ہے۔ وہ اچھے مضمون نگار بھی تھے، اور زیادہ تر مذہبی موضوعات پر اور مذہبی تہواروں کے موقع پر لکھا کرتے تھے۔ اُردو شاعری میں بے غرض نے اچھا معیار حاصل کر لیا تھا، اور کافی کلام سرانجام کیا، چنانچہ ان کا اُردو اور فارسی کلام دو مجموعوں کی صورت میں مدّون ہوا ہے، جو "جام وحدت" اور "ترانہ بے غرض" کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کے فارسی کلام کا نمونہ درجِ ذیل ہے:

گفتم ندانم راہِ او، گفتا، بر و دیوانہ باش — گفتم ببوسم خاکِ پا، گفتا بگوی من در آ

گفتم کہ قربانت شوم، گفتا کہ چون پروانہ باش — گفتم کہ بینم رو برو، گفتا دوی را ترک کن

شُدم بیخود چو مجنوں در پے دیدار آن لیلا
بشوقِ سنگ طفلاں، ہر طرف دیوانہ می رقصم

اُردو میں بیغرض نے غزلیں اور قومی اور اخلاقی نظمیں کہی ہیں۔ ان کی غزل میں کہیں کہیں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ اِن کی غزل کے کچھ شعر ہیں:۔

شبِ فرقت بلائے بد ہے، ٹالے سے نہیں ٹلتی
نہ پوچھو دل لگانے کی سزا میں نے یہ پائی ہے

نہیں سُنتا وہ ظالم، بیغرض شکوہ ہے لاحاصل
میں تنہا اس طرف اور اس طرف ساری خدائی ہے

ان کی قومی اور اخلاقی شاعری کے کچھ نمونے ذیل میں درج ہیں:۔

ماضی تمہارا کیا ہوا، کیوں حال سے بدحال ہو
ہمت اگر کچھ تم میں ہو، ہر خار رہ گلفام ہے

بس غافلو، ہوشیار ہو، غفلت کی نیندیں سو چکے
سر پر تمہارے کھیلتی شمشیرِ خوں آشام ہے

حسن باطن اور ہے، شکل و شمایل پر نہ جا
بے خبر کھاتا ہے دھوکا ظاہری تصویر سے

بیغرض اکثر "مارتنڈ" کے ادبی شماروں کے لئے لکھتے تھے۔ شیوراتری، سال نو (نورہ) اور پنڈتوں کے دوسرے تیوہاروں کے موقعے پر ان کے مضامین اکثر شائع ہوتے تھے۔ "مبارک سال نو" جو "مارتنڈ" کے ۹ اپریل ۱۹۳۸ء کے شمارہ میں اور "شیوراتری اور کشمیری پنڈت" (مارتنڈ ۲۸ فروری ۱۹۳۸ء) اور "ہدیہ سالِ نو" جو اسی اخبار کے اپریل ۱۹۴۴ء کے شمارے میں شائع ہوئے ہیں۔ شیوراتری پر ان کے ایک مضمون کا اقتباس ذیل میں درج ہے:۔

"مقتدر ناظرین، راقم آپ کے طائرِ خیال کو اب سے ڈیڑھ سو سال گذشتہ کی طرف سبک پرواز ہونے کی تحریک کرتا ہوا، اس وقت کے حالات پر ایک چھچلتی ہوئی نگاہ ڈالنے کی دعوت دیتا ہے، جبکہ یہاں کے ہندو (کشمیری پنڈت) حکمرانِ وقت کے ہاتھوں گوناگوں مظالم اور مصائب کے تختۂ مشق بنائے جاتے تھے۔ تاآینکہ

"انہیں تیوہاروں کے منانے اور کھلے بندوں یادِ الٰہی و عبادتِ یومیہ ادا کرنے کی اجازت نہ تھی ..."

بے غرض کے کلام کا مجموعہ "تازیانۂ عبرت" کے نام سے مرتب ہوا تھا لیکن شائع نہیں ہوسکا۔

بلدیو کشن تکو قومی اور اخلاقی شاعری میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کے والد ریاست کے محکمۂ پولیس کے سُپرانٹنڈنٹ تھے۔ بلدیو کشن ملازمت کے سلسلے میں کچھ عرصہ لاہور میں بھی رہے، جہاں وہ محکمۂ چنگی میں کام کرتے تھے۔ شاعری میں وہ زیادہ تر قومی اور اخلاقی انداز کو پسند کرتے تھے۔ عشقیہ غزل انہوں نے شاید ہی کہی ہو۔ ان کا اردو دیوان مرتب ہوا تھا، لیکن غالباً شایع نہیں ہوسکا۔

ان کے کچھ شعر یہ ہیں:-

نہ وہ اوصاف ہیں ہم میں نہ وہ الفت رہی دل میں	ہماری غفلتوں سے دیکھئے سارا وطن بگڑا
ذرا دیکھو تو بگڑی کس قدر حالت ہماری ہے	روش بگڑی، چلن بگڑا، ہمارا پیرہن بگڑا

آذر عسکری اسی زمانے کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ انہیں گھڑی سازی میں مہارت تھی، اور لال چوک میں بگلنی اینڈ کو میں گھڑیاں درست کیا کرتے تھے۔ مزاحیہ انداز میں وہ خوب کہتے تھے اور جب مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تو سارے مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔

پنڈت دینا ناتھ مٹو دلگیر، اس صدی کی تیسری دہائی کے کشمیری ادیبوں میں پیش پیش تھے۔ ان کے خاندان میں فارسی کا چرچا تھا۔ دادا پنڈت کرشن داس مٹو، کشمیر کے گورنر کے دفتر میں میر منشی تھے۔ دلگیر ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم بھی خاندانی روایت کے مطابق، فارسی میں ہوئی تھی اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم کا امتحان پاس کیا تھا۔ بعد میں ایف۔ اے بھی اسی یونیورسٹی سے کامیاب کیا۔ اور پنجاب میں نیشنل اسکول میں فارسی کے مدرس ہوگئے تھے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر آباد میں بھی فارسی کے اُستاد کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ ابتدا سے ان کی طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی اور اردو کے علاوہ

کشمیری میں بھی شعر کہتے تھے۔ قومی اور ہندو مذہبی تحریکات کا دلگیر پر بہت اثر تھا، اور اکثر نظمیں اسی اثر کے تحت لکھی تھیں۔ ان کی ایک نظم جو "تحریکِ انجمنِ امدادِ قرضہ" کے عنوان سے لکھی گئی ہے، اس کے دو شعر ہیں :

جان لو کیسی فراغت بخش ہے تحریک یہ
خود ہے راجہ بہادر جس کے ہوں روح رواں

اس سے حاصل فیضِ اہلِ ملک کو ہووے سدا
ہاں یہی دلگیر کی، تجھ سے دعا ہے اے خدا

دلگیر غزل بھی کہتے تھے اور اچھی کہتے تھے۔ ان کی مختلف غزلوں سے اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

گرہ جب اس نے دی ناز و ادا سے اپنی زلفوں میں
بہم سب جڑ گئے یہ عشق کی زنجیر کے ٹکڑے

گریباں زاہدوں کے جب نہیں محفوظ وحشت سے
نہ کیوں ناصح کے ہوں پھر دامنِ تزویر کے ٹکڑے

بھلا کب چھوڑ دے وہ اپنے وطن کی پاک مٹی کو
جسے گھر بیٹھے ہی مل جاتے ہوں تقدیر کے ٹکڑے

دل جو پامالِ خیالِ دیدِ جاناں ہو گیا
گویا عکسِ شمع پر پروانہ قرباں ہو گیا

لوگ کہتے ہیں سنبھل جاؤں گا لیکن ہائے اب
فرطِ سودا باعثِ چاکِ گریباں ہو گیا

دلگیر کو افسانہ نگاری کا بھی شوق تھا، گو ان کے افسانوں میں جدید عہد کے فنی محاسن کم ملتے ہیں۔ پھر بھی اپنے زمانے کے وہ مقبول افسانہ نگار مانے جاتے تھے۔ ان کے افسانے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ ایک افسانہ "مندر" جو سماجی زندگی کے ایک مخصوص پہلو پر لکھا گیا ہے، اچھا افسانہ ہے۔ سماج اور سماجی اصلاح کے موضوعات پر ان کے کئی مضامین شائع ہوتے رہے۔ پنڈتوں میں کمسن بیوہ کی حالتِ زار پیشِ منظر میں لانے کی تحریک اس زمانے میں عام تھی اور احساس رکھنے والے پنڈتوں نے مضامین، افسانوں اور نظموں کے ذریعہ اس طرف توجہ منعطف کرانے کی کوشش کی تھی۔ اس سلسلے میں دلگیر نے ایک بال ودھوا کا دکھڑا اپنی ماں سے بیان کرنے کا اندوہناک منظر پیش کیا ہے۔ اس میں تھوڑا سا افسانہ پن بھی پیدا ہو گیا ہے ــــ

دِلگیر "مارتنڈ" کے ادبی شماروں اپنے معاصر ادیبوں اور شعروں کے چہرے "علامہ صدیقی سابنوی" کے فرضی نام سے لکھا کرتے تھے۔ یہ چہرے یا خاکے "اراکینِ محفلِ ادب" کے کالموں میں شایع ہوتے رہے۔ ایک خاکہ انہوں نے پردیسی کا لکھا تھا جس کا اقتباس آگے دیا جا رہا ہے۔ ایک شمارہ میں انہوں نے خود اپنا خاکہ پیش کیا تھا۔ جس کا آغاز اس طرح کیا ہے :

"حضرت دلگیر، ذرا سنبھل کر بیٹھ جائیے، ہلیئے جلیئے نہیں تصویر کھینچتی ہے۔ آپ کی طرح شعر نہیں کہتا ہے۔ کیا کر دیا؟ چھپوا دیا؟ خبردار، ایک، دو، تین، لیجئے جناب یہ رہی آپ کی تصویر، پیش کر دی. مصور کے خلاف کہیں سازش نہ کیجئے گا......"

آگے حلیہ لکھا ہے اور اپنے عادات بیان کئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی تحریر کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ ان کی عبارتیں چست اور انداز دلکش ہوتا ہے اور زبان میں محاورے اور کبھی کبھی معمہ نگاری کے چٹخارے بھی ہوتے ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی بھی "مولانا علائی" کے نام سے اراکینِ محفلِ ادب کے لئے خاکے لکھتے تھے۔ ایک دفعہ ادبی حلقوں میں یہ بحث چھڑی تھی کہ مولانا علائی اور علامہ صدیقی سابنوی کے خاکوں میں سے کس کے خاکے بہتر ہوتے ہیں۔ دونوں کے خاکوں کی اضافی اہمیت پر غور کرنے کے لئے "مارتنڈ" کے دفتر میں ۱۵ مارچ ۱۹۳۸ء میں ایک محفل کا انتظام کیا گیا جس کی صدارت نند لال طالب نے کی تھی اور دینا ناتھ وارکیو شاہد کاشمیری، شیام لال ولی نیرنتہ کاشمیری، شیام لال ایمہ اور خود دلگیر اور پردیسی بھی محفل میں شریک تھے۔

دلگیر نے آخری زمانے میں اسمٰعیل میرٹھی کے انداز کی آزاد نظم لکھنے کی بھی کوشش کی۔ ان کی ایک نظم اسمٰعیل کی "تاروں بھری رات کے انداز پر لکھی ہوئی" "مارتنڈ" کے ایک شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کا اقتباس یوں ہے:۔

اے جگ مگ جگ مگ کرتے ننھے ننھے تارو

تم لیلائے شب کے ہار بنے ہو ، اے جھل مِل جھل مِل کرتے ہوئے شبنم کے پیارو

تم ذریعہ آبیاری گلزار ہی بنتے ، اے جھل مِل جھل مِل کرتے تارو......"

دلگیر کے فرزند ویر و شیشور، اس عہد کے آخری برسوں میں بہت نمایاں رہے اور کشمیر کی ادبی چہل پہل میں حصہ لیتے رہے۔ ان کا حال آگے آ رہا ہے۔

ملک محی الدین قمر قمرازی تحصیل کولگام کے رہنے والے تھے۔ یہ علاقہ کامراج میں واقع ہے۔ اس تعلق سے انہوں نے قمرازی (کمرازی کامراج) نسبت اختیار کی تھی۔ ان کا خاندان پشمینہ کی تجارت میں شہرت رکھتا تھا اور ہندوستان سے باہر بھی وہ پشمینہ کی برآمد کرتے تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں جیسے دہلی لکھنؤ شملہ اور امرتسر میں بھی ان کی تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ قمر کی ولادت ۱۸۹۶ء کے لگ بھگ ہوئی تھی۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد وہ امرتسر چلے گئے جہاں انہوں نے حکیم فیروزالدین طغرائی سے تلمذ اختیار کیا اور فارسی کے درس کی تکمیل کے علاوہ فنِ شعر میں بھی مہارت حاصل کی۔ حبیب کیفوی نے طغرائی کے ارشد تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ قمر کو فارسی میں شعر کہنے کی ویسی ہی مہارت تھی جیسی اُردو میں کہنے کی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ سلسلہ ملازمت میں داخل ہو گئے اور کچھ عرصہ اوڑی میں تحصیلدار کے عہدہ پر فایز رہے۔ پھر ترقی کرتے کرتے وہ افسر مال ہو گئے تھے، لیکن ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود، ادبی اور شعری مشاغل جاری رہے۔ ۱۹۵۹ء تک کہا ہوا کلام، ایک مجموعے کی صورت میں مرتب اور "ارمغان کشمیر" حصہ اول کے نام سے شایع ہوا ہے۔ اِس وقت وہ پاکستان میں مقیم ہیں۔

قمر غزل اور نظم دونوں اصناف میں کہتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام پر مقدمہ لکھتے ہوئے محمد حسین عرشی، اڈیٹر ماہ نامہ "فیض الاسلام" راولپنڈی نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"قمر صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے ہمہ گیر شاعری کی ہے اور ہر صنف میں اپنے جوہر کمالے ہیں

اور مجموعہ کلام کی اہمیت کے بارے میں لکھا ہے:

ادب کے ساتھ ساتھ اس گلستانِ فکر و تخیل کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔
ایک محقق ادب کو اس میں نصف صدی تک کے ادبی ادوار و ارتقاء کے نمونے
ملیں گے، جو کسی اور مجموعے میں شاید ہی مل سکیں۔"

شاعری کے آغاز میں قمر کے فکر و تخیل پر اور نوعمر شعراء کی طرح، حسن و رومان کی پرچھائیں تھیں، لیکن زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ، ان کی فکر میں گہرائی، و گیرائی پیدا ہوتی گئی۔ غزل سے ہٹ کر

آثار ذیل کے اشعار میں نظر آتے ہیں:

عشق رخ گلگوں کا مضمون ہو کیب مجھ کو
لکھ دیں مرے نسخے میں اطبا عرقِ گل

وہ بیکس ہوں کہ ہنستا ہے زمانہ دیکھ کر مجھ کو
اثر لائی ہے اپنی زرد روئی زعفراں ہو کر

بت پرستی گر نہ ہوتی حق پرستی کا اصول
کعبہ کہلاتا ہے جو اب کیوں وہ کبھی بُت خانہ تھا

مثنویوں میں فکر اور اسلوب کے لحاظ سے قمر کے لئے اندازِ فکر کے آثار نظر آئیں گے:

روتا ہوں جدائی میں تیری دجلہ دجلہ جیحوں جیحوں
پھرتا ہوں تجسس میں تیری صحرا صحرا ہاموں ہاموں

جس وقت مجھے یاد آتی ہیں ہستی کا رنگ جاتی ہیں
زلفیں وہ تیری مشکیں مشکیں، آنکھیں وہ تری میگوں میگوں

یہ سوز محبت میں وہ ہوا دنیا میں کسی سے حل نہ ہوا
زر جوں جوں ہاتھ میں آتا ہے ہوتی ہے ہوس افزوں افزوں

یہ سوزش وہ آگ ہے جو بجھتی ہی نہیں ہے بجھانے سے
یہ دل میں سلگتی رہتی ہے مخفی مخفی، مکنوں مکنوں

یہ تیر نمر شدازِ سخن، تسلیم نہ ہو کیوں نازِ سخن
ہر مصرعہ ہے جب جادو جادو، ہر شعر ہے جب افسوں افسوں

قمر بحیثیت ریاست کے عہدہ دار اور شاعر ہونے کے ناطے، حکمرانوں کی مدح سرائی بھی کرنی پڑتی تھی۔
اس نے مہاراجہ ہری سنگھ کی سالگرہ کے موقع پر ایک قصیدہ لکھ کر مہاراجہ کی خدمت میں پیش کیا

؎ ماہوار رتن کے یکم اکتوبر ۱۹۳۲ء کے شمارہ میں شایع ہوا۔

باقی ہیں نجوم و قمر افلاک پہ جب تک — جب تک کہ ان اجرام پہ ہے شعشعۂ نیر ازاں

جب تک کہ تبسم رہے غنچوں کے لبوں پر — جب تک کہ دمِ نامیہ ہے وزاں

یہ گلبنِ اقبال مہاراجہ ہری سنگھ — شاداب و تر و تازہ و سرسبز اسر ردواں

یارب سحر و شام یہی وردِ زباں ہے — درگاہ میں مقبول قمرؔ کی یہ دعا ہو

قمرؔ کو بھی اپنے دوسرے ہمنواؤں کی طرح اس کا شعور تھا کہ وہ ایسی سرزمیں کا رہنے والا۔۔۔ جنت ارضی سے موسوم کی جاتی ہے، اور اس زمانے سے، 'مادر وطن کی توصیف ان کا فرض تھا، لیکن اس فرض کو انہوں نے اپنے انداز سے پورا کیا ہے۔ کشمیر کے بارے میں لکھی ہوئی ان کی نظم ہے:

جہاں پر مسرت ہے رنج و الم میں — جہاں شادمانی ہے پوشیدہ غم میں

جہاں رنگ الفت ہے طرز ستم میں — جہاں نوشداروں کی لذت ہے سم میں

بہت طول تمہید طول سخن ہے

بتادوں کہ وہ سرزمینِ وطن ہے

وطن بھی کہ جو انتخابِ جہاں ہو — جہاں کا ہر ایک ذرہ اکسیرِ جاں ہو

ہر اک کوہ جس کا جواہر فشاں ہو — بیاباں ہر اک غیرتِ بوستاں ہو

فلک سے سحاب ایک لحظہ جو برسے

زمیں گنج بن جائے گل ہائے زر سے

قمرؔ نے کشمیر کے حسن اور اس کے منظری محاسن پر کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ذیل کی نظم، بحر کی روانی اور ترنم کے سبب قابلِ مطالعہ ہے۔ یہ نظم مستزاد کی شکل میں ہے اور کشمیر سے باہر لکھی گئی ہے۔ اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

پھرتی ہے مری آنکھوں میں ہر دم تری تصویر — اے وادیٔ کشمیر

فلسفی اور بالغ النظر شاعر تھے۔ آپ کی ملاقات مجھے سنہ ۱۹۴۶ء
میں نصیب ہوئی ...... ڈاکٹر صاحب کی شخصیت آسانی سے بھلائی جانے والی نہیں تھی۔
بڑے تند تھے، بظاہر کم گو تھے مگر شعر لبریز۔ اجنبی کی صحبت سے بھاگتے تھے، شعر و ادب کی
جان ہو پاتے، کھنچ کر چلے آتے تھے۔ ایک وٹرنیری ڈاکٹر کا ملکوتی تخیل دیکھ کر عقل حیران
رہ جاتی تھی۔ شام کی صحبت میں اکثر وجدانی کیفیت رہتی تھی۔ اُن کا سرور مستعار تھا کہ مے
سیخ ان کا شعار تھا۔ یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں بادۂ حق کا جام نصیب ہوا
تھا یا نہیں مگر ان کے کلام میں تصوف کی گہرائیاں ملتی ہیں۔

ڈاکٹر سوز کا کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔ میرزا کمال الدین شیدا نے سوز کی ایک غزل کے تین شعر سناتے تھے، جو سوز نے ایک مشاعرہ میں پڑھی تھیں۔ یہ مشاعرہ میرزا کمال الدین شیدا کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ عارف نے یہ شعر "گلریز" میں نقل کر دیئے ہیں۔ مشاعرہ کی طرح تھی: ع۔

ہر رگِ گل مجھے شمشیر نظر آتی ہے

سوز کی غزل کے شعر ہیں: ؎

باغِ جنت مجھے کشمیر نظر آتی ہے ... موجِ صہبا مجھے اکسیر نظر آتی ہے

ان اشعار کے تیور قابلِ غور ہیں:

میں بھی پابند تو آئینِ وفا بھی پابند ... یہ تو زنجیر پہ زنجیر نظر آتی ہے

زندگی خط ہے، غم عنوان، مگر مطلب فوت ... یہ کسی شوخ کی تحریر نظر آتی ہے

سوز کے دو شعر اور ہیں:

دل اگر مضطر ملا قسمت میں ہوتا کچھ سکوں ... آسماں گردش میں کیوں ہے گر زمیں ساکن نہیں

بہتر تھا ٹوٹتا کسی گلچیں کے ہاتھ سے ... وہ پھول ہوں کہ شاخ پہ مرجھا رہا ہوں میں

علامہ عارف درویش عامل[1] لکھنو کے متوطن، سرینگر میں عرصہ سے مقیم ہیں، اور ان کی صحبت میں کشمیر کے بہت سے نوجوان سخن سنجوں کی تربیت ہوتی ہے۔ سری نگر میں باغ نشاط کے قریب گپت گنگا کے پاس، انہوں نے "عامل کٹیا" بنا لی تھی، جہاں شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ کشمیری کے مشہور شاعر پنڈت دینا ناتھ نادم سے جو اُردو میں بھی شعر کہتے ہیں، ان کے گہرے مراسم ہیں۔ اس صدی کے تیسرے دہے میں، ان کا کلام رسالوں اور اخباروں میں اکثر شایع ہوتا تھا۔ "مارتنڈ" کے ادبی اڈیشن کے لئے وہ اکثر لکھا کرتے تھے اور ان کے نام کے ساتھ "ماہر نفسیات" "اِنتشارالعصر"

---

[1] عامل بابا کا انتقال کئی سال پہلے ہو چکا ہے۔

اور "بانی انجمن تنقید ادب، لکھنؤ" کے القاب لکھے جاتے تھے۔ اب "عامل کٹیا" کی صحبتیں درہم برہم ہو گئی ہیں، اور دینا ناتھ نادم نے بتایا کہ اس وقت عامل جموں میں مقیم ہیں، جہاں نادم نے کی ان سے ملاقات حال ہی میں ہوئی تھی۔ عامل بڑے طنطنہ کے شاعر ہیں۔ اور ایک موقع پہ انہوں نے جگر مراد آبادی کو اپنا فرزند معنوی لکھا ہے۔

ان کی سرپرستی میں ایک محفل شعر "بزم ساغر" کے نام سے قائم ہوئی تھی، جس کے مشاعرے انہیں کی قیام گاہ پر منعقد ہوتے تھے۔ نادم، جو ساغر کے نام سے بھی لکھا کرتے تھے، ان مشاعروں میں اکثر شریک رہا کرتے تھے۔ عامل غزل کے استاد ہیں، لیکن نظمیں بھی کہتے ہیں، اور ان کی نظم پر بھی غزل کا انداز غالب رہتا ہے۔ "معمورہ ہستی" کے کچھ شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں:

کیا بتائیں گے اُسے اپنے گناہوں کا حساب
کوئی آیا بھی اگر روزِ جزا لینے کو

کشش فرط محبت سے جب آیا وہ صنم
پئے تعظیم وہیں درد اُٹھا لینے کو

جنسِ دل ان سے طلب کی تو کہا اے عامل
ذرا ٹھہرو اسے کوئی ہے گیا لینے کو

علامہ عامل کی غزل کے کچھ شعر ہیں:

ہوئی فصل نمو رخصت نہ پر وہ گلعذار آیا
خزاں کا دور گلشن میں بہ ہنگام بہار آیا

رموز داستان عشق کو سمجھا نہ وہ کمسن
میں کہتا مر گیا، لیکن نہ اس کو اعتبار آیا

حباب آسا وجود ظاہری تھا، مٹ گیا آخر
عدم سے جو بہ سوئے عالم ناپائیدار آیا

تعجب ہے کہ عامل بھی اگر روتا ہوا نکلے
کہ ہر کس بزم جاناں سے بہ چشم اشکبار آیا

عامل کی ایک نظم "نیرنگ عشق" کے عنوان سے "مارتنڈ" کے شمارہ ۲۸، جولائی ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی، جس کے ساتھ ذیلی توضیحی سرخی — "حیات خطابیہ بہ پسر معنوی جگر مراد آبادی" شامل ہے۔ اس نظم کے چند شعر ہیں:

بے خودی، اختیار کیا جاتے　　عاشقی اعتبار کیا جاتے
مشغلہ ہے یہ پختہ کاروں کا　　عشق کو خام کار کیا جاتے

ان کے چند خطوط سوالوں کے جواب کے طور پر شائع ہوئے تھے۔ ان سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے:

پرشن ــــ نتیجہ زندگی کیا ہے؟

جواب ــ نتیجہ زندگی کا آخرش ہے موت اے عاملؔ

خدا جانے کہ اپنے آپ کو میں کیا سمجھتا ہوں

عاملؔ اپنی ادبی امارت پسندی کے باعث بعض وقت نوجوان لکھنے والوں کے خلاف سخت تنقیدی لب و لہجہ اختیار کرتے تھے۔ بعض شعراء ان کے اس رویے سے ناراض ہوگئے تھے۔ اور ایک مضمون ان کے خلاف شائع کیا تھا، جس میں انہیں اپنے درویش محل میں چین سے رہنے کی صلاح دی تھی اور نوعمر لکھنے والوں پر تعریض کرنے سے احتراز کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی ایک نظم کے اشعار درج کئے تھے، جو یہاں درج ہیں:

جو صحیح ابجد نہ جانیں وہ بنے جادو نگار　　شاعری کے نام پر بیٹھے ہیں وہ کھائے اُدھار
کچھ تخلص رکھ لیا، جلدی سے بن بیٹھے سوار　　ڈٹ گئے میدان میں آ کر ہم بھی ہیں اک شہسوار

۱۹۴۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی کشمیر میں آمد کے موقع پر عاملؔ نے ایک مختصر قصیدہ لکھ کر "مارتنڈ" میں شائع کیا تھا۔ ان کے چند خطوط" اپنے پسر معنوی جگر مرادآبادی کے نام" اسی اخبار میں شائع ہوئے تھے۔ ایک خط کا اقتباس ہے:۔

" میں اپنی لنگوٹی پوشی میں چکرورتیوں کی پوشاک کا افتخار لیتے ہوئے اپنی شاہانہ خیالی کا اظہار کرتے ہوئے رائے دی

پنڈت تارا چند ترسں سالک اپنی عہد کے لکھنے والوں میں اپنی خاندانی وجاہت اور ادب دوستی کے باعث ایک امتیاز رکھتے تھے۔ ان کا خاندان کشمیر کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور اس خاندان میں علم و ادب کی روایات قدیم زمانے سے چلی آتی تھیں۔ سالک کے دادا پنڈت سہج رام ترسں، ڈوگروں کے ابتدائی دور میں فارسی کے اچھے شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ سالک کے والد پنڈت ٹھاکر ۔۔۔ بھی شعر و ادب کا مذاق رکھتے تھے۔ اپنی خاندانی روایات اور عہد کے اقتضا کے مطابق سالک نے فارسی کی تعلیم اچھی پائی تھی، اور عربی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے اور تحصیلداری کے عہدہ تک ترقی پائی۔ کچھ عرصہ وہ بلدیہ سری نگر کے کمشنر بھی رہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے وکالت شروع کی، لیکن ان کا زیادہ وقت ادبی مشاغل میں صرف ہوتا تھا۔

سالک کے مراسم اپنے زمانے کے کئی برسرآوردہ ادیبوں سے گہرے تھے۔ محمد الدین فوق سے بھی جن کا نام کشمیر کی تاریخ، تہذیب اور صحافت کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہے، سالک کے مراسم تھے۔ اپنی ایک نظم میں جو انیسویں صدی کے قومی اور وطنی احساس سے پُر ہے، سالک، فوق کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

ہیں فوق بھی سالک بھی پرستار وطن کے	کیوں اپنا وطن چھوڑ کے جائیں وہ کہیں اور

اس نظم کے اشعار قومی یک جہتی اور اتحاد کے جذبے سے مملو ہیں:

برباد کیا ہم کو فقط بغض و حسد نے	اقبال و حشم ہم سے گئے دور کہیں اور
جب پھوٹ نہ ہو ہم میں تو پھر اپنے مکاں کے	ہرگز نہیں ممکن کہ بنیں آ کے مکیں اور
اے کاش نکالے کوئی محنت سے ذرا کھوج	اس ملک کی کانوں میں ہیں دُر ثمیں اور

مناظرِ فطرت اور کشمیر کی بہار، سالک کی فکر کے لئے اکثر محرک کا کام کرتے ہیں، چنانچہ ان کی

کئی نظمیں ان موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ "گل نرگس" کے عنوان سے انھوں نے ایک نفیس نظم لکھی تھی، جس کے کچھ شعر ہیں :-

نرگس، تجھے کس کی جستجو ہے
بیمار صفت جو زرد رُو ہے
ہے کس کے فراق میں یہ حالت
ہے کون جو تجھ سے خوبرُو ہے
تجھ سے ہی ہے باغ یہ مہکتا
گلشن میں تجھی سے رنگ و بو ہے
مالک دل سے ہوا ہے مفتوں
جب سے کہ تو اس کے رُوبرو ہے

اپریل ۱۹۲۸ء میں موسم بہار کی آمد اور نوروز کی مسرت کے موقع پر انھوں نے ایک نظم لکھی تھی، جس کے دو شعر ہیں :

ہو مبارک، تجھ کو کشمیر، پھر بہار آنے کو ہے
پھر بخشش رحمت پروردگار آنے کو ہے

مست ہوں گے کشش جہت مخمور سے برنا و پیر
بے بہ ساد گی کی آنکھوں میں خمار آنے کو ہے

اسی زمانے میں انہیں خبر ملی تھی کہ چودھری خوشی خاماں کے ساتھ جو اس زمانے میں کشمیر میں برسرِ خدمت تھے۔ علامہ اقبالؔ، حفیظ جالندھری اور منشی محمد الدین فوقؔ کشمیر کی سیر کے لئے آنے والے ہیں۔ نظم میں وہ اس خبر کا خیر مقدم کرتے ہیں :

ہے مسرت یہ کہ نادار فوقؔ اقبالؔ

[illegible]

یہ موضوع اور یہی بحر سالک کو اتنے پسند تھے کہ انہوں نے کئی نظمیں اور قطعے کشمیر کی بہار پر اس بحر میں لکھے ہیں۔ اوپر کی نظم میں دو تین شعر اور خوب ہیں۔ شعر ہیں:

ظلمت شام زمستان رخصت سفر ما گئی
دلکشا صبح نسیم پُر بہار آنے کو ہے
برف باری اور یخ بندی کا دورہ ختم ہے
موسم رنگیں ادا اور سحر کار آنے کو ہے
طائروں کی خوشنوائی، آبشاروں کی صدا
باغ میں دُراج و قمری و ہزار آنے کو ہے

سالک کو تصوف سے بھی تھوڑا بہت لگاؤ تھا، اور اس میں یا تو ان کے تخلص کی رعایت تھی، یا تخلص اسی رجحان کے مدِ نظر اختیار کیا تھا۔ ایک نظم انہوں نے "ترانۂ وحدت" کے عنوان سے لکھی تھی جس میں سارے مسلکوں کا مقصود ایک ہونے کا اثبات کیا ہے، بلکہ ساری کائنات کو ایک ہی ذات کا پرتو ظاہر کیا ہے۔ نظم کے کچھ شعر ہیں:

سارے جہاں کو خالق تیری ہی جستجو ہے — راہیں جدا جدا ہیں، مقصود سب کا تو ہے
جلوے سے تیرے روشن خورشید و ماہِ تاباں — سب میں ہے تو ہی جوہر اور سب کی آبرو ہے
ہر شے میں تیرا جلوہ، ہر جا ترا تماشا — قمری میں تو ہے نغمہ، گُل میں تری ہی بو ہے
جو لوگ ہیں شراب وحدت میں مست سالک — کیا ان کو احتیاج پیمانہ و سبو ہے

سالک اچھے مضمون نگار بھی تھے اور ان کا رجحان زیادہ تر ادب لطیف کی طرف تھا۔ نوروز کے موقع پر انہوں نے "نوروز مبارک اور میرا پیغام" کے عنوان سے ایک انشائیہ لکھا تھا جس میں انہوں نے تکوین کائنات اور اس بارے میں مذاہب اور فلاسفہ کے خیالات سے بحث کی ہے۔ اور مذاہب کے بنیادی

اِتحاد پر زور دیا ہے۔ لکھتے ہیں :

" میرے خیال کے مطابق دنیا میں یا تو دو ہی مذہب ہیں یا جتنی سرشتیں ہیں اتنے ہی مذاہب ہیں۔ قسم اول میں وہ مذاہب داخل ہیں جن کا اعتقاد خدا پر ہے۔ قسم دوم میں وہ تمام خلقت ہے جن کا اعتقاد خود اپنا اپنا جدا جدا عقیدہ ہے خواہ وہ مقر بخدا ہوں یا منکرِ خدا۔"

ہندوستان کی قدیم تاریخ پر ان کا ایک مقالہ "قدیم آریوں میں جذبہ حب الوطنی" کے عنوان سے شایع ہوا تھا، جس میں آریوں کے ہندوستان میں بس جانے کے بعد اپنے نئے ملک سے ان کی محبت پر بحث کی ہے۔ مذہبی تہواروں کے موقعوں پر بھی وہ اکثر لکھا کرتے تھے۔ "شیوراتری" کشمیری پنڈتوں کا بڑا تہوار ہے کیونکہ وہ شیو مذہب کے پیرو ہیں، سالک نے اس موضوع پر مضامین لکھے ہیں۔ ان کا ایک اچھا انشائیہ ـــ "جاکو راکھے سائیاں واکو مار سکے نہ کوئی۔" کے عنوان سے شایع ہوا تھا جس میں تائیدِ ایزدی کے مقابلے میں مخالف قوتوں کی ناکامی پر زور دیا ہے۔ ان کے ادب لطیف کے طرز کے انشائیوں میں "میری پرارتھنا" دلچسپ ہے۔

فارسی سے ان کے اسلاف کو لگاؤ رہا تھا، وہ کبھی کبھی سالک کو بھی فارسی میں شعر کہنے پر اکساتا تھا۔ لیکن ہندوستان کی طرح کشمیر سے بھی، جو کبھی ایرانِ صغیر کہلاتا تھا، فارسی کا ذوق اب ختم ہو چکا تھا، اس لئے وہ مزاحیہ انداز میں "قندِ پارسی" کے عنوان سے کبھی کبھی لکھ لیتے تھے۔

امر چند ولی، سری نگر کی شعر و ادب کی محفلوں کی نمایاں شخصیت ہیں[۱]۔ ان کی ولادت ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ اور مروجہ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ سکول کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ جموں و کشمیر کے علاوہ انہوں نے سرحد، اور پنجاب میں بھی خدمت انجام دی اور سکولوں میں ڈرائنگ اور آرٹ کی تعلیم دیتے رہے۔ ان کے شعری مذاق کی تربیت اچھے سخن سنجوں کی صحبتوں میں ہوئی، موسیقی سے بھی انہیں شغف ہے شاعری کے ذوق نے انہیں اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ کرنے پر مائل کیا۔ چنانچہ غزل اور رباعی میں وہ اساتذہ قدیم کے

---

[۱] ۔ ولی کا بھی تین سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔

معیاروں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔ طبیعت کچھ قلندرانہ پائی ہے، اور کچھ تصوف سے بھی لگاؤ ہے۔ ایک رُباعی میں اپنی دلچسپیوں کے بارے میں کہتے ہیں :

سنگیت، مصوری، ویت گری کی ۔۔۔ رندی اور زاہدی، قلندری کی
ملتی ہیں جہاں یہ سرحدیں، ہوتی ہے ۔۔۔ تمہید وہاں وؔلی کی شاعری کی

وؔلی کی زندگی ناکامیوں اور مایوسیوں سے دوچار رہی۔ غم زندگی کی تلخیوں کو وہ ہنس کر جھیلنے کی کوشش کرتے رہے۔ ایک قطعے میں اپنی نامرادیوں کی طرف اسی طرح اشارہ کیا ہے :

ابتدا میں مفلسی تھی، اِنتہا میں بے کسی
درمیان مفلسی و بے کسی تھی، بے بسی
غم غلط کرنے کو ہم نے چُن لیا اُلفت کا غم
جذبۂ الفت نے آخر ہم کو بخشی بے رُخی

وؔلی کی غزل میں بیان کا لطف اور اسلوب کی خوبی خاص طور پر نمایاں ہے اور غزل کی روایت کی پابندی کے ساتھ، جدید عصر کے رجحانات کی جھلک بھی اس میں ملتی ہے۔ وؔلی کی طبیعت میں ایک دبا دبا سا مزاح بھی تھا، جو ان کی غزل کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔ ایک غزل کے شعر ہیں :

کیا بات تھی بگڑ کے یہ کیا بات ہو گئی ۔۔۔ دن وصل کا تھا، ہجر کی پھر رات ہو گئی
جمہور کی سحر سے نئی ضوفشاں کرن ۔۔۔ پھوٹی تو نذر گردش حالات ہو گئی

اے میر کاروانِ سفر، خیر اب کہاں ۔۔۔ رہزن ہی سے ہائے تیری ملاقات ہو گئی
ساقی سے آ کے کرنے گلہ رندِ مے پرست ۔۔۔ تقریب کچھ تو بہر ملاقات ہو گئی

وؔلی نے غالب کی ایک مشہور غزل کی تضمین مخمس کی صورت میں کی تھی، اس کے دو بند ذیل میں درج ہیں :۔

سوزِ غم کی ترجمانی اور ہے　　اشکِ پیہم کی روانی اور ہے

کشتۂ غم کی کہانی اور ہے　　کوئی دن گر زندگانی اور ہے

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

پھڑپھڑاتے ہی رہے ہم زیرِ دام　　اپنی قسمت میں نہ تھی پروازِ بام

زندگی کی اے ولی اب تو ہے شام　　ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

مشاہیر پر ان نظموں میں ٹیگور اور ولی اور خیام اور ولی دو اچھی نظمیں ہیں، جن میں انہوں نے ان صاحبانِ فکر و نظر پر حاشیہ آرائی کی ہے۔ پہلی نظم میں ٹیگور کی مشہور نظم کو اردو کا جامہ پہنایا ہے:

جس جگہ دِل خوف سے عاری رہے، اونچا ہو سَر

ہو جہاں آزاد علم و عقل کا سوز و اثر

کشمیر پر انہوں نے ایک اچھی نظم لکھی ہے، اور یہ اس سرزمین کے فرزند ہونے کے ناتے، ان کا ایک مقدس فرض بھی تھا۔ اس نظم کے چند شعر ہیں:

آسماں پر صبح کے تارے کا انجام خرام　　دے رہا ہے رہروؤں کو صبحِ خنداں کا پیام

کھِل رہی ہے فطرت صد رنگ کیا آئینہ دار　　کر رہی ہے گوہرِ شبنم سے پھولوں کا سنگھار

آرسی میں پھول کے ہوتی ہے شبنم جلوہ گر　　نور سے معمور ہو جاتی ہے گل کی چشمِ تر

میری آنکھوں میں ابھی ہے خوابِ غفلت کا خمار　　ہوگئی کیا وہ سحر، جس کا' ولی' تھا انتظار

ولی کے چھوٹے بھائی' دینا ناتھ المست' جو المست کاشمیری کے نام سے لکھتے ہیں' بڑے اچھے فنکار اور مصور ہیں۔ وہ کشمیری اور اردو میں شعر بھی کہتے ہیں۔ ان کے کشمیری کلام کا مجموعہ "یالہِ یپارہ" (پہاڑ کے اِس پار) کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔

اردو میں ان کی ایک نظم جو "پیام بیداری" کے عنوان سے کلچرل اکادمی کے مجموعے "وطن کی پکار" میں شایع ہوئی ہے، اس کے دو شعر ہیں:

مٹا کر چھوڑ دو باطل کو اس دنیا کے پردے سے
جوانو، حق و باطل آزمانے کا سماں آیا
مبارک جان پر جو کھیل جاتے ہیں
ہے موقعہ ہم کو بھی، جوہر دکھانے کا سماں آیا

پنڈت نند لال کول طالب، کشمیر کے اردو شعرا میں، اساتذہ کا مقام رکھتے ہیں اور ہم سے قریب تر عہد میں، وہ شعر و ادب کی فضا پر چھائے رہے، اور بہت سے نو مشق سخن سنجوں کو راہ دکھائی۔ تعلیم کے زمانے میں، منشی امیر الدین نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو پاکر ان کی ہمت افزائی کی، چنانچہ کوئی گیارہ برس کی عمر سے وہ شعر کہنے لگے تھے۔ بعد میں جب پنڈت کیفی کشمیر کی ملازمت میں منسلک ہوئے، تو طالب نے ان سے رجوع کیا، اور اس فن کے رموز سے آشنائی حاصل کی۔

طالب، کشمیری پنڈتوں کے ایک ذی اثر خاندان سے ہیں۔ ان کے جد امجد پنڈت رگھوناتھ کول کشمیر کے وزیر اعظم رہ چکے تھے، دادا دیوہ کاک کول اپنے وقت کے سربرآوردہ عالم، اچھے خوشنویس اور مصور بھی تھے۔ موسیقی میں بھی انہیں مہارت تھی۔ فارسی کے علاوہ عربی اور سنسکرت سے آگاہی رکھتے تھے۔ پنڈت طالب کے والد پنڈت ٹھاکر پرشاد کول بھی سنسکرت کے عالم اور خوشنویس بھی تھے۔ علم و ادب اور شاعری کا ذوق اس طرح طالب کو اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملا تھا، اور اس کو انہوں نے اپنے عصر کے تقاضا کے مطابق نئی راہوں پر ڈالا۔ ویرندر پرشاد سکسینہ بدایونی نے طالب کے حالات اور ان کی شاعری کے بارے میں ایک سیر حاصل مضمون "ہماری زبان" کے شمارہ ۲۲، جون ۱۹۵۸ء میں شایع کیا تھا۔

طالب نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔ اے کیا، اور اردو کے امتحانات بھی کامیاب کئے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد، وہ سری پرتاپ کالج میں اُردو اور فارسی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ پھر ترقی کرتے کرتے پروفیسر کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ کالج کی تعلیم سے اپنے طویل تعلق کے باعث، وہ سینکڑوں نوجوانوں کے ذوق کی آبیاری کرتے رہے۔ خدمت سے وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کے مشاغل جاری ہیں، چنانچہ وہ کئی ادبی اداروں کے رکن رہے، اور اس وقت کلچرل اکادمی کی جانب سے زیر ترتیب کشمیری لغت کے لئے ان کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔[۱]

طالب کی شاعری کا آغاز ان کے زمانے کے رواج کے مطابق غزل گوئی سے ہوا، ابتدائی دور کی روایتی غزل سے ترقی کرتے ہوئے، وہ عصری مذاق کے مطابق غزل کہتے رہے، اور آخری دور میں نظمیں بھی لکھیں۔ اُن کے کلام کا پہلا مجموعہ "رشحات التخییل" کوئی چالیس برس پہلے ۱۹۲۵ء میں شایع ہوا تھا اس میں غزلوں کے علاوہ مناظر قدرت پر کچھ نظمیں اور قومی اور مذہبی موضوعات پر نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس کے ستائیس سال بعد دوسرا مجموعہ "مرقع افکار" ۱۹۵۲ء میں شایع ہوا۔ اور یہ تمام تر نظموں پر مشتمل ہے۔ اس سے طالب کی شاعری کی طویل عمر اور ان کی فکر کے ارتقائی منازل پر روشنی پڑتی ہے۔

ان کی ابتدائی غزل کے کچھ نمونے ہیں:

گیا دل ہاتھ سے، اور دل مستاں کے ہاتھ کیا آیا
اڑا آنکھوں میں مطلب رازداں کے ہاتھ کیا آیا
میری آنکھوں میں حسن یار کی تصویر پنہاں تھی
تو میرے روکنے سے پاسباں کے ہاتھ کیا آیا؟

اِس غزل میں، اکبر کے انداز کے کچھ اخلاقی شعر بھی آگئے ہیں۔ مثلاً

نہ غربی بن سکا، ہاں شرقیت اپنی گنوا بیٹھا
تشنع سے بھلا ہندوستان کے ہاتھ کیا آیا

---

[۱] ۔ طالب صاحب کا ۱۹۷۱ء میں انتقال ہو چکا ہے۔

مر طالب کا اصلی میدان نہیں، حالانکہ ان کی تربیت پہلے غزل میں ہوئی تھی۔ وہ نئے عہد کے لیئے کہا اور نیا عہد نظم کا عہد ہے، اس لئے طالب کو غزل سے زیادہ نظم سے لگاؤ ہے، اور ان کی نظم ان کے دورِ سیمِ فکر کی اچھی نمائندگی کرتی ہے۔ نظم کے لیئے، کشمیر کے اس سخن سنج کے لئے اطراف میں محرکات کی کمی تھی۔ کشمیر کے حسن اور رعنائیوں پر کچھ لکھنا، گویا اس کا اولین فریضہ تھا۔ چنانچہ طالب نے کشمیر کے حسین گوشوں کے بارے میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔ "بہارِ کشمیر" اہربل کی سیر" آبشار اور میں" کشمیر کے حسن طالب کی قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ ان مناظر کا ردعمل طالب پر اپنے انداز سے ہوتا ہے۔ "بہارِ کشمیر" میں نشاط، شالامار، اور ہاروَن کے حسن اور دلکشی کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم ترکیب بند کی نظم کا آغاز شاعر کی دیرینہ آرزو کے اظہار سے ہوتا ہے:

تمنائے آرزو تھی لطف بہار دیکھوں　　کاشانہ چمن کے نقش و نگار دیکھوں

باغِ نشاط میں ہو دل کو نشاط حاصل　　تازہ نسیم ڈل ہو اور شالامار دیکھوں

نظم میں عینیت پسندی کا شائبہ پیدا ہو جاتا ہے، جب شاعر کہتا ہے:

سن جائے مجھ پہ رازِ ناروتیانہ الفت　　بلبل کے سامنے جب گل کا سنگھار دیکھوں

اسی سلسلے میں وہ منظر سرائی کرنے لگتا ہے:

چھائی ہوئی گھٹائیں گھنگور آسماں پر
برسا رہی تھیں موتی ابرِ بہار ہو کر
سروِ سہی کی شاخیں تھی جھومتی ہوا سے
یا کوئی لڑکھڑاتا تھا بادہ خوار ہو کر

مناظر کا یہ کیف، شاعر کو دو دوں بینی کی طرف مائل کر دیتا ہے اور وہ کہتا ہے:

جلوت میں نورِ کثرت، کثرت میں عینِ وحدت　　آنکھوں میں آسمائے، اغیار یار ہو کر

نقشِ دوئی مٹادوں، کثرت سے دل ہٹادوں — قدرت سمائے مجھ میں، قدرت میں میں سماؤں

غافل خودی سے رہ کر اپنا سروپ دیکھوں — وحدانیت کا نقشہ اس رنگ سے جماؤں

طالب نے قومی اور مذہبی موضوعات پر بھی کچھ نظمیں کہی ہیں، جن میں چکبست کا انداز جھلکتا ہے۔ اور یہ عموماً مسدس کی شکل میں ہیں۔ مذہبی موضوعات کی نظموں میں "سری کرشن مہاراج کی یاد" موثر پیرایہ رکھتی ہے۔ رامائن کے بعض واقعات کو بھی طالب نے منظوم کہا ہے، ان میں راون اور سیتا جی کا اس سلسلے کی اردو منظومات میں انوکھا ہے۔ "شیوراتری" پر بھی طالب نے ایک عمدہ نظم کہی تھی، جو "مارتنڈ" کے شمارہ شیوراتری (۲۹ فروری ۱۹۳۶ء) میں شایع ہوئی۔ اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

کس قدر روشن ہے اپنی آج شامِ زندگی

لائی ہے شیوراتری تازہ پیامِ زندگی

طالب نے کچھ مرثیے بھی کہے ہیں، جو جدید انداز کے مرثیے ہیں اور ان میں انہوں نے اپنے بعض دوستوں یا عزیزوں کے انتقال پر اظہارِ رنج و ملال کیا ہے۔

طالب کی تحویل شاعرانہ زندگی میں اردو نظم پر جو انقلاب آئے، ان کا عکس ان کے افکار اور اسالیب میں نمایاں ہے۔ "عالمِ مجاز" "بہار" "جلوۂ دلدار" وغیرہ اس کی اچھی مثالیں ہیں، جن میں حفیظ جالندھری کی ابتدائی نظموں کا آہنگ ملتا ہے۔ "عالمِ مجاز" پہلا بند ہے:

بہار میں شباب ہے — شباب انتخاب ہے

نظر کی آب و تاب ہے — کہ حُسن لاجواب ہے

عذاب ہے، ثواب ہے — سکون و اضطراب ہے

یہ عالمِ مجاز ہے

کہ زندگی کا راز ہے

آگے اس عالمِ مجاز کے اوصاف گنائے ہیں :

کبھی خوشی ہے دمبدم　　کبھی ہے حسرت و الم

کبھی ستم پہ ہے ستم　　کبھی ہے موجزن کرم

یہ شانِ عظمت و حشم　　یہ محفلوں میں جامِ جم

یہ عالمِ مجاز ہے

کہ زندگی کا راز ہے

"سورج کی کرن" اور "عورت" میں طالب نے مستزاد کی تکنیک آزمائی ہے۔ "مرزا غالب" اور "نور جہاں" پر ان کی نظمیں بہت مؤثر ہیں۔

طالب نے پروفیسر جیالال کول کی معیت میں للہ دید پر جو کتابچہ کلچرل اکادمی کے لئے تیار کیا ہے۔ اس میں للہ دید کے کچھ واکھ کا ان کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہے۔ کشمیری شعرا کے یادگار تذکرہ "بہار گلشن کشمیر" پر انہوں نے بسیط مقدمہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ لالہ سریرام کی "خمخانۂ جاوید"۔ انہوں نے ایک طویل منظوم تقریظ بھی لکھی ہے۔ اس تقریظ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اردو کے کم و بیش ایک سو مشاہیر کا ذکر آگیا ہے۔ یہ مثنوی کی شکل میں ہے اور اس کا آغاز ایک طرح کی تشبیب سے ہوتا ہے، پھر تذکرہ کا حال اس طرح لکھا ہے کہ گویا وہ ایک محفل ہے، جس میں :

کہیں کرسی نشیں تھے میرؔ و سوداؔ

کہیں سوزؔ اور جراتؔ، دردؔ و انشاؔ

کہیں تھے حاتمؔ و تاباںؔ و ناسخؔ

کہیں مومنؔ، اسیرؔ و برقؔ و راسخؔ

طالب کے تنقیدی مضامین بھی رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون "علامہ کیفی دہلوی

کی یاد میں" کے عنوان سے "شیرازہ" (جنوری ۱۹۶۲ء) میں شایع ہوا تھا۔ اس مضمون میں علامہ کیفی سے اپنے مراسم اور ان کی اصلاحوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مضمون استاد کے ساتھ ان کی عقیدت مندی کا آئینہ دار ہے اور کیفی کے ادبی مزاج کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس میں طالب کے نام کیفی کے لکھے ہوئے خطوط بھی شامل ہیں۔

رسا جاودانی جو کشمیر کے اردو شعراء میں اساتذہ کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ بھدرواہ کے متوطن ہیں، جو کشتواڑ کی طرح ایک چھوٹی سی خوبصورت وادی ہے۔ خواجہ عبدالقدوس ان کا اصلی نام ہے، لیکن اب نام کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ ان کے جد بزرگوار خواجہ احمد، سکھوں کے عہد حکومت میں، ترک وطن کر کے بھدرواہ چلے گئے تھے۔ رسا کے والد خواجہ منور تجارت کرتے تھے، لیکن فارسی علم و ادب کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ رسا کی تعلیم انہیں کے پاس ہوئی۔ بعد میں انہوں نے ذاتی مطالعے کی مدد سے، پنجاب یونیورسٹی کا منشی فاضل ۱۹۲۶ء میں کامیاب کیا، اور والد کی تجارت میں پے در پے آتش زدگیوں کی وجہ سے نقصان آنے کے بعد انہیں، سکول کی ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ بھدرواہ کے ہائی اسکول میں عرصہ تک تعلیم دیتے رہے اور اب ملازمت سے سبکدوش ہو کر، علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

گھر کے علمی ماحول کی وجہ سے رسا کو شعر و سخن کا ذوق بچپن ہی سے پیدا ہو گیا تھا، بھدرواہ میں کوئی استادِ فن میسر نہیں آسکتا تھا، ذوقِ خداداد کے سہارے انہوں نے اتنی مشق بہم پہنچائی کہ اب کشمیر کے سر برآوردہ شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ کلام کے ۲ مجموعے اب تک شایع ہو چکے ہیں، جن میں سے پہلا مجموعہ "لالۂ صحرا" کے نام سے ۱۹۴۸ء میں چھپا تھا اور دوسرا مجموعہ "نظم ثریا" ۱۹۶۲ء میں شایع ہوا۔ اس پر مشہور ادیب اور محقق، ڈاکٹر زور کا مقدمہ بھی شامل ہے، جو اُس زمانے میں کشمیر یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو تھے۔

رسا نہایت سادہ طبیعت کے انسان ہیں، اور یہ سادگی ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کے ایک نقاد، اللہ رکھا ساغر نے ان کی شاعری کے اس مخصوص پہلو کی طرف اس طرح

اِشارہ کیا ہے :-

"لالۂ صحرا کے مصنف نے جس دنیا میں آنکھ کھولی، اور پرورش پائی، اِس میں کوئی پیچ و خم نہیں، بناوٹ نہیں، پرکاری نہیں اور یہی ماحول ان کی شاعری پر بھی چھایا ہوا ہے۔"

اللہ رکھا ساغر، جو اے۔آر۔ساغر کے نام سے لکھتے تھے، جموں کے صاحبِ ذوق ادیب، شاعر اور ماہرِ صحافت تھے۔ ان کا حال پچھلے صفحات پر قلمبند ہوا ہے۔

غزل سے رسا کو طبعی مناسبت ہے، اور اسی صنف میں ان کی طبیعت کے جوہر نمایاں ہوئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بحریں، انہیں مرغوب ہیں، اور اپنے سادہ اندازِ اظہار میں، وہ میر تقی میر جیسا اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی غزل کا ایک اور نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں رومانیت کم، لیکن غور و فکر کی پرچھائیں زیادہ نمایاں ہیں۔ مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو :-

بے یقینی ہے سستی ایماں   ضعف اوہام کا سہارا ہے
تیری فرقت میں تجھ سے ملنے تک   تیرے پیغام کا سہارا ہے
میکشوں کو فلک کی گردش میں   گردشِ جام کا سہارا ہے

ایک اور غزل کے چند شعر ہیں :-

جو اثر آگ پر ہے پانی کا   وہی دشمن پہ مہربانی کا
ایک جھونکا ہوا کا آ گذرا   کیا یہی عہد تھا جوانی کا
ہے غنیمت اگر میسر ہو   ایک لمحہ بھی شادمانی کا
گنجِ بے فیض ریت کا ساگر   جس سے قطرہ ملے نہ پانی کا
وہ کمربستہ ہیں ستم پہ رسا   حوصلہ مجھ کو سخت جانی کا

رسا کے تغزل میں بھی ایک مخصوص انفرادیت ہے۔ جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوگا۔

جو عشق قرین ہوش رہا، وہ عشق کی دنیا کیا جانے

جو قیس کبھی مجنوں نہ بنا، وہ الفت لیلیٰ کیا جانے

جو تنگ نظر کم ظرفی سے قطرہ کو سمندر کہتا ہو

قلزم کی حقیقت کیا سمجھے وہ وسعتِ دریا کیا جانے

ان کی بعض غزلوں میں تنظم کا سا تسلسل پایا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں، جو زیادہ تر مناظرِ قدرت سے متعلق ہیں۔ ان میں "بیتے دنوں کی یاد" اور "ساون" پاکیزہ نمونے ہیں۔ "ساون" کے دو بند[۲] ذیل میں درج ہیں۔ اپنے عہد کی نظم نگاری کی جھلک موجود ہے:۔

کیا رنگ ہیں گلوں کے نغمے ہیں بلبلوں کے

قمری کی کُو

حق سرہ ہو

ہے تو ہی تو

ہر سو ہے خوشنوائی ساون کی رُت ہے آئی

اے دل جلے پپیہے بے چین میرا جی ہے

تو کیں تیری

ہو کیں تیری

ہے تو ہی تو

ہر سو ہے خوشنوائی ساون کی رُت ہے آئی

کِشن سمیلپوری، متنوع دلچسپیوں اور صلاحیتوں کے شاعر اور ادیب، جموں کے موضع

سے اٹھے۔ ان کی پیدائش کا سنہ ۱۹۰۱ء ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے موضع میں پائی۔ پھر جموں آگئے، جہاں ان کے چچا پنڈت آگیا رام سپرانٹنڈنٹ محکمہ تواضع کی نگرانی میں ان کی تعلیم اور تربیت ہوئی۔ بچپن سے انہیں شعر و موسیقی سے دلچسپی رہی۔ چنانچہ اپنے بچپن کی دلکشیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مقام پر انہوں نے لکھا ہے:

"چار پانچ سال کی عمر میں، جس وقت گاؤں کے مراثیوں کے گھر میں سارنگی کے لہرے فضا میں موسیقی کا رس گھولنے لگتے، طبلے کی تھاپ پر کسی کے پاؤں کے گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دیتی تو میں بھاگ کر، ان کے گھر جا پہنچتا اور اس وقت تک وہاں سے نہ اٹھتا، جس وقت تک وہاں رقص و نغمہ کی وہ مشق جاری رہتی۔"

جب کشن سن شعور کو پہنچے، جموں شعر و سخن کے ذوق اور علم و ادب کے چرچوں کے سبب لاہور ثانی بنا ہوا تھا۔ اس کی تھوڑی بہت تفصیل خود کشن نے اس طرح بیان کی ہے:۔

"مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں، جموں میں بڑے دھوم دھام کے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ خلد آشیانی حکیم مولوی فیروز الدین احمد فیروز طغرائی امرتسری، پنڈت نرنجن داس غبار، میرزا مبارک بیگ مبارک، لالہ متھرا داس وکیل، قمر قمرازی، ڈاکٹر عماد الدین سوز، ڈاکٹر قیس، پنڈت وشوناتھ درماہ، غلام حیدر چشتی، لالہ منوہر لال دل، سیوک رام باقر اور ان کے علاوہ بیسیوں شعرائے کرام مشاعروں میں شرکت فرماتے تھے۔"

اپنی شاعری کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انہیں بلند پایہ شعراء کے سامنے میں نے بھی ایک طرحی غزل پڑھنے کی حماقت کر ڈالی۔ میرے ہر شعر پر سامعین ہنستے تھے، لیکن اس غزل میں ایک شعر صحیح بھی تھا اور وہ شعر تھا:۔

نبھا کر زندگی کا اور نفس کا تار توڑ

حشر میں مل لیں گے لکھا ہے اگر تقدیر میں

یا شعری کہہ "انشرقی" سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اس شعر کی خوب داد دی اور کہا "ایسے مشاعرے میں پڑھنے سے پہلے ہی تم ہمیں دکھا لیا کرو۔"

اسے العرابی سے کرشن کے تلمذ کا آغاز اس طرح ہوا — استاد کی تربیت سے انہیں شعر کے فن اور اس کے بحث فہم کی پرکھ ہوئی۔ جب حکیم طغرائی امرتسر چلے گئے تو کرشن اپنا کلام پنڈت ہرکشن لال حبیب کو دکھانے سے رفتہ رفتہ ان کی مشق اتنی پختہ ہو گئی کہ وہ معرکے کے مشاعروں میں اپنا کلام سنانے اور داد حاصل کرنے لگے۔ اس طرح کے ایک مشاعرے کا تذکرہ کشن نے کیا ہے، جو لالہ سریرام مرتب "خمخانہ جاوید" کی کشمیر میں آمد پر سری پرتاپ کالج سری نگر میں منعقد ہوا تھا۔

ان کی آمد پر سری پرتاپ کالج میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا، مشاعرہ میں جموں و کشمیر کے ہر پایہ، ادبا، شعرا اور اہلِ ذوق حضرات نے شرکت فرمائی۔ خلد آشیانی چوہدری خوشی محمد اور سرگیہ علامہ دتاتریہ کیفی ایسے اُستادانِ فن کے علاوہ اس وقت کے منسٹر اور جج ان ہائیکورٹ بھی مشاعرہ میں رونق افروز تھے۔ مشاعرہ چوہدری خوشی محمد ناظر کی صدارت میں شروع ہوا۔ میں نے بھی مشاعرہ کے دونوں مصرعہ ہائے طرح پر غزلیں پڑھیں اور بہت پسند کی گئیں۔"

ایسے معرکۃ الآرا مشاعروں میں داد ملنے سے کرشن کی خود اعتمادی کا احساس ہونا شروع ہونے لگا۔ کہا جانے لگا کہ وہ ریاست کے سربرآوردہ مشاعروں میں شمار ہونے لگے :-

نذ جمیل پوری کو صحافت سے بھی دلچسپی رہی۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دو ماہنامہ "جنت" کے بجائے جاری کیا تھا، لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا۔ اور انہوں نے

لالہ ملک راج صراف کی شرکت میں جموں سے ایک ہفتہ وار "شیر" جاری کیا۔ اس میں بھی انہیں بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی تو پھر خود اپنا اخبار "ویر" ہفتہ وار نکالتے رہے۔ یہ اخبار بھی کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ریڈیو کشمیر سے منسلک ہو گئے۔

کشن کی ذہانت، غزل اور نظم دونوں میں یکساں رواں ہے۔ بلکہ شعر میں وہ خود اپنے ذہن سے نئے نئے اسالیب اور موضوع پیدا کرتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر ہیں:

تیری بزم میں ماہ وش کبھی چند لمحے گذر گئے
تو مرا نصیب چمک اٹھا مرے دن سدھر کے سنور گئے

کہیں دیر و کعبہ کے درمیاں کوئی اک حسین مقام تھا
وہاں رقص تھا، وہاں جام تھا، وہیں جا کے ہم بھی ٹھہر گئے

وہ نظر بچا کے نکل گئے، جنہیں جوشِ مستی پہ ناز تھا
مری مے پرستی کو دیکھ کر، جو نشے چڑھے تھے، اتر گئے

مجھے مل گیا وہ نقشِ پا وہیں اے کشن پڑا رہا
سرِ راہ سینکڑوں کارواں مرے سامنے سے گذر گئے

کچھ اور غزلوں کے اقتباسات ہیں:-

تاروں کو جو دیکھا تو ہوا مجھ کو یقیں اور
ان سا کوئی مہ وش نہیں بر روئے زمیں اور

تیرا عہدِ ستم ہی اگر استوار ہوتا
مرا ہر اداس لمحہ طرب آشکار ہوتا

مرے مطلع یقیں پر کبھی تیرگی نہ چھاتی

جو کبھی کبھار ہی تو کہیں جلوہ بار ہوتا

کرشن کو جہاں اپنے وطن، "ڈگر دیس" سے عشق ہے، کشمیر کے حسن اور اس کی رعنائیوں سے بھی ان کی فکر الہام حاصل کرتی ہے۔ ڈگر دیس پر انہوں نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ایک سچے محب وطن کی طرح، ان کی نظر ڈگر دیس میں وہ سارے حسن دیکھتی ہے، جو اوروں کو نظر نہیں آسکتے۔ ان کی نظم "میرا وطن ڈگر" اس موضوع پر کہی ہوئی نظموں میں، امتیاز رکھتی ہے۔ اس نظم کا اقتباس درج ذیل ہے:

توصیف سے بالا ہے، یہ خطۂ خوش منظر

رہتی ہے خجل اس سے رعنائی ہر کشور

ہر موج ہوا، اس کی ہے موج مئے کوثر

انداز فضا کے ہیں، کیف آور و جاں پرور

ہر ناز دل افزا ہے، ہر ایک ادا دلبر

ہٹتی ہی نہیں اس سے، اٹھے جو نظر اس پر

فردوس سے بڑھ کر ہے

یہ میرا وطن ڈگر

ڈگر دیس کے ساتھ ڈوگرا حکمرانوں کے حکمرانوں سے بھی انہیں بڑی محبت اور عقیدت رہی ہے، چنانچہ گلاب سنگھ، رنبیر سنگھ، پرتاپ سنگھ اور ہری سنگھ پر انہوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ اپنے گاؤں سمیل پور کو بھی وہ نہیں بھول سکتے، جہاں ان کا بچپن گذرا، اور جس سے ان کی بہت سی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ سمیل پور پر کرشن نے جو نظم لکھی ہے، اس کا ماحصل یہ مصرعہ ہے۔ ع

سو جان سے عزیز ہے، مجھ کو سمیل پور

کشمیر کے بارے میں بھی کرشن نے کئی دلکش نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں میں " اے وادی کشمیر" " نغمہ کشمیر" اور "مکتوب کشمیر" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "مکتوب کشمیر" میں، وہ اہلِ نظر کو دعوت دیتے ہیں:

اگر تم نے کبھی فردوس کا نقشا نہیں دیکھا
لب تسنیم و کوثر، حور کا جلوہ نہیں دیکھا
اگر جنت کے پھولوں کا حسین دستہ نہیں دیکھا
اِرم کی وادیوں میں دودھ کا دریا نہیں دیکھا
تو میرے دوست، کچھ دن کے لئے کشمیر آجاؤ!

اگر تم شاہکار دست قدرت دیکھنا چاہو
اگر روئے زمیں پر باغ جنت دیکھنا چاہو
اگر کانٹوں میں بھی پھولوں کی نکہت دیکھنا چاہو
اگر ذرّوں میں بھی نورِ حقیقت دیکھنا چاہو
تو میرے دوست، کچھ دِن کے لئے کشمیر آجاؤ!

اگر دِل میں وقارِ ملک و ملت سے عقیدت ہے
اگر سچ مچ تمہیں تعمیر نو سے کچھ محبت ہے
اگر جذبہ ترقی کا، تمہیں وجۂ مسّرت ہے
اگر یہ دیکھنا ہو، ہمتوں میں کتنی طاقت ہے
تو میرے دوست، کچھ دن کے لئے، کشمیر آجاؤ!

" وادی کشمیر" میں کرشن کی شاعری کی ساحری، ترتیب، تکمیل اور ترنّم کے اعتبار سے اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ اس نظم کا ایک بند ہے:

بہتی ہوئی ندیوں کے فسوں کار سے نغمے　　سرشار سے نغمے
پُرکیف فضاؤں میں طرب بار سے نغمے　　بیدار سے نغمے
سنگیت کی دیوی کے ہر اک نغمے کی تفسیر　　اے وادیٔ کشمیر

تخلیقی شاعری کی طرح مرقع نگاری اور بیانیہ پر بھی انہیں یکساں قدرت ہے۔ نشاط باغ میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی ایک بستانی پارٹی کا نقشہ وہ اس طرح کھینچتے ہیں:

آخری تختے پہ اک ٹی پائی کا انتظام
دید کے قابل تھا یہ شاہانہ حُسنِ اہتمام
شامیانوں کی وہ رونق، کرسیوں کی وہ قطار
پُرتکلف نعمتوں کا تھا نہ کوئی بھی شمار
دیدنی، میزوں پہ گلدستوں کی جاں پرور بہار
صاف مثلِ آئینہ ہر ایک طشت زر نگار
ساغروں میں لے رہی تھی دخت رز انگڑائیاں
راہ میں آنکھیں بچھائے، منتظر تھیں کرسیاں

کرشن کی وطنی اور ملی نظموں کا مجموعہ "فردوس وطن" کے عنوان سے ۱۹۶۱ء میں شایع ہوا تھا، جس میں اڑتالیس نظمیں شامل ہیں۔ ان کی غزلوں کا بھی ایک مجموعہ مرتب ہوا ہے، جو "فردوس خیال" کے نام سے موسوم ہے۔ ان کی فکر کے سوتے ابھی بند نہیں ہوئے ہیں۔ اور ان کی غزلیں اور نظمیں رسالوں میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔

پنڈت دینا ناتھ چکبن مست، کشمیر کے ایک کہنہ مشق سخن سنج ہیں، جنکی ولادت ۱۹۰۲ء میں اننت ناگ، اسلام آباد میں ہوئی۔ ان کے والد پنڈت آنند رام چکبن، مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے

پرائیویٹ سیکریٹری رہ چکے تھے مست نے سری نگر میں تعلیم پائی اور انٹرنس کا امتحان کامیاب کیا۔ اُن کا اُردو اور فارسی کا مُطالعہ وسیع ہے۔ شاعری سے انہیں فطری لگاؤ ہے، اور نوعمری سے شعر کہنے لگے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں ان کا تعارف پنڈت کیفی سے ہوا، اور اپنے کلام کی اصلاح کے لئے ان سے رجوع کیا۔ قومی جوش اور خدمت کا جذبہ ان میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہے۔ کچھ عرصہ تک وہ رسالہ "صبحِ کشمیر" لاہور کے مدیر بھی رہے۔ لاہور سے لوٹنے کے بعد تجارتی کاروبار میں لگ گئے۔ لیکن اس وقت وہ امریکن ایمبیسی میں مُلازم ہیں۔

مست غزل اچھی کہتے ہیں۔ ان کی نظمیں بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ کشمیر کے مشہور مقامات پر مست نے کبھی کئی نظمیں لکھی ہیں، جن میں "کھیر بھوانی کے چرنوں میں" ایک خصوصیت رکھتی ہے۔ کھیر بھوانی جن کا مندر سری نگر سے کچھ فاصلے پر تولہ مولہ میں ایک مشہور تیرتھ ہے۔ مست کے عقیدت مندانہ جذبات سے نظم بھرپور ہے کہتے ہیں:

یہ معبدِ حقیقت ـــــ یہ خاکِ نور ساماں ـــــ یہ جلوہ گاہِ فطرت ـــــ یہ ارضِ طور ساماں

آئینۂ ازل ہے تنویر بخشِ عالم	آبِ حیاتِ ابدی امرت کا چشمۂ تر
ہر قطرہ اس کا حوروں کی آنکھ کا ہے تارا	درِ عدن سے بھی ہے تابندگی میں بڑھ کر
سیّال ہو کے شاید اُترا ہے ماہِ کامل	یا آ گیا زمیں پر جنت سے حوضِ کوثر
صبر و سکوں رزکا اس کی فضا کا حاصل	جوشِ بہارِ جنت گلہائے تر سے پیدا

اس نظم کے چار بند ہیں اور ان میں اشعار اور مصرعوں کی ترتیب مخصوص ہے۔ ان کی دوسری قابلِ ذکر نظموں میں "سنہری جمنا" "جلوہ زار ڈنڈک" اور "دِل کا پجاری" بھی شامل ہیں۔ مست نے کئی قومی اور وطنی نظمیں بھی لکھی ہیں، جن میں وطن کی ترقی اور خوش حالی کی خواہش نمایاں ہے۔ سماجی شعور، مست کی نظموں کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اِس سلسلے میں ان کی نظم "فُغانِ بیوہ یا ماتمِ شوہر" بہت مؤثر انداز رکھتی ہے۔

مست کی غزل رومانی ہے اور اس میں ایک شخصی لے کا احساس ہوتا ہے۔ ایک غزل "عقیدت کے موتی" کے عنوان کے ساتھ لکھی گئی ہے، اس کے چند شعر ہیں :

بہت صدمے سہا کرتا ہوں میں تیری محبت میں
رہینِ گریۂ پیہم رہا کرتا ہوں خلوت میں
چراغِ برق کی صورت دھواں اٹھتا نہیں لیکن
سراپا داغِ دل سے جل اٹھا ہیں سوزِ الفت میں
تری مُرلی کا نغمہ گونجتا رہتا ہے کانوں میں
نظر آتا ہے تیرا روپ اب ہر ایک صورت میں

ایک اور مختصر رواں بحر میں لکھی ہوئی غزل کے چند شعر ہیں یہ :

کیوں کس کے لئے تو روتا ہے	ہار موتی کے کیوں پروتا ہے
یاس و حرماں، جنوں و رسوائی	عشق میں بس یہی تو ہوتا ہے
مست سمجھتا ہے زندگی جس کو	موت اس کا مآل ہوتا ہے

پنڈت چکبست پر مست نے ایک عمدہ نظم کہی تھی جس کا عنوان "آہ چکبست" ہے۔ نظم میں شاعر نے اپنے ہم وطن ہم نوا کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے :

آہ، اے چکبست، اے روحِ روانِ شاعری	ہو گیا خاموش تو، اے نغمہ خوانِ شاعری
تیری خاموشی سے اب اے عندلیبِ نغمہ زن	ہو گئی رخصت بہارِ بوستانِ شاعری
تیرے اک اک شعر میں پنہاں تھا پیغامِ عمل	تیرا اک اک لفظ تھا گویا کہ جانِ شاعری
نوگر حبِ وطن تھا، عاشقِ زارِ وطن	تیرے شعرِ تر سے تھا سرسبز گلزارِ وطن

مست کی اساتذہ قدیم کے انداز میں کہی ہوئی ایک نفیس غزل کے چند شعر ہیں :

مجھ کو کرے گی ان سے کیا گردشِ آسماں الگ
دور نظر سے ہوں تو ہوں، دل سے ہیں وہ کہاں الگ

کتنی جنونِ عشق میں کی ہیں قبول زحمتیں
منتِ پاسباں الگ، سجدۂ آستاں الگ

تجھ کو سمجھ سکے بھی کچھ نہ سمجھ سکا کوئی
دونوں جہاں میں تو نہاں، پھر بھی ترا جہاں الگ

کوئی سما سکے گا کیا دیر و حرم کی قید میں
ٹھہرے جو لامکاں کوئی اس کا ہو کیوں مکاں الگ

جھکائے سر کو کیا دیر و حرم کے سامنے
بندۂ لامکاں ہے وہ، دکھتا ہے آستاں الگ

ان کی ایک بہترین نظم "سچی خوشی کہاں ہے" کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ شاعر خوشی کی تلاش کرتا ہوا پھرتا ہے ہر نسخے کو آزماتا ہے، سوال کرتا ہے:

بہت کیا شے ہے وہ جس میں ہے نہاں سچی خوشی
وسعت ارض و سما میں ہے کہاں سچی خوشی

سچی خوشی   دل میں نظر آتی ہے اور نہ تنہائی کر وصلِ محبوب میں۔ جب سارے ارض و سما کو سوں کر مایوس ہو جاتا ہے تو اس کے دل پر القا ہوتا ہے:

عارف کا اس کے قلب پر سکوں میں ہے نہاں
طفلکِ معصوم کے شیریں تبسم میں عیاں

شیوراتری کے موقع پر اکثر پنڈت شعرائے خشوع و خضوع سے نظمیں کہی ہیں۔ کچھ اقتباسات ان نظموں

کی پچھلے صفحوں میں نقل کی جا چکی ہیں۔ مستت کی نظم ان میں اپنے اظہار کے سڈول پن کے سبب قابل مطالعہ ہے۔ ان نظموں کی بڑی خصوصیت ان کا مثالی کشمیری پس منظر ہے۔ مستت کا پہلا بند یہ ہے:

ضو فگن ہے کوہ اک دُنیائے محشر سے پرے
آسمان سے دور مہر و ماہ و اختر سے پرے
دامن کہسار رنگیں دور تک پھیلا ہوا
فرش پا انداز بن کر ہے فلک پھیلا ہوا
برف سیمیں سے سراسر یہ تجلی زار ہے
ذرّۂ خورشید دُر نخشِ انوار ہے

برف پر آس جمائے اک خدائے نور ہے
جس کا پرتو دونوں عالم سے بھی پڑتا دور ہے
پیکر تنویر آگیں سے ہیں جلوے آشکار
ہے سراپا نور افگن، نور گستر، نور بار
آؤ اب سمجھائیں یہ تو مستت، بھولا ناتھ ہیں
سارے جگ سے دُور ہو کر سارے جگ کے ساتھ ہیں

"سنہری جمنا" بھی مستت کی اچھی نظموں میں سے ہے۔ اس نظم کا پہلا بند یہ ہے:

وہ شام دلنما ہوئی خموشی ہر نوا ہوئی
چشمک سے صبا ہوئی
شفق کا غازہ اُڑ گیا وہ شمس کی ضیا گھٹی

وہ رنگ تازہ اڑ گیا　　وہ شوخیٔ ادا مٹی

خوشا ظہورِ حق ہوا　　طلوع نورِ حق سے ہوا
گگن کا ابر شق ہوا
کسی کی ضو سے نگر بسر　　خلائیں جھلملا اٹھیں
چمک اٹھے ہیں بحر و بر　　فضائیں جگمگا اٹھیں
جھلک رہے ہیں خشک و تر
چمن ہے ایک دودِ زر
علاوہ اسکو اوج ہے　　سنہری موج موج ہے

خموشی نے کی ترجمانی کسی کی
زباں بن گئی بے زبانی کسی کی

اسی زمین میں شایق کاشمیری کی بھی ایک غزل ہے۔ یہ غزلیں دراصل اس حلقہ شعرائے کے مشاعروں کے لئے کہی گئی تھیں، جو بزم ساغر کے نام سے قائم تھی اور اس کے سرگرم ارکان میں مست شائق کے علاوہ دینا ناتھ نادم کاشمیری بھی تھے۔ پنڈت لسہ کول شایق بارہ مولہ کے رہنے والے ہیں۔ وہ غزل، رباعی، نظم، ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ مذکورہ بالا زمین میں ان کی غزل کے دو شعر ہیں:

دعا ہے تیری یاد کی خامشی میں　　مرے اشک لکھ لیں کہانی کسی کی
کریں کیوں نہ قربان قدموں پہ دل کو　　جوانی بھی اور خوش بیانی کسی کی

ایک اور غزل کے شعر ہیں:

تیری غمخواری عجب ہے محتسب
مجھ کو بھی ہونا تھا رسوا ہو گیا

واکہیں شایق نہ ہو چاک قبا
لوگ سمجھیں گے یہ چھیلا ہو گیا

شایق نے کئی رباعیاں اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان ایک نظم جو "حیات" کے عنوان سے (۱۹۳۶ء) میں شایع ہوئی تھی، اسکے دو شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں:-

دل اپنا دور رکھتے ہیں ہم بغض و عداوت سے
کوئی آئے نہ آئے پیش آتے ہیں محبت سے

غنیمت جانئے لمحے جو ہم کو ہاتھ آتے ہیں
یہ منزل زندگی کی طے بھی ہو جائے سلامت سے

میرزا کمال الدین شیدا کشمیر کے عالموں اور ادیبوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیدا کے اسلاف میں میرزا اسعد الدین سعد کا ذکر گذر چکا ہے، جو مولانا شبلی کے دوست اور اردو کے شاعر تھے۔ شیدا کے والد میرزا جلال الدین میرزا فارسی کے اچھے شاعر تھے، جنکی کچھ غزلیں اور ایک مثنوی "حسن و گوہر" موجود ہے۔ یہ مثنوی نظامی کی "خسرو شیریں" کے اتباع میں لکھی گئی ہے۔ میرزا کمال الدین شیدا کے ادبی ذوق کی نشو و نما میں میرزا اسعد الدین اور ان کے رفقا، منشی سراج الدین احمد خان، چودھری خوشی محمد ناظر، پنڈت تارا چند ترسل کی صحبتوں کے اثر اور مولوی امیر الدین امیر کی تربیت کو بہت دخل رہا۔

میرزا شیدا کے مورث اعلیٰ میرزا قاسم بیگ، ترکستان کے عمایدین میں سے تھے، جو ۱۰۵۵ھ میں ترک وطن کرکے ہندوستان آئے تھے اور شاہجہاں کی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کے فرزند،

میرزا عنایت اللہ بیگ ۱۰۶۸ھ میں شاہجہاں کے ہمراہ کشمیر آئے اور یہاں کی آب و ہوا سے متاثر ہو کر یہیں اقامت گزین ہو گئے۔ میرزا عنایت اللہ بیگ کے پوتے میرزا احمد فارسی کے اچھے عالم تھے، اور سکھوں کے آخری زمانے میں وہ کشمیر کے وقایع نگاری کی خدمت پر مامور ہو گئے تھے۔ گلاب سنگھ کے زمانے میں بھی وہ اس خدمت پر بحال رہے۔ انگریزی حاکموں سے اُن کے اچھے تعلقات تھے، میرزا احمد کے پانچ فرزندوں ـــــ میرزا سیف الدین، میرزا غلام محی الدین، میرزا عزیز الدین، میرزا قمر الدین اور میرزا بدر الدین میں سے پہلے تین نے بعد دیگرے، وقایع نگاری کی خدمت انجام دیتے رہے۔ میرزا سیف الدین فارسی کے اچھے ادیب تھے۔ اور ۱۸۵۹ء میں کشمیر کی ایک تاریخ "خلاصۃ التواریخ" کے نام سے لکھی تھی۔ ان کا ایک اور کارنامہ ڈوگرا حکمرانوں گلاب سنگھ اور رنبیر سنگھ کا روزنامچہ ہے۔ جو گیارہ بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ میرزا محی الدین کے فرزند میرزا سعد الدین تھے۔ شیدا کے والد میرزا جلال الدین، میرزا بدر الدین کے فرزند تھے۔

میرزا شیدا کی ولادت ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ فارسی میں ان کی تربیت، اس عہد کے مشہور عالم، میرزا غلام مصطفیٰ کے یہاں ہوئی تھی۔ سکول کی تعلیم کے زمانے میں، ان کے استاد لطیف داد خان اردو اور فارسی شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ جس کا شیدا پر بھی اثر پڑا۔ سری پرتاپ کالج میں ان کے استاد، پروفیسر اسحاق علی بھی شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتے تھے، اور انہیں کی صحبتوں سے شیدا کو شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ غزل کہنے لگے اور اس زمانے میں کہی ہوئی غزلیں کالج کے رسالے "پرتاپ" میں شایع ہوتی رہی ہیں۔ کالج کے اساتذہ میں پروفیسر اسحاق علی کے علاوہ اور بھی کئی صاحب ذوق اساتذہ موجود تھے۔ جن میں لطیف الرحمن ناز، چونی لال تلوار، سردار محمد میر اور کالج کے پرنسپل پنڈت اقبال کشن ترپاٹھی خاص قابل ذکر ہیں۔ کالج کے باہر کے سخن سنجوں میں مولوی امیر الدین کی بہت شہرت تھی۔ شیدا انہیں سے مشورہ کرنے لگے۔

۱۹۲۰ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد، حکومت نے بلدی نظم و نسق کی تربیت کے لئے ان کا انتخاب کیا۔ چنانچہ ہندوستان کے کئی شہروں میں رہ کر، انہوں نے بلدیات کی تربیت حاصل کی اور کشمیر لوٹنے

کے بعد سری نگر میں وارڈ افسر مقرر ہوئے۔ ورترقی کرتے کرتے ڈائریکٹر لوکل باڈیز ہو گئے۔ ۱۹۵۸ء میں حکومت نے ان کے علمی اور ادبی ذوق کے مد نظر کلچرل اکادمی کا معتمد منتخب کیا۔ اس تعلق سے ملک کے علمی اور ادبی حلقوں سے قریبی رابطہ پیدا کرنے اور ریاست کے ابھرتے ہوئے ادیبوں میں ذوق کو ابھارنے کے مواقع مل گئے۔ اس وقت وہ ادبی قومی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان کا خاندانی کتب خانہ بہت وسیع نہ ہو، لیکن قیمتی مخطوطات اور خطاطی کے نمونوں کی بدولت قابل قدر بن گیا ہے۔

شہید کو غزل سے زیادہ لگاؤ رہا۔ لیکن جدید عہد کے تقاضوں نے ان سے اچھی اچھی نظمیں بھی کہلوائی ہیں۔ ان کی دو طویل نظموں کا ذکر صاحب زادہ عبدالرحمٰن ذکی کے بیان میں کیا جا چکا ہے۔ پہلی نظم جو انہوں نے "احساسِ منظر" کے عنوان سے کہی تھی، اس میں کشمیر کے کوہسار کے پس منظر میں صبح کا سماں پیش کیا ہے۔ اس نظم کی ابتدا کے کچھ شعر ہیں:۔

صبح کا دلکش سماں یہ کوہسار
آب جو، صحنِ چمن، صورت ہزار
بدلیاں چھائی ہوئی کہسار پر
ابرِ رحمت خیمہ زن گلزار پر

نغمہ زار بلبل ہے اور گل محوِ خواب
بج رہے ہیں ہر طرف ساز و رباب
آج سازِ درد پر گاتا ہے کون
یوں چمن والوں کو تڑپاتا ہے کون

اس کی ہم آہنگ ہے اک آبجو نازنین، سیمیں بدن، شیریں گلو

آگے اس آبجو کی خوبیاں بیان کی ہیں :-

آتی ہے رقصاں فراز کوہ سے ۔۔۔ مضطرب فرط غم و اندوہ سے

خفتہ ساحل کو جگا دیتی ہے یہ ۔۔۔ آگ پانی میں لگا دیتی ہے یہ

عشق سے آباد اس کا سینہ ہے ۔۔۔ چشم بینا کے لئے آئینہ ہے

اس نظم کا آخری شعر ہے :-

اس کے پنہاں سوز میں سازِ حیات

اہلِ بینش کے لئے رازِ حیات

شیدا انہیں خیالات نے ذکی درون بینی پر مائل کیا تھا ، اور ان کے تاثرات "سوز منظر" میں ظاہر ہوئے ، جن کے اقتباسات نقل کئے جا چکے ہیں ۔ ذکی کی نظم کو پڑھ کر ان کے دل میں جو خیالات اُبھرے انہیں "ماحصل منظر" کے عنوان سے شیدا نے نظم کیا ہے ، اور ذکی کے مداوا کی کوشش کی ہے کہتے ہیں :- ——— ؎

ابرِ رحمت اب بھی ہے آفاق گیر

آدم خاکی کی ہوس میں ہے اسیر

لیکن اس نظم میں شیدا بھی دروں بینی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں ، اور ذکی کو شمس تبریزی ، جلال الدین رومی ، شیخ احمد سرہندی اور مخدوم شیخ حمزہؒ کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں ، کہتے ہیں :

تجھ کو شکوہ چرخِ ناہنجار سے

اے ذکی مجھ کو گلہ ہے یار سے

کیوں جہان کاف و نون برہم کریں

عشق کو صورت گرِ عالم کریں

شیدا کی غزل میں تغزل سے زیادہ اخلاقی پہلو نمایاں ہے۔ ان کی ایک غزل کے شعر ہیں:

تری فطرت سے ناداں فتنہ سامانی نہیں جاتی
نہیں جاتی نگہ کی تنگ دامانی نہیں جاتی

سمٹ سکتا نہیں بکھرا ہوا ملت کا شیرازہ
کہ جب تک نوجوانوں کی تن آسانی نہیں جاتی

بدل کر روپ جمہوری وہی دورِ شہنشاہی
مری محکوم دنیا سے جہانبانی نہیں جاتی

شیدا نے مناظر، اور خاص طور پر کشمیر کے مناظر پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی منظری نظموں میں حفیظ جالندھری کی تکنیک استعمال ہوئی ہے۔ چھوٹی بحروں میں، مصرعوں کی تقطیع کا وہی انداز ہے، جس کو حفیظ نے مقبول بنادیا تھا۔ کشمیر پر کہی ہوئی نظموں میں شیدا کی نظمیں ایک امتیاز رکھتی ہیں۔ ان کی ہے "پانپور میں ایک شام"، کشمیر کے زعفران زاروں کے بارے میں ہے۔ بیرونی شعراء میں سے جو یر سے موضوع پر نظمیں کہی ہیں، کیونکہ زعفران کی شگوفہ کاری اس وقت ہوتی ہے، جب شملہ میں تجرب نقعزیخ ہو جاتی ہے، اور اس موسم میں کم ہی سیاح یہاں ٹھہر سکتے ہیں، یا ٹھہرتے بھاگ جاتے ہیں۔ انھوں نے اس نظم میں پیش کی ہے شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔ اس نظم کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے

جا رہے ہیں کس طرف پس شکر گلگ بہار
ننھے ننھے پھول ہیں پہنے ہوئے رنگیں قبا
دلنواز و دلفریب و دل نشیں و دلربا
شعلہ اک لپٹا ہوا گویا ہے دود آہ میں
یا ہے سوز معرفت پنہاں دل آگاہ میں
میں یہ سمجھا ہر طرف شمعیں فروزاں ہو گئیں
یہ صف آرا رقص کرنے کو پریاں ہو گئیں
نقرئی ہر دل میں اپنی ان کو نہلاتا ہے چاند
موتیوں سے ان کا دامن بھر کے چھپ جاتا ہے چاند
چن رہی ہیں پھول اور گاتی ہیں دہقاں لڑکیاں
حسن کی آبادیاں کشمیر کی شہزادیاں

کبھی کبھی فارسی اور کشمیری میں بھی فکر شعر کرتے ہیں۔ کچھ فارسی اشعار "سوز و منظر" مجموعے میں
بنی ہوئے ہیں

محمد طیب شاہ صدیقی منیغم، کشمیر کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ محمد عابد، محمد کاظم، محمد مقیم، محمد فاضل اور نور الہدیٰ اس خاندان میں سربرآوردہ علماء ہوتے ہیں۔ یہ خاندان "ٹوپی گرد" کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس خاندان کے مورث اعلیٰ علامہ محمد یعقوب دہلی سے کشمیر آئے تھے اور وہ یہاں کے علماء کے برخلاف، جو عمامہ باندھتے تھے، ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ جب حضرت خواجہ طاہر رفیقی اشائی نے انہیں دیکھا تو کہا تھا۔ "ٹوپیگر و آمد" یعنی یہ ٹوپی پہننے والا استاد آگیا۔ کشمیر کے مفتی اعظم کے مورث اعلیٰ مولانا قیام الدین اور کئی اور علماء مولانا محمد مقیم اور مولانا نور الہدیٰ کے شاگردوں میں تھے۔

خواجہ طاہر پشمینہ کی تجارت کرتے تھے۔

طیب شاہ ضیغم ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے اور فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر پائی اور پھر مولانا محمد حسین زیرک کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ سری پرتاپ کالج میں انٹرنس کی تعلیم حاصل کی اور سلسلہ ملازمت میں داخل ہوگئے۔ ملازمت کے دوران پنجاب یونی ورسٹی سے بی۔ اے اور فارسی میں ایم۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ ۱۹۳۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے بی۔ ٹی اور اردو میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۴۳ء میں سری پرتاپ کالج میں اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے مامور ہوئے، اور فارسی، اردو دونوں زبانوں کے درس دیتے رہے۔

ضیغم کو شعروشاعری کا ذوق زمانہ طالب علمی ہی سے تھا۔ اور اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ غزل ان کی پسندیدہ صنف رہی۔ غزل میں تصوف کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ کچھ غزلیں نعتیہ بھی لکھی ہیں۔ ان کی ایک غزل کے شعر ہیں:

فضائے جنت الماویٰ اُدھر کچھ اور کہتی ہے
ہوائے کوچۂ جاناں اِدھر کچھ اور کہتی ہے
رُخ جاناں میں جلوہ ذات کا ہم کو نظر آیا
شنیدہ سے زیادہ تر نظر کچھ اور کہتی ہے

ذیل کے اشعار میں تغلسف اور تصوف کی جھلک ملتی ہے:

زندگی، تعبیر خواب محشرستان خیال
سمجھے کیا نا آشنا، رازِ نیاز زندگی
ہر کوئی اسرار سے ضیغم نہیں ہے باخبر
غیر کیا سمجھے بھلا یہ درد و راز زندگی

بیانِ حرفِ نیاز زاہد اگر نہ سمجھے تو کیا عجب ہے
فضائے قدسی میں اس کو ہرگز مجال پائے طلب نہیں ہے
کبھی نہ نکلے جو خانقاہ سے خیال اوجِ علا کرے کیا
بلندیٔ حوصلہ کہاں جب خیالِ درد و تعب نہیں ہے
یہاں ہے درکار سوزشِ دل، طپیدنِ مرغِ نیم بسمل
مقامِ انغمائے خود پرستی ہے کوئی لہو و لعب نہیں ہے
حقیقتِ دہر کیا ہے ضیغم، کہا یہ پیرِ مغاں نے بیشک
عمل پہ دار و مدارِ عالم، نتیجہ بھی بے سبب نہیں ہے

ضیغم ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک جموں و کشمیر یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ فارسی میں لیکچرار کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔ انہیں تصنیف و تالیف اور ادبی تحقیق سے بھی دلچسپی ہے، چنانچہ حضرت صرفیؔ کے سوانحِ حیات مرتب کر کے اسے کلام کے انتخاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ حضرت سید علی ہمدانیؒ کی "چہل اسرار" اور حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے قصیدہ "ورد المریدین" کا منظوم ترجمہ، علامہ ابن فارض مصری کے عربی قصیدے کا اردو نثر میں ترجمہ، رسالہ فقریہ امیریہ کا اردو ترجمہ، ضیغم کے قابلِ ذکر کارنامے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے "اخلاقِ جلالی" کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا، جو ۱۹۴۰ء میں لاہور سے شائع ہوا۔[۱]

پنڈت زنا ردن ٹینگ ساغر ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی، سری نگر ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے۔ وہ بلدیہ سری نگر کے کمشنر بھی رہے۔ حیدرآباد سے بھی اُن کا تعلق رہا۔ پنڈت سالگرام سالک کی ڈائری کے ایک اندراج میں انہیں عثمانیہ یونیورسٹی کا "پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد" لکھا ہے۔ لیکن ساغر کبھی عثمانیہ یونیورسٹی میں نہیں رہے۔ اُن کے فرزند ہری کرشن جو فانی پریم نگری کے نام سے لکھتے ہیں،

---

[۱]۔ ضیغم کا انتقال دو سال پہلے ہو چکا ہے۔

حیدر آباد میں رہ چکے ہیں۔ ساغؔر شعر کہتے تھے، اور اپنے حلقہ میں بہت مقبول تھے۔

لالہ منوہر لال دِلؔ، جموں کے صاحبِ ذوق اصحاب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شعر و سخن سے دلچسپی کا محرّک، ان کے زمانے میں جموں کی خوشگوار ادبی فضا تھی، انہیں اپنے زمانے کے بعض سر برآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کے مواقع نصیب رہے۔ اثرؔ صہبائی اس زمانے میں جموں میں تھے، پنڈت کیفیؔ اور نواب جعفر علی خان اثرؔ کی موجودگی نے سخن سنجیوں کے لب و لہجے میں ایک شستگی پیدا کر دی تھی۔ فطرتاً دِلؔ بھی اس فضا سے متاثر ہوئے۔

دِلؔ کی ولادت جموں میں ۱۹۱۲ء میں ہوئی، ان کے والد لالہ شری جوانند امل بنک کا کاروبار کرتے تھے۔ لیکن ان کے بے وقت انتقال کی وجہ سے دِلؔ کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ۱۹۲۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ جنگی کے محکمہ میں ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصہ وہ نیشنل بنک لاہور میں بھی کام کرتے رہے، اور لاہور کے قیام سے بھی ان کے شعری مذاق میں نکھار پیدا ہوا۔ شعر و سخن کا ذوق انہیں بچپن ہی سے تھا، لیکن پنڈت میلا رام وفاؔ ان کی نوعمری کے زمانے میں جموں آئے تھے، اور دِلؔ ہی کے مکان پر ان کا قیام ہوا تھا۔ اس صحبت نے ان کے شوق کے لئے مہمیز کا کام کیا۔ اور وہ شعر کہنے لگے۔ وفاؔ اور پریم ضیائی اس زمانے میں "کارواں" نکالتے تھے۔ دِلؔ کو بھی صحافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ اپنی نظمیں اخباروں کے لئے بھیجنے لگے۔ ان کی سب سے پہلی نظم جس کا عنوان ہے "میں دیوانۂ الفت ہوں" "ویر بھارت" لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد "شہباز" "زمیندار" "ریاست" وغیرہ میں ان کی نظمیں چھپتی رہیں۔

غزل سے دِلؔ کو زیادہ لگاؤ رہا۔ اور ان کا قدیم اساتذہ غزل کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اس لئے ان کی غزل میں اساتذہ کی سی پختگی اور شستگی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن ان کے اسالیب اور فکر پر جدید عہد کا بھی پرتو ہے۔ اس خوشگوار آمیزش سے دِلؔ کی غزل قابلِ مطالعہ بن گئی ہے۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر ہیں:-

جب دردِ محبت بڑھتا ہے، دن آتے ہیں جل اٹھنے کے
جب داغ یہ بن کے ابھرتا ہے شعلوں میں نظام آجاتا ہے

ہم کس کو حقارت سے دیکھیں، ہے کون حقیر اس دنیا میں
تنکے کا سہارا بھی تو کبھی، انسان کے کام آجاتا ہے

تدبیر کے ہاتھوں ہی اے دل، دنیا کے مقدر بنتے ہیں
قایل بہ مقدر رہنے سے، حسرت کا مقام آجاتا ہے

ایک اور غزل ہے :-

نہ خضر رہ کی بدولت، نہ کارواں کے طفیل
ملی حیات کی منزل غمِ جواں کے طفیل

تمام عمر رہا سامنا قیامت کا
غمِ حبیب کی خاطر غمِ جہاں کے طفیل

غمِ حیات کی تلخی، ارے معاذ اللہ
بہلا ہے جانِ حزیں یادِ رفتگاں کے طفیل

ہر ایک اہلِ سخن، دل ہے تیرا گرویدہ
نئی زمین غزل اور نئے بیاں کے طفیل

دِلؔ نے اپنے کلام کا مجموعہ بھی "نقدِ دل" کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔

سید مبارک شاہ فطرتؔ کاشمیری فارسی اور اردو، دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ علم و ادب اور ارشاد و ہدایت کی روایات اس خاندان سے وابستہ رہی ہیں۔ ان کا خاندان سادات گیلانیہ خانقاہیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ فطرتؔ کے والد سید غلام محی الدین قادری بھی صاحبِ ذوق عالم تھے۔ فطرتؔ کی

ولادت ۱۳۱۶ھ میں ہوئی، اور ان کی تعلیم و تربیت والد کے علاوہ شیخ عبد الصمد، ملا اسد اللہ کلاشپوری اور مفتی محی الدین کے یہاں ہوئی۔ علوم باطنی میں حضرت سید حسین آفندی سے استفادہ کیا، اور کشمیر کے مشہور بزرگ پیر عزیز اللہ حقانی سے بھی اکتساب فیض کیا۔

دینی علوم میں قرآن، حدیث، فقہ اور کلام میں بھی ان کی اچھی تربیت ہوئی ہے۔ علم رمل بھی سیکھا اور موسیقی کی تعلیم، اس فن کے ماہر اُستاد محمد خلیل خوشنوا سے حاصل کی۔ ملازمت میں وہ معلم کی حیثیت سے داخل ہوئے، اور آخر میں ریسرچ اسسٹنٹ ہو گئے تھے۔ وسط ایشیا کے بہت سے حصوں کی سیاحت کی ہے۔ یارقند میں اپنے عم زاد بھائی کے یہاں یہ عرصہ تک مقیم رہے، اور شادی بھی وہیں کی۔ یارقند سے وہ اقسو، ختن، کاشغر اور دوسرے قریب کے مقامات میں بھی وہ مقیم رہے اور اس کا ذکر اپنی ایک فارسی نظم میں اس طرح کیا ہے:

صحبت پاک نژادان ختن روزی چند
شد نصیب من مهجور وطن روزی چند
شنگ مویان خطا، غالیہ سامان ختن
تازہ کردند مرا داغ کہن روزی چند
چہ مبارک نفسی ہست و چہ فطرت نفسی
کہ بترکان خطا کرد وطن روزی چند

فطرت نے اپنے اور سلسلہ گیلانیہ کے حالات میں ایک مختصر مثنوی "آئینہ فطرت" کے عنوان سے لکھی جس کا دیباچہ اردو میں ہے اور اس میں مثنوی کی تصنیف پر روشنی ڈالی ہے۔ میر غلام رسول جان نے، جو فطرت سے دوستی اور قرابت کے دوگونہ رشتے رکھتے ہیں "آئینہ فطرت کے لئے تعارف کیا ہے اس میں بزم اخوان الصفا کا بھی تذکرہ کیا ہے، جو فطرت اور ان کے ہم خیال دوستوں نے بڑی بات میں

قائم کی تھی، اور اس کی محفلوں میں کشمیر کے مشہور فارسی سخن سنج محمد امین مدراب، میرزا کمال الدین شیدا، اور کبھی کبھی حفیظ جالندھری، اثر صہبائی اور احسان دانش بھی شریک ہوتے تھے۔

فطرت اُردو میں غزل اور نظم، دونوں پر یکساں آسانی سے طبع آزمائی کر سکتے ہیں۔ اُن کی غزل میں تصوف کا بھی رنگ ہے، اور عموماً سلوک و معرفت کے نکات کی طرف توجہ زیادہ رہتی ہے۔ ایک غزل کے شعر ہیں:

اے تیری ارضِ پاک پر خم یہ سرِ سجود ہے
وے تیرے کوچے میں میرا شام و سحر قصود ہے
شاہدِ گل کے رنگ میں موجِ بہار موجزن
آئینہ جمال میں عکس ترا نمود ہے
غور سے دیکھئے اگر، غیر نہیں کوئی بھی یہاں
منزلِ عشق میں یہود، راہبرِ جہود ہے

کشمیر کی بہاروں کے نغمہ سنج سب ہی شاعر ہیں، لیکن فطرت اس کی خزاں کی تصویر کھینچتے ہیں۔ ان کی نظم "خزاں کی ایک رات" کے عنوان سے شایع ہوئی تھی۔ اس کے کچھ شعر ذیل میں درج ہیں:

وہ بھیگی رات ہے، تارے ہیں خاموش — زمیں مے نوش عالم مست و مدہوش
چمن میں سبزہ کا نام و نشاں گم — زمیں گلستاں ہے حُلّہ بردوش

عجب سنسان ہے، عالم ہے ہو کا — خدائی خود فراموشی میں ہے مدہوش
ابھی گو رات ہے آدھی سی باقی — مگر انوار ہیں ظلمت میں روپوش
اسی نیرنگیٔ فطرت میں فطرت — خدا کی یاد میں مستِ مے ہوش

فطرت کی ایک نظم "نغمۂ وحدت" کے عنوان سے شایع ہوئی تھی، یہ مخمس کی شکل

میں ہے۔ اس

صحرا میں دشت وکوہ میں تیری نمود ہے ہر برگ سبز رنگ سے تیرے کبود رہے

ہر نہر تیرے عجز سے محو سجود ہے ہر آبشار نغمہ زن "یا ودود" ہے

مولا مجھے بتا تو کہاں ہے، کدھر نہیں

فطرت اُردو اور فارسی میں کئی رسالوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی تفصیل درج ہے :

رشحات فطرت، معارف طبع فطرت، بیاض ہائے فطرت، چند پند فطرت، رباعیات فطرت، آئینہ فطرت فارسی میں اور فریاد جرس اور الثقلان اُردو میں ہیں۔

پیر عزیز اللہ حقانی کے حالات اور کشمیری میں ان کے کلام کو بھی انہوں نے مرتب کیا ہے اور یہ رسالہ کلچرل اکادمی کے سلسلہ منتخب منظومات کشمیری میں ۱۹۵۹ء میں شایع ہوا ہے۔ پیر حقانی کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے اس رسالے میں لکھتے ہیں :

" اگرچہ پیر عزیز اللہ حقانی صوفی تھے، مگر رومانی کی سحر پرور فضا بھی ان کے لئے غیر مانوس نہ تھی۔ وہ حسن وعشق کی ناز پروروادی میں بھی اسی طرح پھرے، جس طرح تصوف کی پُرپیچ گھاٹیوں میں، چنانچہ متصوفانہ اثر کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں حسن وعشق کے جلوے بھی اپنی تمام تر دلفریبیوں کے ساتھ موجود ہیں۔"

پیرزادہ غلام حسن قادری انقلاب، پانپور کے ایک گاؤں میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے تعلیم سری نگر میں پائی، بی۔ اے اور بی۔ ٹی کے امتحانات کامیاب کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ پہلے ماسٹر رہے، پھر صدر مدرس اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولس بھی رہے۔ کچھ عرصہ لداخ میں بھی متعین رہے۔ اب ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن میں مقیم ہیں۔

پیرزادہ انقلاب کو زمانہ طالب علمی سے ہی شعر وسخن سے دلچسپی رہی۔ اس زمانے میں

محمد کرم اسرارالدین کی اُستادی کا شہرہ، اِنقلاب انہیں کے تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ اور مولوی صاحب کی تربیت سے شعر خوب کہنے لگے ۔ میر غلام رسول نازکی سے بھی مشورہ کیا۔ لیکن زیادہ خود اپنے کلام کی اصلاح آپ کرتے رہے۔ غزل اور نظم دونوں میں ان کا کلام موجود ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں "شہباز" لاہور "زمیندار" "سرحد" (پشاور) "ادبِ لطیف" اور "ادبی دنیا" میں شایع ہوتا تھا۔ کچھ کلام مقامی اخباروں اور رسالوں میں بھی شایع ہوا ہے۔ غزل میں ان کا انداز منجھا ہوا ہے، اور اپنے عہد کی تحریکوں سے بھی متاثر ہے۔

ان کی ایک غزل کے دو شعر ہیں، جو "تجلیات" کے عنوان سے شایع ہوئی ہے:

مری مستی نہیں منت کشِ پیرِ مُغاں ساقی
مجھے آتا ہے بے جام و سبو مدہوش ہو جانا

میرا سینہ بہارِ بے خزاں ہے لالہ کاری سے
چمن، تو بھی ذرا میری طرح گلپوش ہو جانا

ایک غزل کرگل کے قیام کے زمانے میں کہی تھی۔ اِس کے شعر ہیں:

دیدۂ نیم باز نے مارا	غمزۂ تُرکتاز نے مارا
جاں گسل طرزِ اجتناب ہوئی	روششِ احتراز نے مارا
کہیں سرمایہ اور کہیں افلاس	اِس نشیب و فراز نے مارا
کہاں کشمیر اور کہاں کرگل	راہ دور و دراز نے مارا

ایک نظم "میں" کے عنوان سے کہی تھی، جو فکر اور اسلوب کے لحاظ سے اِقبال کا آہنگ رکھتی ہے۔

چند شعر ہیں:

کُن فکاں کے ساز کی آواز ہوں	یعنی تفسیرِ نیاز و ناز ہوں
زلزلہ ہے قصرِ استعمار میں	صورِ اسرافیل کا دمساز ہوں

شاخِ طوبیٰ پر ہے میرا آشیاں　　طائرِ سدرہ کا ہم آواز ہوں

ہمنوا کی جستجو میں انقلاب　　مدتوں سے گوش بر آواز ہوں

پنڈت پتیامبر ناتھ درفانیؔ سری نگر کے محلے وچار ناگ میں رہتے ہیں۔ اسی لئے وہ تخلص کے ساتھ وِچارناگی لکھتے ہیں۔ ان کی ولادت کا سنہ ۱۹۱۹ء ہے۔ فانیؔ کے والد پٹواری تھے۔ فانی کو شاعری اور انشاء پروری کا شوق زمانۂ تعلیم سے تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جب وہ فتح کدل ہائی اسکول میں پڑھتے تھے، اس سکول کے رسالے "جہلم" میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ان کا ایک تہ دار مضمون "میں لامکاں ہوں" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ اس تربیتی دور کے بعد وہ وسیع موضوعات پر لکھتے رہے اور اب بھی ان کے قلم کی سیاہی سوکھی نہیں ہے۔ فانیؔ کی طبیعت میں تنوع بھی ہے۔ شعر سے بھی ان کو ابتدا سے دلچسپی رہی، اور قیس شیروانی سے وہ مشورہ کرتے تھے۔ ان کے دوسرے اساتذہ میں پنڈت نند لال کول طالب اور وشونا تھ درماہ بھی رہے۔

فانیؔ نے بی۔اے کی تعلیم سری پرتاپ کالج میں پائی۔ بعد میں اُردو میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ سکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ انہوں نے "ہمدرد" اور "خدمت" کی سب ایڈیٹری بھی کی۔ اس زمانے میں کشمیر میں کسان مزدور تحریک شروع ہوئی، اور فانیؔ اس سے وابستہ ہو گئے۔ سیاسی اختلافات کی بنا پر انہیں ریاست چھوڑنا پڑی تھی اور اس زمانے میں وہ مدھیہ پردیش میں اور وہاں بھی سکول میں معلمی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۱ء میں جب سری نگر لوٹے تو انہیں سیاسی الزامات کی بنا پر نظر بند رکھا گیا۔ رہائی کے بعد دہلی جا کر ایک نجی سکول میں ملازمت کر لی۔ ۱۹۵٦ء سے ریاست کے محکمہ تعلیم میں ملازمت کر رہے ہیں۔

فانی گذشتہ پینتیس ۳۵ سال سے مسلسل لکھ رہے ہیں، اور اپنے مضامین اور کلام کے دو مجموعے مرتب کر لئے ہیں۔ یہ دونوں مجموعے خاصے ضخیم ہیں۔ مضامین میں ادبی، تعلیمی، اخلاقی، سیاسی، سب ہی

نوعیت کے مضامین شامل ہیں۔ کچھ تنقیدی مضامین بھی انہوں نے لکھے ہیں۔ ان کا ایک اچھا مضمون، "مسلمانوں کے سائنسی ایجادات و انکشافات"، "حقیقی شاعری کیا ہے؟" "کیا اردو ہندوستان کی مشترک زبان ہے؟" جیسا مضامین ہیں۔ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ ترقی یافتہ زبان کا ایک معیار مقرر کرتے ہیں، اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ:

"دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی ایک ترقی یافتہ زبان ہے جو کہ اپنی ترقی پسندی کی بدولت دنیا کی سربرآوردہ زبانوں کے ساتھ ساتھ اور دوش بدوش چلنے کے قابل بن کر بین الاقوامی شہرت کی مالک ہو بیٹھی ہے۔ یہ امر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اس زبان کو بنانے اور ترقی دینے میں بحیثیت مجموعی تمام ہندوستانیوں کا ہاتھ ہے۔"

فانی کا ایک اور اچھا مضمون فن لطیف اور سماج کے بارے میں کلچرل اکادمی کے مجموعے "ہمارا ادب" ۱۹۵۹ء میں شایع ہوا تھا، جس میں فن اور فنکار کے لئے آزاد ماحول کی ضرورت پہ زور دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"فن لطیف اور فن کار کا جب ہی بھلا کر سکتے ہیں جب کہ ان دونوں کو آزاد حول مسل ماحول میں پنپنے اور منظر عام پر آنے کے مواقع میسر ہوں۔ اگر فن لطیف جغرافیائی، فرقہ وارانہ اور نسلی حدبندیوں اور سیاسی تیور سے آزاد نہیں ہے، تو اس کی پختگی، سالمیت اور وسعت کے زیادہ امکانات نہیں ہو سکتے۔"

فانی غزل بھی کہتے ہیں، لیکن ان کی نظمیں زیادہ اہمیت کی مالک ہیں۔ اور یہ نظمیں اُن کے نثری مضامین کی طرح وسیع اور متنوع موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ ان کی ایک نظم "چاندنی رات" کے کچھ شعر ہیں:

نور زا ہے شمع مہ سے فلک کا سائبان
قشقہ سیمیں سے ہے روشن جبین آسماں
دھیمی دھیمی روشنی ہے مثلِ موج جوئے شیر

لیلیٰ شب نے نکالی مانگ ہے کیا دلپذیر
چاندنی ہے یا کہ یہ ایک نور کا سیلاب ہے
رائگاں اب تو فروغ کرمکِ شب تاب ہے

ہے فضا ہر سو سکوں آمیز اس دم اس طرح
کیف آور خامشی زاہد کے دل میں جس طرح
چاند کے طرزِ عمل سے ہے رواداری عیاں
خشک و تر پر اس کی یکساں ہیں ضیاء پاشیاں

فانی کی نظموں میں "غروبِ آفتاب" "طلوعِ آفتاب" "نظمِ نو" "ودھوا کی آہ" اچھی نظمیں ہیں۔ "نذرِ حسین" کے عنوان سے انہوں نے جو نظم لکھی ہے۔ اس میں اسلام کے محاسن کا تذکرہ کیا ہے۔

پرتھوی ناتھ حالی راز کاشمیری اس صدی کے تیسرے دھے کے لکھنے والوں میں ایک مقام پیدا کر چکے تھے۔ وہ سری نگر میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم یہیں کے ایک سکول میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم سری پرتاپ کالج میں پائی، اس وقت وہ بمبئی میں مقیم ہیں۔ ان کی ایک غزل کے دو شعر ہیں:-

مسافر کی طرح بھٹکے ہوئے بازار میں آئے
گئے تھے سیرِ گلشن کو سرِ کہسار میں آئے

ہمیں ہے ہم نشیں منصور کی تقلید کا سودا
مزا پھر کیوں نہ ہم کو آرزوئے دار میں آئے

چودھری دینا ناتھ رفیق ایک کہنہ مشق شاعر اور ادیب ہیں، جو اپنی طبعِ رسا کے سہارے ہر صنف اور ہر انداز میں شعر کہتے ہیں۔ ان کا وطن پونچھ ہے، جہاں وہ سنہ ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کرنے

کے بعد ۱۹۲۲ء میں محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی اور کئی سرکاری سکولوں میں معلم اور ہیڈ ماسٹر کے عہدہ پر فائز رہے۔ ٹیچر ٹریننگ سکول، پونچھ سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے اس کے بعد ہی خالصہ سکول جموں میں معلمی کی خدمات ان کے سپرد ہوئی، اس وقت وہ سناتن دھرم سبھا ہائر سیکنڈری سکول، جموں میں کارگذار ہیں۔

رفیق کو اوائل عمر سے ہی شعر و سخن سے دلچسپی رہی۔ اس وقت پونچھ کے شعراء میں انہیں استادی کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ اردو کے علاوہ پنجابی ہندی، کشمیری حتی کہ انگریزی میں بھی آسانی سے شعر کہہ لیتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء تک ان کے کلام کی ایک مکمل بیاض تیار ہو چکی تھی، جو فسادات کے دوران ضایع ہو گئی۔ جو کلام بچ رہا یا فسادات کے بعد سرانجام پایا، اس کو مجموعے کی صورت میں "سنبل و ریحان" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس میں غزلیں، اور نظمیں شامل ہیں۔ غزل میں ان کا انداز منجھا ہوا ہے۔ شعر کی تکنیک پر انہیں اتنی دست رس ہے کہ وہ طویل بحروں، مختصر بحروں، طویل ردیفوں، غرض ہر نوع کی تکنیک کے ساتھ، آسانی اور روانی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ ایک غزل کے شعر ہیں:-

کیوں بے خودی سی ہر رگ و پے میں ہے موجزن
جب میں شریک محفل پیر مغاں نہ تھا

کرنی پڑے گی ترک وفا بھی مآل کار
خود مجھ کو اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

ہر شاخ کے طواف میں بجلی ہے محو کیوں؟
ہر شاخ پر چمن میں مرا آشیاں نہ تھا

ایسا نہ ایک لمحہ بھی گذرا ہے اے رفیق
معمور اس کی یاد سے میرا جہاں نہ تھا

طویل بحر میں اُن کی ایک غزل کا شعر ہے :

کبھی چاند بن کر روشنی تم نے دی تھی، مرے غم زدہ دل کے ظلمت کدہ کو
بنا دو گے پھر اس کو جانکاہ ظلمت، مجھے خواب میں بھی توقع نہیں تھی

ایک اور غزل کے دو شعر ہیں :

ستمگر، مرے دل کے حال زبوں کی تجھے بھی اگر کچھ خبر ہو تو کیا ہو
مرے لب سے نکلے ہوئے نالۂ غم کا تجھ پر بھی کوئی اثر ہو تو کیا ہو

تیرے فیض کے آج ہر سو ہیں چرچے، ہیں اذکار تیری کرم گستری کے
مری کس مپرسی پر لطف و عطا کی خداوند اگر اک نظر ہو تو کیا ہو

"سنبل و ریحان" میں مختلف موضوعات پر نظمیں بھی شامل ہیں۔ مشاہیر ہند اور مشاہیر عالم پر لکھی ہوئی نظموں میں "سری کرشن" "گوتم بدھ" "گرو گوبند سنگھ" پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، سُبھاش چندر بوس، لال بہادر شاستری پر انہوں نے اچھی نظمیں کہی ہیں۔ "بھگوان رام" رفیق کی کافی طویل نظم ہے۔ ایک نظم رفیق نے "شہید اعظم، حضرت امام حسینؑ سے خطاب" کے عنوان سے نہایت مؤثر لکھی ہے، جس کا ایک بند ذیل میں درج ہے :—

اے حسین ابن علی سرِ شہیدانِ جہاں   اے علم بردار حُریت اے انیسِ بے کساں
اے جَری ہمت، کماندارِ سپاہِ قدسیاں   اے کرم فرمائے مِلت، چارۂ بے چارگاں

رہتی دُنیا تک رہے گی یاد قربانی تری
تیغ کے سائے میں حق کی زمزمہ خوانی تری

رفیق نے ایک نظم میں غالب کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس نظم کے دو شعر ہیں :—

چاند بن کر جو ذکاوت کے فلک پر چمکا
تاج آسا جو سرِ علم و ادب پر چمکا
نقش دنیا کے زمانہ تو مٹ سکتا ہے
کون غالب کو زمانے میں بھلا سکتا ہے

رفیق کی شاعری کی تہ میں ایک اخلاقی رجحان مضمر ہوتا ہے، جو کبھی کبھی سطح پر اس طرح ابھر آتا ہے:

ہمت ہار کے بیٹھ نہ جاؤ، اٹھو اور پتوار سنبھالو
آئی ہے گرداب میں کشتی بچنے کی کوئی راہ نکالو

اپنے عہد کے حالات کا ردِ عمل ان کی شاعری میں نمایاں طور پر ظاہر ہوا ہے۔ آزادیٔ وطن کے مابعد مسائل پر کڑی تنقید میں وہ اپنے عہد کے ترقی پسند شاعروں کے ہم نوا ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں:

یہ مانا، زبانوں پہ تالے نہیں ہیں کسی غیر کے ہم حوالے نہیں ہیں
مگر قحط، مہنگائی، رشوت ستانی یہ جنتا کے ڈسنے کو کالے نہیں ہیں؟

ایک اور شعر میں وہ آزادی سے جو توقعات تھیں، ان کے پورے نہ ہونے پر تنقید کرتے ہیں:

ہم نے رفیق، آزادی کے کیا میٹھے سپنے دیکھے تھے
سانس کا لینا ہو گیا دوبھر، بات زباں پر لائے کون

اپنے عہد کے سخن سنجوں کو رومان کی خیالی دنیا سے نکل کر، ان کے سامنے جو مسائل ہیں، ان سے نبرد آزما ہونے اور سماجی برائیوں اور سرمایہ داری کے خلاف صف آرا ہونے پر اکساتے ہیں۔

عورتوں کی حد سے زیادہ آزادی بھی انہیں پسند نہیں۔ اپنے ہم پیشہ مدرسین کے بارے میں بھی انہوں نے ایک اچھی نظم لکھی ہے، جس میں ان کی گذشتہ عظمت اور موجودہ دور میں ان کی پستی اور زبوں حالی کو نمایاں کیا ہے۔ "یومِ آزادی" رفیق کی اچھی نظم ہے، جس میں وہ انگریزوں کے ہندوستان

سے جانے اور اس کے جلوے میں جو نیا عہد طلوع ہو رہا تھا، اس کی طرف اس طرح اشارے کرتے ہیں:

اے دیکھنے والے، ذرا نیرنگ جہاں دیکھ | یہ بدلا آسماں دیکھ، زمیں دیکھ زماں دیکھ

اُٹھتی ہوئی اس چادرِ ظلمت پہ نظر کر | بڑھتی ہوئی رنگینی فطرت کو عیاں دیکھ

تھی لرزہ براندام جس انگریز سے دنیا | کاندھے پہ رکھے بوریاں، تو اس کو رواں دیکھ

ہاتھوں میں لیا رہتا تھا جو دہر کی قسمت | ٹوٹی ہوئی اس شاطرِ عالم کی کماں دیکھ

ان بدلے مناظر پر ذرا ڈال نگاہیں | مٹتے ہوئے دنیا سے غلامی کے نشاں دیکھ

پیغمبرِ اسلام حضرتِ محمدؐ کے کردار اور پیغام پر رفیق نے ایک خوبصورت نظم لکھی ہے۔ اس کے چند شعر یہاں درج ہیں:

بانیٔ دینِ اسلام تیری ثنا، کس میں طاقت ہے تحریر میں لا سکے
میری ننھی زباں، اس میں قدرت کہاں، گیت لطف و کرم کے ترے گا سکے

تو غریبوں کا ملجا و ماویٰ رہا، تو یتیموں کے دل کا سہارا رہا
تھی بھنور میں جو کشتی پڑی قوم کی، اس کا ساحل بنا تو کنارا بنا

بھول بیٹھے خدا کو تھے اہلِ عرب، پوجتے تھے شب و روز اصنام کو
اپنا اپنا تھا معبود ہر ایک کا، جبر، پہ تکرار تھی، صبح کو شام کو

ایسے بندوں کا تو نے سنوارا چلن، ان کی بڑھتی ہوئی بدعتیں دور کیں
ان کو تہذیب سے آشنا کر دیا، عادتیں جو بری تھیں وہ کافور کیں

تیرے حسنِ تدبر سے اہلِ عرب، چھوڑ جھگڑوں کو فخرِ وطن بن گئے
خون سے سینچ کر گلشنِ قوم کو، آپ اس کے بہارِ چمن بن گئے

یہ نظم کافی طویل ہے اور اسی طرح کے احترام اور جذبات سے پُر ہے۔

پنڈت موہن کشن، اس زمانے میں عموماً بچوں کی دلچسپی اور ان کے استفادہ کے لئے چھوٹے مضامین لکھا کرتے تھے، جو "مارتنڈ" کے شماروں میں شایع ہوئے ہیں۔ اُن کے ایک اور ہم عصر ڈاکٹر اندر سین ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی بھی عام دلچسپی کے مضامین اسی اخبار کے لئے لکھتے تھے۔ یوگ دھیان ویاس شاعر تھے اور اخلاقی اور مذہبی نظمیں لکھا کرتے تھے۔ ان کی ایک نظم کے دو شعر ہیں :۔

عزیز من، نہیں آیا ہے تو آرام پانے کو
تری قسمت میں راحت ہے نہ ہیں خوشیاں منانے کو
زمانہ تجھ کو امن و چین سے جینے نہیں دے گا
کمربستہ ہے یہ دنیا، نشاں تیرا مٹانے کو

مندروں کی مظلومیت پر بھی انہوں نے کچھ نظمیں لکھی ہیں۔

پنڈت آفتاب رام کاو شاعر اور انشاء پرداز ہیں۔ شعر میں وہ ارشد تھانوی سے اصلاح لیتے تھے۔ غزل قدیم انداز کی کہتے ہیں، پنڈت نند لال طالب سے ان کے گہرے روابط ہیں۔

پنڈت پریم ناتھ پٹواری مسرور کا وطن سوپور رہے۔ ابتدائی تعلیم وہیں پائی پھر سری نگر میں تعلیم کی تکمیل کی اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ کئی سکولوں میں مدرّسی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ شعر و سخن سے انہیں ابتدا سے دلچسپی رہی۔ رسالہ "بہار گلشن کشمیر" میں ان کی غزلیں اور نظمیں شایع ہوئی ہیں۔ مسرور اچھے مقرر بھی ہیں۔

مولانا سالک بھی اچھے شاعر ہیں۔ ان کا کلام رسالوں اور اخباروں میں شایع ہوتا رہا ہے "پیام انقلاب" (۱۱ مارچ سنہ ۱۹۵۰ء) میں ان کی پانچ بند کی ایک طویل نظم شایع ہوئی ہے، جس سے دو بند ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :۔

تمہیں سے اے مجاہدو، جہاں کا ثبات ہے ‌ ‌ ‌ شہید کی جو موت ہے، وہ قوم کی حیات ہے

تمہاری مشعلِ وفا فروغِ شش جہات ہے   تمہاری ضو سے پُر ضیا جبینِ کائنات ہے

کواکبِ بقا ہو تم، جہاں اندھیری رات ہے

یہ نکتہ بے نظیر ہے معارف و نکات میں   کہ فرق ہے تمہاری اور عوام کی حیات میں

تمہارا امتیاز ہے دوام میں ثبات میں   جُدا ہو کائنات سے تو محو اس کی ذات میں

بقا ہے جس کی ذات کو وہ اک خدا کی ذات ہے

پنڈت رادھا کشن بھان جنون، خوش فکر اور پُرگو شاعر ہیں۔ اُن کی فکر میں تنوع اور ان کے اظہار کے اسالیب میں بڑی پختگی ہے۔ اس صدی کے تیسرے دہے کے شعراء میں وہ اپنی بسیار نویسی کی بدولت ممتاز تھے، جنون نے ایک نظم "گُل ہائے عقیدت" کے عنوان سے کہی تھی، جس میں وہ نہرو کو مخاطب کرتے ہیں:۔

مادرِ ہندوستان کی شان، سردار وطن

اے جواہر لال نہرو، اے علمبردار وطن

کشمیری پنڈتوں کے سالِ نو کے موقع پر ایک ترانہ لکھا تھا، جو مارتنڈ کے شمارہ ۲۰ ارمارچ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے کچھ شعر ہیں:۔

ساقیا، آج پلا دے مئے گلفام مجھے

بادہ کہنہ سے دے بھر کے نئے جام مجھے

صدقہ رندوا، کا بنا خوشدل و خوش کام مجھے

بھول کر یاد نہ ہو گردشِ ایام مجھے

پھول برسا دے بہر دور خدارا ساقی

سالِ نو تجھ کو مبارک ہو، دل آرا ساقی

ایک اور نظم کے دو شعر ہیں:۔

باغ میں گل بھی نئے آئے، عنادل بھی نئے

ولولے دل کے نئے، جوش نئے، دل بھی نئے

مدتیں ہوگئیں یونان کا تخت اُلٹے

فلسفی بھی نئے عالم نئے، کامل بھی نئے

ان کی منظری نظموں میں "آج کی صبح" اچھی نظم ہے، جس میں صبح کی تجلیوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ ایسے وقت خوابِ غفلت میں سرشار لوگوں کو للکارتے ہیں:۔

ہے وقتِ سحر اب تو بیدار ہو جا

اٹھ، اس خوابِ غفلت سے ہوشیار ہو جا

زمانہ ہے سرشار یادِ خدا میں

ہے مقبولیت آج ہی کی دعا میں

جنونؔ آج کی صبح اور یہ بہار

اٹھے کیا کوئی خفتۂ روزگار

جنونؔ کی رومانی نظموں میں "تیری آنکھیں" دلچسپ ہے۔ اس کا ایک بند ذیل میں درج ہے:۔

چھلکتی ہے جن میں شرابِ محبت — جہاں لہریں لیتی ہے مستیٔ الفت

نمایاں ہے رگ رگ میں جن کی شرارت — زمانے کی جن سے بدلتی ہے قسمت

وہ ہیں تیری آنکھیں، وہ تیری ہیں آنکھیں

غزل میں جنونؔ کا ایک مقام ہے۔ انہیں کلاسیکی انداز کی غزل پر انہیں قدرت حاصل ہے، اس کا اندازہ ذیل کی غزل سے ہو سکے گا۔

مرے سوزِ دروں پر مسکرائے جس کا جی چاہے
گرائے بجلیاں دل پر، گرائے جس کا جی چاہے

قفس میں ہوں، مجھے کیا کام اب گل سے، گلستاں سے
رکھے شاخِ نشیمن یا جلائے جس کا جی چاہے

...... ترستم نے میرے سینے کو
ستائے خوب، جی بھر کر ستائے جس کا جی چاہے

مری تربت نہیں ہے، یہ نشانی ہے وفاؤں کی
چڑھائے پھول یا آنسو بہائے جس کا جی چاہے

بہار آتے ہی افشا کر دیا رازِ جنوں میں نے
جنوں اب مجھ کو دیوانہ بنائے، جس کا جی چاہے

جنوںؔ کی ایک غزل "پھنس گئی طوفاں میں کشتی اور ساحل دور ہے" کے عنوان سے شایع ہوئی تھی، اس کے کچھ شعر ہیں:

وہ ابھی ہیں زلفِ مشکیں دوش پر ڈالے ہوئے — دامنِ نورِ سحر سے ظلمتِ شب دور ہے

دیدنی ہے ساقیِ حسنِ ازل کا فیضِ عام — جس کو دیکھو وہ شرابِ عشق سے مخمور ہے

وہ تجھے کیوں وادیِ ایمن میں جائے ڈھونڈنے — تیرے جلوؤں کے کرم سے جس کا دل خود طور ہے

دیکھئے بحرِ حوادث سے رہائی کب ملے — پھنس گئی طوفان میں کشتی اور ساحل دور ہے

اے زہے قسمت کہ صہبائے محبت ہے جنوںؔ — جان بھی، دل بھی، جگر بھی، گھر کا گھر مخمور ہے

غلام رسول نشاط کشتواڑی، سرزمینِ کشتواڑ کے کہنہ مشق کہنے والوں میں سے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۰۸ء میں کشتواڑ میں ہوئی۔ گھر کے حالات سازگار نہیں تھے، اس لئے جو تعلیم میسر آسکی

اس سے مستفید ہوئے۔ شعر و ادب سے لگاؤ بچپن سے تھا، لیکن کسی باکمال استاد سے استفادہ کیلئے کشتواڑ سے باہر جانے کے مواقع نہیں مل سکے اور کشتواڑ میں بھی کوئی قابلِ ذکر استاد نہ مل سکا، اس لئے اپنے ذوق اور مطالعے کی مدد سے اس فن پر عبور حاصل کیا۔ آخر میں سیماب اکبر آبادی سے رجوع کرنے کا انہیں خیال پیدا ہوا، جو نزدیک اور دور کے شعراء کی تربیت کے لئے ایک ادارہ بن چکے تھے۔ سیماب کو جموں و کشمیر کے نوجوان شعراء سے بھی ربط پیدا ہو چکا تھا، اور کچھ نوجوان ہدایت اور اصلاح کے لئے ان سے رجوع بھی کرنے لگے تھے۔ انہیں نوجوانوں کی سعی سے ایک انجمن سیمابیہ بھی سری نگر میں قائم ہوئی تھی، جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔ نشاطؔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۳ء تک سیماب کو اپنا کلام بھیجتے رہے۔ غزل، ان کی شعری تربیت کی زمین تھی، اور اس میں انہیں اچھی مہارت حاصل ہوگئی۔ لیکن عہد کا اقتضا انہیں نظم گوئی پر بھی ابھارتا رہا۔ چنانچہ اس وقت ان کی غزلوں اور نظموں کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ مہیا ہو گیا ہے۔ ایک غزل کے شعر ہیں:-

ان کا حسن و جمال، کیا کہنا   اور وہ خد و خال، کیا کہنا

حورِ جنت کا تو بھی دلدادہ   زاہد باکمال، کیا کہنا

ایک اور غزل کے دو شعر بھی یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

یہ کیا دستور آئینِ میخانہ ہے اے ساقی
کہ رندوں کی یہاں تو بات بھی مانی نہیں جاتی

بھلا کر بھی وہ فنِ شاعری کی پُر کٹھن راہیں
نشاطؔ اپنی طبیعت کی یہ جولانی نہیں جاتی

نشاطؔ نے کچھ اخلاقی اور قومی اور کچھ مذہبی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ "حضرت حسین" کے عنوان سے لکھی ہوئی ایک نظم ان کے جذباتِ عقیدت کی آئینہ دار ہے۔

بیغرض کاشمیری اور سالک کے ساتھی شعرا میں نیاز کاشمیری بھی اپنے مذاق کے شاعر تھے۔ ان کا اصلی نام عبدالرحمٰن تھا، لیکن زندگی میں کچھ ناکامیوں کے سبب انہیں نام کے بارے میں کچھ بدشگونی پیدا ہوگئی اور منظور احمد خان نام اختیار کیا۔ ان کی ولادت پشاور کے قریب ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ ان کے والد موسیٰ خان، سری پرتاپ سکول میں استاد مقرر ہوگئے تھے، انہوں نے نیاز کی تعلیم و تربیت کی سکول کی تعلیم کے زمانے سے انہیں شعر کہنے کا شوق ہوا۔ والد نے انہیں ٹیکنیکل کالج میں شریک کرایا تھا، لیکن نیاز کو دلچسپی نہیں ہوئی، اس لئے والد نے عرائض نویسی کا امتحان کامیاب کرایا اور عرائض نویسی کے کام پر لگا دیا۔ بعد میں وہ امداد باہمی کے محکمے میں سب انسپکٹر ہوگئے تھے اور اس تعلق سے کچھ عرصہ مظفر آباد میں بھی رہے۔ اسی زمانے میں کشمیر میں احرار تحریک شروع ہوئی، اور نیاز اس کے رکن بن گئے۔ مہاراجہ کی حکومت نے اس کی سزا میں انہیں خدمت سے ہٹا دیا۔ اس طرح ان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے رہے۔ آخری زمانے میں وہ بارہمولہ اور ہندوارہ ہائی سکولوں میں بھی کام کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۶۸ء میں وہ حج کو گئے اور مکہ معظمہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

نیاز کاشمیری، نیاز کامراجی کے نام سے بھی لکھتے تھے۔ "جہلم کے کنارے" ان کی ابتدائی نظموں میں سے ہے۔ غزلیں بھی انہوں نے کہی ہیں اور کچھ انشائیے بھی لکھے ہیں، لیکن ان کی ایک نظم "وٹاون" بہت مقبول ہوئی۔ یہ چھ بند کی طویل نظم ہے۔ جس کے ہر بند میں اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ اس نظم کا اقتباس درج ذیل ہے :-

وٹاون بنا آج کل گلبدن ہے ۔۔۔ فدا ہو رہا بس پہ چرخِ کہن ہے

عجب ہے نزاکت عجب بانکپن ہے ۔۔۔ عجب ان دنوں اس کا طور و چلن ہے

وہ دیکھو کہ ہے دیوہ نی سر اٹھائے

وطن کو آغوش میں لے دیا ہے

کہ عشق کا جرم ہے میرا ، یارو
لگائی مجھے حسن نے ہتھکڑی ہے

پنڈت دینا ناتھ عارف کاشمیری اور ویدلال گیرو، دونوں شاعر بھی تھے اور افسانے بھی لکھتے تھے ۔ گیرو کشمیر سے سولہ سترہ میل کے فاصلے پر اونتی پورہ کے پاس ایک گاؤں ہے ، وید لال وہیں رہتے ہیں ، کچھ عرصہ وہ راولپنڈی میں بھی رہے ۔ ان کی ایک اخلاقی نظم کے کچھ شعر یہاں درج ہیں ۔ اس نظم میں نئے عہد کی تحریکوں کا ردِ عمل ملتا ہے ۔

اٹھ کھڑا ہو اے دیہاتی تجھ میں گر کچھ جان ہے
ناز خالق کو بھی ہے جس پر تو وہ انسان ہے

تو جہاں کو قوت مردانہ کے جوہر دکھا
شہر والے جس سے ہوں حیران وہ منظر دکھا

کام لے ہمت سے تو ، تو دستِ قدرت ساتھ ہے

ساری دنیا ہو مخالف ، بازی تیرے ہاتھ ہے

صمد میر ، اصل میں کشمیری زبان کے شاعر تھے ، ان کو کشمیر میں اردو شاعری کے مرکزوں جیسے سرینگر سے واسطہ نہیں رہا تھیل ہار ، ایچھ گام اُن کا وطن تھا ۔ کشمیری میں ان کا متصوفانہ کلام عوام میں مقبول ہے ۔ صمد میر کو اپنے گاؤں میں اردو شاعری کی روایت جس طرح پہنچ پائی تھی ، اس کا اندازہ ہم کو ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے ، جن میں کشمیری بھی بعض جگہ ملی جلی ہے ۔

فنا سمسار آج یا کل
تو سمجھو سوچ کر کے گل

وہ پہلا وعدہ قالو ابلا
تو سمجھو سوچ کر کے گل

وہ پانی پر حیرخ لا کا
خودی اپنا بنیاد مودا

چیکی پھرتی سکا یا پھل
سو سمجھو سوچ کر کے گل

ڈرو مرت اور نہ کوئی دشمن
وفا سے دوست دریا من

واعتبار دربدن مجمل — تو سمجھو سوچ کر کے گل
یہ رعنا چشمہ ہلالی رو — ٹھنڈا آواز عاشق جو
تو اس کو پای پکڑ مکمّل — تو سمجھو سوچ کر کے گل
سوائے چھپیہ یہ مخمتہ لعل — تو پاد تاگ بتاؤ مال
نہ کچھ رکھ چھپکے نہ در بغل — تو سمجھو سوچ کر کے گل
اور اور یار نہیں چلتا — رہو بیچ میں کہ راستہ راہ
اگر عاشق تو سینور لا — تو سمجھو سوچ کر کے گل
یہ اپنا دل طلب شہنشاہ — بنا ؤ مار سیپی زنگا ؟
ہوئی روشن تو روغن مل — تو سمجھو سوچ کر کے گل
یہ دریا درد دیکھو ڈونگا کیا — نہ کشتی و نہ پل نے راہ
دو آنکھوں کو نیا و مجلو — تو سمجھو سوچ کر کے گل
تو ترکے سر دگرش ید — در بے بہا بہ کف آید
حلاف سامنے بہر سیکل — تو سمجھو سوچ کر کے گل
صمد میر کو ستا یار است — نہ میں ہندو، نہ مومن خاص
فدا از رہ عشق تو فیصل — تو سمجھو سوچ کر کے گل

صمد میر کا کلام اور دوسرے کشمیری شعرائے کے کلام کی طرح غلام محمد نور محمد کے مطبع سے شایع ہوا تھا
ایک مجموعے کے حقوق کے محفوظ ہونے کا اعلان کرتے ہوئے انہوں نے یہ تحریر لکھ دی تھی۔

ضروری اِعلان

میرے تمام غزلیات کے جملہ حقوق طباعت بحق غلام محمد نور محمد محفوظ ہیں۔ کوئی شخص

لن کے بغیر میرے غزلیات کا جزواً یا کلیتاً قصد طبع نہ کرے۔ اور کوئی گانے والا یا کمپنی بلا میری اجازت، میری نظموں کو ریکارڈوں میں لانے کا ارتکاب نہ کرے۔ خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف کاپی رائٹ رجسٹریشن ۱۹۲۱ء کے تحت قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ مہجور میر چھیل ہار۔

مولانا ابوالحسن مبارک اہلِ حدیث کے پیشوا اور واعظ کشمیری اور اردو میں شعر کہتے ہیں۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "سوز وساز" کے عنوان سے محمد امین نقشی نے مرتب کر کے ۱۳۵۳ھ میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعے کی اکثر نظموں میں اردو، کشمیری اور کبھی کبھی فارسی ملی جلی زبان میں تضمین، شعر اور مصرعے آجاتے ہیں۔ نظموں کے عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

التجا بدرگاہِ کبریا عز وعلا، التماس بدرگاہ خیر الناس، باغ علم نالہ یتیم، توجہ بدر صفائی، اسلامیہ ہائی سکول سری نگر، دردِ دل دنیا رنگ ہے، التجا ابی حضرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اول الذکر نظم میں مہاراجہ ہری سنگھ کے لئے بھی دعا کی ہے۔ ریختہ انداز کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں:۔

اے قوم، یاد کر تو، گومت زمانہ سارا
بلّٰہ اَچھ مرٔ ریٚتو تراوت بہتا نہ ہارا
اسلاف کی وہ حشمت، اصحاب کی وہ عظمت
آسوک پرن کھورن تل اقبال زادہ بادا

اس نظم میں میر واعظ رسول شاہ کی تقریر کی تعریف کی ہے:۔

تقریرِ میر واعظ، تصویرِ میر واعظ
تعمیرِ میر واعظ، دل کردہ پارہ پارا

جو نظمیں اُردو میں ہیں، ان میں سے ایک "شاہ کشمیر کی علمداری" مہاراجہ ہری سنگھ کی سالگرہ موقع پر لکھی گئی تھی۔ اس کا پہلا شعر ہے:-

سری کو اے خدا جب تک ترے در سے ملے پرکاش
ہری سنگھ شاہ کشمیر کی علمداری مبارک ہو

کچھ خلاقی اور مزاحیہ بھی کہا ہے۔ اپنے جوتا چھوڑ کر بوٹ پہننے کی توجیہ معذرت کے ساتھ اس طرح کی ہے:-

چھوڑ کر جوتا مبارک بوٹ کا مشتاق کیوں
مولوی اور بوٹ، آخر شہرۂ آفاق کیوں
دل نے چاہا، اس نئے فیشن کو کر دوں پائمال
اس لئے یہ بوٹ پہنا، ورنہ اس سے ہے ملال

مجموعے کے لئے تمہید خود مولانا نے لکھی ہے۔ اور اس میں اس مجموعے کی پیش کش پر انکسار کے ساتھ معذرت کی ہے۔ لیکن اس کا انداز منشیانہ ہے۔ فرماتے ہیں:-

"نہ ناشر ہوں نہ ناظم .... شعر و شاعری سے کام نہیں، شعرائے کشمیر میں نام نہیں .... سالہائے ماسبق میں چند بوسیدہ و فرسودہ خیالات کو اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ظاہر کیا تھا .... شرم و حیا میدان ناموری (اشاعت) میں قدم دھرنے مانع تھی اور طبیعت پردۂ گمنامی میں ہی زندگی بسر کرنے پر قانع .... آخر احباب کے اصرار اور عزیزی محمد امین نقشی طول عمرہ کی بار بار گذارشات نے مجھے عزیزی مذکورہ حسن طبع دینے پر مجبور کیا۔"

مجموعے کے آخر میں محمد امین نقشی "سوز و ساز" کے دوسرے حصّے کی جلد ہی اشاعت کی اطلاع دی ہے۔ مولانا مبارک کی دو نثری تصانیف "فیصلہ آسمانی" اور "سانحِ حضرت" کے بھی مصنف ہیں۔

عبداللہ در مشیخ علماء کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے مورث اعلیٰ
ہالستینز کو حسن حقیقت میں بشیخ حمزہؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ اور شیخ غازی الدین
شہر کے کرسے کیے نام بھی کہتا۔ وہ قانون گو کے عہدہ پر مامور تھے۔ ان کے پوتے شیخ محمد فاضل،
بہادر بھی تھے ایک مقام رکھتے تھے۔ انہیں سے اس خاندان کا نام "فاضلی" چلا ہے۔ اس
وقت کے ایک عالم غلام احمد حیدری نے "خلافت نامہ" کے نام سے فارسی میں ایک طویل مثنوی لکھی
جو بائیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف "گلدستہ نعت" بھی ہے۔

عبدالغنی فاضلی کے والد خواجہ غلام رسول فاضلی بھی علم و ادب سے لگاؤ رکھتے تھے۔ کشمیر کے
مورخ پیرزادہ غلام حسن بھی اسی خاندان سے ہیں۔ ان کی تاریخِ کشمیر جو "تاریخِ حسن" کے نام سے
ہے چار جلدوں پر مشتمل ہے اور فارسی میں کشمیر کی سب سے زیادہ ضخیم تاریخ ہے۔ عبدالغنی
۔ ۔ ۔ ۔ خان سے لگاؤ رہا۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے
کی کامیابی کو ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ منصف
کے لیے عہد کیا۔ مور ہوئے اور اسسٹنٹ کنٹرولر کے عہدہ تک ترقی کی۔ کچھ عرصہ وہ محکمہ پولیس
ڈپٹی سپرانٹنڈنٹ، کورٹ انسپکٹر اور اسسٹنٹ پبلک پراسیکیوٹر بھی رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی
اکاؤنٹنٹ جنرل تھے اور ایک اور بھائی ڈاکٹر علی محمد جان، حاذق طبیب اور گورنمنٹ میڈیکل کالج
سری نگر میں پروفیسر رہے۔

عبدالغنی فاضلی، مولوی امیرالدین کے فیض یافتہ تلامذہ میں سے ہیں۔ طالب علمی کے
زمانے سے اُن کا کلام کالج کے رسالے اور اخباروں میں شائع ہوتا تھا۔ مولوی امیرالدین کے اتباع میں
فاضلی بھی انجمن نصرت الاسلام کے سالانہ جلسوں کے لیے نظمیں لکھتے اور پڑھتے تھے۔ ان
"امتحانِ زندگی" اور "رازِ حیات" مقبول نظمیں ہیں۔ کچھ رومانی نظمیں بھی ان کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ جن میں

"دخترِ شیر فروش" دلچسپ نظم ہے۔ وہ غزل بھی کہتے ہیں اور غزل میں زیادہ تر غالب کے اندازِ فکر سے متاثر ہیں۔ ان کی ایک نظم "صبح پہلگام" مقامی دلچسپی رکھتی ہے۔ اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے :-

صبحِ پہلگام تھی
حُسنِ ازل عام تھا

ہر جگہ اک آبشار دوڑتا دیوانہ وار
جیسے کوئی بے قرار میری طرح بار بار

صبحِ پہلگام تھی
حُسنِ ازل عام تھا

صبح یہیں شام ہو یار لبِ بام ہو
دورِ مے و جام ہو میکشی سے کام ہو

صبحِ ازل عام ہو
حُسنِ ازل عام ہو

کاش یہیں ہو بسر زندگیٔ مختصر
جلوہ دیدار پر فاضلی منتظر

صبحِ پہگام ہو
حُسنِ ازل عام ہو

غزل کے چند شعر ہیں :-

جنوں کا زور پھر ہونے لگا فصلِ بہاراں میں جل بھی جائیے، یہ آشیاں توبہ

مری ڈوبی ہوئی نبضیں یہ کس نے تیز پھر کر دیں یہ کس عیسیٰ نفس کا فیض ہے جاری رگِ جاں میں

ہر قدم پر ہیں بجلیاں، توبہ   جل بھی جائے، یہ آشیاں توبہ

میری بہاری نقشہ   ہے اگر یہ، تو پھر خزاں؟ توبہ

میرزا کمال الدین شیدا ایس اور فاضلی میں شعری رفاقتیں رہیں۔ نوجوانی میں فاضلی بڑے رنگین مزاج تھے۔ ۱۹۳۰ء میں میرزا شیدا نے یہ چند شعر انہیں کو مخاطب کر کے کہے تھے۔

دل میں طوفانِ تخیّل سے تموّج خیزیاں

اس پہ ہیں شاعر مزاجی کی جنوں انگیزیاں

مجھ سے کہہ دینا ذرا، اے نو گرفتارِ حیات

ہو گئی تجھ کو نشاطِ غم یہ کیونکر سادہ بات

ہے ہوس کاری کی اس شطرنج کا انجام رنج

دہرِ دوں کا رکھ دیا ہے عاقلوں نے نام رنج

پنڈت نندلال کول ناشاد اور ان کے چھوٹے بھائی پنڈت گوپی ناتھ رینہ ناتھ، دونوں کو شعر و سخن سے دلچسپی رہی۔ سری نگر کے محلہ درابی یار میں ان کا آبائی گھر ہے۔ ناشاد ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد محکمہ کسٹم میں محال دار کے عہدہ پر مامور ہوئے، اور کچھ عرصہ ہائیڈرو الکٹرک ورکس پنجاب میں بھی کام کیا اور جموں و کشمیر کے کسٹم گارڈ کی خدمت بھی انجام دی۔ ۱۹۴۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ناشاد نے پہلے پہل طالب تخلص اختیار کیا تھا۔ لیکن پنڈت نندلال کول طالب کی شہرت نے انہیں تخلص تبدیل کرنے پر مجبور کیا اور اس سوءِ اتفاق نے انہیں ہمیشہ ناشاد و نامراد ہی رکھا۔ ان کو شعر کہنے کی تحریک پنڈت پریم ناتھ پردیسی اور دینا ناتھ چکن مست سے ملی، لیکن ان کی ملازمت کی مصروفیتوں نے انہیں اپنے فن کو سنوارنے اور نکھارنے کا موقع نہیں دیا۔ یوں وہ غزل اور نظم، دونوں میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ ناشاد کی نظمیں زیادہ تر مذہبی موضوعات پر ہیں۔ کچھ نظمیں انہوں نے یوراج کرن سنگھ (سابق صدرِ ریاست و گورنر ریاست، حال وزیر سیول

ہوا بازی، حکومت ہند کی سالگرہ کے موقعوں پر بھی لکھی ہیں۔ ناشاد نے ایک طویل مثنوی "سفر نامۂ نوری نار" کے عنوان سے لکھی تھی جس میں اپنی حیات کی کہانی پیش کی ہے۔ اس کہانی کو وہ اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

سُناؤں، سفر کا کسے اپنا حال
زمین سخت ہے، آسماں پُر و بال
رہا سال تیراں وطن سے بھی دُور
مقدر میں لکھا تھا، کس کا قصور

مثنوی شعری محاسن کے اعتبار سے، بلند پایہ نہیں ہے۔ لیکن یہ ناشاد کی جیون کہانی ہے۔ اور کوئی ۱۲۱ اشعار پر مشتمل۔ نوری ایک مقام ہے۔ جہاں تک سفر کی صعوبتیں بیان کی ہیں اور اس مقام کا تھوڑا سا حال لکھا ہے۔

پنڈت گوپی ناتھ، ناتھ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے اور میٹرک کامیاب کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ وہ اردو، کشمیری اور ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہہ لیتے ہیں۔ ان کی نظمیں اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوتی رہی ہیں۔ ان کی ایک اچھی نظم "پریتم کی یاد" کے عنوان سے چھپی تھی، جس کے کچھ شعر ہیں:۔

دریچے میں وہ بیٹھی گا رہی ہے	کسی کی یاد، دل تڑپا رہی ہے
وہ ہے شاید سُناتی آپ بیتی	کہ کس آشا پہ ہے اب تک وہ جیتی
وہ آئیں گے سُناؤں گی نئے راگ	مٹے گا ان کے درشن سے یہ ویراگ
کبھی بچوں سے کہتی ہے کہ "وہ آئے"	کبھی بھر آہ، کہتی ہے کہ "ہائے"

اسی انداز سے ایک برہن کی کہانی سُنائی ہے۔

پنڈت پرتھوی ناتھ تھپلو، اننت ناگ، اسلام آباد کے رہنے والے ہیں۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ دیہات سُدھارنے کے محکمے میں کام کرتے تھے اور اس تعلق سے وہ محکمہ کے ترجمان "دیہاتی دنیا" کے ادارہ

سے بھی وابستہ رہے، جس کے ایڈیٹر پنڈت گنگا دھر بھٹ دیہاتی تھے۔ "بھپلو" مارتنڈ کے ادبی شماروں کے لئے بھی لکھتے تھے۔ فروری ۱۹۳۶ء کے ایک شمارہ میں ان کا ایک اچھا مضمون "عورت کیا ہے" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ایک نظم "پیار کی یاد میں" بھی شامل ہے جو پانچ بند کی اچھی نظم ہے۔ اس کا اقتباس ہے :-

آسمان پر چھائی ہے، کالی گھٹا　　　کیف سے مخمور ہے ساری فضا

آج دم بھر کے لئے آؤ پیا

آئی ہے صحن گلستان میں بہار　　　گدگداتا ہے دل الفت شعار

میرے دل کو یوں نہ ترساؤ پیا

نرسنگھ سہائے شوق، جموں کے کہنہ مشق سخن سنج ہیں، اور پورے آداب اور سلیقے کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ ان کا تعلق جموں کے چوہان راجپوت فرقے سے ہے، اور غالب کی طرح "اسلاف کا تیر" ان کے ہاتھ میں قلم بن گیا ہے۔ ان کے بزرگ دہلی سے جموں آکر آباد ہو گئے تھے، والد کا انتقال کمسنی میں ہو گیا، اور سرکاری امداد سے تعلیم حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے انٹر سائینس کا امتحان کامیاب کیا اور محکمہ تعلیمات میں منشی کے عہدہ پر مامور ہو گئے۔ اس وقت وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو چکے ہیں۔ عمر کوئی پچہتر برس کے لگ بھگ ہے، اور شعر و سخن کی دلچسپیاں بدستور جاری ہیں۔

شوق کو بچپن سے شعر و سخن کا ذوق رہا۔ جس زمانے میں وہ چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے شعر کہنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد جو کلام انہوں نے سرانجام کیا، اس میں سے اکثر لاہور کے اخباروں جیسے "پرتاپ" "ملاپ" "سدرشن" وغیرہ میں شایع ہوتا رہا۔ کچھ کلام جالندھر کے اخبارات "پرتاپ" اور "پردیپ" میں بھی شایع ہوا ہے۔ جموں کے اخباروں اور رسالوں میں سے "رنبیر" "شنکھ دھن" "چاند" "قومی آواز" میں بھی اُن کی نظمیں شایع ہوتی رہی ہیں۔ اُن کی ایک مسدس نظم "اندھا لڑکا" کے

عنوان سے شایع ہوئی تھی، جو انگریزی سے خود ترجمہ ہے۔ اس نظم کا اقتباس ذیل میں درج ہے۔

یہ بتا تو مجھے تم ذرا — کہ ضیا و نور ہیں چیز کیا

مزا جن کا میں نہ اُٹھا سکا — ہیں نظر کی برکتیں کیا بلا

کوئی رند ہے ترکے کو دے بتا

مری کم نصیبی پہ جب کبھی — دلِ دردمند نے آہ کی

مرے گوش ہوش نے سُن ہی لی — میں نے پھر بھی صبر سے سہہ لیا

وہ الم جو میں نہیں جانتا

قومی نظمیں بھی شوق نے کئی لکھی ہیں۔ جن میں نوجوان کے حوصلوں کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ ایک نظم کے شعر

سلف کے کارناموں کی نئی اِک داستاں تم ہو
شجاعت کو رہی ناز جس پر وہ جواں تم ہو
تمہاری جاں نثاری کا کرے گی تذکرہ دنیا
بہت میٹھی، بہت دلکش، وطن کی داستاں تم ہو

شوق کے کلام کا مجموعہ شائع ہوا تھا لیکن اب نایاب ہے۔

پنڈت درگا پرشاد رونق کا کلام اِس صدی کے تیسرے دہے میں اخباروں میں شایع ہوتا رہا۔ پنڈت دینا ناتھ نادم نے نشاندہی کی کہ کشمیر کی سیاست کی مشہور شخصیت ڈی۔ پی۔ راد موہانی اور ان نے کچھ شعر بھی سنائے تھے۔ بعد میں "مارتنڈ" کے فوٹو کو ٹٹولتے ہوئے ان کی ایک پوری کر ادد ہو گئی۔ یہ پاکیزہ رومانی غزل ہے جو ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔ اس غزل کو پڑھ کر لگتا ہو گا ہے کہ حضرت موہانی نے سیاست کے چکر میں چکی کی مشقت برداشت کرتے ہوئے بھی شعر کہنا مناسب نہیں سمجھا ہے۔ اس موضوع کے سامنے شعر بد نثر جھکایا جا چکا ہے۔

. . . .

رسالہ ماتمند میں غزل "پس رفو ہوتا ہے چاک پردۂ تقدیر دیکھ" کے عنوان کے تحت شایع ہوئی ہے۔
غزل کلاسیکی رومانی انداز کی ہے جو ذیل میں درج ہے :-

محمل میں زیبا تھی پردہ بستہ بے پیر! دیکھ
آئینہ خانہ میں آکر حسن کی تصویر دیکھ

بزم خوباں میں مجھے سوئے بیاباں لے چلی
کس قدر وحشت طلب ہے عشق کی تاثیر دیکھ

اب بھی باقی ہے دم بیمار الفت اے طبیب
دور کر نسخہ ذری کچھ وصل کی تدبیر دیکھ

مسکرا کر ناز سے کہتا ہے شیشے میں وہ شوخ
آئینہ خانے میں آکر عام تصویر دیکھ

کیا نمائش ہو رہی ہے مقتل نگاہ ناز میں
ایک سو بسمل پڑے ہیں ایک تو نخچیر دیکھ

سوزن تدبیر اے رونق ذرا لے ہاتھ میں
پس رفو ہوتا ہے چاک پردہ تقدیر دیکھ

رونق کا ذوق شعر و ادب اصل میں موروثی ہے۔ ان کے خاندان میں بہت سے صاحب ذوق شاعر گزرے ہیں۔ تعلیم کے دوران ان کا ذوق شعر اوج پر تھا۔ ایل۔ ایل۔ بی کے لئے وہ لکھنؤ رہے۔ بہر صورت شعری صحبتوں سے بھی انہوں نے استفادہ کیا اور جب عملی سیاست میں داخل ہوئے تب بھی اس ذوق سے انہوں نے بیگانہ موقعوں کو ہلکا پھلکا بنانے میں بہت کام لیا۔ رونق کا ایک اور شعر بھی تاہم اسی کی سند تھا۔ جو درج ذیل ہے :-

سکون حاصل نہیں مجھ کو کہیں سیماب کی صورت

مثالِ ماہی بے آب میں ہر دم تڑپتا ہوں

غلام رسول نازکی وادی کشمیر کے کہنہ مشق شاعروں میں سے ہیں اور اردو زبان میں اظہاری نزاکتوں کے شعور بیان کے انداز پر قدرت نے انہیں اساتذہ کے مرتبہ پر پہنچا دیا ہے۔ اساتذہ اردو کی روایات کے وہ وفا شعار پابند ہیں، اسی لئے غزل کی صنف زیادہ تر ان کی فکر کا محور رہی ہے۔ لیکن اُن کی غزل نئے عہد کی نئی غزل ہے۔ جس میں ہمارے اپنے عہد کی فکر کا شعور موجود ہے۔ میر کی سادہ بیانی کا پرتو اگر کشمیر کے کسی سخن سنج کے کلام میں نظر آتا ہے۔ تو وہ نازکی ہیں۔

نازکی کا ایک سوانحی جائیزہ ان کے ایک دوست ہنسی بردوش نے، جو خود بھی اردو میں لکھتے ہیں "تعمیر" (سرینگر) کے شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۶۱ء میں شایع کیا تھا۔ جس میں ان کے خاندانی حالات اور اُن کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ نازکی کا اسم نسبت کشمیر کے ایک بزرگ سادات 'میر نازک قادری' کے واسطے سے ہے، جو حضرت شیخ حمزہؒ کے زمانے کے کچھ بعد کشمیر آئے اور مرجع خاص و عام بن گئے۔ نازکی کے والد بزرگوار انہیں کی اولاد میں تھے۔ وہ عربی اور فارسی کے سربرآوردہ عالم تھے اور انہیں کی تربیت سے نازکی کی طبیعت کو علم و ادب سے لگاؤ پیدا ہوا۔ شعر وہ بچپن سے کہنے لگے تھے اور ابتدا میں اخبار "ہمدرد" اور دوسرے اخباروں میں اپنا کلام "تمنی کاشمیری" کے قلمی نام سے شائع کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ء تک اتنا کلام اکٹھا ہو گیا کہ ایک مجموعے کی صورت میں، جو "دیدۂ تر" سے موسوم ہے، مرتب ہو سکا۔ یہ مجموعہ ۱۹۴۹ء میں نازکی کے ایک دوست غلام محمد میر طاؤس کے تعارف کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ طاؤس شستہ ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ اور اردو کے شاعر اور نقاد بھی ہیں۔ نازکی کی شاعری کی اقدار کا اندازہ لگاتے ہوئے، طاؤس لکھتے ہیں:۔

"آپ کی شاعری، ایک دکھی دل کی پکار ہے۔ ایک غم انگیز پکار۔ آپ کے

یہاں غم، زندگی کی اہم ترین حقیقت سے عبادت ہے۔"

نازکی کا شعر ہے :-

محبت زندگی، اور زندگی غم ہوتی جاتی ہے
خوشی تحلیل ہو کر، غم میں مدغم ہوتی جاتی ہے

نازکی کے احساسِ غم کا فانی کی لذتِ الم سے مقابلہ کرتے ہوئے، طاؤس رقمطراز ہیں :-

"غم کا یہ خوشگوار تصور، جس کو اردو شاعری میں فانی مرحوم نے مستقل موضوع کے طور پر روشناس کیا، قنوطیت اور یاسیات کے اِس قدیم تصور سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ غم انسان کو فرار پر مجبور نہیں کرتا، نہ تو بے عملی کی طرف مائل کرتا ہے۔ نازکی کے یہاں غم کا یہ تصور اس حد تک کارفرما ہے کہ آپ کے نزدیک غم ہی بندہ و مولا ہیں، وجہ ارتباط ہے اور روح کی پائیدگی کے لئے صرف دلِ اندوہگین کی ضرورت ہے۔"

احساسِ غم کی اس گہرائی اور گیرائی کے سرچشمے کا سراغ انہوں نے شاعر کے معاشرتی ماحول اور کشمیر کی پچھلی حوصلہ فرسا تاریخ سے لگایا ہے۔

"دیدۂ تر" قطعات، غزلیات اور نظموں پر مشتمل ہے۔ قطعات چو مصرعہ ہیں۔ اور ان میں نازکی کو ایک امتیاز حاصل ہو گیا ہے۔ اُن میں سے بعض ان کی فکر کے نفیس نمونے ہیں۔ نظمیں شاعر کے انفرادی تاثرات اور تجربات پر مشتمل ہیں۔ نازکی کا ایک قطعہ ہے جس میں انہوں نے جوانی کی حقیقت واضح کی ہے۔ کہتے ہیں :-

کوئی کہتا ہے اس کو جاودانی
کوئی کہتا ہے فانی ہے جوانی
نہ آگا اس کا ملتا ہے نہ پیچھا
بڑی الجھی ہوئی ہے یہ کہانی

قطعات اور نظموں کی فکر عمیق غزل میں سُبک سیری کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ غزل میں بعض جگہ گہرے

طنز سے، نازکی کی شاعری میں ایک انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک غزل کا شعر ہے :۔

اس شوخ کو کیا دیکھا، آنکھوں میں سمٹ آئی
شیراز کی شادابی، کشمیر کی رعنائی

غزل کا ایک شعر اور ہے :۔

اب کس کو یقین آئے، جو چیز ہے فانی ہے
پیغام محبت ہے، اور ان کی زبانی ہے

ان کے طنزیہ انداز کی مثال ذیل کے شعر میں ملتی ہے :۔

مجھے بے طلب زندگی دینے والے
یہ احسان تیرا نہیں، دشمنی ہے

نازکی فارسی اور اردو کی شعری روایات کا اچھا عرفان رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام کو پڑھتے ہوئے اساتذہ قدیم کی فضا ذہن میں پیدا ہو جاتی ہے کشمیر کے فارسی شعرا میں غنی سے انہیں فطرتاً عقیدت ہے۔ اور اسی عقیدتمندی کے سبب انہوں نے غنی کے کلام کو مرتب بھی کیا ہے۔ ایک شعر میں اپنی شاعری کو غنی کے فیض سے اس طرح تعبیر کرتے ہیں :۔

کہاں میں کہاں نغمۂ زندگانی
مرے روپ میں جلوہ فرما غنی ہے

نازکی کی غزل کی سرحدیں، نظم سے مل جاتی ہیں، اسی لئے کئی غزلیں سوائے قافیہ کی ترتیب، صنف کے التزام کے بہت کم غزل معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ذیل کے اشعار کے تیور اسی طرح کے ہیں :

سر کو جنبش سی ہوئی چہرہ سے زلفیں ہٹ گئیں
شام نے اک جھرجھری سی لی سویرا ہو گیا

دُور تا حدِ نظر میری نظر تھی ہمرکاب
لوٹ کیا آئی اُجالے میں اندھیرا ہو گیا
جادہ الفت میں منزل کا تعین کیا کریں
جب مُسافر ہار بیٹھا، بسیرا ہو گیا
اِک نگاہ ناز نے جھگڑے چکائے تمام
میں بھی تیرا ہو گیا، میرا بھی تیرا ہو گیا[1]

اِقبال اُردو کے بہت سے شعراء کی طرح کشمیر کے اکثر اُردو شعراء کے لئے الہام کا باعث ہوئے۔ نازکی کے ذیل کے اقتباس میں اسی اثر کا ردِعمل ملتا ہے:

گفتگو کل ہو رہی تھی بُلبُل و شہباز میں
دے دیا بلبل نے شاہیں کی تعلّی کا جواب
ہے بظاہر تلخ، لیکن یہ حقیقت ہے جناب
زندگی ہے سینکڑوں تاروں کی، مرگِ آفتاب

نازکی کی مُلازمت کا زمانہ زیادہ تر محکمہ تعلیم میں گذرا۔ بعد میں وہ ریڈیو کشمیر سے بھی وابستہ ہو گئے تھے۔ محکمہ تعلیم کی مُلازمت کے زمانے میں، جب خواجہ غلام السیدین ناظمِ تعلیم تھے، ایک تعلیمی رسالہ "تعلیم جدید" کے نام سے جاری کیا تھا، اور اس کی ادارت نازکی ہی کے تفویض ہوئی تھی۔ نثر میں بھی نازکی کا انداز شُستہ اور سادہ پُرکار ہوتا ہے۔ انہوں نے کئی مضامین بھی لکھے ہیں۔ جن میں تاریخی اور تنقیدی شعور ابھرا ہے۔ ان کا ایک اچھا مضمون "نعتیہ ادب" پر لکھا گیا ہے۔ جس میں عربی اور فارسی نعت نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جب وہ اقبال پر پہنچتے ہیں، تو لکھتے ہیں:۔

" متاثرین میں نعت کو ایک نیا روپ اِقبال نے بخشا" جاوید نامہ" "اسرار و رموز" "مسافر" اور

"پیام مشرق" نعت کا پہلو ہر کتاب میں غالب ہے۔"ارمغان حجاز" کا مرکزی خیال ہی نعتِ رسول ہے۔ اقبال کی نعت ایک الگ مبسوط اور مستقل موضوع ہے۔

کشمیری کے نعت نگار شاعر عبدالاحد نادم کے حالات اور کلام کے انتخاب پر مشتمل ایک رسالہ مرتب کیا ہے جو کلچرل اکادمی سے شایع ہوا ہے۔ اُن کے مضامین کا سلسلہ کشمیری شاعری پر "شیرازہ" میں شایع ہوا ہے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے ایک ہفتہ وار "الغفران" بھی نکالنے لگے ہیں۔ اس کے اداریوں اور خبروں پر تبصرہ کے لب ولہجے میں، ان کے عام مذاق کی سلامت اور طبیعت ہی طنز نے، کشمیر کی صحافت میں اسے ایک امتیازی مقام عطا کیا ہے۔ اس کام میں بھی نازکی نے اپنی شعری دلچسپی اس طرح برقرار رکھی ہے کہ اساتذہ کے کلام کا انتخاب ہر شمارے میں شامل ہوتا ہے۔ اور رشیدین اقوال اور لطائف کی بھی اس میں گنجایش رکھی ہے۔

میرزا غلام حسن بیگ عارف، بہت سی ادبی تحریکوں کے سرگرم رکن رہے۔ جدید کشمیری شاعری اور ادب کے وہ بانیوں میں سے ہیں۔ اور اُن کا شمار کشمیری کے سربرآوردہ شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے خاندان میں علمی اور ادبی روایات عرصہ سے چلی آرہی ہیں۔ عارف کے والد میرزا سرفراز بیگ عالم، صوفی اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ عارف کی ولادت ۱۹۱۰ء میں اننت ناگ اسلام آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اننت ناگ میں پائی، اور انٹر سائینس کی تعلیم کے لئے سری نگر آتے۔ بی۔ ایس۔ سی، گورنمنٹ کالج لاہور میں پائی۔ قیام لاہور کے زمانے میں وہاں کے ادبی حلقوں میں شریک رہنے کے انہیں موقعے ملے، اور علامہ اقبال صحبتوں سے بھی استفادہ کیا۔ ایم۔ ایس۔ سی، حیاتیات کے مضمون میں، علی گڑھ سے ۱۹۳۵ء میں پاس کیا اور سرینگر لوٹنے کے بعد اُن کا تقرر سری پرتاپ کالج میں ڈیمانسٹریٹر کی اسامی پر ہو گیا۔ ۱۹۴۰ء میں محکمہ زراعت میں وہ ڈپٹی ڈائیریکٹر مقرر ہوئے اور اسی محکمہ سے ناظم کی حیثیت سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

دفتری مصروفیتوں کے باوجود عارف کے علمی اور ادبی مشاغل میں کمی نہیں ہو سکی کشمیری کی طرف ان کی توجہ کا ایک سبب علامہ اقبال ہوئے تھے۔ ایک موقع پر، عارف نے علامہ سے پیام عطا کرنے کے لئے کہا تھا، جس علامہ نے انہیں دو مشورے دیئے تھے۔ ایک یہ کہ قوم کی خودی بیدار ہونی چاہئے دوسرے اس کی زبان زندہ ہو۔ یہ مشورے ان کے دل پر ایسے نقش ہو گئے کہ کشمیر لوٹنے کے بعد ہی کاشمیری بزم ادب کی انہوں نے ابتدا کی، جس کے سرگرم اراکین میں پنڈت دینا ناتھ نادم، عبدالحق برق اور غلام رسول نازکی، ماسٹر زندہ کول ثابت، پنڈت ڈی۔ پی۔ دھر، مولانا محمد سعید مسعودی، پروفیسر پی۔ این۔ پشپ، جسٹس جیالال کلم، مکھن لال محو اور کئی اور حضرات تھے۔

۱۹۴۷ء میں جب کلچرل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ تو خواجہ غلام محمد صادق اس کے صدر، اور عارف اس کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی جب بنیاد رکھی گئی، تو عارف اس کے بھی سرگرم رکن بن گئے ہندوستان کے دستور کی تدوین جس زمانے میں عمل میں آرہی تھی، اصطلاحات تجویز کرنے کے لئے مختلف زبانوں کے ماہرین کی کانفرنس کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کی کشمیری کے ماہرین میں پروفیسر جیالال کول اور عارف کانفرنس کے رکن رہے۔ ایشین رائٹرز کانفرنس، دہلی کے بھی وہ رکن رہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی وزارت اعظمی کے دور میں کشمیری رسم الخط کی اصلاح کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اس کی رکنیت کے فرائض بھی انہوں نے انجام دیئے۔ دستور ہند کے کشمیری ترجمہ کے لئے جو کمیٹی بنی تھی، اس میں پروفیسر پی۔ این۔ پشپ اور عارف شامل تھے۔

کشمیری بزم ادب کی جانب سے اردو اور کشمیری میں جو ترجمان "گلریز" کے نام سے جاری ہوا تھا، اس کی ادارت کے فرائض بھی عارف نے انجام دیئے۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے وہ ایک ڈائری مرتب کر رہے ہیں، جو ان کے عہد کی سیاسی، علمی اور ادبی تحریکوں کی ایک مختصر سی تاریخ بن گئی ہے۔

شعر و سخن کا ذوق عارف کو سن شعور کو پہنچنے کے بعد سے رہا۔ ان کی شاعری کا آغاز کشمیر

گئے بہت سے شعراء کی طرح اردو سے ہوا۔ فارسی میں بھی وہ کہہ لیتے تھے، اردو میں غزل اور نظم دونوں اصناف میں ان کا سلسلہ جاری رہتا تو وہ اس وقت اردو کے سربرآوردہ شعراء میں شمار ہوتے۔ عارف کی غزل اساتذہ قدیم کی غزل کی ساری پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ اپنے عہد کی فکر کے تاثرات کا پرتو رکھتی ہے۔ غالب کی زمین میں ان کی ایک غزل کے چند شعر ہیں :-

غنچۂ گل کی حسرتیں، توبہ — جو نسیم سحر سے وا نہ ہوا

نگہ ناز کے اشاروں کا — جان دے کر بھی حق ادا نہ ہوا

دل میں طوفان لب پہ مہر سکوت — وہ ملے تو، مگر گلا نہ ہوا

ناز پروردۂ فضائے چمن — میرے قسمت ہوا، برا نہ ہوا

عارف خستہ جاں کی آہ و پکار — سن لو، ایسا غزل سرا نہ ہوا

عارف کی شاعری کے عروج کے زمانے میں ہندوستان فرقہ وارانہ تصادم اور فسادات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کشمیر کے سخن سنجوں کے لئے یہ وحشیانہ مظاہرے اجنبی تھے۔ عارف کا دل بھی ان پر دکھتا تھا اور ان کے جذبات شعر کا جامہ پہن کر نمودار ہوتے تھے۔ ایک نظم "انسان" انہوں نے اسی زمانے میں کہی تھی، جس میں انسانوں کی گراوٹ کا ماتم کیا ہے، لیکن ایک بشارت بھی دی ہے۔ کہتے ہیں :

خالق کا جوشہ کار ہے کیا ہے یہی خاکی
تفویض ہیں جس کے ہیں شجر اور حجر بھی
چالاکی ادراک کا ہے غلغلہ جس کی
غواص معانی ہے، سمندر بھی گہر بھی
گلزار جناں چشم براہ اس کے لئے ہے
سورج بھی ہے خدمت میں ستارے بھی قمر بھی

دی قدسیوں نے خالقِ اکبر کی دُھائی

اس ظالم و جاہل کے ذرا دیکھ ثمر بھی

فتنہ ہے بشر روزِ ازل عرض یہ کی تھی

بڑھ کر ہے درندے سے، ہوا لاکھ بشر بھی

عارف کی بشارت بامعنی ہے۔ اس زمانے میں اردو شعرا کمیونسٹ طرزِ فکر سے آشنا ہو چکے تھے اور بعض شعرا جیسے ظفر علی خاں وغیرہ نے اسے انگریزی سامراج کے خلاف حربے کے طور پر استعمال کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ آخری شعر اسی کی صدائے بازگشت ہے۔ کہتے ہیں :-

نادان نہ گھبرا ہے یہ فطرت کا تقاضا۔ سُرخی جو شفق کی ہے تو آتی ہے سحر بھی

عارف نے کچھ نعتیں بھی اچھی کہی ہیں :-

چھڑایا ماسوا سے جس نے آدم کو محمدؐ ہے

جھکایا حق کے آگے جس نے عالم کو محمدؐ ہے

وطن اور نسل کے خانوں میں انسانوں کو بنایا تھا

بنایا ایک جس نے نسلِ آدم کو محمدؐ ہے

وہ نورِ لم یزل جو رحمۃ للعالمین بھی ہے

اخوت کے اٹھایا جس نے پرچم کو محمدؐ ہے

عارف کو گورنمنٹ ہند نے ایک ثقافتی وفد کے ساتھ چین بھیجا تھا۔ جب بمبئی میں تھے کشمیر کے تجارتی ایجنٹ نے ایک پارٹی دی تھی۔ اس پارٹی میں ایک حسین لڑکی اور اس کا نوجوان دوست بھی شریک تھے۔ اس موقعہ پر عارف نے ایک نظم کہی تھی جس کے بارے میں خود بیان کرتے ہیں :-

" ڈاکٹر ملک نشاط ٹریڈ ایجنٹ نے چین کے سفر پر جانے سے پہلے ایک الوداعی پارٹی دی تھی۔ کئی

معززین کو مدعو کیا تھا، جن میں ایک حسینہ اور اس کا "بائے فرینڈ" بھی تھے۔ خوب مے لنڈھی، خشک بمبئی میں میرے سوا کوئی خشک لب نہ تھا۔ عالم کیف میں سب نے مئے پینے کے جرم میں اس حسینہ پر نظم کہنے پر مجبور کیا۔ مطلع اس کے رنگین ہونٹوں سے لیا۔"

اس طرح شراب ناب کی بجائے مئے حُسن کی سرشاری میں یہ شعر موزوں ہوئے:

تیرے ہونٹوں کی سُرخی ساتھ اپنے چھین لے جاؤں
میں اس بے دین دنیا کے لئے یہ دین لے جاؤں

تیرا نظریں چُرانا، دیکھ کر پھر جھینپ سا جانا
قسم تیرے تبسم کی یہی تسکین لے جاؤں

تیری زلفوں کی موجوں کے سہارے کشتیٔ ہستی
بلاخیزی کے طوفانوں سے با تمکین لے جاؤں

تیری محفل سے رسمِ دوستی، دستور جانبازی
بھلا یہ حُسن کی سرکار کا آئین لے جاؤں

جگر کے پار تیر عشوہ گر ہو بھی تو کیا غم ہے
یہ کم تحفہ ہے، پہلو میں دلِ غمگین لے جاؤں

دلِ عارف کو تسکین ہو، خدا حافظ جو وہ کہہ دے
دُعائیں اہلِ محفل کی، تیری آمین لے جاؤں

عارف نے "گلریز" کی ادارت کے زمانے میں، ترتیب اور تدوین کے متنوع فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیئے ہیں۔ متفرقاتی نوٹ وہ اکثر لکھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مزاحیہ پاروں پر بھی طبع آزمائی کی۔ انشائیہ کے انداز کی ایک چیز انہوں نے "در مدح ملاوٹ" کے عنوان سے لکھی تھی، جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

"ہیون سانگ کو تم جانتے ہو ؟ وہ ایک چینی سفیر تھا، جو کوئی چودہ سو برس پہلے برصغیر ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے' ایک بین الاقوامی بدھ کانفرنس میں شرکت کے لئے کشمیر آیا تھا۔ اس نے اور باتوں کے علاوہ ہمارے کردار کو اس طرح بیان کیا ہے' جیسے کوئی غیر ملکی سفیر آج کل کے کیریکٹر کا خاکہ کھینچ رہا ہو۔

اس نے برصغیر ہندوستان میں گھوم کر، لوگوں کو گائے کے دودھ کا معتقد پایا۔ دودھ کی خرید و فروخت کو لوگ پاپ سمجھتے تھے لیکن کشمیر ہی ایک ایسا خطہ تھا جہاں دودھ کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اس میں پانی کی ملاوٹ کی جاتی تھی' بیہودہ اور لغو قسمیں کھائی جاتی تھیں، باوجودیکہ بڑے بڑے لاما، بڑے بڑے دانشور، اور علامہ اسی سرزمین سے پیدا ہوئے تھے۔"

پنڈت ویریشیشور، جن کا اصلی نام پرتھوی ناتھ منٹو ہے، ہندی اور سنسکرت کے عالم تھے اور اپنی متنوع دلچسپیوں اور عمدہ تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے' اس صدی کے تیسرے دھے کشمیر کے ادیبوں میں نمایاں مقام کے مالک رہے۔ اردو، ھندی اور ھندوستانی پر یکساں قدرت نے انہیں اپنا ایک مخصوص اسلوب نشو ونما دینے پر مائل کیا تھا، جو اردو اور ہندی کے درمیان ایک سلیس اور شائستہ اسلوب بن جاتا، اگر ان کی تخلیقی کاوشیں جاری رہتیں۔

ویریشیشور کا اصلی نام پرتھوی ناتھ منٹو ہے۔ اُن کے والد پنڈت دینا ناتھ منٹو دلگیر کے افکار کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ اور دادا کے بارے میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ وہ فارسی کے اچھے عالم تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ تعجب نہیں کہ ویر عنفوان ہی سے ادب اور شعر کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے۔ چنانچہ اس صدی کے تیسرے دھے میں جب وہ ایس۔ پی۔ کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، وہ کالج کے رسالے "پرتاپ" کے لئے لکھنے لگے تھے۔ ھندی سے دلچسپی کی وجہ سے انہیں رسالے کے ہندی حصے کا ایڈیٹر بھی منتخب

کیا گیا تھا۔ بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد روزنامہ "مارتنڈ" کے ادبی شماروں کے لئے لکھتے رہے۔ لیکن اس سے انہیں تشفی نہیں ہوئی۔ بلکہ انہیں خود ادبی رسالہ جاری کرنے کی خواہش ہوئی۔ اس کا محرک، جیسا کہ انہوں نے اپنے ترتیب دیئے ہوئے "سواستکا" کے پہلے شمارہ میں لکھا ہے۔ کشمیر میں ادیبوں کی تنظیم انہیں ایک مرکز پر جمع کرنے اور ان کے ذوق کو ابھارنے کی خواہش تھی۔ چنانچہ جنوری ۱۹۴۱ء کے شمارہ میں انہوں نے لکھا تھا:-

"ریاست میں ایک ادبی جرنل کی کمی کو بہت مدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔"

اور اس کمی کو پورا کرنے کے لئے، انہوں نے پہلے ایک ادبی ہفتہ وار "ہمالیہ" نکالا، لیکن یہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے بعض احباب کی مدد سے ایک ماہ نامہ "نرگس" کے نام سے جاری کرنے کی تجویز مرتب کی، لیکن یہ تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی۔ اس سعئی ناکام کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> "ان تمام کوششوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ریاست میں ایک ایسے ادبی رسالے کی بے حد ضرورت ہے جو یہاں کے ادباء کے خیالاتِ پریشان کو ایک سنگم پر لا سکے اور ملک کے ادباء کی آواز کو ملا کر ایک ایسا سوز و ساز پیدا کر سکے جو ریاست کی ادبی فضا میں وجد آفریں اور مسرور کن ارتعاش پیدا کرنے کا موجب ہو۔"

غالباً مالی اور انتظامی دشواریوں کی وجہ سے نیا رسالہ جاری کرنا ممکن نہ ہو سکا، اس لئے انہوں نے ایک رطبی رسالے "سواستکا" کے حلقۂ ادارت کے ساتھ جس میں نمایاں حصہ غالباً کوی راج جانکی ناتھ در کا تھا انہوں نے سمجھوتہ کیا، اور اس کا مالی بار خود برداشت کرنے کا پیش کش کر کے اسے ادبی ماہ نامہ میں تبدیل کر دیا، چنانچہ لکھا تھا۔

> "سواستکا کے اخراجات کا بار اپنے ناتوان کندھوں پر لینے کے باوجود ہم سمجھ رہے ہیں کہ "سواستکا" کی کامیابی کی ذمہ داری ریاست کے ادیبوں کے کندھوں پر بھی اسی قدر عائد ہوتی ہے جس قدر ہم پر۔"

"سواستکار" کے ادبی روپ اختیار کرنے کے بعد کو یراج جانکی ناتھ درؔ اس میں صحت عامہ اور بیماریوں پر مضامین لکھتے رہے۔

ویر جی گیت، نظمیں اور ادبِ لطیف کے انداز کے انشائیے خوب لکھتے تھے۔ ان کے گیتوں میں خاص طور پر بڑا رس ہوتا ہے۔ ذیل میں ایک گیت کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:

رو رو کر یہ اکھیاں سو جھیں

تڑپت بیتے رین

پیتم پیارے روٹھ چلے ہیں

کاہے آئے چین

آن کے پیتم درس دکھاو

ویاکل ہوئے ہیں پران

ویر کی نظموں میں "پربھوسے" "جیون نوکا" "چلے گئے پردیس" وغیرہ جذبات کی ملائمت اور زبان کی سلامت اور لطف کے سبب عمدہ پارے ہیں۔ "پربھوسے" ایک بھگت کی مناجات ہے۔ اس کا اقتباس ہے:-

دین دیا کر میرے سوامی — جیون سارا ویرتھ گنوایا

میں اتی مورت ہوں کھل کامی — پریت کئے پر کچھ نہ پایا

ادھم نیت ہوں اور اتی پاپی — جگ کی مایا ڈھلتی چھایا

بس کیا جانوں ہری دوار — جھوٹا جگ کا پیار

تم ہی سے آشا ہے بھگوان — تم ہی کرو بیڑا پار

ایک اور نظم جس کا عنوان ہے ۔ "رہ رہ کے تڑپائے" زبان میں ہندی اور سنسکرت لفظوں کی زیادتی کے باوجود دلکشی رکھتی ہے۔ اس کا اقتباس حسبِ ذیل ہے:-

اجڑے من کی کون لے سُدھ اب　　کون سُنائے بات

برہ میں ان کے شتھل ہوئے انگ　　کمپت ہیں سب گات

ویربشیشور نے نظم میں کچھ نئے تجربے بھی کئے تھے۔ ان میں "امر گیت" اور "بابا" بہت دلچسپ ہیں۔ "امر گیت"، غنائیہ انداز کا ایک منظوم ڈراما ہے، جس کا موضوع کرشن جی اور رادھا کی داستان محبت کا ایک رُخ ہے۔ یہ نظم طویل ہے اور سات بند پر مشتمل۔ نظم کے بیچ بیچ میں نثری توضیحات بھی آجاتی ہیں۔ اس کا پہلا بند ہے :-

"رادھا، رادھا،

رُوٹھ گئی کیوں

پگلی رادھا

دیکھ، میں آیا تیرے پاس

چُپکے، چپکے، دھیرے دھیرے

جا کہاں سکتا ہوں میں

ڈال سے پنچھی

جائے کہاں

جل سے مچھلی

جائے کہاں

رادھا ... رادھا

روٹھ گئی کیوں ؟

پگلی رادھا

روٹھ گئی کیوں —"

رادھا کا روٹھنا ظاہر ہے، منا سے جانے کے لئے تھا، چنانچہ اس دلچسپ چھیڑ چھاڑ کا انجام رادھا کے مان جانے پر ہوتا ہے ۔

"بابا" ویرجی کی ایک اور منظوم کہانی ہے جس کا متبادل عنوان انہوں نے "گیتوں والی کہانی" بھی مقرر کیا ہے ۔ یہ غنائیہ انداز کی کہانی بھی اپنا ایک خاص رُوپ رکھتی ہے اور اس میں بھی منظوم غنائیہ کے درمیان نثری پارے توضیح کے لئے لائے گئے ہیں ۔ کہانی ایک درویش اور مہارانی کی ہے ۔ مہارانی کو اولاد کی خواہش ہے، اور وہ "بابا" کے پاس اولاد کی تمنا لے کر جاتی ہے ۔ بابا اسے لڑکے کی خوش خبری سناتا ہے ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ بیس برس کے بعد راجکمار محل کا عیش و آرام ترک کر کے سنیاس اختیار کرے گا ۔ لڑکا پیدا ہوتا ہے اور جب کچھ بڑا ہوتا ہے تو ماں کو اکثر لوری سنانے کو کہتا ہے ۔ ماں کی لوری اصل میں اس کی اپنی داستان ہوتی ہے نظم کی بحر بہت رواں ہے، اور ایسے بیانیہ کے لئے بہت موزوں ــ اس کے کچھ شعر ہیں :ــ

ایک نگر اک کٹیا میں بستے تھے دو پرانی
نس دن دونوں ویاکل رہتے مچھلی جیوں بن پانی
دھن کا سکھ تھا کو انہیں پر سکھ سے تھے انجان
جس سکھ کے ابھیلاشی تھے وہ وہ سکھ تھا سنتان

آسان بول چال کی زبان پر ویرجی کی قدرت اور ان کی طبیعت میں رچے ہوئے ترنم نے ساری نظم میں گویا رس گھول دیا ہے ۔

ویر پشیشور نے کچھ افسانے بھی لکھے ہیں، جن میں سے کچھ ان کی کالج کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان کا ایک افسانہ "ابھاگن" ذیلی توضیحی عنوان "کالج کی زندگی کا ایک رومان" کے ساتھ شایع ہوتا تھا ۔ اس میں دو ساتھ پڑھنے والے طالب علموں، موہن اور سروجنی کی محبت کی ناکام داستان بیان کی گئی ہے ۔

ان کے دوسرے قابلِ ذکر افسانے "ایکٹرس" "بابو" "میر بھی بھینٹ" اور "شہزادہ" ہیں۔ "ایکٹرس" اور "بابو" سماجی زندگی کی کہانیاں ہیں۔ ان کا ایک اور اچھا افسانہ "ادیب" مارتنڈ کے شمارہ ۲۸ جون ۱۹۴۷ء میں شایع ہوا تھا۔ یہ افسانہ اُن کے دُوسرے روایتی تکنیک کے افسانوں کے مقابلے میں کچھ نُدرت رکھتا ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :-

" اس کی پہلی کہانی تھی "میرا جنم" ایک رُلا دینے والا افسانہ، ایک بچے کی پیدائش کی کہانی، جس کے جنم پر ایک دل بھی خوشی سے جھوم نہ سکا۔ ایک زبان بھی، اسے آسیس نہ دے سکی . . . . . . اور اس کے بعد اس نے دوسرا افسانہ لکھا "میرا گھر"....."

افسانے میں ایک ادیب کی فلا زدہ زندگی کی تصویر بڑی خوبی سے ابھاری گئی ہے۔ ویر بشیشور مضامین بھی لکھتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون جو کالج کی زندگی سے متعلق ہے، "نتیجے کے بعد" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ ویر بشیشور نے بھی پردیسی اور چند اور معاصر ادیبوں کی طرح ادبِ لطیف کے انداز کے انشائیے بھی لکھے ہیں۔ اِن کے اِنشائیوں میں "دو آغاؤں کی تصویر" "زندگی اور موت" "مجھ سے نہ پوچھو" "گمنام قبر" اور "گنبد" قابلِ مطالعہ ہیں۔ آخری دو انشائیے انگریزی سے منتقل کئے گئے ہیں۔ "زندگی اور موت" سے ایک اِقتباس دَرجِ ذیل ہے، جس میں ایک ماں ایک سپوت کو سمجھاتی ہے :-

" یہ جیون کیا ہے ؟ یہ ایک سنگرام ہے، میرے لال، جہاں سب سے مضبوط نیزہ ناکام رہ جائے، جہاں ہوشیار آنکھیں دھوکا کھا جائیں، اور معصوم کچلے جائیں . . . .

جہاں دشمن ہر دور سے رکھے ہوتے ہیں، شب و روز آرام نہیں کرنے دیتے اور ہم سنگرام کے درمیان کھڑے ہیں ۔"

اِس زمانے کے ایک مزاحیہ شاعر پنڈت لمبو درجی کدلہ بجو روشن ہیں، مزاحیہ نظموں کے علاوہ وہ مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کی ایک نظم جو "ہندو جاگو" کے عنوان سے چھپی تھی۔ اِس کے چند شعر ہیں :-

تلاشِ "جاب" میں نکلے جو سرگرم فغاں ہو کر
فلک ہنسنے لگا انگشت حیرت در دہاں ہو کر

جدھر دیکھو اِدھر تخفیف کی صورت ہویدا ہے
دلِ ناداں، چلا ہے کس ہوس میں شادماں ہو کر

لگا کر شہد چاٹیں ڈگریوں کو ڈگریاں والے
حکیموں نے بنایا ہے یہ نسخہ مہرباں ہو کر

نہ سروس ہے نہ دھندا ہے غرض روشن یہ آفت ہے
الٰہی کاش سُن لے تو ہی اِس کی مہرباں ہو کر

ایک اور شاعر، جنہیں شعری روایات پر اچھی دسترس حاصل تھی "فسرن پوش" کے فرضی نام سے مزاحیہ انداز میں لکھا کرتے تھے۔ ایک نظم کے کچھ شعر ہیں :-

مانعِ وصل اسے شرم و حیا ہوتی ہے
چھیڑتا ہوں تو کمبخت خفا ہوتی ہے

پا کے سوراج حسینوں کو کریں گے تاراج
کسی امید پہ یہ عمر فنا ہوتی ہے
ناک میں دم ہے، شبِ ہجر کی ایسی تیسی
سر پہ نازل یہ سرِ شام بلا ہوتی ہے

لالہ منوہر لال شہید، جموں کے شعرا میں، اردو اور ہندی دونوں کے اسالیب پر قدرت رکھنے کی وجہ سے ممتاز رہے ہیں۔ قومی اور اخلاقی نظموں کے علاوہ انہوں نے رومانی انداز کی نظمیں بھی کہی ہیں۔ شاعری سے ان کے غیر معمولی شغف کا اندازہ اس سے ہوتا ہے۔ کہ وہ قانون کے طالب علم رہے اور جموں میں وکالت کرتے ہیں۔ ان کی ایک قومی نظم کے چند شعر ذیل میں درج ہیں، جن سے اُن کے مزاحیہ اُفتادِ طبع پر روشنی پڑتی ہے۔

جئیں جو انان ملک و ملت محافظ ننگ و نام ہو کر
نہ یہ کہ مظلوم قوم پر گر پڑیں وہ خونی نہنگ ہو کر
ہو عرش بالاتریں سے بالا تمہاری پروازِ تخیل
مگر نہ غیروں کے ہاتھ میں تم اڑو بسنتی پتنگ ہو کر
گناہ سے پاک، نیک معصوم زندگی ہو شہید تیری
مگر جھپٹ دشمنوں کے اوپر ببرو شیر و پلنگ ہو کر

یہ نظم اپریل [illegible]ء میں "مارتنڈ" میں شائع ہوئی تھی، جو اس دور کے قومی انداز کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ ان کی ایک اور نظم جو اسی زمانے میں "درسِ عمل" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، اس میں بھی نوجوانوں کو اس طرح نصیحت کرتے ہیں۔

اے کشتۂ جورِ فلک، آہ و فغاں بے سود ہے
اے آتشِ خاموشِ غم، سوزِ نہاں بے سود ہے
ہمت سے دکھ کو دور کر، دکھ کا بیاں بے سود ہے

یعنی کبھی رویا نہ کر
اشکوں سے منہ دھویا نہ کر
غفلت میں یوں سویا نہ کر

ہندی کے اسلوب میں ان کی ایک خوبصورت نظم "الغم گیت" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، جس کے شعر ہیں:۔

آؤ چلیں اِس پار سجنیا آؤ چلیں اُس پار
یہاں کوئی من کا میت نہیں ہے

اس بستی میں پیت نہیں ہے

پیت یہاں کی ریت نہیں ہے　　　کس سے کیجئے پیار سجنیا

آؤ چلیں اُس پار

پار ندی کے ڈیرہ ڈالیں

پریم نگری ایک بسائیں

من مندر میں جوت جگائیں

چھیڑیں من کے تار سجنیا　　　آؤ چلیں اُس پار

پنڈت نرائن جو رینہ عنقا تخلص، خوش فکر شاعر ہیں۔ رعناواری میں ان کا قیام ہے۔ ان کی نظمیں جو عموماً مذہبی موضوعات لکھی ہوئی ہیں، اخباروں میں شایع ہوتی رہیں۔ ایک کافی طویل نظم امرناتھ کی یاترا پر "شری امرناتھ سوامی" کے عنوان سے لکھی تھی، جس کے اقتباسات ذیل میں لکھے جاتے ہیں:۔

دُور بستی کے تلاطم سے بسی ہے وہ جگہ

اور برفانی پہاڑوں سے گھری ہے وہ جگہ

مضطرب تھا دل مرا، خوش دامن کہسار تھا

دل کسی کے شوق میں وارفتہ دیدار تھا

اپنی فیاضی سے فطرت نور برسانے ... لگی

دور سے روشن گپھا کی اک جھلک آنے لگی

آگے اس مقام اور اس کی کیفیت کی تفصیل بیان کرتے ہیں:۔

سامنے کشکول رکھا تھا کھرل بھی پاس تھا

دفعتاً ڈمرو سے 'بم بم' کی صدا آنے لگی

پھر عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہیں :-

ہے دماہ کرتے وہاں ہیں جبۂ سائی، بندگی
اس طرح ہوتا ہے ہمدم احترام زندگی

اسی طرح ساری نظم جذبات عقیدتمندی سے پر ہے ، آخر میں کہتے ہیں :-

کیف کے عالم میں جب مختارِ کل میں ہو گیا
بخت عنقاؔ اپنی عظمت سے پھسل جانے لگا

عنقاؔ مزاحیہ انداز کے انشائیے بھی لکھتے تھے۔ کچھ مضامین اور نظمیں بھی انہوں نے مزاحیہ لکھی ہیں، جن میں "اضطرابِ دل" خاص طور پر دلچسپ ہے۔

پنڈت دینا ناتھ نادمؔ، جو نادم کشمیری کے نام سے لکھتے رہے، کشمیری کے سر برآوردہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کا آغاز بھی اردو سے ہوا۔ وہ سحر مشرقی کے نام سے بھی لکھتے رہے۔ کشمیر میں اردو شاعری اور ادب کو ترقی پسند تصورات سے روشناس کرانے والے اولین ادیبوں میں نادم بھی شامل ہیں۔ اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکوں کو آگے بڑھانے میں ان کا بڑا حصہ رہا اور فسادات اور تقسیم ملک کے ساتھ برپا ہونے والے ہنگاموں اور کشمیر پر قبائلی حملے کی شکست و ریخت کے بعد ریاست کی تہذیبی اور ادبی تعمیر نو میں بھی ان کا ہاتھ رہا۔

نادمؔ سری نگر کے ایک متوسط خاندان میں مارچ ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد ہی ۱۹۲۳ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا، اور والدہ نے بڑی جدوجہد اور مشقت سے انہیں میٹرک پاس کروایا اور اپنی ذہانت کے سبب انہوں نے درجہ اوّل حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ سری پرتاپ کالج میں شریک ہوئے لیکن تعلیم کے اخراجات کا بار اٹھانے کی سکت نہ ہونے کی وجہ سے، انہوں نے خانگی طور پر بچوں کو پڑھا کر تعلیم جاری رکھی۔ آخر محکمۂ تعلیم میں ملازمت اختیار کرنی پڑی اور ایک

مدرسہ میں مدرس ہو گئے۔

اسی زمانے میں نادم انہیں اردو شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ شعر و سخن سے انہیں بچپن سے رغبت تھی۔ شعراء کے کلام کے مطالعے اور خاص طور پر چکبست کی قومی، اخلاقی اور تاریخی نظموں اور غزل سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ چکبست ہی کے انداز اور انہیں کی بحروں میں لکھنے لگے۔ اس زمانے کی لکھی ہوئی نظموں میں چکبست ہی کی طرح جوش قومی اور حب وطن کے جذبات اُبل پڑے ہیں۔ یہ جوش و خروش بعد میں بھی باقی رہا، خاص طور پر اس زمانے میں، جب وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں کشمیر میں جب آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو نادم اپنی ساری ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے ساتھ اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ اور محنت کش عوام کی حسرتناک زندگی کی ترجمانی کرنے لگے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک، کشمیر کے ادبی حلقوں میں سے ابھی ابھی روشناس ہوئی تھی، نادم نے پہلی نظم جو "مزدور کا خواب" کے عنوان سے لکھی تھی، اس کا لب و لہجہ، حکومت کے ٹھیکہ داروں کے لئے بنا تھا، یہ نظم جب ایک جلسہ میں پڑھی گئی، تو اقتدار کے کان کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ اس سے عوام کو بھڑکانے اور بغاوت پر اُبھارنے کی بو آتی تھی۔ اس نظم کے چند شعر ہیں:-

رات کا پچھلا پہر تارے ہوئے ہیں محوِ خواب
دامنِ بادل میں جاکر سو چکا ہے ماہ تاب

پھر رہے ہیں چار سُو، مایوس ٹکڑے ابر کے
گھاٹیوں میں کنگروں پر اونگھتے ہیں دُھند لکے

ایک ٹوٹا جھونپڑا، مخزوں سا ویرانی میں ہے
شب کا سایہ صبح کے بہتے ہوئے پانی میں ہے

اس ٹوٹے جھونپڑے اور مزدور کی زندگی کے اثاثے کی آگے حسرتناک تصویر کھینچی ہے۔ یہ نظم سحر مشرقی کے نام سے شایع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کی دوسری باغیانہ نظم "کشمیر" شایع ہوئی۔ ان کی تیسری نظم "مزدور کی موت" حکومت کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور ان کی گرفتاری کے احکام صادر ہو گئے۔

نادم کی ان نظموں پر لاہور کے مشہور مزدور شاعر، احسان بن دانش کا بہت اثر تھا۔ بعد میں جب ان کا ذوق نکھرتا گیا، تو وہ جوش کی ولولہ انگیز انقلاب پسند شاعری کے اثر میں آتے گئے اور اس انداز میں بھی کچھ نظمیں کہی۔ اردو میں ان کی نظم نگاری کا سلسلہ ۱۹۴۱ء تک جاری رہا۔ اس دوران میں انہوں نے غزل بھی کہی اور کئی اچھی غزلیں سرانجام کیں۔ غزل عموماً وہ سحر مشرقی کے نام سے لکھتے تھے۔ نادم کی غزل کو شستگی بخشنے اور اس کی تکنیک کا احاطہ کرنے میں، علامہ عابل درویش کی صحبتوں کو بہت دخل رہا۔ ان شعری صحبتوں کو ایک باقاعدہ شکل دینے کے لئے ۱۹۴۰ء میں بزم ساغر کے نام سے ایک انجمن کی بنا ڈالی گئی تھی جس کے صدر خود نادم منتخب ہوئے تھے۔ ساغر (نند لال کول) کا تخلص تھا، جو شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ بزم ساغر کے اہتمام میں طرح مصرعہ پر غزلیں کہی اور پڑھی جاتی تھیں۔ ان محفلوں میں نادم اور علامہ عابل درویش کے علاوہ شائق کشمیری، قاضی پریم نگری، زخمی کاشمیری، آغا افضل، راجہ محبوب علی خان محبوب ساغر، شاد کشمیری اور کئی اہل ذوق شامل ہوتے تھے۔ غزلوں کے لئے عموماً طرح ساغر کی غزلوں سے منتخب کی جاتی تھی۔ اس کی کچھ تفصیل اداروں کے ذکر میں آ رہی ہے۔ پہلے مشاعرے میں مصرعہ طرح ــــ "صدائیں دو مرے گذرے ہوئے زمانہ کو۔" پر نادم نے دو غزلیں کہی تھیں، ایک خود نادم کے نام سے شایع ہوئی اور دوسری سحر مشرقی کے نام سے۔ ان دونوں غزلوں سے ایک ایک شعر ذیل میں درج ہے۔

مجھے تمہارا تصوّر، تمہیں خیالِ رقیب — میں یاد آنے کو، روؤں کو بھول جانے کو

کھلی رہے گی پسِ مرگ چشمِ تر میری — کہ دار ہیں دردِل تیرے آنے جانے کو

بزم کا دوسرا مشاعرہ جولائی ۱۹۴۰ء میں منعقد ہوا تھا، جس کے لئے طرح مصرعہ دیا گیا تھا ــــ
"ایک عالم سامنے آیا، عالم دل میں ہے" ۔ نادم نے اس کے لئے بھی غزل کہی تھی ۔ سحر مشرقی کی
غزلوں نے اہلِ محفل سے ان کے لئے "مصور فطرت" کا لقب حاصل کر لیا تھا ۔ اس زمانے میں نادم نے جو
غزل کہی تھی، وہ "سحر پاشیاں" کے عنوان سے "مارتنڈ" کے ادبی اڈیشن (۳ ستمبر ۱۹۳۹ء) میں شایع ہوئی ۔
یہ نادم کی فکر کے عمدہ نمونوں میں سے ہے ۔ غزل کے ساتھ علامہ عامل درویش کا یہ نوٹ بھی شایع ہوا تھا ۔

"معنوی لحاظ سے سحر جہاں کھڑا ہے، سرمستی و سرشاری، تاثیر و دلفگاری اس کے ہر شعر
سے عیاں ہے ــــ"

اس غزل کے دو شعر ہیں :- ــــ

اسیر عشق ہوا، آبرو کی خاک اڑی ہے ۔۔۔ زباں پہ حرفِ وفا صورت سوال آیا

سحر تو فکر عمل سے جو بے نیاز ہوا ۔۔۔ زیاں و سود کو دریا میں جا کے ڈال دیا

نادم کی بعض اچھی رومانی انداز کی نظمیں بھی اسی زمانے میں کہی ہوئی ہیں ۔ ان میں "دختر کہسار" اور "جمنا کے
کنارے" خوب صورت نظمیں ہیں، جن میں منظر کی خوبی اور جذبات نگاری کا حسن جاذب توجہ ہے ۔

۱۹۴۷ء کے بعد، تحریک آزادی کے قائدین نے، سرزمین کے ادیبوں اور فنکاروں کی صلاحیتوں
کو صحت بخش تعمیری مدھوں پر ڈالنے کے مقصد سے کلچرل فرنٹ قائم کیا، تو فطرتاً نادم اس کے سرگرم
رکن بن گئے ۔ وہ فرنٹ کے جنرل سیکریٹری بھی منتخب ہوئے، اور اس حیثیت سے شیخ محمد عبداللہ وزیر اعظم
کشمیر کے معتمد علیہ بھی رہے ۔ فرنٹ کی سرگرمیاں جن وسیع شعبوں پر حاوی تھیں ۔ ان کے سرانجام اور ان
کی تکمیل کے سلسلے میں نادم کو ریاست کے مختلف حصوں کا دورہ کرنا پڑتا تھا ۔ اسی طرح کے ایک دورے
میں وہ رانگر گئے ۔ جہاں ان کی ملاقات پیر غلام احمد مہجور سے ہو گئی ۔ مہجور جو پہلے اردو میں کہتے تھے، کچھ عرصہ

قبل سے کشمیری میں کہنے لگے تھے۔ میرزا غلام حسن بیگ عارفؔ کی ترغیب پر ناد مؔ کو بھی کشمیری میں شعر کہنے کی تحریک ہوئی۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز نے ۱۹۳۵ء میں "ہمدرد" ہفت روزہ جاری کیا تھا، جس میں نادمؔ کی وہ نظمیں شایع ہوئیں، جو حکومت کے خلاف بغاوت پر محمول کی گییئں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد بھی اس زمانے میں رکھی گئی جس میں نوجوان ادیب شامل تھے ان میں قابل ذکر، عارفؔ...، رامانند ساگر کشمیری، سوم ناتھ زتشی اور مہندر رینہ ہیں جو پہلے شادؔ کشمیری کے نام سے لکھتے تھے۔

نادمؔ نے ۱۹۴۲ء تک ہندو سکول میں کام کیا تھا۔ لیکن سکول کے منتظمین سے اختلافات کی وجہ سے انہوں نے ملازمت ترک کردی اور لاہور چلے گئے، جہاں علوم مشرقیہ کے ادارے میں وہ شریک ہوگئے اور فارسی میں ایم۔اے کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ یہاں اُن کا تعارف احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، ن۔م۔ راشد اور کئی نوجوان ترقی پسند ادیبوں سے ہوا اور ان کی صحبتوں میں بھی وہ شامل رہے۔ لاہور میں قیام کے زمانے میں کچھ عرصہ "ویر بھارت" اور "ملاپ" کے حلقہ ادارت میں بھی انہوں نے کام کیا۔ دو سال بعد کشمیر لوٹے تو آزادی کی تحریک شروع ہو چکی تھی، اور اس کے ساتھ وہ وابستہ ہوگئے۔

ترقی پسند تحریک سے گہری وابستگی کے باعث، چین کے دورہ کے لئے بھی اُن کا انتخاب ہوا تھا، اور چین میں قیام کے زمانے میں وہاں کے ثقافتی اور ادبی اداروں سے انہوں نے رُوشناسی حاصل کی۔ کشمیر میں جب انجمن اساتذہ کا قیام عمل میں آیا تو نادمؔ اس کے بھی جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ نوجوان ادیبوں کی کوششوں سے، اردو اور کشمیری کا ماہ نامہ "کونگہ پوش" جاری ہوا، اور اس کی ترتیب کا کام نادمؔ ہی کے ذمہ کیا گیا۔ پھر کشمیری ہفتہ وار "گاش" جب دوسری مرتبہ جاری کیا گیا تو اس کی ادارت کے فرائض بھی وہ انجام دیتے رہے۔ جموں و کشمیر ٹیچرز فیڈریشن کے قیام میں ان کی مساعی کو بہت دخل رہا اور اس کے جنرل سیکریٹری بھی وہی منتخب ہوئے تھے۔ اساتذہ کے حلقے سے وہ ریاست کی قانون ساز کونسل کے رُکن بھی چنے گئے تھے۔

۱۹۶۵ء میں نادم سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے، اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر سوشل ایجوکیشن کی حیثیت سے ۱۹۶۸ء تک برسرِ خدمت رہے۔ اس خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سے للہ دید ہائیر سیکنڈری سکول کے اعزازی صدر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

اردو میں نادم کی تخلیقات وسیع عنوانات پر منقسم ہیں۔ نظم اور غزل کے علاوہ انہوں نے چند منظوم کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ کچھ افسانے، مضامین، انشائیے اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ سماجی اصلاح سے متعلق ان کا ایک اچھا مضمون "جہیز کی لعنت" "مارتنڈ" میں شایع ہوا تھا۔ ایک اچھا انشائیہ انہوں نے "کاغذ کے ٹکڑے" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس کا اقتباس نیچے درج کیا جاتا ہے:-

"جیون خود بھی ایک حادثہ ہے ــــ جیون یاترا، حادثات کی یاترا ہے۔ جنم کا حادثہ ــــ لگاؤ اور اُنس کا حادثہ ــــ ناحق کے رشتوں کا حادثہ ــــ کیا کیا جائے، چھٹکارے کی سعی لاحاصل ہے ــ "آپے" سے کیسے بھاگا جائے ــ

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا"

اختر لولابی، اچھے کہنے والوں میں سے ہیں۔ ان کا کچھ کلام "پرتاپ" میں شایع ہوا ہے۔ دو شعر ہیں:

گل کو گلچیں لے گیا تجھ کو خزاں لے جائے گی
اے گلِ لالہ نہ یوں مارے خوشی کے پھول تو

زبان گدی سے کھینچوں گا تیری اظہارِ الفت پر
جواب نامہ میں ملتی ہیں یوں دلبر کی تحریریں

کوثر سیمابی کے نام سے شیخ منظور الٰہی لکھا کرتے تھے۔ سری نگر ان کا وطن تھا، اور سیماب اکبر آبادی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ پیشہ وکالت تھا، ملک کی تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ ۱۹۴۷ء تک ان کا

کلام "ہمدرد" اور "پرتاپ" میں شایع ہوتا رہا۔ کچھ کلام "مارتنڈ" میں بھی شایع ہوا ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے کوثرؔ بھی متاثر تھے۔ اُن کی ایک نظم کا عنوان ہے۔ "آج کے دن بھی ہے مُفلس مُفلسی سے اشکبار" اس نظم کے چند شعر ہیں :-

کون پرسان ہے غریبوں کا جہاں میں حالِ زار
اشک آلودہ ہیں آنکھیں اور دامن تار تار
چھا رہی ہے چار سُو افلاس کی کالی گھٹا
زندگی کا ہے مگر فیشن پہ سب دار و مدار
اب نئے اٹھتے جوانوں کا عجب ہے بانکپن
جن کے چہروں سے عیاں نسوانیت کی ہے بہار
نازنینوں کی طرح سے آئینہ ہے رُوبرو
... پاوڈر سے ہے مطلب اور شانے سے ہے پیار
ریش، موچھیں سب صفا، گلفام سے ناز کبار
پھر نہ کیوں ان کو کریں ہم نازنینوں میں شمار
مردِ میدان ہو نہیں سکتے کبھی ایسے جوان
جن کو راحت کی طلب ہو اور عشرت سے ہو پیار

کشمیر کے موسم زمستان پر بہت کم شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ کوثرؔ نے "کشمیر کی سردی" کے عنوان سے ایک نظم ۱۹۳۶ء میں لکھی تھی جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے :-

بیان کرنے کے قابل ہے کہاں کشمیر کی سردی
یہاں کب کام آتی ہے جوانوں کی جوانمردی

سدا ابرِ سیہ ہیں چرخ نیلی فام پر چھائے
یہاں تو دن بھی گویا اک شبِ ظلمت نظر آئے
لحافِ ابر سے باہر کبھی خورشید آتا ہے
تو قرصِ آتشیں ہوتا ہوا بھی کانپ جاتا ہے
فقط اک کانگڑی ہے جو نبھاتی ہے وفا اپنی
یہی مونس ہے اپنی اور یہی مشکل کشا اپنی
نہ گل ہے اور نہ گلچیں اور نہ بلبل کی صدا باقی
چمن میں رہ گیا کوثر فقط نامِ فدا باقی

کوثر کو مضمون نگاری سے بھی دلچسپی رہی، اور ان کے کچھ مضامین تہواروں اور تقریبوں کے موقعے پر اخباروں میں شایع ہوتے تھے۔ ایک مضمون جو انہوں شیوراتری کے موقعے پر اسی عنوان سے لکھا تھا۔ "مارتنڈ" (فروری ۱۹۳۶ء) میں شایع ہوا تھا۔

حبیب کیفوی، جموں کے اُن ادیبوں کے اُس گروہ سے ہیں، جو آزادی اور تقسیم ملک سے پہلے منظرِ عام پر آئے۔ لیکن تقسیم کے بعد کئی اور ادیبوں کی طرح حبیب بھی پاکستان چلے گئے اور اس وقت رائٹرز گلڈ سے منسلک ہیں اور علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اُن کے قیامِ جموں کے زمانے میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، ریاست کی ملازمت میں تھے۔ حبیب بھی ان کے تلامذہ کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ غزل میں انہوں نے اچھی مہارت بہم پہنچائی ہے اور نظم بھی کہتے ہیں منشی سراج الدین اور چودھری خوشی محمد ناظر کی صحبتوں سے بھی حبیب کیفی بہرہ یاب ہوئے۔ اِس زمانے کی ادبی چہل میں ان کا اور ان کے دوسرے رفقاے کار، قمر قمرازی، ڈاکٹر عماد الدین سوز، غلام جیلانی اثر، قیس شیرانی کا بڑا حصہ تھا۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں کے حبیب روحِ رواں تھے۔ میرزا کمال الدین شیدا نے ایک مشاعرے کی تفصیل مجھے بتائی۔

جو ۱۹۳۴ء میں سری نگر کی نمائش گاہ میں کمیٹی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ مشاعرے کے لئے طرح "انتہائے عشق نے مجنوں کو لیلیٰ کر دیا" مقرر تھی۔ اِس طرح پر حبیب نے جو غزل سُنائی تھی۔ شیدا کے حافظہ میں محفوظ رہ گئی تھی۔ انہوں نے مجھے عنایت کی، جو یہاں درج کر رہا ہوں۔

ہائے، یہ کیا کیا تو نے اے دستِ تمنا کر دیا
اس سراپا ناز کو عالم میں رُسوا کر دیا

میں علاجِ درد سمجھا تھا نگاہِ لُطف کو
پھر یہ دیکھا درد اِس نے اور دونا کر دیا

اے نگاہِ مستِ ساقی مانگ لے کچھ اور بھی
دل تو ہم نے آج نذرِ جام و مینا کر دیا

دیکھ لے جی بھر کے اے مشتاقِ حسنِ روئے دوست
شوقِ بے پروا نے ان کو عالم آرا کر دیا

حبیب "امر" جموں میں اکثر لکھتے تھے۔ انہوں نے اس رسالے کی کرن نمبر کے لئے فیڈرک ڈریو کی کتاب سے مہاراجہ گلاب سنگھ کے کچھ حالات اخذ کر کے ایک مضمون "شاہی دربار" کے عنوان سے لکھا ہے۔ فیڈرک ڈریو ۱۸۶۲ء میں، ماہرِ علم ارضیات کی حیثیت سے ریاست کی ملازمت میں داخل ہوئے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں وہ خدمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان واپس گئے اور دو سال کے بعد اپنی کتاب شائع کی مضمون میں رنبیر سنگھ کے نظم و نسق اور خاص طور پر فصل خصوصیات کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی روزمرہ زندگی اور ان کی دلچسپیوں اور طریقہ کار کے بارے میں کچھ تفصیلات پنڈت ہرگوپال خستہ نے بھی اپنی تاریخ "گلدستہ کشمیر" میں دی ہیں۔ حبیب کے مضمون سے نوروز اور بسنت کی تقریبوں کے بارے میں دلچسپ معلومات بہم پہنچتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

بہار کی آمد پر بسنت کا دربار منعقد ہوتا تھا، جس میں تمام لباس بسنتی ہوتا اور

بعض صرف پگڑی بسنتی پہنتے تھے۔ اس دربار پر ملازمان شاہی حکمران کو

نذریں پیش کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دربار پریڈ گراونڈ میں ایک بڑے شامیانے

کے نیچے منعقد ہوتا تھا۔ مہاراجہ بہادر اور تمام درباری جلوس کی شکل میں گھوڑوں

کا زرّین اور سواروں کا بسنتی لباس عجب بہار سماں پیش کرتا تھا۔ خود مہاراجہ

بھی بسنتی لباس میں ہوتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

حبیب کیفوی، کشمیر سے اپنی دلچسپی کی یادگار کے طور پر اس وقت جموں و کشمیر کے اردو شعراء کا تذکرہ مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔[۱]

حبیب کے دوسرے معاصرین میں حسن محمد منہاس، محمد امین شمیم اور کیف اسرائیلی بھی شعر و سخن کی دلچسپی میں کسی اور سے پیچھے نہیں تھے۔ حسن محمد منہاس کی طرف حکیم فیروز الدین طغرائی کے شاگرد کی حیثیت سے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ استاد کی توجہ نے انہیں غزل پر تصرف حاصل کرنے میں بڑی اعانت کی اور اب تذہ کی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئے عہد کے تصورات کو بھی غزل میں سموتے ہیں۔ شمیم بانڈی پورہ کے متوطن تھے۔

سردار ناتھ آفتاب کی نشو و نما پونچھ میں ہوئی تھی، جہاں ان کے والد ریاست میں تحصیلدار تھے۔ ان کے آبا کا وطن بھیرہ ضلع سرگودھا تھا، جو اب مغربی پاکستان کا علاقہ ہے۔ آفتاب ۱۹۰۸ء میں بھیرہ ہی میں پیدا ہوئے۔ لیکن سن شعور تک پونچھ میں قیام رہا، اور ابتدائی تعلیم وہیں پائی پھر لاہور کے ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا، اس کے بعد وہ دہلی گئے اور آیورویدک اور یونانی طبیہ کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۸ء میں فارغ التحصیل ہو کر، پونچھ لوٹے اور مطب کر رہے ہیں۔ دہلی میں قیام کے زمانے میں شاعری سے بھی لگاؤ پیدا ہوا، اور غزل کہہ کر مشاعروں میں سنانے لگے تھے۔

---

[۱] یہ تذکرہ مرکزی اردو بورڈ، لاہور کے اہتمام سے کب کا شائع ہو چکا ہے۔ (مرتب)

سائل دہلوی سے انہیں تلمّذ رہا۔ غزل کا انداز زیادہ تر عاشقانہ ہوتا ہے۔ جس میں اخلاق اور تصوّف کے نکات بھی باندھے جاتے ہیں۔ ایک غزل کے کچھ شعر ہیں :۔

جہانِ رنگ و بو میں حسن و الفت کے سوا کیا ہے
جدھر دیکھو محبت ہے، محبت کے سوا کیا ہے

نہ جانے کیا سمجھتے ہیں، خدا کو حضرتِ زاہد
وجودِ کبریا، حسنِ عقیدت کے سوا کیا ہے

ضیائے آفتابِ عشق سے دُنیا منوّر ہے
نہ ہو یہ نور تو دنیا میں ظلمت کے سوا کیا ہے

ایک اور غزل کے دو شعر ہیں، جن میں اخلاقی پہلو، اپنے مخصوص تیور رکھتے ہیں۔

احسان ناخدا کا اٹھایا نہ کیجئے
مر جائیے پہ منّتِ عیسیٰ نہ کیجئے

سرمایۂ حیات ہے انسان کا ضمیر
اس دُرِّ شاہوار کو بیچا نہ کیجئے

آفتاب نے کچھ نظمیں اور کچھ نعتیں بھی کہی ہیں۔ ان کی ایک نعت جو پونچھ کے ہفتہ وار "المجاھد" میں چھپی تھی، اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے :۔

پیامِ محمدؐ نشانِ اخوت ہے دُنیا میں راحت تو عقبیٰ میں دولت
دیا درسِ توحید دنیا کو اس نے اسی نے سکھائے رموزِ محبت
غریبوں کا مولیٰ یتیموں کا آقا تھی ذات اس کی سب کے لئے بابِ رحمت

آفتاب کو صحافت سے بھی دلچسپی رہی، چنانچہ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے "آفتاب" کے نام سے ایک ہفتہ وار

جاری کیا تھا، جو ۱۹۴۵ء تک شایع ہوتا رہا۔

پنڈت جیالال بھان برقؔ، ان پنڈت شعرا میں جو اس صدی کے تیسرے دہے میں کافی لکھتے رہے، ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت قصبہ ویرناگ میں ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ جہاں ان کی ابتدائی تعلیم بھی ہوئی۔ اس کے بعد سری نگر میں کالج کی تعلیم حاصل کی۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں اچھے صاحبِ ذوق اساتذہ کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کا انہیں مواقع ملے۔ اور وہ شعر کہنے پر مائل ہوئے۔ پروفیسر نند لال طالبؔ کو کلام دکھاتے تھے۔ تعلیم کے دوران انہیں طب سے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی، اور وہ لاہور جاکر ہیومیوپیتھی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ۱۹۴۲ء میں سند حاصل کرکے وہ سرینگر لوٹے اور اپنا مطب قایم کرکے خدمت کررہے ہیں۔

برقؔ، غزل اور نظم دونوں کہتے ہیں بلکہ غزل سے زیادہ ان کی دلچسپی نظم سے ہے اور وسیع موضوعات پر وہ طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ ان کا کلام جب کشمیر میں اخبار نہیں تھے۔ لاہور کے بعض اخباروں اور رسالوں اور خاص طور پر "بہارِ کشمیر" میں چھپتا رہا۔ سری نگر سے اخباروں کے اجرائے کے بعد وہ یہاں کے اخباروں اور خاص طور پر "مارتنڈ" میں اپنا کلام چھپواتے رہے۔ اب تک اُن کے کلام کا ایک مجموعہ مرتب ہوگیا ہے، جیسے انہوں نے "عالمِ خواب" کے نام سے موسوم کیا یہ مجموعہ غزلوں، مذہبی، ملّی، اخلاقی اور مناظرِ فطرت پر لکھی ہوئی کوئی ستّر کے قریب نظموں پر مشتمل ہے۔ ان کی ایک نظم، جو "آئینۂ فطرت" کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے۔ اس سے شعر کی تکنیک اور زبان پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوسکے گا۔ اس نظم کا پس منظر ظاہر ہے، کشمیر ہے:۔

جہاں آئینۂ اسرارِ فطرت کا نظارہ ہے
کہ گویا خلا میں گلزارِ فطرت کا نظارہ ہے
بہارِ خندۂ گُل کی نسیم مشک آگیں ہے

نظارہ سوز یارب کیا یہ اپنی بزم رنگیں ہے
یہ عالم رونما بیشک ہے جلوہ زارِ فطرت کا
کوئی کب جان سکتا ہے، معمہ زارِ فطرت کا

نشاط آرزو میں زیست کی پنہاں حقیقت ہے
نہیں تو زندگانی ایک تصویرِ مشیت ہے

زمانہ بھی ہے اک خوابِ گراں کی دلکشا تعبیر
یہ کاخِ زندگانی بھی ہے مشتِ خاک کی تعمیر

جو چشمِ دل نہیں بینا تو حق سے آشنائی کیا
جو خلا کوش جہاں دل ہے تو لطفِ پارسائی کیا

شبابِ برق کی صورت قرارِ زندگانی ہے
گلوں پر صورتِ شبنم بہارِ زندگانی ہے

"جلوہ بہار" بھی ان کی اچھی نظموں میں سے ہے، جس کے دو شعر ہیں :-

شگفتہ ہیں گل ارماں بہارِ زندگانی سے
نظر آتی ہے دنیا آج خنداں شادمانی سے

سمجھتے اہلِ دنیا ہیں سماں یہ عیش و عشرت کا
نظر میں برق کے لیکن ہے جلوہ حسنِ فطرت کا

برق کی بعض مذہبی نظموں میں ان کے جذبۂ خلوص اور عقیدت نے، لطف و دلبستگی پیدا کر دی ہے۔

"بھگوان شیو سے" اِس طرح نظموں میں ان کی شاید یہ سب سے اچھی نظم ہے۔ اس کے کچھ شعر ہیں :-

مجھے اے حُسنِ فطرت کچھ نیا لطف جوانی دے

مرے جذباتِ پژمردہ کو آبِ زندگانی دے

یہ کب کہتا ہوں تو مجھ کو حیاتِ جاودانی دے

مگر دو چار دن کی تو بہارِ شادمانی دے

کبھی کی یاد میں میری طبیعت شاد ہو جائے

کبھی تو دل کی بستی اس طرح آباد ہو جائے

اپنے ہم وطن چکبست پر بھی انھوں نے ایک اچھی نظم "آئینہ چکبست" کے عنوان سے لکھی ہے، اور چکبست پر لکھی ہوئی نظموں میں ان کے ایک ہم وطن کے جذباتِ عقیدت ہونے کے لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے۔ کہتے ہیں:۔

تیری صبحِ وطن آئینہ دارِ حسرتِ دل ہے ۔۔۔ سمجھا مقصدِ حُسنِ سخن کا سخت مشکل ہے

نئے انداز کی تو شاعری کا ایک مُوجِد تھا ۔۔۔ دل و جان پر بڑا احسان ہے تیری نواؤں کا

اپنے وطن ویری ناگ سے ان کو جو محبت ہے، اس کا پرتو، نظم "ویری ناگ کا مفہوم" میں نظر آتا ہے، جس کے تین شعر ہیں:۔

ذرے ذرے سے یہاں ظاہر ہے اک شانِ ارم

دیکھ کر کشمیر کو مٹتے ہیں ارمانِ ارم

چشمۂ کوثر رواں ہے دامنِ کہسار سے

اور جنت ہے نمایاں جلوۂ گلزار سے

ختم ہیں رعنائیاں سب حُسنِ فطرت کی یہاں

جلوہ گر نیرنگیاں ہیں ساری قدرت کی یہاں

راجہ محمد لطیف خان موزوںؔ کا تذکرہ حقوق نے اپنی "اقوام کشمیر" میں کیا۔ جو اچھا شعر کہتے تھے، ان کا تعلق کشمیر کے قدیم راجاؤں کے خاندان سے تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ راجہ مل نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور اس کا اسلامی نام مل خان رکھا گیا تھا، راجہ کا ایک بیٹا کھکھہ خان کے نام سے موسوم تھا، اس کی اولاد کھکھہ یا کھش کہلاتی ہے اور یہ لوگ پونچھ اور پنجاب کے شمالی اضلاع میں آباد ہیں۔ موزوںؔ، سیماب اکبرآبادی سے اصلاح لیتے تھے، لیکن اب ان کا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔

سردار وزیر محمد خان جو ریاست کے محکمہ پولیس کے اعلیٰ عہدوں پر فائیز رہے، اور آخر میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل کی حیثیت سے خدمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ شعر وادب کا شستہ مذاق رکھتے تھے۔ شاعری کا شوق انہیں سن شعور سے ہی تھا جس زمانے میں جموں میں مقیم تھے۔ صاحبزادہ محمد عمر اور دوسرے صاحب ذوق ادیبوں کے ساتھ مل کر، وزیر نے بزم سخن کی بنیاد ڈالی تھی۔ جس کی سرپرستی میں سالانہ مشاعرے وسیع پیمانے پر منعقد کئے جاتے تھے اور ان میں کلام سنانے کے لئے مشاہیر شعرا مدعو کئے جاتے تھے۔ جموں میں شعر وسخن کا ذوق پیدا کرنے میں ان مشاعروں نے بڑی مدد دی۔

وزیر ابتدا میں غزل کہتے تھے، اور اساتذہ کی صحبتوں میں اٹھنے بیٹھنے سے ان کی غزل میں بڑی پختگی پیدا ہوگئی تھی۔ بعد میں جب وہ حج کو گئے۔ تو غزل کی شاعری سے اُن کا جی اُکتا گیا اور نعت اور منقبت کہنے لگے تھے، اور غزل کا سارا سرمایہ انہوں نے ضایع کردیا تھا۔ نعت گوئی کا جو ذخیرہ وزیر نے چھوڑا ہے اُس میں اپنی شعر گوئی کی ساری صلاحیتوں سے کام لیا ہے۔ زبان پر بھی انہیں اچھی قدرت حاصل تھی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد، جب وہ مستقل سری نگر میں مقیم ہوگئے تھے، اپنی کوٹھی میں شعر وسخن کی محفلیں منعقد کرتے تھے اور خوش فکر شعرا اور صاحب ذوق سامعین کو مدعو کرتے تھے۔ نعت اور منقبت کی شاعری کم اور عقیدت مندی کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے، تاہم وزیر اس نوع کی شاعری میں بھی ایک معیار پیدا کر لیتے تھے۔ وہ فارسی اور اُردو، دونوں زبانوں میں فکر شعر کرتے تھے اور بہت زود قلم بھی

دکھاتے تھے۔ کٹری زمینوں میں پچاسوں شعر کہہ لیتے تھے۔ ان کے کلام سے کچھ اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

ہوں بحر و بر، افلاک و زمیں جس کے حوالے
کیا کہنا پھر اوس بار امانت کے امیں کا

یہ پیچ و خم آپنے ہی مقدر کے تھے سارے
اب حال کھلا جاکے کہیں چین جبیں کا

دنیا میں وزیر ان کے سوا کون ہوا ہے
جو باعثِ تخلیق ہو افلاک و زمیں کا

اگر دل کو کہیں اوس لامکاں کا کھوج مل جاتا
کہاں کافی پھر اوس کو وسعتِ ارض و سما ہوتی

مرے شام و سحر اے کاش کٹ جاتے مدینے میں
سرور انگیز دن ہوتا شب راحت فزا ہوتی

بس گئے دل میں جب وہ جانِ بشر
پھر کہاں آپ میں ہم آنے کے

دل کی بستی میں جو ہوا ان کا گذر
دن پھرے اس غریب خانے کے

نقشِ اول بھی نقشِ آخر بھی
ہیں حضور اس نگار خانے کے

نعت اور منقبت کے علاوہ وزیر نے کئی رُباعیاں بھی کہی ہیں۔ رُباعیات زیادہ تر شہدائے کربلا کے مصائب کے بارے میں ہیں۔ کچھ اخلاقی بھی ہیں۔ ایک رُباعی ذیل میں درج ہے:۔

تعزیہ گناہ کی سدا ہوتی ہے — ہر جرم کی لاریب سزا ہوتی ہے
معصوموں کا قتل و خون و غارت کرنا — یہ جور و ستم کی انتہا ہوتی ہے

کچھ اخلاقی نظمیں بھی وزیر کی یادگار ہیں۔ ایک نظم "درسِ عمل" کے عنوان سے لکھی تھی، جس کا اقتباس یہاں منقول ہے:-

اے اشرفِ مخلوق، اے اِنسان نیکی میں ضرب المثل بن جا
گمراہی کے اندھیروں میں اِک راہ نما مشعل بن جا
ہے ایک سلیقہ اے بندے، دنیا میں، تیرے رہنے کا
تو ماضی کی کچھ فکر نہ کر کچھ آج ہو اور کچھ کل بن جا
یہ بھی کلیاں پھول بنیں گلشن میں تیری تدبیروں سے
ہر مشکل تجھ سے آساں ہو، ہر عقدے کا تو حل بن جا
یہ شاہ وزیر امیر و گدا سب تیری نظر میں یکساں ہوں
نادار کا تو داتا ہو جا، داماں پہ ئے دَول بن جا

سردار وزیر محمد خان کا انتقال ۱۹۶۶ء میں جموں جاتے ہوئے، ہوائی جہاز کے حادثے میں ہو گیا۔ ان کی نعتوں کی بیاض بھی، ان کے ساتھ تھی۔ جو کئی دن برف سے ڈھکی رہی۔

دُرگا پرشاد رونق غزل گوئی کی بڑی اچھی صلاحیتوں کے مالک ہیں[1]۔ اُن کی ایک غزل "مارتنڈ" کے ایک خاص شمارے میں شایع ہوئی تھی۔ اس میں کلاسیکی غزل کا سارا رچاؤ ملتا ہے۔ غزل حسبِ ذیل ہے۔ یہ "پس رفو ہوتا ہے چاکِ پردۂ تقدیر دیکھ" کے عنوان سے شایع ہوئی تھی۔

---

[1] ڈی۔ پی۔ صاحب ۱۲ جون ۱۹۷۵ء کو سورگ باشی ہو گئے۔

وصل میں زیبا نہیں پردہ، بت بے پیر دیکھ
آئینہ خانے میں آکر عالمِ تصویر دیکھ

بزمِ خوباں سے مجھے سوئے بیاباں لے چلی
کس قدر وحشت طلب تھی عشق کی تاثیر دیکھ

اب بھی باقی ہے دمِ بیمارِ الفت، اے طبیب
دور کر نسخہ ذری کچھ وصل کی تدبیر دیکھ

مسکرا کر ناز سے کہتا ہے شیشے میں وہ شوخ
آئینہ خانے میں آکر عالمِ تصویر دیکھ

کیا نمائش ہو رہی ہے قتل گاہِ ناز میں
ایک سو بسمل پڑے ہیں ایک سو نخچیر دیکھ

سوزنِ تدبیر اے رونق ذرا لے ہاتھ میں
پس رفو ہوتا ہے چاکِ پردۂ تقدیر دیکھ

پنڈت دینا ناتھ نادم نے مجھے اس غزل کے صرف دو شعر سنائے تھے اور یہ بتایا تھا کہ یہ دُرگا پرشاد رونق کے ہیں۔ وصل کشمیری سیاست کی مشہور شخصیت ڈی۔پی۔دھر ہیں۔ اُن کی تعلیم لکھنؤ میں بھی ہوئی تھی۔ ان کا ادب اور شعر کا مذاق ستھرا ہے۔ کشمیری بزمِ ادب سے بھی وابستہ رہے۔

"مارتنڈ" شمارہ ۲۰، فروری ۱۹۳۹ء میں دھر اور کاشی ناتھ کاہلو کی مشترکہ نظم "ایک اہم سوال" کے عنوان سے چھپی تھی۔

کشمیر اور جموں کے نوجوان شاعروں اور ادیبوں میں صحیح ذوق کی تربیت اور شوق پیدا کرنے میں، جن بیرونی ادیبوں کا اثر رہا، ان میں سے چند کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ اردو غزل کے صاحبِ طرز استاد،

نواب جعفر علی خان اثر بھی اُس زمانے میں ریاست میں وزیر مالیات تھے۔ اثر شاعری کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے' اور اساتذہ قدیم کے معیاروں کو ملحوظ رکھتے تھے۔ میر تقی میر کے اتباع پر انہیں افتخار تھا۔ اور میر ہی کی زمینوں اور انداز پر بہت سی غزلیں کہی تھیں۔ "بہارستان" ان کی غزلوں کا مجموعہ فن اور زبان ہر لحاظ سے قدر رکھتا ہے۔

لیکن اثر اپنے عہد کے تقاضوں سے بھی ناآشنا نہ تھے اور نہ ہی انہیں نئے عہد کی فکر اور فن سے بیزاری تھی۔ انہوں نے خود بھی نئے انداز کی نظمیں لکھنے کی کوشش کی ہے' لیکن یہ دنیا کی بعض اہم زبانوں کی شہ کار نظموں کے منظوم ترجمے ہیں' جو ان کے مجموعے "رنگ بست" میں شامل ہیں۔ کچھ تنقیدیں بھی انہوں نے لکھی تھیں' لیکن ان میں زبان اور محاورہ پر زیادہ زور دیا ہے، جو ان کی سی ذہنی تربیت رکھنے والے اُستاد کی طبیعت کا تقاضا تھا۔

جس زمانے میں اثر کشمیر میں تھے' انہیں گیتا کے ترجمے کا بھی خیال پیدا ہوا تھا اور اس سلسلے میں وہ لالہ تولی رام' وزیر ریاست اور پروفیسر جیالال کول سے مشورہ کرتے تھے۔

اُردو شاعری میں فطرت پرستی اور قومیت اور وطنیت کے نئے رجحان کو فروغ دینے اور رسم پرستی کو شاعری کا اساس قرار دینے کے خلاف جدوجہد کرنے میں' حالی کے بعد شاید چکبست کا سب سے اہم مقام ہے۔ اس کے علاوہ چکبست نے اُردو شاعری کی ایک اہم خدمت یہ بھی انجام دی کہ اپنے ہم عقیدہ شاعروں کی مذہبی موضوعات کو شاعری کے دامن میں سمیٹنے کی اگلی رسم سے تجاوز کر کے' تاریخی اور با معنی اساتیری موضوعات کو شاعری میں جگہ دی' اور جس انداز کی فکر اور اظہار پر انہیں قابو حاصل تھا۔ اس کی مدد سے اس نئے انداز کو کامیاب بھی بنایا۔ چنانچہ ان کے کئی ہم عصروں میں سرور جہاں آبادی کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ انہیں کی تقلید میں رامائن کے اکثر مناظر کو اچھے شاعرانہ پیرایہ میں اُردو شاعری روشناس کرایا۔

چکبست خاندان کشمیری ہے اور اس خاندان کے کچھ لوگ تلاشِ معاش میں لکھنؤ اور فیض آباد جاکر بس گئے تھے۔ برج نارائن چکبست فیض آباد میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے، لیکن ان کی تعلیم اور تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ کیننگ کالج سے انہوں نے ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا اور پھر قانون کی تعلیم حاصل کرکے ۱۹۰۸ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا اور وکالت کرنے لگے۔ نوجوان وکیلوں میں ان کو بہت جلد نمایاں حیثیت بھی حاصل ہوگئی۔ شاعری کا ذوق بچپن سے تھا۔ وکالت کے ساتھ ساتھ شعروسخن کا مشغلہ بھی جاری رہا، وہ اچھی تنقیدی صلاحیتوں کے بھی مالک تھے، جس کا اندازہ ان کے مضامین سے ہوتا ہے، جو "مضامین چکبست" کی صورت میں شایع ہوئے ہیں۔ اپنے ہم قوم نسیم کی "گلزارِ نسیم" کے معرکے میں عبدالحلیم شرر کے مقابلے میں انہوں نے جو رویہ اختیار کیا تھا، اس سے بھی ان کے تنقیدی شعور اور سلامت پسند طبیعت پر روشنی پڑتی ہے۔ چکبست کا ذہنی لگاؤ کشمیر سے ہمیشہ قائم رہا۔ اُن کے اکثر مضامین "کشمیر درپن" میں شایع ہوئے ہیں۔ سیاست سے بھی انہیں دلچسپی رہی، جس کا پرتو اُن کی شاعری اور خاص طور پر اُن کی وطنی نظموں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ مثلاً ان کے زمانے میں ہند کے آزادی خواہوں میں انگریز سامراج کے ایک "سمجھاؤ" "ہوم رول" پر بڑی بحث تمحیص ہو رہی تھی، چکبست نے اس بارے میں اپنا نقطۂ نظر اس شعر میں ظاہر کیا تھا ـــــــــــ

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم "ہوم رول" کے بدلے

چکبست کی وفات ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔

ایک اور کشمیری نثر او ادیب جگموہن ناتھ رینہ شوق کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے، جو ہندوستان چلے گئے تھے اور خاص طور پر لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ وہ خوش فکر سخن سنج تھے، اور

اپنے کلام کا مجموعہ "پیامِ شوق" کے نام سے مرتب کیا تھا، جو دو حصوں میں شائع ہوا۔ پہلا حصہ جو نظامی پریس بدایوں سے سنہ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۱۵ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۰ء تک کے کلام پر مشتمل تھا۔ دوسرے حصے میں بعد کا کلام ۱۹۴۷ء تک شامل ہے۔ پہلے حصے کا تعارف نظامی بدایونی نے لکھا تھا۔ حصہ دوم پر احمد الدین نے لکھا ہے۔ شوق غزل اچھی کہتے ہیں اور اساتذہ قدیم کے انداز میں۔ ان کے کچھ شعر ہیں:-

دلِ محوِ عشق شاہدِ عکسِ جمال ہے
امکان ہے اور وسعتِ وہم و خیال ہے

دل ہے شکارِ رنج و ستم ہائے روزگار
احساسِ غم نہ ہو تو یہ حدِ کمال ہے

کون و مکاں کی سیر کا افسانہ کیا کہیں
اب ہم ہیں اور گوشۂ بزمِ خیال ہے

شوق، نظامی بدایونی کے دوست تھے۔ پنڈت امرناتھ مدھو جھا، منوہر لال زتشی اور ڈاکٹر حفیظ سید سے بھی ان کے مراسم تھے۔ چنانچہ ان کے مجموعۂ کلام کے پہلے حصے پر نظامی بدایونی کے تعارف کے علاوہ امرناتھ جھا، منوہر لال زتشی اور ڈاکٹر حفیظ سید نے بھی پیش لفظ کے طور پر لکھا ہے۔ لیکن شوق کا عظیم کارنامہ "بہارِ گلشنِ کشمیر" کی ترتیب اور اشاعت ہے۔ جس میں فارسی کے کشمیری اور کشمیری نژاد پنڈت شعراء کا تذکرہ ہے، کچھ اردو شاعروں کا حال بھی شامل ہے۔ اس یادگار کارنامے کی بدولت کشمیر کی ادبی تاریخ کا ایک اہم باب مدوّن ہو گیا ہے۔

پنڈت آنند نرائن مُلا، جن کی دو چاہتیں، اردو اور قانون ہیں۔ اور ان دونوں سے وہ بڑے سلیقہ سے گذشتہ تین قرنوں سے زیادہ عرصہ سے نباہتے چلے آئے ہیں، اس عہد کے سخن سنجوں میں نمایاں اونچا مقام رکھتے ہیں۔۔ اُن کے والد پنڈت جگت نرائن مُلا، لکھنؤ کے سربرآوردہ وکیلوں میں سے تھے۔ مُلا

اصل میں ایک مشہور کشمیری خاندان "مٹہ" ہے۔ جو لکھنؤ کی فضا میں پہنچ کر "مُلّا" بن گیا ہے۔ اب پنڈت آنند نرائن جو کشمیر میں ہوتے تو "مٹہ" رہتے، لکھنؤ میں "مُلّا" ہو گئے ہیں اور "مُلّا" سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ لیکن طبیعت سے قطعاً مُلّا نہیں بلکہ شاعر ہی رہے۔

مُلّا نے اپنے کلام کے حالیہ مجموعے "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" میں اپنے حالات لکھتے ہیں:-

"میں کشمیری برہمن ہوں۔ میرے والد پنڈت جگت نرائن مُلّا لکھنؤ میں ایک مشہور و معروف وکیل تھے۔ ۱۹۱۷ء میں انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے، ۱۹۲۳ء میں ایم۔ اے اور ۱۹۲۳ء میں قانون کا امتحان کیننگ کالج لکھنؤ سے جو ۱۹۲۱ء میں لکھنؤ یونیورسٹی بن گیا تھا، پاس کیا۔"

قانون کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۲۶ء سے لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۲ء تک ہند پاک ٹرابیونل کے چیرمین رہے۔ پھر ۱۹۵۴ء تک وکالت کی۔ اور اسی سنہ میں الہ آباد ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ اس خدمت سے ۱۹۶۱ء میں سبکدوش ہوئے۔ اِس وقت ہند پارلیمان کے رکن اور انجمن ترقی اردوِ ہند کے نائب صدر ہیں، اور ان کی مساعی کا محور اردو ہے، جس کو ہند کے لسانی نقشے میں اپنا جائز مقام دلانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

مُلّا نے شاعری ۱۹۲۶ء میں شروع کی، اِس طرح اُس وقت ان کی فکر کے ارتقاء پر تقریباً چار قرن بیت چکے ہیں۔ کلام کے تین مجموعے اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ "جوے شیر" ۱۹۴۹ء میں، دوسرا "کچھ ذرے کچھ تارے" ۱۹۵۹ء میں اور تیسرا مجموعہ "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" جو اگلے دو مجموعوں کے انتخاب اور نئے کلام پر مشتمل ہے، ۱۹۶۳ء میں شایع ہوا۔ اس کے ساتھ ایک نہایت خیال زا تعارف بھی پاکیزہ اسلوب میں قلمبند کیا ہے، جس سے ان کے معیاروں پر روشنی پڑتی ہے۔

مُلّا کی شاعری مجموعی طور پر اپنے عہد کے تاریخی، سیاسی اور سماجی شعور اور فکری تحریکوں کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ شاعر کے منصب کا انہیں جو احساس ہے، اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے

ہو سکے گا۔ لکھتے ہیں :

"میں شاعر کو صرف فن کار نہیں سمجھتا، بلکہ دانائے راز اور پیمبر بھی سمجھتا ہوں۔

..... میرے نزدیک کوئی شاعر یا افسانہ نگار، نوعِ انسان سے محبت کئے بغیر

نہیں ہو سکتا۔ اور نہ وہ ادبِ عالیہ پیش کر سکتا ہے۔"

اور یہی طرزِ فکر ان کی زندگی اور ان کی شاعری میں رہنمائی کرتا رہا۔ جدید عہد کے فکری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مُلاّ کی نظم کی اہمیت کو گھٹا نہیں سکتے۔ لیکن غزل کو، جو ان کے اور عالمی شاعری کے معیاروں پر ٹھیک اترتی ہے، وہ آسانی سے نظم کے ہم دوش مانتے ہیں۔ مُلاّ کی فکر روایت پسند نہیں، اجتہاد پسند ہے۔ تاہم وہ جانتے ہیں کہ فنکار اور ادیب اپنے عہد کے لئے، اپنے سماج کے لئے لکھتا ہے۔ اسی لئے نئے رمزیہ انداز شاعری کو وہ غیر صالح اور گمراہ کن قرار دیتے ہیں۔ شاعری اور فن کی خوبی کا معیار ان کے پاس اس کی ابلاغی اور ترسیلی صلاحیت ہے۔

مُلاّ شاعری کے امکانات اور اس کے صحت بخش اثرات کے معتقد ہیں۔ اُن کے آخری مجموعے کی آخری نظم "اور ایک دن انسان جیتے گا" اپنے عہد کے یاس انگیز آشوب خیال میں ایک روشنی کی کرن، ایک پیغام سروش ہے، خیال، اسلوب اور نغمگی، ہر اعتبار سے یہ اردو کی حسین نظموں میں سے ہے۔ اس کا خلاصہ آخری بند ہے:

جب سے یہ دُنیا قایم ہے

یہ جنگ برابر جاری ہے

اب تک تو یہی ہوتا آیا، انسان ہارا، شیطان جیتا

لیکن جب تک یہ دنیا ہے

یہ جنگ بھی ہوتی جائے گی، میدان بدلتے جائیں گے

اور اِک دن انسان جیتے گا

نیا عہد اور نثری ادب

افسانہ نگاری

پریم ناتھ پردیسی۔ تیرتھ کاشمیری۔ دینا ناتھ وارکیو شاپہ، شیام لال آکچہ۔ گنگا دھر بھٹ دیہاتی۔ بہاری لال شاستری۔ شیام لال کچو۔ دینا ناتھ عارشمی، ودیاد ھر(؟) محمود ہاشمی، منوہر کاک۔ شمبو ناتھ جی کول۔ ترلوکی ناتھ نگو۔ کاشی ناتھ لولا۔ وید لال گیرو۔ سومناتھ زتشی۔ پرتھوی ناتھ کول۔

کشمیر سے باہر

سعادت حسن منٹو۔ کرشن چندر۔ رامانند ساگر۔

ناول اور ڈراما

نرسنگھ داس نرگس۔ دیا کرشن گردش۔ کاشی ناتھ ترچھل خوشتر۔ صاحبزادہ محمد عمر نورالہیٰ۔

مضمون نگار

سوم ناتھ ترچھل مصروف۔ پریم ناتھ روشن دل۔ شمبھو ناتھ ہکو۔ چراغ حسن حسرت۔ غلام احمد مہجور۔ نراین جو ریتہ عنقا۔ شیخ محمد عبداللہ۔ آنند کول بامزئی، جانکی ناتھ در۔ سری ناتھ تار۔ جگناتھ ولی۔ امرناتھ کاک۔ جیا لال پنڈتا۔ چندر کاشمیری۔ نگاشہ لال کول۔ بخشی غلام محمد۔ غلام احمد مختار۔ شریمتی ستیہ دیوی۔ شریمتی ارنی کول۔

مسز دیرینا کول۔ شریمتی رادھا رانی۔ جے کشوری دیوی در۔ "ش" صاحبہ۔ کماری

ارن وتی کول۔

تصنیف و تالیف

جیا لال ناظر۔ ٹھاکور رگھوناتھ سنگھ سامیال۔ ہری کول۔ شمبھو ناتھ کول ناظر وکیل۔

دینا ناتھ در۔ دینا ناتھ جوگی۔ جیا لال کول۔ حکیم غلام صفدر ہمدانی۔ مرزا محمد افضل

بیگ۔ مرزا غلام قادر بیگ۔ منشی محمد اسحاق۔ سری کنٹھ توشہ خانی۔ قاضی غلام الدین

میر حبیب اللہ کاملی۔ غلام محی الدین۔ عبدالاحد آزاد۔ پدم ناتھ گنجو۔ خواجہ غلام محمد

صادق۔ خواجہ غلام نبی گلکار۔ چودھری غلام عباس۔ سردار محمد ابراہیم خان۔ منشی

نصیر الدین۔ آفتاب کول وانچو۔ پی۔ این۔ پشپ۔ صاحبزادہ حسن شاہ۔

عزیز احمد قریشی۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ ماسٹر موہن لال۔

صحافت اور صحیفہ نگار

لالہ ملک راج صراف اور "رنبیر" وغیرہ۔ بلراج پوری اور "للکار"۔ پریم ناتھ بزاز

اور "وتستا" وغیرہ۔ مولانا محمد سعید مسعودی۔ پنڈت کشیپ بندھو اور

"مارتنڈ" وغیرہ۔ نند لال واتل اور "خدمت"۔ دوسرے صحیفہ نگار۔

رسائل

جہلم۔ سواستکا۔ پرتاپ۔ لالہ رخ۔

ایک فتویٰ۔ ایک عرضداشت

ادارے:

نیا عہد اور نثری ادب

مختلف مرکزوں میں اُردو ادب کی نشو و نما کی تاریخ کی طرح جموں اور کشمیر میں بھی اس روایت کا اعادہ ملتا ہے کہ ابتدا میں شاعری کی دلچسپیاں، لوگوں کو زیادہ مسحور کئے ہیں۔ چنانچہ پچھلے اوراق سے اندازہ ہوا ہوگا۔ کہ شعر و سخن کے ذوق کی وسعت کے سبب، مختلف اصناف شاعری کو خاطر خواہ فروغ نصیب ہوا تھا۔ شاعری کے بعد اگر کوئی اور صنف اس عہد کے ادیبوں میں مقبول رہی، تو وہ افسانہ نگاری ہے۔ لیکن جو ذوق اور ولولہ اور شعر گوئی کی صلاحیتوں کا اُبھار شاعری میں ملتا ہے اور فکر اور تجربات کا وسیع تنوّع اس فن کی مختلف صنفوں میں نظر آتا ہے۔ نثری اصناف میں سے کسی میں کم دِکھائی دیتا ہے۔ تاہم شاعری کے بعد "جموں اور کشمیر" کے ادیبوں کی صلاحیتیں کسی صنف میں نمایاں ہوتی ہیں۔ تو وہ افسانہ نویسی ہے۔ افسانے سے ہٹ کر دوسری ادبی اصناف، جیسے ناول یا ڈراما، اس عہد میں برائے نام ہے۔

افسانہ نگاری کا آغاز یہاں بھی، اس میں شک نہیں کہ روایتی، رومانی اور کسی حد تک رسمی انداز سے ہوا۔ لیکن جوں ہی ان ادیبوں کا شعور بیدار ہوا اور فن پر دسترس کا ایقان پیدا ہو گیا۔ ان کی اپنی ذاتی صلاحیتیں اُبھرنے لگیں اور اپنی سرزمین کی حقیقی زندگی کے سماجی، معاشی، نفسیاتی، مناظراتی اور بعض وقت سیاسی پہلو [illegible]

والے افسانے سرانجام کئے جانے لگے، جس سے جموں اور کشمیر کے افسانوں میں مقامی رنگ اور انفرادیت نمایاں ہونے لگی۔

افسانہ نگاری

افسانہ نگاری میں سب سے عظیم نام جو ہمارے سامنے آتا ہے، وہ پنڈت پریم ناتھ پردیسی کا ہے جن کی بے وقت موت نے، اس مخصوص انداز افسانہ نگاری کو، جسے وہ بعد میں فروغ دینے لگے تھے۔ یکایک مسدود کر دیا اور اس کے ساتھ کشمیری افسانے میں ارتقاء کے جو امکانات تھے، انہیں ختم کر دیا اور اردو افسانہ ایک نئے ابھرتے ہوئے رجحان سے، جو اپنی نوعیت میں کشمیری تھا، محروم ہو گیا۔ پردیسی بڑی رنگارنگ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ غزل اور بہت سے نوجوانوں کی طرح ان کے لئے بھی دلکشی کا باعث ہوئی اور انہوں نے شعر موزوں کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن جموں اور کشمیر کے کسی شاعر کی طبیعت ان سے بڑھ کر شعر کے لئے ناموزوں نہیں تھی۔ اور اس کا احساس خود پردیسی کو بھی جلد ہی ہو گیا تھا۔ تاہم اس کافر عادت کے چھوٹتے چھوٹتے، انہوں نے کئی غزلیں کہہ ڈالیں غزل سے جی اکتایا تو کچھ قومی انداز کے ترانے لکھ لیے۔

پردیسی کشمیری پنڈتوں کے ایک نیچے متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ولادت کا سال ۱۹۰۹ء ہے۔ گھر کے حالات مساعد نہیں تھے۔ اس زمانے میں کشمیری پنڈتوں کی رسم کے مطابق ان کا بیاہ بھی کم عمری میں ہو گیا تھا۔ اس لئے جلد تعلیم ختم کر کے ملازمت کی تلاش کرنی پڑی۔ اور کوئی ۳۲-۱۹۳۱ء میں انہوں نے محکمہ چنگی میں چھوٹی اسامی قبول کر لی۔ اس محکمہ میں اسسٹنٹ انسپکٹر کے عہدہ تک پہنچتے پہنچتے انہیں کوئی چودہ سال لگ گئے۔ پردیسی نے سن شعور

کو پہنچنے کے بعد سے کشمیری آزادی خواہی کی ڈوگرا شاہی مطلق العنانی کے خلاف جدّوجہد دیکھی تھی۔ ملک کی آزادی کے ساتھ کشمیر میں بھی راجا شاہی نظام کے بطن سے ایک نیا جمہوری نظام منصۂ شہود پر آیا اور ترقی پسند قائدین نے جن میں خواجہ غلام محمد صادق پیش پیش تھے۔ اسے ایک تعمیری شکل میں ڈھالنے کے لئے کلچرل فرنٹ قائم کیا جس میں بہت سے پُرجوش نوجوان شامل ہو گئے۔ انہیں میں پردیسی بھی تھے۔ اس تحریک سے منسلک ہونے کے بعد پردیسی کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ اس سے پہلے انہوں نے کچھ کہانیاں بھی لکھی تھیں، جو روایتی موضوعات پر رومانی انداز کی کہانیاں تھیں، لیکن ترقی پسند تحریک کے اثر کے تحت، پردیسی کشمیر کی حقیقی زندگی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد انہیں ریڈیو کشمیر میں ملازمت مل گئی، اور پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے، پردیسی نے کئی ڈرامے، فیچر اور مضامین لکھے۔ شاعری کا شوق اب کم ہو گیا تھا اور جو باقی رہ گیا تھا۔ انہوں نے اسے قبائلی حملہ کے دوران، فوجی ترانے اور اسی طرح کی کچھ منظومات لکھنے میں صرف کیا۔

اپنی متنوع ادبی دلچسپیوں کی بدولت پردیسی اس صدی کے وسطی دہوں میں کشمیر کی ادبی فضا پر چھا گئے۔ ان کا کلام، ان کے افسانے اور ادبِ لطیف کی طرز کے انشائیے اخباروں اور رسالوں میں چھپتے رہے۔ کلام کے ایک دو مجموعے بھی مرتب کئے اور افسانوں کے مجموعے بھی "شام و سحر"، "ہماری دنیا" اور "بہتے چراغ" کے نام سے مرتب اور شائع ہوئے۔ ان افسانوں کے علاوہ، جو ان مجموعوں میں شائع ہو سکے، کئی افسانے اور ہیں، جو اخباروں اور رسالوں کے پرانے فائلوں خاص طور پر "مارتنڈ" کے ادبی شماروں میں محفوظ ہیں۔ اخبار "ہمدرد" کے بعد "مارتنڈ" دراصل نوجوان ادیبوں اور خاص طور پر پنڈت ادیبوں کی تخلیقات کا ترجمان بن گیا تھا۔

پردیسی کچھ تو اپنی تخلیقات کے تنوع کی خاطر اور کچھ اس زمانے کے ادیبوں کی روایت کی پابندی میں ایک سے زیادہ ناموں سے لکھتے تھے۔ پردیسی کاشمیری کے نام کے علاوہ، سادھو کشمیری، رونق کاشمیری، بابو کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ پنڈت نند لال واتل، مدیر روزنامہ "خدمت" نے جو پردیسی کے ساتھ اکثر رہتے تھے، بتایا کہ وہ "مارتنڈ" میں اپنے معاصرین کے چہرے "علامہ صدیقی ساہنوی" کے نام سے بھی لکھا کرتے تھے۔ لیکن پنڈت تیرتھ کاشمیری کا بیان ہے کہ علامہ صدیقی ساہنوی کے نام سے پنڈت دینا ناتھ مٹو دلگیر چہرے لکھا کرتے تھے اور پردیسی علامہ ہلائی کے نام سے ... قیصر قلندر نے اپنے ایک مضمون میں جو "پردیسی — ایک مطالعہ چند یادیں" کے عنوان سے شایع کیا ہے۔ دو ناموں سادھو کاشمیری اور رونق کاشمیری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن اس کی بہتر تفصیل خود ان کے علامہ صدیقی ساہنوی کے نام سے لکھے ہوئے ایک مزاحیہ خاکے میں ملتی ہے جو "پردیسی کاشمیری" کے عنوان سے "مارتنڈ" کے شمارہ ۱۷ مارچ ۱۹۳۵ میں شایع ہوا ہے۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے حلیہ اور عادات پر روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:۔

"پہلا فرشتہ بولا، ان کا اسم شریف ظاہر کرنا گناہ ہے۔ البتہ ان کا مشہور عام تخلص پردیسی ہے۔ کسی قدر دراز، خوش شکل، کم گو، ہنس مکھ اور شرمیلے، آنکھوں پر عینک لگاتے ہیں۔

دوسرا فرشتہ بولا۔ ہماری بھی سنو، ان کا ایک ہی تخلص نہیں بقول ان کے صرف تین تخلص ہیں کشمیر کے لئے ایک، پنجاب کے لئے دوسرا، یو۔پی کے لئے تیسرا، کبھی پردیسی کا لفظ مرغوب، کبھی بابو کا خطاب مطلوب، کبھی رونق سے ہم آغوش ہیں۔"

پردیسی، شاعری میں رونق تخلص کرتے تھے۔ ان کی غزل کے دو شعر

نمونے کے لئے یہاں درج کئے جاتے ہیں :

یار کی قامت قیامت خیز   میری خاطر ہے بے سرو پائی
رنگِ گیسو ہے تو تیلے نظر   شمع کو شب ہے، وجہِ بینائی

لیکن جب اوپر اِشارہ کیا گیا ہے، شاعری کا نظم، ضبط، فن اور تیکنِک کی پابندیاں، پر دیسی کی آزاد اور بے چین طبیعت کے لئے ایسی قیود تھیں۔ جن کی وہ مُتحمل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ جلد ہی شاعری سے دست کش ہو گئے۔ اور بعد میں جب کبھی یہ شوق اُبھرا۔ تو انہوں نے ادبِ لطیف کی طرز کے انشائیوں کی صورت میں نثری شاعری کی۔ پر دیسی کا لکھا ہوا، ایک ترانہ، جو قبائلی حملے کے دوران لکھا گیا تھا اور مقبول بھی تھا ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

قدم قدم بڑھیں گے ہم   محاذ پر لڑیں گے ہم
لڑیں گے ہم، لٹیروں اور حملہ آوروں کے ساتھ
لڑیں گے ظالموں کے ساتھ اور جابروں کے ساتھ
وطن فروش بے وفاؤں اور شاطروں کے ساتھ
قدم قدم بڑھیں گے ہم   محاذ پر لڑیں گے ہم
سوال اب نہیں رہا یہاں کسی کی ذات کا !
یہ مسئلہ نہیں ہے ایک دو یا پانچ سات کا!
سوال ہے یہ قوم کی حیات اور ممات کا !
قدم قدم بڑھیں گے ہم   محاذ پر لڑیں گے ہم

اس جوش میں پر دیسی نے کچھ اور نظمیں بھی لکھی تھیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد حالات جب سازگار ہوئے اور کلچرل فرنٹ، پھر کلچرل کانگریس قائم ہوئی، تو انجمن ترقی پسند مُصنفین کا قیام بھی عمل میں آیا، جس کے

ساتھ پردیسی بھی وابستہ ہوگئے اور اس کے بعد ان کے افسانوں کی طرح شاعری کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ افسانوں کی طرح شاعری میں بھی وہ عوام اور خاص طور پر محنت کش عوام اور نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی کی ترجمانی کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی زمانے کی لکھی ہوئی ایک نظم "بیکار نوجوان سے" غالباً اس انداز کی اچھی نظموں میں سے ہے۔ نظم ذیل میں درج ہے :

پیکرِ دردو مصیبت ہے یا تصویرِ غم
تیرے حصے میں ہے آئی یا کوئی جاگیرِ غم
گردشِ چرخِ جفا پیشہ سے تو بیزار ہے
بزمِ ہستی میں مآلِ زیست سے لاچار ہے
بے نوا یوں ہو گیا ہے، کس خیالِ خام میں
کس کی خاطر ہو گیا ہے مبتلا آلام میں
ہے دلِ مہجور میں کس کی تجھے اب آرزو
چشم اشک آلود میں رہتی ہے کس کی جستجو
اُٹھ ذرا نامِ خدا اے تعزیتی سے نکل
ذلت و ادبار کی سنسان بستی سے نکل
ٹوٹ جائے گا کہیں غافل حبابِ زندگی
اپنی ہمت سے دکھا کچھ انقلابِ زندگی

افسانہ دراصل، پردیسی کا مخصوص میدان تھا، اور اس میں ان کی طبیعت کے جوہر چمکے۔ خاص طور پر ترقی پسند تحریک سے منسلک ہو جانے کے بعد، انہوں نے جو افسانے لکھے، ان میں سماجی اور ابلاغی قدروں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۸ء میں اپنے ایک خط میں اس نئے رجحان کے طلوع ہونے کے بارے میں لکھا تھا :

۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۸ء تک جو کچھ میں نے لکھا تھا، اس پر میں فخر نہیں کر سکتا۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت تک مجھے یہ احساس ہی نہ تھا کہ ایک افسانہ نگار ہونے کی حیثیت سے مجھ پر اپنے وطن کے کیا فرائض ہیں ۔۔۔"

ان کے خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رجحان میں یہ تبدیلی افسانوں کے مشہور اور معرکۃ الآرا مجموعے "انگارے" کو پڑھنے کے بعد ہوئی۔ نئے افسانہ کے باغیانہ رجحانات شاید ان کی اپنی زندگی کے حالات سے ہم آہنگ بھی تھے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "شام و سحر" کا تعارف پروفیسر نند لال کول طالب نے لکھا تھا، "بہتے چراغ" جو بعد میں لکھے ہوئے افسانوں کا مجموعہ ہے اور ۱۹۵۵ء میں شایع ہوا، اس کے لئے خواجہ غلام محمد صادق نے جو اس زمانے میں کلچرل فرنٹ کے روح رواں تھے، تعارف لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے پردیسی کی صلاحیتوں کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا ۔۔ "پردیسی ہماری ریاست کے بہت بڑے افسانہ نگار تھے"۔ اسی تعارف میں، صادق صاحب نے پردیسی کے تین اور مجموعوں "وصول"، "کیچڑ کے دیوتا" اور "جنگ، اور نغمہ" کا تذکرہ کیا ہے۔ جو چھپ نہیں سکے۔ "بہتے چراغ" پر صادق صاحب کے تعارف کے علاوہ پروفیسر احتشام حسین، سہیل عظیم آبادی اور کشمیر کے دوسرے مشہور افسانہ نگار، پریم ناتھ در کے تبصرے بھی شامل ہیں۔ جن میں پردیسی کے افسانوں کے نمایاں خط و خال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پروفیسر احتشام لکھتے ہیں:-

"فن کار کے لئے سچائی اور سادگی، دو بڑے سہارے ہیں، جن کی مدد سے وہ فن کی دشوار گذار وادیوں میں سفر کرتا ہے۔ پردیسی کے پاس یہ دونوں سہارے تھے۔ اس لئے ان کی افسانہ نگاری میں حسن اور کشش کے ساتھ تابندگی ہے ۔۔"

نئے شعور کے طلوع ہونے کے بعد، پردیسی نے جتنے افسانے لکھے۔ ان میں کشمیر اور کشمیر کے محنت کش عوام کی زندگی اور ان کے مسایل کو پیش منظر میں لانے کی سعی نمایاں ہے۔ کشمیر کی زندگی اپنے مخصوص سماجی پس منظر کے ساتھ، اپنے مخصوص مسایل رکھتی ہے۔ لیکن کئی افسانہ نگار، جن میں کشمیر سے کوئی اتفاقی ربط رہا ہو۔ اور جنہوں نے کشمیر کو اپنے افسانوں کا موضوع بنانے کی کوشش کی ہو۔ وہ اس کے حقیقی حُسن و قُبح کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اس بات کو صادق صاحب نے اپنے تعارف میں صحیح طور پر واضح کیا ہے اور پردیسی کے بارے میں لکھا ہے؛

"وہ کشمیری عوام کی زندگی کی گہرائیوں تک پہنچے اور یہ بیرونی زندگی کے خد و خال تک محدود نہیں، بلکہ ان کی دلی تمناؤں اور اُمنگوں کو محسوس کر کے کہانیوں میں پیش کرتے تھے۔"

پردیسی نے کشمیر کے پس افتادہ طبقوں کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے، جہاں تک ہو سکا، ان کے شعور کی گتھیوں کو سلجھانے اور کبھی کبھی ان کے تحت شعور میں جھانکنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس طرح ان کے افسانوں میں فضا کی ایک تازگی اور ان کے بیان میں رچاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے جو خود بھی اچھے افسانہ نگار ہیں۔ پردیسی کے افسانوں میں اس خصوصیت کو نمایاں دیکھا تھا اور لکھا ہے کہ "پردیسی کی زندگی کشمیر کے لئے تھی"۔ ساتھ ہی ان کا یہ خیال بھی ہے کہ "ان کا فن کشمیر کے لئے تھا۔" تاہم یہ تخصیص مطلق مفہوم کے لئے نہیں، کیونکہ پردیسی کے موضوع کی تخصیص، ان کے فن کو مُقید نہیں کر دیتی ہے۔ ان کی اپیل عام ہے۔

کشمیر کے حسین طبعی مناظر، اس کے انسانوں کی ذہانت، اور اس کے عوام کی زندگی کے نشیبوں اور فرازوں کے پس منظر میں، پردیسی نے اپنے افسانوں میں حیات

کی گوناگونی کو مصور کرنے اور انسانی نفسیات کی تہوں کو کھولنے کی جو کوشش کی ہے ان کے عہد کے فنی رچاؤ کی نمائندگی کرتی ہے۔ افسانہ "ڈھول" جو پری محل کے تاریخی کھنڈر، ڈل کی شاداب فضا اور بلیوارڈ کی رنگا رنگ زندگی کے اطراف میں گھومتا ہے۔ پردیسی کے نمائندہ افسانوں میں سے ہے۔ جس کے تانے بانے میں ایک غریب میاں بیوی کی زندگی کے نقوش اُبھارے گئے ہیں "ٹیکہ بٹنی" کشمیری پنڈتوں کے گھرانوں میں شادی بیاہ کے مراسم اور ان کے اہتمام کا عمدہ خاکہ ہے۔ بعض افسانوں میں، نفسیاتی اشارے، سرشت انسانی سے ان کے عرفان کی گواہی دیتے ہیں۔ اور کچھ افسانوں میں عمدہ ڈرامائی مواقع کی تخلیق، پردیسی کی فن پر گرفت کا ثبوت ہیں۔

پردیسی کو بیان کے حسین انداز پر بھی قدرت تھی۔ چنانچہ "اُجالے اندھیرے" میں صبح کے مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے، وہ ایک خوبصورت جملے میں، وسیع تصور کو سمو دیتے ہیں۔ "زندگی نئی صبح پر سوار ہو کر آ گئی تھی"۔ کشمیر کے جنت نظیر ہونے کے دعوے کے وہ منکر نہیں، لیکن جہاں تک اس جنت ارضی کے عوام کی زندگیوں کا تعلق ہے، وہ اس جنت ارضی میں پہلے سے طے کئے ہوئے تصورات لے کر آنے والوں پر زہر خند کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لیکن شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ جنت ارضی کی میلی مخلوق کی تصویریں جہنم کے بے فکر باسی بہت پسند کرتے ہیں۔"

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ پردیسی اپنے افسانوں کو ایک ڈرامائی موڑ پر لا کر ختم کرنے کے بہت شائق تھے۔ اس خصوصیت کے لحاظ سے افسانہ "کاری گر" بہت بلیغ ہے۔ یہ ایک یورپی سیاح کی کہانی ہے، جو نفسیات کا معلم ہے، وہ ایک کاری گر کے کام کو پسند کر کے، سگریٹ کیس پر نقش بنانے کی فرمائش کرتا ہے لیکن جب یہ سگریٹ کیس تیار ہو جاتا ہے۔ تو اس کے نقش اور صناعی کو پسند کرتے ہوئے

اس کے لینے سے ہیبت ناک گریز، جہاں اس معلم نفسیات کی ایک پوشیدہ نفسیاتی اُلجھن کی طرف اشارہ ہے، وہاں کہانی کے لئے ایک اچھا ڈرامائی انجام بھی مہیا کرتا ہے۔

پردیسی کے کئی افسانے اردو کے افسانوی ادب میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ مثلاً "جنت جہنم"، "جھنڈیاں"، "ڈھول" اور "بہتے چراغ"۔ افسانہ میں انہوں نے جو تخصیص حاصل کر لی تھی۔ اس کے لحاظ سے کوئی تعجب نہیں کہ وہ عام طور پر "کشمیر کے پریم چند" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ اپنے فن میں اُپج پیدا کرنے کا رجحان، جہاں انہیں بیان کے نئے نئے انداز اختیار کرنے پر اُبھارتا تھا، انہیں نئے نئے تجربوں کی طرف بھی مایل کرتا رہا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ انہوں نے پنجاب کے ایک افسانہ نگار، رنبیر سنگھ ویر کی شرکت میں ایک افسانے کی تکمیل کی تھی۔ اس کا ابتدائی حصہ ویر جی نے لکھا تھا۔ اور اسے ایسے موڑ پر چھوڑا تھا۔ جہاں سے بیانیہ کو آگے بڑھانے کے لئے کئی راہیں سُجھائی دیتی تھیں۔ بعد کے حصے کی تکمیل پردیسی نے کی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کے سلسلے کا انجام اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ افسانہ "مارتنڈ" کے شمارہ ۹ اپریل ۱۹۳۸ء میں اڈیٹر کے اس نوٹ کے ساتھ شایع ہوا تھا:

> "اس کہانی کا پہلا حصہ پنجاب کے مشہور افسانہ نویس شری پت رنبیر سنگھ جی ویر نے لکھ کر پردیسی کو دیا تھا جس نے کہانی کو مکمل کر دیا، رنبیر جی کی یہ ہدایت تھی کہ شاکنی کا کیریکٹر بلند رکھا جائے۔ آپ کہانی پڑھ کر دیکھ سکتے ہیں کہ ویر جی کی ہدایت کس حد تک پوری کی گئی ہے اور جس مقام پر ویر جی نے کہانی کا بیک گراونڈ پیدا کیا، اگلا حصہ لکھنے والے کے لئے کتنا مشکل تھا۔"

کہانی کے ابتدائی حصے میں ویر جی نے شاکنی کے اطراف راز کی ایک

گہری فضا پیدا کی تھی۔ وہ اپنے دس چاہنے والوں میں سے ہر ایک کو رات کے تین بجے ایک مندر میں ملنے کا وعدہ کرتی ہے۔ اسی مقام پر کہانی ادھوری چھوڑ دی گئی تھی۔ پردیسی نے راز کی فضا کو اور گہرا بنایا اور ایسا انجام پیدا کیا کہ شالنی کا کردار ایک دیوی کا کردار بن گیا۔

پردیسی اپنی طبیعت کی اُفتاد کے ناطے ہمیشہ سنجیدہ بلکہ المیہ موضوع منتخب کرتے تھے، حالانکہ قیصر قلندر نے لکھا ہے کہ وہ ظرافت اور بذلہ سنجی کا بے نظیر ملکہ رکھتے تھے۔ غالباً اپنے افسانوی موضوعات کے چھٹکارے کے طور پر مزاحیہ خاکے لکھنے شروع کئے تھے۔ ۱۹۳۵ء-۱۹۳۴ء سے وہ انشائیوں کے انداز کے مزاحیہ خاکے لکھنے لگے تھے۔ ان نثری پاروں کو وہ نثری شاعری یا آزاد نظم کا عنوان دیتے تھے۔ ان میں سے بعض میں وزن کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ لیکن اکثر محض نثری پارے ہیں اور ان سے دراصل ان کی ناآسودہ شعری رجحانات کی تکمیل ہو جاتی تھی۔ دو نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

تیاگ کر دنیا کو آیا!
ایشور پریم کا روگی!
جپتا تھا وہ نام پربھو کا
نس دن شام سویرے
گاتا تھا وہ گیت اسی کے
اُٹھ کر مُنہ اندھیرے

دوسرا اقتباس محض نثری پارہ ہے:

جب سے تم پہاڑوں پر چلے گئے ہو
تب سے ہی شام ہونے کے بعد

تمہیں یاد کرتی ہوں، تمہاری پوجا کرتی ہوں
اور کبھی کبھی، اور ہاں کبھی کبھی روتی ہوں۔
اس امید پر کہ جب تم واپس آؤ
تو میرے آنسو پھول بن گئے ہوں

اس طرح کی نثری شاعری اس زمانے میں خاص طور پر لاہور کے ادبی حلقوں میں مقبول تھی اور اس کا اثر ملک اور ادیبوں پر بھی پڑا تھا۔ پردیسی نے ۱۹۳۴ء سے "سپاہی کے خطوط" کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کے علاوہ چند اور پارے جیسے "مت ڈھونڈ اسے" "نغمۂ ازلی" "بھر دے" "جانے والی پریاں" "ہم تین" "چھپائے رکھو" "دیکھ اے دل" خاصے دلچسپ ہیں۔ "مت ڈھونڈ اسے" ایک گہری معنویت رکھتا ہے۔ اس کا اقتباس یہاں درج ہے۔

پہاڑوں کی چوٹیوں پر، اسے مت ڈھونڈ سکھی
تاریک غاروں میں اسے مت دیکھ آؤ
طوفانی دریاؤں میں اس کا کھوج مت لگاؤ
گھنے جنگلوں میں اس کی تلاش مت کرو
واپس آؤ، سکھی
وہ باہر کہیں نہیں ملے گا
میرے آنسوؤں نے اس کا راستہ ساگر بن کر روک رکھا ہے۔
میری آہیں، اس کی منزل پر کہر بن کر چھا گئی ہیں۔
اور، وہ واپس آگیا ہے
میں اسے دیکھ کر اب پاگل ہو گئی ہوں
سکھی مت ڈھونڈو اسے، مت ڈھونڈو

وہ باہر کہیں نہیں ملے گا ـــــ

پردیسی نے، ریڈیو سے منسلک ہونے کے بعد، کئی ڈرامے اور فیچر بھی لکھے تھے۔ ان میں سوامی" سنگتراش" "مستعصم کی آخری رات" "بھتہ ہر" قابل ذکر ہیں۔ شروانی جو قبائیلیوں کے حملے کے دوران مارے گئے تھے۔ ان پر ایک ڈرامہ 'مجاہد شیروانی' کے عنوان سے بھی لکھا تھا۔ یہ ڈرامہ اور ان کے کچھ اور ڈرامے کلچرل فرنٹ کے شعبہ ڈرامہ کے اہتمام سے اسٹیج پر بھی پیش کئے گئے تھے۔ قبائیلیوں کے حملے کا ایک رپوتاژ بھی ان کی یادگار ہے۔ اپنے زمانے کے نوجوانوں میں شاعری کے شوق کے بارے میں انہوں نے ادبِ لطیف کے انداز کی ایک تنقید بھی لکھی تھی۔ جس میں وہ کہتے ہیں:

"موجودہ زمانے میں ہر اُردو، ہندی، انگریزی پڑھنے اور سمجھنے والے کے لئے شعر کہنا فیشن بن گیا ہے۔ ہر شخص کی خواہش ہے کہ وہ شاعر بنے۔ خواہ اس کی نظموں میں کچھ ہو یا نہ ہو۔ اسے اس سے سروکار نہیں، اُسے اگر کسی چیز کی آرزو ہے تو یہ کہ اپنے ہم وطنوں میں اور ہم عصروں میں شاعر کہلائے۔"

اس سے اور ان کے ایک جائزے سے جو غیر کشمیری افسانہ نگاروں کے کشمیر کو موضوع بنا کر بے تکی باتیں لکھنے کے بارے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک نشست میں پڑھا گیا تھا۔ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پردیسی اچھی تنقیدی صلاحیتوں کے بھی مالک تھے۔

پریم ناتھ پردیسی نے افسانہ نگار کی حیثیت سے، ایک خصوصی مقام حاصل کر لیا ہے لیکن ان سے کچھ پہلے ہی پنڈت شیام لال ولی، جو تیرتھ کاشمیری کے نام سے لکھتے رہے اور کشمیر میں اور کشمیر کے باہر ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کی، میدان میں آ چکے تھے۔

تیرتھ فراواں نگار ہیں۔ انہوں نے سو کے قریب افسانے لکھے ہیں۔ اسی تعداد میں ان کے مضامین ہیں، جو مذہب، اخلاق اور تاریخ کے وسیع موضوعات پر حاوی ہیں۔ انہوں نے ڈرامہ پر بھی طبع آزمائی کی اور ادبِ لطیف کے انداز کے مختصر انشائیے بے شمار لکھے اور وہ شعر بھی کہتے ہیں۔ اور پردیسی کی تخلیقی صلاحیتوں کا پھیلاؤ بھی انہیں اصناف تک تھا۔ لیکن پردیسی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد چمک اُٹھے تھے۔ تیرتھ کی ملازمت کی پابندیاں ان کے قلم کیلئے رکاوٹ بنی رہیں۔

تیرتھ سری نگر کے ایک علم دوست خاندان میں سنہ ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد، محکمۂ ناظم حسابات میں ملازم ہو گئے۔ جہاں سُپرنٹنڈنٹ کے عہدہ تک ترقی کر کے، وہ چند سال پہلے سبکدوش ہوئے ہیں اور اب بھی ادبی، سماجی اور مذہبی خدمت میں مصروف ہیں۔

(سنہ ۱۹۲۲ء سے تیرتھ نے قلم اُٹھایا اور اب تک بے تکان لکھ رہے ہیں۔ اس عرصے میں ان کا کئی اخباروں کی ترتیب سے بھی تعلق رہا۔ لیکن نام کے ساتھ نہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی ان کا تعلق "ہفت روزہ "جیوتی" سے ہے۔ ان کے مضامین بھی اس میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

تیرتھ نے سنہ ۱۹۲۳ء سے ہفت روزہ "اخبارِ عام" لاہور میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کشمیر میں اخبار کی اجرائی کی اجازت مہاراجہ کے دربار سے مل سکتی تھی۔ "اخبارِ عام" کشمیر کے لکھے پڑھے لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ اور اس کے مدیر پنڈت بال کرشن گرٹو کو کشمیر کے جوانوں کی ادبی صلاحیتوں کو اُبھارنے اور انہیں منظرِ عام پر لانے کا بڑا خیال تھا۔ جب انہیں اپنی قلمی صلاحیتوں کے بارے میں اعتماد پیدا ہو گیا تو وہ محمد دین فوق کے رسالے "کشمیری" میں بھی لکھنے لگے۔ لیکن ان کا طویل عرصہ یعنے کوئی دس سال تک

"بہار کشمیر" سے تعلق رہا۔ جو لاہور ہی سے نکلتا تھا۔ ایک اور ہفتہ وار "صبح کشمیر" میں بھی ان کے مضامین اور افسانے شائع ہوتے رہے۔ اُردو کے لکھنے والوں میں ان کا مقام پیدا ہونے کے بعد ہندوستان کے اور اخباروں اور رسالوں میں بھی انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ اپنے ہم عصر لکھنے والوں میں ادبی ذوق کو ترقی دینے کے لئے ۱۹۲۱ء میں اپنے چند ہم خیال رفقاد کی اعانت سے ایک دارالمطالعہ اہلمر ریڈنگ روم کے نام سے قائم کیا تھا۔ جس کی اجازت مہاراجہ سے حاصل کی گئی تھی۔ اس ریڈنگ روم میں، ہندوستان کے اکثر اخبار اور رسائل آتے تھے۔

پھر جب ۱۹۳۱ء سے کشمیر میں اخبار جاری ہوئے تو تیرتھ نے اپنے وطن کے اخباروں "وِتستا" اور "ہمدرد" اور "مارتنڈ" کے لئے بھی لکھنا شروع کیا۔ اسی زمانے میں پریم ناتھ پردیسی، تاراچند ترسل، وشوناتھ ماہ، دیناناتھ مٹو دلگیر بھی منظرِ عام پر آئے۔ نوجوان لکھنے والوں میں جب ادبی ذوق عام ہو گیا۔ تو ان کے لئے ایک فورم مہیا کرنے کے مقصد سے انہوں نے کشمیر رائیٹرز لیگ کی بنیاد ڈالی، جس کے سرگرم ارکان میں پردیسی، غلام احمد مہجور، گنگا دھر بھٹ دیہاتی، شاد کاشمیری، دلگیر، وشوناتھ ماہ، کاشی ناتھ ابمہ کنول، سومناتھ ترچھل، سومناتھ زتشی زار وغیرہ تھے۔ شاد اور کنول اچھے شاعر تھے۔ لیکن اب ان کا کلام عام طور پر نہیں ملتا۔

۱۹۴۰ء میں پنڈت ویریشور نے "سواستکا" ماہنامہ نکالنا شروع کیا تھا اور تیرتھ اس میں بھی اکثر لکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ رسالہ ایک سال کے اندر بند ہو گیا۔

تیرتھ اپنے افسانوں کے لئے مواد ہر گوشے سے حاصل کرتے ہیں اور انہیں نئے نئے انداز اور اسلوب سے پیش کرتے ہیں۔ تاریخ، دساتیر، عام زندگی اور

اس کے اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں انہوں نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً "چندراولی" کا موضوع استیری ہے۔ "نربل کے بل رام" "اندھی ماں" "تلاش حق" "جگ چھوٹا سرمایہ" اخلاقی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ "پاگل کا خط" میں انہوں نے مکتوبات کے انداز سے کام لیا ہے۔ افسانوں کی طرح ان کے مضامین کا دایرہ بھی وسیع موضوعات پر حاوی ہے۔ ان کے مذہبی مضامین میں "تربھون سامی" "پریم کا اوتار بھگوان کرشن" "مہاتما کی شیوراتری" "رام نومی کے پھول" اور تاریخی مضامین میں "مکنا پیڈ للتا دیتیہ" اور "عہد اکبری کا کشمیر میں طلادان" دلچسپ مضامین ہیں۔

تیرتھ کا خاص میدان انشائیہ اور ادب لطیف ہیں۔ یہ انداز کشمیر کے اس دور کے اکثر ادیبوں میں بہت مقبول رہا ہے اور ان سب لکھنے والوں میں تیرتھ کو ایک خصوصیت حاصل ہو گئی ہے۔ "پارس کا پتھر" "سنسان بستی" "کتاب" "ہم ایک ہیں" "میں نے کہا"۔ غرض کئی ایک ایسے ہیں جو ایک دلکش اسلوب میں لکھے گئے ہیں اور گہری معنویت رکھتے ہیں۔ عمر کے ساتھ، ان کی فکر میں گہرائی اور تصوف نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر ان کا انشائیہ کے انداز کا ایک مضمون جو "کتاب" کے عنوان سے ہفت روزہ "جیوتی" کے شمارہ ۲۳ مئی ۱۹۶۳ء میں شایع ہوا تھا۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

ا۔ (۱)

"زندگی کی یہ کتاب،
میں نے لکھنا شروع کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس میں لڑکپن، جوانی اور ادھیڑ پن کے انوکھے تجربے بیان کئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیال تھا کہ یہ مقبول ہوگی۔

(۲)

لیکن دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ مقبول ہونے کی کوئی سبیل نہیں۔ اس لئے
جسم کے انگ انگ میں محسوسات، وسوسات اور خواہشات، درد وکرب
اور بے چینی کی نہ دیکھی جانے والی لہریں۔ ۔ ۔ ۔ روز افزوں اُمڈتے
لگیں۔

(۳)

علم اور علم کی باتیں، گیان اور دھیان کے جھمیلے، فلاسفی اور
فلاسفروں کے اقوال ریگستان میں ایک پیاسے مُسافر کی طرح سُراب
ثابت ہوئے۔ ۔ ۔ ۔ شاید میں سمجھنے کے اہل، نہ تھا۔ ۔ ۔"

کشمیر کی ایک اُجڑی نگری اکھیمنو پور پر بھی ان کا ایک اچھا تاریخی
انشائیہ ہے۔ جس میں اس گاؤں کی زندگی کے ایک خاص رُخ کو اس طرح پیش کیا
ہے:

"اس گاؤں کا نام تھا، اکھیمنور پور، جہاں کبھی اکھیمنوجی کا آشرم تھا لیکن
اب چشمے سے دور ایک چھوٹا سا گاؤں، ہے۔ جس میں چند ہندو گھر آباد ہیں۔ زمینداری
ان کا پیشہ ہے۔ غضب خدا کا ایک گھر بھی ایسا نہیں جہاں عورت کی صورت دیکھنے
میں آئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عورت ان کے لئے گراں بہا جنس ہے، کیونکہ دیہاتیوں
کے گھروں میں جہاں لڑکی پیدا ہو۔ اس کا پارسل شہریوں کے نام ہو جاتا ہے اور
شہری بھی دزدانِ عرب کی طرح ان کی تاک میں رہتے ہیں۔ جہاں موقع ملا، بلا تمیز
عمر، اپنے لئے ایک نویلی دُلہن تلاش کی اور اپنی غیر آباد وادی کو زرخیز بنا لیا۔"

تیر تھ نے ڈراما پر بھی طبع آزمائی کی ہے اس کے علاوہ کشمیر کی تاریخ کے ایک
خاص عہد کے بارے میں ایک رسالہ "دیونا" کے نام سے لکھا ہے۔ یہ سلطان زین العابدین
کے عہد کے ایک وید شری بٹ کی داستانِ حیات ہے۔ جس نے بادشاہ کو ایک مہلک

مرض سے نجات دلاکر، اُس کے صلے میں ہندوؤں کے لئے مراعات مانگ لی تھیں۔ تیرتھ کا یہ مختصر سا رسالہ شائع ہونے کے بعد بہت معرکتہ الآرا بنتا رہا۔ گنگا دھر بھٹ دیہاتی نے اس رسالے کے لئے ایک پیش لفظ "دیوتا کی پوجا" کے عنوان سے لکھا ہے۔ تیرتھ اُردو کے علاوہ، انگریزی، کشمیری، اور ہندی میں بھی لکھتے ہیں۔ ان کے کئی اچھے مضامین اور افسانے "وِتستا" (کلکتہ) میں شائع ہوئے ہیں۔

تیرتھ نے بہت سی نظمیں بھی کہی ہیں، جو اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوع اخلاقی، سماجی اور مذہبی بھی ہیں اور کچھ نظمیں مناظر پر بھی لکھی ہیں۔ "جوئے حیات" کے عنوان سے انہوں نے ایک اچھی نظم لکھی تھی، جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

صبح کا تھا وقت اور دُھندلی فضا
وہ قمری کی کو کو میں شانِ خُدا
کہیں طایر خوشنوا باغ میں مست
ہوا معتدل، بوئے گُل جانفزا تھی
نمودار سبزہ کہیں اور کہیں گُل
کہیں آتی جھرنے کی دِلکش صدا تھی
کنار ندی ایک لڑکی حسیں تھی
تھی غنچہ دہن اور خندہ جبیں تھی [۱]
طبیعت تھی شاد اور چہرہ گلابی
بجاتی مدھر تان میں وہ بیں تھی

کشمیر پر بھی انہوں نے کچھ نظمیں کہی ہیں۔ ایک نظم کا اقتباس ہے؛

مخمور گلستاں ہے، لو فصلِ بہار آئی

خاموش فضاؤں میں نکہتِ کی ہوا لائی

شاداب ہوا سبزہ، پانی پہ جمی کائی

تفسیر محبت میں تاثیر نئی پائی

گلپوش ہے سر تا پا کشمیر وطن میرا

سرجوش ہے سر تا پا کشمیر وطن میرا

مزاح کا لطیف عنصر بھی کہیں کہیں ان کی تحریروں میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ ایک نظم انہوں نے "ہیٹ بے کاری میں عشرت بیز ہے" کے عنوان سے لکھی تھی، جس میں اکبر الہ آبادی کی طرح مغربی تہذیب کا خاکہ اڑایا ہے۔ یہ نظم "مارتنڈ" کے شمارہ ۲۲ ستمبر ۱۹۴۰ء میں ان کے ایک نوٹ کے ساتھ شایع ہوئی تھی۔ جس میں نظم کی شانِ نزول کا تذکرہ کرتے ہیں؛

"فقیر، احقر، شاعر نہیں اور نہ شاعری کا دعویٰ ہے۔ ہاں گاہ بہ گاہ اس میدان میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی جرأت کرتا ہے۔ دلی یا لکھنو کے استاد یہاں موجود کہاں کہ ان کی صحبتوں سے طبیعت خود بخود اصلاح پاتی، چونکہ شعر کا عشق ہے، شوکت الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی سے دور رہ کر، دل کی امنگ اور طبیعت کے جوش کے باعث شعر کہہ دیا . . . . چند دن پہلے کی بات ہے کہ ایک پارٹی میں ہم کئی دوست شامل تھے، نزدیک ہی کسی ڈنر میں ایک ہیٹ آویزاں تھا، بو وقت

دینا ناتھ ولی نے ہیٹ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ 'جناب' فرمائیے، آپ کیا کہتے ہیں، بیچ اس مسئلے کے ــــ" میں نے عرض کی، چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہیٹ بے کاری میں عشرت بیز ہے

ہیٹ ہے تو صاحبِ توقیر ہے ۔۔۔ رعب سے عاجز جوان و پیر ہے

ہے یہ عزت کی نشانی آج کل ۔۔۔ اور اثر میں اپنے وہ اکسیر ہے

—

تیرتھ نے ایک ڈایری بھی لکھنی شروع کی تھی، لیکن اس کے بعض اندراجات کی وجہ سے کبھی موقع پر دارو گیر میں پھنس جانے کے خوف سے اسے ضائع کر دیا۔ یہ ڈائری ان کے زمانے کے حالات پر اچھی روشنی ڈال سکتی تھی۔ اس وقت وہ اپنی خود نوشت "اپنی کہانی" کے عنوان سے لکھنی شروع کی ہے اور اس کے چار ساڑھے سو صفحات مکمل کر چکے ہیں۔ اس کا ایک باب "پہلی بات" کے عنوان سے "جیوتی" میں شایع ہوا ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"یہ کوئی افسانہ نہیں، زندگی کی سچی کہانی ہے، اس کہانی کے لکھوانے کا سہرا راقم کے دوست شری جے۔ این۔ زُتشی کے سر ہے۔ بات اکتوبر ۱۹۶۱ء کی ہے۔ دودھ گنگا شمشان بھومی سری نگر میں ہمارے ایک ساتھی کے پتا کا مرنک شریر چتا پر جل رہا تھا۔ مسٹر زیدی سیکرٹری کلچرل اکادمی اور شری زتشی بھی وہاں کھڑے تھے۔ شری زُتشی نے جو اس وقت ڈائریکٹر انفارمیشن تھے، میرا تعارف زیدی صاحب سے کرایا۔ ۔ ۔"

پہلے حیات مستعار کی ناثباتی کے بارے میں جو گفتگو ہوئی۔ بڑے اچھے انداز میں بیان کی ہے۔ پھر لکھا ہے کہ زیدی صاحب نے پوچھا کہ کیا آپ اس وقت کچھ لکھ رہے ہیں؟

"میں نے کہا ۔ جی، بہت کچھ لکھا ہے، ادھر اُدھر، یہاں، وہاں،
اب شمشان بھومی پر خیال آیا ۔ زندگی مایا کا کھیل اور کال کا کھلونا
ہے ۔ تہیہ کیا کہ اپنے ذاتی تجربات اور واقعات کو قلمبند کروں، جن
سے میں زندگی میں دوچار ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ان واقعات کے بیان میں کسی
مبالغہ سے کام نہیں لوں گا ۔ ہاں بیان میں اثر نہ ہو تو، وہ بیان کرنے
والی کی نااہلیت ہوگی ۔ واقعات بالکل سچے ہیں ۔"

ان واقعات کا تعلق کشمیر کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور روحانی
زندگی سے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پنڈت دینا ناتھ واریکو، جو شاہد کاشمیری کے نام سے لکھتے تھے، ایک اور
وسیع دلچسپیاں رکھنے والے ادیب ہیں ۔ درابی یار محلہ ان کی جائے سکونت تھا ۔ دو
تیسرے اور چوتھے دہے میں ان کی طبیعت کی روانی عروج پر تھی ۔ وہ شاعر تھے، اور
خوش فکر ۔ اپنے زمانے میں وہ اچھے انشا پرداز بھی تسلیم کئے جاتے تھے ۔ نثر میں
حالی کا انداز انہیں بہت پسند تھا ۔ اور خود بھی اسی کا اتباع کرنا چاہتے تھے ۔ مذہبی
اور سماجی موضوعات سے لے کر، وہ ادبِ لطیف کے انداز کے پارے بھی لکھتے تھے ۔
مزاح نگاری میں بھی ان کی طبیعت کے جوہر کھلتے تھے اور افسانے انہوں نے کافی تعداد
میں لکھے ہیں ۔ جو اس زمانے کے رسالوں اور اخباروں اور خاص طور پر "مارتنڈ" کے
ادبی شماروں میں شایع ہوئے ۔ ڈراما پر بھی انہوں نے طبع آزمائی کی تھی ۔

شاہد کے افسانوں میں "ملاپ" "بکھان" اور ایک مزاحیہ افسانہ "جواب"
دلچسپ ہیں ۔ ان کے دوسرے افسانے "ایجاد" "انتقام" اور "گناہ" بھی قابلِ مطالعہ
ہیں ۔ ادبِ لطیف کے انداز کے انشائیوں میں "اظہارِ محبت" اچھا پارہ ہے ۔ شاہد کا
ایک ڈراما جو دیہات سدھار کے موضوع پر ہے ۔ "گرام سدھار" کے عنوان سے شایع

ہوا ہے۔ پہلے یہ "دیہاتی دنیا" میں قسط وار شایع ہو کر بعد میں ۱۹۴۲ء میں یہ کتابی صورت میں شایع ہوا اور پنڈت نند لال کول طالب نے اس پر مقدمہ لکھا ہے۔ طالب کے تعارف سے ڈراما کی خصوصیات اور خود مصنف کی صلاحیتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر طالب لکھتے ہیں:

"پلاٹ قابلِ تعریف ہے اور مناظر دلکش۔ بعض مناظر میں طرزِ مکالمہ رنگین اور ظرافت آمیز ہونے کے باعث جاذبِ توجہ بن گیا ہے۔"

یہ بھی لکھا ہے کہ موضوع اور صنف کے لحاظ سے یہ اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے۔ شاہد کی ایک اور تصنیف امرناتھ کی مشہور یاترا کے بارے میں ہے۔ جو "رہنمائے یاترا" کے نام سے شایع ہوئی ہے۔ مصنف نے ۱۹۲۴ء میں مہاراجہ ہری سنگھ کے تلک کے موقع پر یہ کتاب پیش کش کی تھی[1]۔ اس کتاب پر بھی طالب نے تقریظ لکھی ہے، اور دینا ناتھ مست کی تقریظ بھی اس کے ساتھ شامل ہے۔

شاہد کے بارے میں علامہ صدیقی سانبوی (پردیسی) کا ایک چہرہ "مارتنڈ" کے کالم "محفلِ ادبِ کشمیر" میں شایع ہوا تھا جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

"خدا رکھے، پرانی وضع کے بزرگ سے دکھائی دیتے ہیں۔ دینا ناتھ صاحب جن کا تخلص شاہد ہے، ایک دبلے پتلے نوجوان، پست قد، سادہ وضع، باوجود جوان ہونے کے جوشِ شباب کی نعمت سے محروم، شعر بہت کم کہتے ہیں، البتہ نثر اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں۔ کچھ دن افسانے لکھتے رہے۔ آپ کا طرزِ تحریر مولانا حالی کی طرزِ تحریر سے ملتا جلتا ہے۔ اب درسی کتابیں لکھ رہے ہیں۔"

شاہد نے کچھ درسی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ ان کا ایک مضمون اسکاوٹوں کے بارے میں "سوارستکا" کے شمارہ اپریل ۱۹۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔ جس کا ایک اقتباس

---

[1] مہاراجہ ہری سنگھ کا راج تلک ۱۹۲۶ء میں ہوا تھا۔

ذیل میں درج ہے :

"کیا کہا" ، "وولف کب" ہاں وولف کب ، یعنے شیر بچہ ، کیا اچھا نام ہے ۔ اور کتنا پیارا ۔ ...... ہاں ، سچ مچ بھلا ہو ، ان کا جنہوں نے دُنیا کے فائدے کے لئے اس کرم کو جاری کیا ۔ ان کا نام سر رابرٹ بیڈن پاؤل تھا ۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ وہ اس دُنیا سے اُٹھ گئے ۔"

شاہد کا ایک مکالمہ ، " اندر ـــ اور ـــ باہر ـــ" کے عنوان سے شایع ہوا تھا ، جس میں انہوں نے دو دوستوں کی جنہیں ملنے کی خواہش نہیں ، لیکن جب ملتے ہیں ، تو ان کے دل اور زبان جس طرح کام کرتے ہیں ، اس کا دلچسپ مُرقع پیش کیا ہے ۔ اس کے ساتھ ان کا ایک توضیحی نوٹ بھی شامل ہے کہ یہ دوست الف اور ب ، سے موسوم کئے گئے ہیں ۔

اندر یعنے دل میں	باہر یعنے زبان سے
ا ۔ بن بُلائے آدھمکا ، پاگل کہیں کا	نمستے آو ، بھائی
ب ۔ آج پکڑ ہی لیا میں نے تمہیں ،	نمستے ، کیوں جی ، آپ ملتے ہی نہیں
ا ۔ تم سے ملنے کے سوا اور کام ہی کیا ہے مجھے	کیوں نہیں ، تو ہوتا ہوں !
ب : ہاں ، میں بلاؤں ، تو یہاں نہیں	جھوٹ میں تو آج چوتھی دفعہ آیا ہوں

یہ مکالمہ طویل ہے اور اس میں اسی طرح دو سطحوں پر گفتگو اور اس کی تہ میں جو حقیقی خیالات ہیں ، پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ شاہد ، شعر بھی خوب کہتے تھے ، گو کم کہتے تھے ۔ ذیل میں ان کی ایک نظم ' آمد بہار ' کے چند شعر درج ہیں :

بہار آئی، خزاں کی کلفتوں میں انتشار آیا
مرے دِل میں تصور یار کا بے اختیار آیا
تیرے گیسوئے مشکیں اور روئے نُور افشاں میں
نظر اہلِ جہاں کو منظر لیل و نہار آیا
رواں ہے سوئے میخانہ جنابِ شیخ بھی شاہد
فلک پر جھومتا تقوا شکن ابر بہار آیا

شاہد کے معاصر لکھنے والوں میں پنڈت تارا چند رینہ شہر باش کاشمیری بھی تھے، جو اکثر "مارتنڈ" میں لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ شاہد سے کچھ استفسارات کئے تھے اور یہ استفسارات " شاہد کاشمیری جواب دیں" کے عنوان سے "مارتنڈ" (شمارہ ۱۳ جنوری ۱۹۳۶ء) میں شایع ہوئے تھے۔ لیکن ان کے جوابات غمخوار کاشمیری نے دیئے۔

شاہد کے ایک اور ہمعصر پنڈت شیام لال ایمہ تھے۔ جو انہیں کی طرح متنوع دلچسپیوں کے مالک تھے۔ ان کے افسانے اور مضامین بھی زیادہ تر مارتنڈ ہی میں شایع ہوتے رہے۔ ایمہ ایک معزز برہمن خاندان سے تھے اور مشن سکول میں تعلیم پائی تھی۔ پنڈت نند لال طالب ان کے ہم جماعت تھے۔ اُردو اور فارسی کے امتحانات بھی پاس کئے تھے اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے تھے۔ مادام مونٹی سوری نے اپنے نظام کی تربیت گاہ جب سری نگر میں قایم کی تھی۔ تو اس میں تربیت حاصل کرنے کے لئے جو اساتذہ منتخب کئے گئے تھے۔ ان میں ایمہ بھی تھے۔ اور یہ امتحان انہوں نے امتیاز کے ساتھ کامیاب کئے۔

لکھنے کا انہیں ابتداء سے شوق رہا۔ "مارتنڈ" کے علاوہ جموں کے بچوں کے رسالوں "رتن" اور "پھول" میں بچوں کی دلچسپی کی کہانیاں شایع کرتے رہے۔ ان کے افسانوں میں "عیار ڈاکو" "لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا" "غربت" اور "تختۂ دار پر لٹکائے

جانے کے بعد پھر زندہ ہوگیا" دلچسپ افسانے ہیں۔ انہوں نے بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں اور ان کے اکثر مضامین مذہبی موضوعات یا تہواروں پر ہیں۔ مثلاً "نوراترا اور بھگوان رام" "شری رام چندرجی کے چرنوں میں" "جیون مکت سدرشن" وغیرہ، "نوره سے خطاب" میں سرسید احمد خان کے ایک مضمون کی طرح کی تمنائیں نئے سال سے وابستہ کی ہیں۔

پنڈت گنگا دھر بٹ دیہاتی، جو دیہاتی کاشمیری کے نام سے اس صدی کے تیسرے دہے کے بعد سے وسیع موضوعات پر بہتات کے ساتھ لکھتے رہے، بڑے زورِ قلم لکھنے والے ہیں۔ ان کی تخلیقات، کہانی سے لے کر، مضمون، انشائیہ، ادبِ لطیف، ڈراما، اور شاعری پر حاوی ہیں۔ صحافت سے بھی ان کا تعلق رہا۔ ان کا وطن سری نگر سے کوئی تیس میل دور، ایک گاؤں، موُرن ہے، جہاں سے وہ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ والد فارسی کے اچھے عالم تھے۔ ابتدائی تعلیم مورن میں پائی۔ پھر سری نگر آگئے۔ جہاں میٹرک کی تعلیم ختم کی اور صحافت سے متعلق ہوگئے۔ "مارتنڈ" "کیسری"، "پری ورتن" کے حلقہ ادارت میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں انہیں ایک سرکاری سکول کی ملازمت مل گئی۔ اسی دوران انٹرمیڈیٹ، ادیب فاضل، بی اے اور بی ایڈ کے امتحانات کامیاب کئے اور ۱۹۶۹ء میں کشمیر یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کا امتحان بھی کامیاب کیا۔

شعر و شاعری کا شوق انہیں بچپن سے رہا۔ ابتدائی زمانے میں کچھ شعر کہتے تھے۔ جن میں ایک یہ ہے ؎

سیر و تفریح کا بہت ہی گرچہ میں مشتاق ہوں
لیکن ان افکار دنیاوی سے دل ناشاد ہے

لیکن شاعری میں انہیں زیادہ دستگاہ حاصل نہ ہو سکی۔ کچھ قطعات، اور نظمیں،

ایسی کہہ لی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک قطعہ کہا تھا:

کہا شیخ نے، آب کوثر پیا کر — برہمن نے چرنامرت کا اُچھالا[ف۱]

مگر جب بڑھا ہاتھ ساقی کی جانب — ہوا ہر طرف ہی اُجالا، اُجالا

۱۹۴۷ء میں پنڈت نہرو کی کشمیر میں آمد کے موقع پر انھوں نے "جواہر لال نہرو کا سواگت" کے عنوان سے ایک نظم کہی تھی۔ جو "مارتنڈ" کے شمارہ ۱۴ اپریل ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دو شعر ہیں:

اے جواہر لال، اے فخرِ وطن، جانِ بہار

تیرے آنے سے کھلا ہے کاشمر کا لالہ زار

پیکرِ حریت ہے تو اور جانِ مُضطر کا قرار[ف۲]

مادرِ بھارت کا وابستہ ہے تجھ سے اِفتخار

پردیسی اور کچھ دوسرے لکھنے والوں کی طرح دیہاتی نے بھی "شاعری کے قیود سے آزاد" قسم کے پارے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کا ایک گیت "ایک کمسن ودھوا کو دیکھ کر" کے عنوان سے انہوں نے لکھا تھا کہ، جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

جب ساری دُنیا ڈوب جائے

تاریکی اور خاموشی میں

اور میں لیٹ جاؤں تمہارے نام کا سمرن کرتے ہوئے

اپنی جھولی پھیلا کر

تو تم چُپکے سے آجانا

اور پھر دینا میری خالی جھولی کو

اس سادھارن سی مرتیو بھکشا سے

دیہاتی نے کہانیاں بہت لکھی ہیں اور اچھی لکھی ہیں۔ اُن کی کہانیوں

ف۲۔ وزن گراں ہے

کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے۔ اور کہانی میں انہوں نے جدت و ندرت سے بھی کام لیا ہے۔ بعض کہانیاں مکاتیب کی شکل میں لکھی ہیں۔ مزاح اور طنز ان کی اکثر کہانیوں میں جھلکتا ہے۔ "جوتا" اور "میری پیاری" میں لطیف مزاح ہے۔ "میری پیاری" اپنی کانگڑی کی کہانی ہے۔ جو ایک دفعہ ان کے خانماں کو برباد کرنے پر تُل گئی تھی۔ اس کا ایک اقتباس درج ہے:

"میری پیاری!

نہیں صاحب آپ کا قیاس غلط ہے، میں اپنی کسی محبوبہ کا حال بیان نہیں کرنے لگا ہوں بھلا چار بچوں کے باپ کی محبوبہ کون بن سکتی ہے۔ عمر بھی ماشاءاللہ اڑتیس ۳۸ سے تجاوز کرنے لگی ہے۔ اس لئے محبوبہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری پیاری بیوی! نہیں، یہ بھی نہیں بی بی کے بارے میں کہا بھی کیا جا سکتا ہے۔ ماں باپ نے ایک لڑکی پلے باندھ دی، بندھ گئے۔ اور دوسروں کی دیکھا دیکھی باپ بھی بنا اور خانہ داری بھی۔ شوکت تھانوی اور امتیاز علی تاج کے سوا آج تک کسی نے بھی اپنی بیوی کے بارے میں زبان تک نہیں کھولی۔ کھولی ہوتی تو سر کے بالوں کا صفایا ہو جاتا۔ . . . . . . "

پنڈت کشیپ بندھو کے ایما سے انہوں نے کچھ نہایت مختصر کہانیاں لکھنے کی بھی کوشش کی۔ اس طرح کی ایک مکمل کہانی ہے۔

"میرا اکلوتا لڑکا دوڑتا ہوا آیا،
" ابا جان! ایک آنہ دو، سب خریدوں گا
میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا، سب کی سب خالی تھیں
میری گردن جھک گئی۔

یہ اس روز کی بات ہے جب میں نے اخبار میں پڑھا کہ ہندوستان کے ایک مہاراجہ نے اپنے راجکمار کے لئے اُنتالیس لاکھ روپے سے ایک ہوائی جہاز خریدا تھا۔"

محکمۂ تعلیمات کی جانب سے اساتذہ کا ترجمان "اُستاد" شایع ہونے لگا، تو دیہاتی اس کے لئے بھی لکھتے رہے اور کئی مضامین اور افسانے لکھ کر، حکام کی توجہ اساتذہ کی زبوں حالی کی طرف منعطف کرنے کی کوشش کی۔ اور بعض وقت اس انداز سے لکھا کہ محکمہ تعلیم کے ارباب حل وعقد ان سے ناخوش ہو گئے۔ بعض وقت وہ ایک فرضی نام "دلکش کاشمیری" اختیار کر کے بھی لکھتے رہے۔

ویر لیشیدر سے، دیہاتی کے اچھے مراسم تھے۔ ویرجی نے جب "سواستکا" کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، تو دیہاتی بھی ان کا ہاتھ بٹاتے رہے اور کچھ کہانیاں اور ایک آدھ ڈرامہ اس کے لئے لکھا۔ حکومت نے دیہات سُدھار کے مقصد سے جب ایک ماہ نامہ "دیہاتی دُنیا" جاری کیا۔ تو دیہاتی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔

ترقی پسند تحریک کشمیر کے نوجوان لکھنے والوں میں مقبولیت حاصل کرنے لگی تو دیہاتی بھی اس سے متاثر ہوئے۔ اور کچھ کہانیاں اور ادب لطیف کے انداز کے پارے لکھے۔ ان کے لکھے ہوئے مضامین کی تعداد بھی کافی ہے۔ ماسٹر زندہ کول ثابت اور پردیسی پر ان کے مضامین نہایت دلچسپ ہیں۔ ان کی ایک کہانی "شاعر کی موت" "مارتنڈ" میں شایع ہوئی تھی جس کے بارے میں پردیسی کا یہ بیان ان تک پہنچایا گیا۔ "یہ رنبیر سنگھ ویر ایڈیٹر "ملاپ" سے لی گئی ہے۔ اس پر دونوں میں شکر رنجی ہو گئی تھی۔ آخر کار پنڈت شیام لال ولی تیرتھ کاشمیری نے دونوں میں صُلح صفائی کرادی۔

پنڈت بہاری لال شاستری، کوٹلی، ضلع میرپور کے نہایت صاحب ذوق اہل قلم، شاعر، اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۰۹ء میں ہوئی تھی۔ ان

والد بزرگوار، دلیوی وقت بھی علم و ادب سے لگاؤ رکھتے ہیں اور اپنے زمانے کے اچھے اہلِ قلم بھی مانے جاتے تھے۔ بہاری لعل کی ابتدائی تعلیم انہیں کے یہاں ہوئی تھی۔ پھر اسکول کی تعلیم ختم کرکے لاہور گئے۔ جہاں کالج کی تعلیم حاصل کی۔ کالج کی تعلیم کے دوران انہیں اچھے اور صاحبِ ذوق اساتذہ سے تربیت حاصل کرنے اور شعر و سخن کی محفلوں میں شریک ہونے کے مواقع نصیب ہوئے۔ اور وہ بھی شعر کہنے لگے اور اپنی خوش فکری کے باعث بہت جلد مشہور بھی ہو گئے۔ سرزمین پونچھ کے سربر آوردہ اساتذہ میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ شعر کے علاوہ افسانہ نویسی سے انہیں خاص شغف تھا اور عموماً اخلاق و موعظت کے موضوعات پر افسانے لکھا کرتے تھے۔ ان کے افسانوں کا اچھا خاصہ مجموعہ فراہم ہو گیا تھا۔ لیکن یہ سارا سرمایہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں تاراج ہو گیا۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان، کشمیر میں کئی اچھے افسانہ نگار منظر عام پر آئے اور یہ صنف اتنی مقبول ہو گئی تھی کہ اکثر ذوق رکھنے والے، قابلِ مطالعہ افسانے آسانی سے لکھ لیتے تھے۔ ان میں پنڈت شیام لال کبو، یاکاؔبو، عارفؔ کاشمیری اور گوپی ناتھ منٹو کی تخلیقی صلاحیتیں اس صدی کے تیسرے دہے میں بہت نمو پر تھیں۔ کبو، رینہ واری کے باشندے ہیں، ان کے کئی افسانے "مارتنڈ" کے ادبی شماروں میں شایع ہوتے رہے۔ جن میں "حرمان نصیب"، "غربت" اور "اوشا" موضوع، کردار، اور پیش کشی کے لحاظ سے اچھے افسانے ہیں۔ دینا ناتھ عارفؔ۔ کشمیر میں اخباروں کے اجراء کے زمانے سے لکھنے لگے تھے۔ شعر اور افسانہ، دونوں میں ان کی طبیعت رواں تھی۔ وہ پہلے پنڈت پریم ناتھ بزاز کے "ہمدرد" میں لکھا کرتے تھے۔ پھر "مارتنڈ" کے ادبی شماروں کے لئے لکھتے رہے۔ ان کا ایک افسانہ "دل کی تڑپ" کافی معیاری ہے۔ گوپی ناتھ منٹو ودیارتھی، سری نگر کے چھنہ کرال محلے کے رہنے والے

تھے۔ ان کا ایک افسانہ "خونی" مقبول ہوا۔ لیکن ان کی صلاحیتیں افسانہ نگاری تک محدود نہیں تھیں، وہ اخلاقی مضامین لکھتے تھے اور بچوں کی دلچسپی کے عنوانات پر بھی لکھ لیتے تھے۔ ان کا ایک اصلاحی، سماجی مضمون، خط کی شکل میں "درود پتنی کا جواب بال ودھوا ہو کر" اور ایک اور مضمون "شیلا کا وکٹوریہ" کمسنی میں بیوہ ہو جانے والی عورتوں کے دوسرے بیاہ کے پرچار کے مقصد سے لکھے گئے تھے۔

پروفیسر محمود ہاشمی جن کا پورا نام سلطان محمود ہے۔ وہ سری پرتاپ کالج سرینگر اور امر سنگھ کالج میں اُستاد تھے۔ اور اس زمانے کے ترقی پسند ادیبوں میں وہ ایک مُعیّن مقام رکھتے تھے۔ امر سنگھ کالج کے رسالے "لالہ رُخ" کے ابتدائی دور میں وہ اس کے نگران کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ان کی دلچسپی اور مشوروں سے رسالے کا معیار خاصا اونچا ہو گیا تھا۔ رسالے میں خود بھی لکھتے تھے۔ چنانچہ اختر شیرانی خواجہ احمد عباس اور حسن عسکری کے بارے میں ان کے کئی جائزے شائع ہوئے ہیں۔ جن سے ان کے ذوق اور تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "اختر شیرانی کی شاعری میں ایک خاموش احتجاج اور ایک مدھم سے ردِ عمل کی جھلک پائی جاتی ہے۔ جو اپنے مخالفین کو مٹانے کے لئے نہیں، بلکہ دوسروں کو اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے ہوتی ہے۔"
>
> "اختر اس راہ پر نہیں چلتا، جس پر اقبال چل کر، نئی تہذیب سے لڑتا بھڑتا ہے، مذہب کا دامن پکڑ کر خودی کے راگ الاپتا جا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ وہ یوں اس لئے نہیں کرتا کہ اسے اقبال سے کد ہے یا وہ اس کے بلند نصب العین کو اور خیالات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ بلکہ یہ شباب کی اس خود بینی

کا اثر ہے، جس کی نگاہ میں بڑی سے بڑی طاقت بھی کوئی حیثیت
نہیں رکھتی۔"

یہ جائزہ جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ دراصل کشمیر میں ترقی پسند
تنقید کے آغازی دور کے انداز پر روشنی ڈالتا ہے۔ ایک اور مضمون ہاشمی نے
حسن عسکری اور احمد عباس کے بارے میں بھی لکھا تھا، جو ۱۹۴۶ء کے ایک شمارہ
میں شائع ہوا۔ اس میں ترقی پسند ادب کے مفہوم اور امکانات کو سمجھانے کی بھی
کوشش کی تھی۔ ہاشمی نے امتیاز علی تاج کے ڈرامے، انارکلی، کا گویا "انارکلی کی واپسی"
کے عنوان سے جواب لکھا تھا۔ ان کے ڈراموں میں "آنکھ" بہت مقبول ہوا۔ اس کے
علاوہ وہ اچھے مضمون نگار اور افسانہ نگار بھی ہیں۔

ہاشمی، ملک کے بٹوارہ کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ اس وقت وہ لندن
میں مقیم ہیں اور برمنگھم سے ایک مصور ہفت روزہ "ایشیا" کے نام سے شائع
کر رہے ہیں۔

دوسرے افسانہ نگاروں میں جن کے افسانے مل جاتے ہیں، پنڈت منوہر
کاک، پنڈت شمبھو ناتھ جی کول، پنڈت ترلوکی ناتھ تکو، پنڈت کاشی ناتھ کولا، پنڈت
وید لال گیرو، پنڈت سوسناتھ جی، پنڈت پرتھوی ناتھ کول، اور پنڈت کھاگیرتی کاشیری
قابل ذکر ہیں۔ پنڈت منوہر کاک کی کہانیوں میں "قربانی" ایک دلچسپ کہانی ہے
جس میں ایک میاں اور بیوی کی نوک جھونک کی تفصیل اچھے انداز میں پیش کی
گئی ہے۔ کاک، اچھے اندازِ تحریر پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ پنڈت شمبھو ناتھ جی کول،
سری پرتاپ کالج میں پڑھتے تھے۔ جہاں سے انہوں نے بی۔ اے کا امتحان پاس
کیا۔ وہ قرہ نلی محلہ، سری نگر کے متوطن ہیں۔ ان کی ایک کہانی جو "مفلسی" کے عنوان
سے "مارتنڈ" کے شمارہ ۱۹۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی، دلچسپ کہانی ہے۔

پنڈت ترلوکی ناتھ ایک اچھا افسانہ "دیشیا" "مارتنڈ" میں شایع ہوا تھا۔ جس میں اس طبقے کی ایک عورت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ کاشی ناتھ کول کا وطن بارہ مولہ ہے اور ان کے افسانے بھی اس صدی کے تیسرے دہے میں شایع ہوتے رہے تھے۔ ان میں "محبت" قابلِ ذکر ہے، جس میں حسن و عشق کی کرشمہ سازیوں کا اچھا مرقع پیش کیا ہے۔ پنڈت ویدلال گیرو، سری نگر کے قریب کے ایک گاؤں گیرو کے رہنے والے ہیں جو سری نگر اور جموں کی شاہراہ پر اونتی پورہ کے قریب واقع ہے۔ ان کا قیام راولپنڈی میں بھی رہا۔ ان کے افسانوں میں "حرماں نصیب شانتا" ایک بدنصیب خاتون کی کہانی ہے۔ ویدلال شعر بھی کہتے تھے اور ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ ایک نظم جو دیہات کے باسیوں کو اُبھارنے کے مقصد سے لکھی گئی تھی، اس کے کچھ شعر ہیں:

اُٹھ کھڑا ہو اے دیہاتی تجھ میں گر کچھ جان ہے
ناز خالق کو بھی ہے، جس پر، تو وہ انسان ہے
تو جہاں کو قوتِ مردانہ کے جوہر دِکھا
شہر والے جس سے ہوں حیران وہ منظر دِکھا
کام لے ہمت سے تو، تو دست قدرت ساتھ ہے
چاہے جو باری بھی ہو دنیا میں تیرے ہاتھ ہے

پنڈت سومناتھ جی اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "عجب چور" پرانے انداز کا ہے۔ پرتھوی ناتھ کول، پریم ناتھ بزاز کے اخبار "ہمدرد" کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ سری نگر کا مشہور محلہ رینہ واری، جو کبھی حکومت کے وزیروں اور اعلیٰ عہدہ داروں کی رہائش گاہ ہوا کرتا تھا۔ اور جہاں سے کئی ایک اچھے لکھنے والے بھی اُٹھے۔ پرتھوی ناتھ کی جائے قیام ہے۔ یہ بھی اچھے صاحبِ ذوق ادیبوں میں

میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں "کنیا آشرم" بے سہارا لڑکیوں کے ایک ایسے ادارہ سے متعلق کہانی ہے۔ بھاگیرتی کاشمیری کو بھی افسانہ نگاری کا اچھا ذوق ہے۔ "رفیقی" ان کے اچھے افسانوں میں سے ہے۔

چند افسانے شری بت رعنا واری (رینہ واری) کے نام سے بھی اس زمانے میں شایع ہوئے۔ جن میں سے ایک "بھولا پیار" ایک معصوم کی کہانی ہے۔ ایک دو خواتین بھی افسانہ نگاری کا ذوق رکھتی تھیں۔ ان میں شریمتی سوہن رانی، محلہ شُہہ یار، رہ بابا صاحب، غالی کدل میں رہتی تھیں۔ ان کی ایک اچھی کہانی، جو جہانگیر کی عدل گستری کے ایک واقعہ کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہے۔ اس زمانے کی لکھی ہوئی کہانیوں میں شاید واحد تاریخی کہانی ہے۔ اس کا آغاز وہ اس طرح کرتی ہیں:

"یہ انہیں دنوں کی بات ہے جب دہلی کے شاسن پر سمراٹ جہانگیر براجمان تھے۔ انہوں نے اپنی راجدھانی میں یہ گھوشنا کرا دی تھی۔ کہ سمراٹ جہانگیر پرتیہ دن وقت کا نصف حصہ لوگوں کے ابھیوگ (مقدمے) سننے اور ان پر نیائے یکھت وچار کرنے میں لگائیں گے۔"

ان کی زبان پر ہندی کا اثر ہے۔ کشمیر میں ہندی کی تحریک شروع ہونے کے بعد سے پنڈت خواتین عموماً ہندی کو ترجیح دینے لگی تھیں لیکن اکثر اُردو حروف میں مِلی جُلی زبان لکھا کرتی تھیں۔ شریمتی سوہن رانی کا مذکورہ بالا اقتباس اس کا اچھا نمونہ ہے۔

کئی افسانے لکھنے والے ایسے بھی تھے۔ جن کی قلمی کاوشیں محض افسانوں تک محدود نہیں تھیں۔ وہ مضامین، انشائیے اور ادب لطیف کے انداز کے پارے بھی لکھا کرتے تھے۔ پردیسی اس کی اچھی مثال ہیں۔ پرتھوی ناتھ کول، جن کا اوپر ذکر گذر چکا ہے، اچھے صحافی بھی ہیں۔ وہ "ہمدرد" اور "پرتاپ" کے حلقۂ ادارت میں

شامل رہ چکے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے قریب وہ دہلی چلے گئے۔ جہاں وہ "پرتاپ" سے متعلق ہو گئے۔

کشمیر سے باہر

سعادت حسن منٹو، مشہور افسانہ نگار، کشمیر کے منٹو خاندان سے تھے۔ جس کی ایک شاخ پنجاب میں آباد ہوگئی تھی۔ سعادت حسن لدھیانہ کے ایک گاؤں سمبرالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم، والد غلام حسن کی عدم توجہی کی وجہ سے، خاطر خواہ نہ ہوسکی تھی، تاہم بڑی کوشش سے انٹرنس کامیاب کیا اور علی گڑھ یونیورسٹی میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے لئے داخل ہوئے۔ لیکن دِق میں مبتلا ہوجانے کی وجہ سے تکمیل نہ کر سکے۔ سعادت حسن پہلے لاہور گئے اور پھر بمبئی میں مقیم رہے اور اخبار نویسی شروع کی۔ کچھ عرصہ فلمی رسالہ "مصوّر" ہفتہ وار سے وابستہ رہے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں انہیں ملازمت مل گئی۔ لیکن ڈیڑھ سال بعد، اس ملازمت کو ترک کرکے بمبئی چلے گئے اور فلمی دنیا سے متعلق ہوگئے اور کہانیاں اور مکالمے لکھتے رہے۔ ان کی مشہور فلمی کہانیاں "مرزا غالب"، "آٹھ دن"، "چل چل رے نوجوان" وغیرہ ہیں۔ کرشن چندر کے اشتراک سے "بنجارہ" اور "دوسری کوٹھی" کی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔

منٹو نے "ہمایوں" لاہور کا روسی ادب نمبر اور "عالمگیر" لاہور کا فرانسیسی ادب نمبر بھی مرتب کیا تھا۔ لاہور ہی سے "پارس" بھی نکالتے تھے اور "کارواں" کے ساتھ بھی وہ منسلک رہے تھے۔ کچھ ڈرامے اور کئی مضامین بھی لکھے تھے لیکن ان کی شہرت کی بنیاد ان کے افسانے ہیں، جن میں انہوں نے نئے سماجی شعور اور حقیقت نگاری کو سمویا ہے۔

ان کا اسلوب بھی اپنا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز مغربی افسانوں کے ترجموں سے ہوا تھا۔ اور خاص طور پر روسی افسانوں کے شہکاروں کو اُردو سے روشناس کرانے میں انہوں نے پہل کی تھی۔ بعد میں افسانہ ان کا مخصوص فن بن گیا۔ انہوں نے جب افسانے لکھنے شروع کئے، فرائڈ کی جنسی نفسیات کا اثر اُردو افسانہ نگاروں پر چھایا ہوا تھا۔ منٹو بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سے متاثر تھے۔ لیکن انہوں نے ان رجحانات کو اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ برتنے کی کوشش کی اور اپنے انفرادی انداز کی وجہ سے اُردو کے سارے افسانہ نگاروں میں ایک نمایاں مقام پیدا کر لیا۔ "ہتک" "ٹوبہ ٹیک سنگھ" "موزیل" "ٹھنڈا گوشت" "ممی" "نیا قانون" وغیرہ ان کے معرکۃ الآرا افسانے ہیں۔

ملک کی تقسیم کے بعد منٹو، لاہور چلے گئے تھے۔ فسادات کے وہ شاہدِ عینی تھے، اور جو افسانے انہوں نے اس موضوع پر لکھے ہیں، وہ بہترین افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ منٹو کا انتقال لاہور میں ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

کرشن چندر، جو اردو کے ایک اور عظیم افسانہ نگار ہیں، کشمیر سے اس طرح وابستہ ہیں کہ ان کے والد ڈاکٹر گوری شنکر، ریاست پونچھ میں میڈیکل افسر ہو کر آئے تھے اور ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۴۴ء تک یہیں رہے۔ کرشن چندر نے ابتدائی تعلیم مینڈھر اور پونچھ میں حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور گئے اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان انگریزی ادب میں اور ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔ اور صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ پہلے دوسروں کے ساتھ اشتراک میں انگریزی ماہنامے نکالتے رہے۔ کچھ عرصہ آل انڈیا میں ملازمت بھی کی۔ اسی دوران ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد کی ترغیب پر وہ شالیمار پکچرز سے وابستہ ہو گئے۔ اس وقت بھی، وہ بمبئی مقیم ہیں اور فلم سے بھی وابستہ ہیں لیکن فلمی کہانیوں سے ہٹ کر وہ بے شمار

کہانیاں لکھ چکے ہیں۔

کرشن چندر کشمیر سے ایک اور طرح بھی وابستہ ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی کشمیر سے ہوا اور ابتدائی کہانیاں اور ناول جو انہوں نے لکھے وہ کشمیر ہی کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں افسانے "یرقان"، "جہلم میں ناؤ پر" اور "مصور کی محبت" اور ناول "شکست" کشمیر ہی کی زندگی ہی سے متعلق ہیں۔ ان کی فطرت میں انسان دوستی کے جذبے نے، انہیں جب ترقی پسند تحریک سے منسلک کر دیا۔ ان کی طبیعت کے جوہر نمایاں ہونے لگے اور جو افسانے انہوں نے لکھے ہیں، وہ اردو افسانوی ادب کا لازوال سرمایہ بن گئے ہیں۔ ان کے شہکار افسانوں میں سے "کالو بھنگی" "غالیچہ" "مہالکشمی کا پل" "دو فرلانگ لمبی سڑک" "ان داتا" "زندگی کے موڑ پر" "برہم پتر" صرف چند نام ہیں۔ ناولوں میں "شکست" کے علاوہ "طوفان کی کلیاں" "جب کھیت جاگے" "سڑک واپس جاتی ہے" اور "دوسری برف باری کے بعد" اور کئی ناولٹ جیسے "ایک گدھا نیفا میں" "گدھے کی واپسی" "الٹا درخت" وغیرہ۔ کرشن چندر نے کچھ ڈرامے بھی لکھے ہیں جن میں مجموعہ "دروازہ" "نئے ڈراموں" میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے کئی رپورتاژ بھی ادب میں اہم مقام حاصل کر چکے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں کی تعداد گنتی سے باہر اور ان کے افسانوں کے مجموعوں کی تعداد بھی وسیع ہے۔ چند مجموعوں کے نام ہیں: "طلسم خیال" "کالا سورج" "پرانے خدا" "میں انتظار کروں گا" "کشمیریوں کہانی" "نئے افسانے" "ایک عورت ہزار دیوانے" "میری یادوں کے چنار" "آسمان روشن ہے" "مزاحیہ افسانے" وغیرہ۔ ان میں سے کئی افسانوں کے ترجمے نہ صرف ہندوستان کی کچھ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ بلکہ روسی، انگریزی اور دوسری کئی

ترجمہ ہو چکے ہیں۔

رامانند ساگر اس عہد کے افسانہ نگاروں میں ایک مقام پیدا کر چکے ہیں۔ ان کا خاندان پنجاب سے کشمیر آیا تھا اور خود ان کی ولادت کشمیر ہی میں ہوئی تھی۔ سری نگر میں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی لیکن دق کے عارضے میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے انہیں تعلیم کے سلسلے کو منقطع کرنا پڑا۔ اور وہ کافی عرصہ تک ٹنگمرگ کے سینی ٹوریم میں زیرِ علاج رہے۔ کشمیری زندگی کا انہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور ان کے قصہ گوئی کے ذوق اور اظہار پر قدرت نے ان سے کئی اچھے افسانے اور ناول لکھوائے۔ اپنے قیامِ ٹنگمرگ کے دوران ہی انہوں نے ایک افسانہ "ٹنگمرگ کے اڈے پر" کے عنوان سے لکھا تھا جو کشمیر کی فضا، اُدھر کے منظر اور زندگی کو بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے کشمیری زندگی پر کئی افسانے لکھے ہیں۔ ایک افسانہ "بخشش" کشمیری زبان میں بھی لکھا ہے اور جس میں کشمیر کے پسماندہ طبقوں کی زندگی کو موثر انداز میں پیش کیا ہے، معرکۃ الآرا بن رہا۔

سینی ٹوریم سے خارج ہونے کے بعد وہ بمبئی چلے گئے اور فلموں کے لئے کہانیاں اور مکالمے لکھنے لگے۔ بعض فلموں کی انہوں نے ہدایت کاری بھی کی جن میں "انسانیت" اور "پیغام" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "آنکھ" ان کی کامیاب فلموں میں شمار ہوتی ہے۔

ساگر کے افسانوں کا ایک مجموعہ "جوار بھاٹا" کے نام سے شایع ہوا ہے، جو سترہ منتخب افسانوں پر مشتمل ہے اور ان کا دوسرا مجموعہ "آئینے" بارہ افسانوں پر۔ ان افسانوں میں "تشنۂ تکمیل"، "زود پشیماں"، "آبِ حیات"، "دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی" ان کی فکر اور فن کے اچھے نمونے ہیں۔ "بخشش" دوسرے مجموعے میں شامل ہے۔ ساگر کے ناول "اور انسان مر گیا" کو بڑی شہرت

حاصل ہوئی۔ تقسیم ملک کے دوران فسادات اس کا موضوع ہے، جب ہندوستان میں انسان مر چکا تھا اور انسانیت مر چکی تھی۔ انہیں انسانی جذبات کو اکسانے کی خاطر یہ ناول لکھا گیا اور فسادات پر لکھے ہوئے ادب میں اس کا ایک مقام ہے۔ ناول کا دیباچہ خواجہ احمد عباس نے لکھا ہے اور یہ دیباچہ بجائے خود ایک نزاعی پارہ بن گیا ہے۔

ناول اور ڈراما

ناول اور ڈراما اس زمانے میں زیادہ نہیں لکھے گئے۔ کیونکہ لکھنے والوں کی توجہ افسانہ یا مضمون اور انشائیہ کی طرف زیادہ رہی۔ چند تصانیف جو لکھی گئیں ان میں نرسنگداس نرگس اور دو ایک اور لکھنے والوں کے کارنامے اہمیت رکھتے ہیں۔

نرسنگداس نرگس رسالہ "چاند" کے اڈیٹر کی حیثیت سے ادبی دنیا سے عرصہ سے متعارف ہیں لیکن وہ ریاست کے بعض اور لکھنے والوں کی پابندی میں پریم منوہر اور بھولا رام کوٹی کے دو اور ناموں سے بھی لکھتے ہیں۔ جموں نرگس کا وطن اور ان کی ادبی سرگرمیوں کی نشو و نما کا مرکز رہا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد، وہ تحصیل بسوہلی کی ایک جاگیر، رام کوٹ میں مختار عام کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ سولہ سال یہ خدمت انجام دینے کے بعد، وہ ترک ملازمت کر کے جموں آ گئے۔ اور دیوان پریس قایم کیا جس سے جلد ہی رسالہ "چاند" جاری کیا۔ یہ رسالہ اپنی مقبولیت اور مسلسل اشاعت کی وجہ سے اُردو صحافت میں ایک مقام پیدا کر چکا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے کے اکثر اہل قلم اس کیلئے لکھتے تھے۔

نرگس میں ادب کا ذوق ابتدا سے رہا۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ اُردو

شعراء میں خاص طور پر غالب کا مطالعہ ان کے لئے وظیفہ بنتا رہا۔ اور اسی ذوق کی بدولت وہ اس وقت سے شعر کہنے لگے تھے جب وہ ابھی نوین جماعت میں پڑھتے تھے۔ غالب کے علاوہ الف لیلہ، فسانۂ آزاد، باغ و بہار، آرائش محفل کے مطالعے نے ان میں افسانہ نگاری کے ذوق کو ابھارا، چنانچہ وہ مولا رام کوڈ کے نام سے افسانے لکھتے رہے۔ اور ان افسانوں کی تعداد اب سینکڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ ان میں سے منتخب افسانے "دکھیا دیس" "پردیسی پریتم" اور "سندلیسہ" کے مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس زمانے میں انہیں ڈوگرہ دیس کی تاریخ، تہذیب اور زندگی کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ جس کا یادگار کارنامہ "تاریخ ڈوگرہ دیس" ہے۔ یہ ڈوگرہ دیس کی تفصیلی تاریخ ہے جو ۱۱۲۲ صفحوں پر حاوی ہے اور ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی یہ کتاب نرگس کی گیارہ سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب کے افتتاحیہ میں، نرگس نے اپنے کچھ حالات اور اس موضوع سے دلچسپی کی ابتداء کے بارے میں لکھا ہے کہ رام کوٹ کی ملازمت کے دوران انہیں اطراف کے علاقوں میں دورہ کرنے کے موقعے ملے تھے۔ ان مقامات کے آثار اور زندگی کے مشاہدے نے انہیں اس نواح کی تاریخ لکھنے کا شوق دلایا اور وہ مواد اکٹھا کرنے لگے۔ چنانچہ

"وہاں سولہ سالہ ملازمت کے دوران قدرت نے وہ کچھ مجھے دکھایا۔ مختار عام جاگیر کی حیثیت سے سادہ لوح عوام، فاقہ کش اور مفلوک الحال جنتا کی مجبوریوں اور مظلومیت کے وہ گھناونے مناظر مشاہدے میں آئے کہ "زندگی کو رینگتے" اور انسانیت کو تڑپتے دیکھ کر میرا شعور جاگ اٹھا۔"

پہلے ان کے شعور کی بیداری کے آثار، اس علاقے کے عوام کی زندگی

کے افسانوں کی صورت میں سامنے آئے۔ ترقی پسند تحریک کشمیر کی طرح، جموں کے لکھنے والوں اور خاص طور پر شاعروں اور افسانہ نگاروں میں بھی اس زمانے تک مقبولیت حاصل کر چکی تھی، چنانچہ نرگس کے افسانوں میں بھی اس کا پرتو "دکھیا دیس" کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ان افسانوں کے موضوع اور کردار، اسی نواح کی دیہاتی زندگی سے چنے گئے ہیں۔ اور ان کو پیش کرنے میں حتی الامکان، حقیقت شعاری سے کام لیا گیا۔ تاہم ان کے اپنے مخصوص تاثرات نے کہیں کہیں مبالغہ کی صورت بھی اختیار کر لی ہے۔

"پاربتی" کی اشاعت ۱۹۶۲ء میں ان کے دوسرے قلمی نام پریم منوہر کے ساتھ عمل میں آئی۔ اور چاند پریس نے اسے شائع کیا تھا۔ یہ شہر کے ایک غریب خاندان کے نوجوان سندر لال کی زندگی کی کہانی ہے جو اپنے خاندان کی پرورش کیلئے کالج کی تعلیم ترک کر کے ملازمت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسے پرتاپ گڈھ کے گاؤں میں پنچایت انسپکٹر کی اسامی ملتی ہے، جہاں ہری رام سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ ہری رام کے اصرار پر، وہ اس کے گھر میں قیام کرتا ہے کہ ہری رام کی نوجوان لڑکی پاربتی سے اس کا رومان شروع ہوتا ہے، اس سلسلے میں بعض اچھے نفسیاتی مواقع بھی آجاتے ہیں۔

نرگس جی اپنے اطراف کی دیہاتی زندگی سے بخوبی واقف ہیں اور اسے حتی الامکان صداقت شعارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک المیہ اس طرح بن گیا ہے کہ سندر لال کی شادی شہر میں ایک انجنیئر کی لڑکی سے ہو جاتی ہے اور پاربتی جو اس کی وجہ سے بدنام ہو گئی تھی۔ گاؤں کے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے بیاہ دی جاتی ہے۔

یہ ہماری سماجی زندگی کے مسائل ہیں اور ملتے جلتے ماحول میں بارہا دہرائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں پریم چند کے سماجی ناولوں کو ایک خصوصیت حاصل ہے۔

سندر لال اور پاربتی کی حیات معاشقہ پر بھی پریم چند کے مخصوص انداز کا اثر ہے۔
پاربتی کے کردار کو بلند رکھنے کی جو کوشش مُصنّف نے کی ہے، اس کو دیکھ کر پریم چند
کی بیوہ ذہن میں گھومنے لگتی ہے، سُندر لال کی محبت میں جو مصیبتیں اس پر پڑتی ہیں،
وہ نہایت صبر اور مستقل مزاجی سے برداشت کر لیتی ہے۔

نرگس جی ئے فرزند اقبال نرگس، اچھے شاعر ہیں اور اقبال تمنائی کے نام
سے لکھتے ہیں۔ ان کے دو چھوٹے بھائی، دیوان چند دیوان اور گیان چند دیوان بھی
ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ گیان چند دیوان لالہ ملک راج صراف کے اخبار "رنبیر" کے
مینیجر بھی رہے اور دیوان چند ایک ہفتہ وار "شیر ڈوگر" کے اڈیٹر ہیں۔

جموں کے ایک اور سربرآوردہ ادیب، پنڈت دیا کرشن گردش، انشا
پردازی اور شاعری میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کے معاصرین انہیں "ادیب العصر"
کے لقب سے موسوم کرتے تھے۔ تعلیم سے متعلق بعض موضوعات پر ان کے مضامین "امر"
میں شائع ہوئے ہیں۔ انہیں میں ایک مضمون" اسناد کے فرائض" ہے۔ جس میں
گردش نے اساتذہ کے فرائض کی تفصیل لکھی ہے۔ ان کا ایک معلومات آفرین مضمون
"ریاست جموں و کشمیر میں فن تحریر و طباعت" جو "امر" ہی میں شائع ہوا تھا، ریاست
میں اُردو پریس کے قیام کے بارے میں بہت مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس مضمون
کے کچھ اقتباسات گذشتہ صفحات میں دیئے جا چکے ہیں۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد
میں ریاست کے پہلے پریس" ودیا پرکاش" کے قیام کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :۔

"شری مہاراجہ گلاب سنگھ جی ۱۸۴۶ء میں سریر آرائے سلطنت ہوئے۔
اور آپ نے دوسرے ہی سال ریاست کیلئے ایک چھاپہ خانہ ودیا پرکاش
کا انتظام فرمایا۔ اس چھاپہ خانہ میں ڈوگری، فارسی اور ہندی میں
سرکاری احکام، ڈاک ٹکٹوں اور اشٹامپوں اور قانونی کتب کی

طباعت شروع ہوئی۔ شری حضور مہاراجہ رنبیر سنگھ جی کے برسرِ حکومت آنے تک اس چھاپہ خانہ نے کوئی نمایاں کام نہیں کیا۔"

قانونی کتب، جن کا ذکر گردش نے کیا ہے، وہ زیادہ تر اُردو میں لکھی گئی تھیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں علوم کی اشاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"آپ نے اشاعتِ علم کی طرف خاص توجہ دی اور تخت نشینی کے دوسرے ہی سال ۱۸۵۸ء میں ایک نئے چھاپہ خانہ ودیا ولاس (ودیا بلاس) پریس کا انتظام کیا۔ اسی سال ٹائپ سازی کے لئے ایک فونڈری قائم کی گئی۔ جس میں سب سے پہلے آپ نے ڈوگری کا ٹائپ کرایا۔"

اس مضمون کے مزید اقتباسات پچھلے صفحات میں بھی نقل کئے جا چکے ہیں۔ گردش اس وقت جالندھر میں جن سنگھ کے اخبار "پردیپ" کے مدیر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

ایک اور خوش فکر ادیب، جن کا انتقال نوعمری میں ہو گیا، پنڈت کاشی ناتھ ترچھل یا ترسل، خوشتر تخلص، پنڈت تاراچند ترسل کے فرزند تھے۔ وہ علم و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ سری پرتاپ کالج میں تعلیم کے زمانے سے انہوں نے افسانے لکھنے شروع کئے تھے۔ اور ایک مجموعہ "بیچی ہی ورتا" کے نام سے مرتب اور شایع کیا تھا۔ افسانوں میں مذہبیت کا رجحان پایا جاتا ہے۔ افسانوں کے علاوہ خوشتر نے ایک ناول "گوری شنکر" بھی لکھا تھا۔ یہ ناول پنڈت نندلال کول طالب کے مقدمہ کے ساتھ شایع ہوا تھا۔ خوشتر کو ویدانت سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے سوامی ویویکانند کی تصانیف کا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے کچھ مضامین بھی لکھے ہیں اور مضامین میں بھی مذہبی رجحان غالب ہے۔ ادبی ذوق انہیں اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔

خوشتر کو زمانہ طالب علمی ہی سے دِق کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اور اسی مرض سے

وہ جوانی میں فوت ہو گئے۔

صاحبزادہ محمد عمر، جنہوں نے نور الٰہی کی شرکت میں اُردو سٹیج اور ڈرامہ
کی تاریخ پر اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "ناٹک ساگر" لکھ کر شہرت حاصل کر لی ہے۔
اس صدی کے ربع اول میں ریاست اور خاص طور پر جموں کے ادبی حلقوں کی روح
رواں بنے رہے، اس کتاب نے ان دونوں ناموں کو ایک دوسرے سے ایسا چسپاں کر دیا
ہے کہ بعض لوگ یہ ایک ہی نام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں محض ایک سببی رشتہ
تھا۔ لیکن اس سے زیادہ گہرا، دلچسپیوں کی وحدت کا رشتہ تھا۔

محمد عمر کی ولادت ۱۸۸۵ء میں جموں میں ہوئی تھی، جموں میں ابتدائی تعلیم حاصل
کرنے کے بعد وہ لاہور چلے گئے جہاں فورمن کرسچن کالج میں انہوں نے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل
کی۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں اپنی ذہانت اور فطری صلاحیتوں کی بدولت وہ کالج کے
پروفیسر یوونگ کے منظورِ نظر بن گئے تھے۔ لاہور کے قیام کے زمانے میں، وہ علامہ اقبالؒ
کی صحبتوں سے بھی مستفید ہوئے۔ اقبال سے ان کی عقیدتمندی کا ایک واقعہ یہ ہے کہ اقبالؒ
نے اپنی نظم "نالۂ یتیم" اسی زمانے میں لکھی تھی اور یہ نظم جب انجمن حمایت الاسلام جلسہ
میں پڑھی گئی، تو صاحبزادہ محمد عمر نے اسے نقل کر لیا، اور ایک رسالہ میں شائع کر دیا۔
لیکن نظم چونکہ سن کر اسی دوران لکھی گئی تھی، اس لئے اس میں غلطیاں رہ گئی تھیں۔
بعد میں اقبال نے خود یہ نظم "مخزن" میں شائع کی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد جب محمد عمر جموں لوٹے تو انہیں محکمۂ عدالت میں ملازمت
مل گئی اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے وہ ریاست کے مختلف مقامات میں متعین رہے۔
ان کی ادبی دلچسپیوں کی وجہ سے، اخبار "رنبیر" کے مدیر لالہ ملک راج صراف سے ان
کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ ایک موقع پر جب محمد عمر سانبہ میں متعین تھے، کسی
کی غلط مخبری کی وجہ سے، دونوں میں کچھ شکر رنجی پیدا ہو گئی تھی اور بتایا جاتا ہے

کہ نوبت عدالتی مقدمہ تک پہنچ گئی تھی، لیکن بعض رشتہ داروں کے بیچ بچاؤ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا اور غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ محمد عمر ان کے لئے لکھتے تھے اور یہ سلسلہ ان کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی باقی رہا۔

محمد عمر کو ابتداء سے ڈراما اور اسٹیج کے فن سے دلچسپی تھی۔ ان کا سب سے پہلا نمایاں کام حکیم احمد شجاع کے ڈرامے "باپ کا گناہ" پر تنقید تھی۔ انہوں نے ڈرامہ کے واقعات کی کئی غلطیاں بتائی گئی تھیں۔ اس تبصرہ کی بدولت وہ ادبی دنیا سے ایک سنجیدہ نقاد کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ اس تنقید کی کامیابی نے انہیں آغا حشر کاشمیری، احسن، بیتاب، مختار اور رحمٰن علی کے ڈراموں کا تنقیدی جائزہ لینے پر مائل کیا اور یہ تنقیدیں بھی اہمیت کی نظر سے دیکھی گئیں۔

ڈراما کے تنقیدی مطالعے نے بالآخر انہیں ڈراما اور اس کے فن اور اردو اسٹیج کی تاریخ پر ایک مبسوط کتاب ترتیب دینے کا خیال پیدا کیا۔ جس کا نتیجہ "ناٹک ساگر" کی تصنیف تھی۔ اس کام میں انہوں نے نورالٰہی سے بھی مدد لی اور کتاب دونوں کے نام سے شائع ہوئی۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اس زمانے میں ریاست کے اسسٹنٹ فارن سیکرٹری تھے اور محمد عمر کے ان سے مراسم تھے۔ کتاب کیلئے کیفی نے ایک بسیط مقدمہ لکھا تھا، جو کتاب کے ساتھ شائع ہوا۔

"ناٹک ساگر" اردو میں ڈراما اور اسٹیج پر پہلی تصنیف تھی اور بڑی توجہ اور محنت سے وہ لکھی گئی تھی، جس کی وجہ سے ادبی اور علمی حلقوں میں اس کی بڑی قدر ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے اس کتاب پر آٹھ سو روپیہ کا انعام عطا ہوا۔ اور انجمن ترقی اردو، حیدرآباد نے اس کتاب کی تصنیف پر مصنف کو ایک ہزار روپیہ کا انعام دیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے دربار سے مصنفین کو پانچ پانچ سو روپیہ انعام ملا تھا۔

اس کتاب کی تصنیف سے پہلے بھی صاحب زادہ محمد عمر کی ڈراما سے دلچسپی متعارف تھی، چنانچہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ڈرامے سے دلچسپی کو فروغ دینے کیلئے ایک کلب رایل امیچور ڈرامیٹک کلب کے نام سے قایم کیا تھا، جس کا اہتمام انھوں نے محمد عمر کے ذمہ کیا تھا۔ "ناٹک ساگر" کے علاوہ محمد عمر اور نور الٰہی نے مشترہ طور پر اور الگ الگ بھی کئی ڈرامے لکھے تھے۔ جن میں اکثر یک منظری اور ایک دو طویل ڈرامے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

تین ٹوپیاں : مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ ہے جو فرانسیسی سے ماخوذ ہیں۔

بگڑے دل : ایک فرانسیسی کومیڈی کا ترجمہ ہے۔

ظہر کی موت : جس کا موضوع انسان کی موت سے کشمکش ہے، موت کے فرشتے کا بہن کی گود سے اس کے معصوم بھائی کو چھین لے جانے کا منظر بہت دردناک ہے۔

سکندر۔

قزاق۔

موجودہ لندن کے اسرار۔ جس میں لندن جیسے مہذب شہر کے اندر، جرائم اور خفیہ قتل کی وارداتوں کی منظم کوششوں کا حال ملتا ہے۔

روح سیاست۔ ابراہام لنکن کی زندگی سے متعلق ایک ڈراما ہے جس کے واقعات ۱۸۶۱ء سے متعلق ہیں۔ ڈرامے کا تعارف دیباچہ میں اس طرح کرایا گیا ہے۔

"یہ ڈراما، امریکہ کے زندہ جاوید پریذیڈنٹ ابراہیم لنکن کی زندگی کے چند جستہ جستہ واقعات پر مبنی ہے اور کتھا کے سلسلے کا التزام نہ ایسے ڈراموں میں ہوا کرتا ہے اور نہ ہے۔"

اس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۳۹ میں چھپا تھا۔ اور حکیم فیروزالدین احمد فیروز طغرائی نے اس کے لئے قطعہ تاریخ کہا تھا۔ جس کا آخری شعر ہے:

لکھ دو، لکھ دو روئے طرب سے — روح سیاست، جانِ سیاست

اس کا دوسرا ایڈیشن مُصنّفین کی نظرثانی کے بعد ۱۹۳۲ میں اُردو بک سٹال، لاہور سے شایع ہوا۔ اس کے آغاز میں ایک منظوم "تقریب" ہے۔ ڈراما طویل ہے اور سات مناظر پر مُشتمل۔

پہلی پیشی: مختصر ڈراما جو پہلے "ہمایوں" لاہور (مارچ ۱۹۲۹ء) میں شایع ہوا تھا۔

ڈرامے چند: حسب ذیل سات ڈراموں کا مجموعہ ہے:

ادماتی، جنونِ ادب، چُپ کی داد، لاگ ڈانٹ، ہمہ خاندانِ آفتاب، مہابلی۔

مہابلی، جو شہنشاہ اکبر کی زندگی کے ایک رُخ سے متعلق ان کا مشہور ڈرامہ ہے۔

پہلی پیشی: جو "ہمایون" میں شایع ہو چکا تھا، اس میں بھی شامل ہے۔

ان ڈراموں میں دو تین کے موضوع اور کردار مغربی ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔ "ادماتی" میں قدیم سنسکرت کی طرح ایک "اناؤنسر" ڈرامے کے واقعات کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے:

"سنو۔ دس کا گھنٹہ بج رہا ہے اور اہلِ مقدمہ کے دل دھڑک رہے ہیں۔ تماشائیوں کا قصرِ عدالت میں تانتا بندھا ہے اور وہ بیم رجا کی کشمکش کے مزے لے رہے ہیں۔ کیونکہ آج انجینیا بنام اڈون کا مقدمہ سماعت ہو گا۔"

یہ دراصل "فارس" کے انداز کا ڈرامہ ہے۔ معرفت کے اعلان کے بعد عدالت کا منظر پیش ہوتا ہے اور سررشتہ دار جیوتی سے اپیل کرتا ہے کہ وہ مدعیہ کے حسن ملائیک

فریب سے متاثر نہ ہوں۔ سررشتہ دار کا انداز خطیبانہ ہے اور مدعیہ کا بیان شاعرانہ۔ مزاج میں گہرائی نہیں۔ مثلاً مدعا علیہ کی زبانی انجلینا سے اس کے عشق کی داستان سُن کر، جبوری کا نابد کہتا ہے:

"جوانی میں مجھے بھی ایسا ہی اتفاق ہوا، اور میرا طریق عمل بدمعاشوں ایسا ہو گیا۔ مگر وہ دن گذر گئے اب تو میں شرافت کی جان اور عزت کا ایمان ہوں۔"

"مہابلی" اس مجموعے کا سب سے اچھا ڈراما ہے، جس میں اکبر کی رواداری اور راجپوت سرداروں کی دلیری کا بڑا عمدہ مرقع پیش کیا گیا ہے۔

محمد عمر نے "تاریخ جموں" بھی تصنیف کی تھی۔

محمد عمر اور ان کے ساتھ نور الٰہی نے زبان اور اسلوب میں جو نئی روش اختیار کی تھی، وہ اُردو کے اسالیب [۱] ، ایک پسندیدہ رجحان کی رہبری کرتی ہے۔ ہندی کے آسان اور مزاج کے موافق لفظوں کو اپنی تحریروں میں جگہ دے کر، انہوں نے ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ان ڈراموں کے علاوہ ہندی، سنسکرت یا پراکرت کے بعض مشہور ڈراموں کو بھی اُردو میں منتقل کرنے کی ان مصنفین نے بڑی مستحسن کوشش شروع کی تھی۔ چنانچہ پراکرت کے دو مشہور ڈراموں "مدرا راکشس" اور "مرچ کیٹکا" کو بھی انہوں نے اُردو میں منتقل کیا تھا۔

محمد عمر کا ایک اور اہم کارنامہ "ناٹک کتھا" بھی قابل ذکر ہے، جس میں قدیم ہندوستانی ڈراموں کو پیش کیا ہے۔ آخری زمانے میں محمد عمر نے ریڈیو سے نشر کے لئے بھی کئی ڈرامے لکھے تھے۔ جن میں "ہمہ خاندان آفتاب" اور "آ بیل مجھے مار" اچھے ڈرامے ہیں۔ شعری کارناموں پر تنقید میں منیر شکوہ آبادی کی مثنوی "حجاب زنان" پر تنقید اہمیت رکھتی ہے۔

صاحب زادہ محمد عمر کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ انتقال کے موقع پر امر سنگھ کالج کے رسالے "لالہ رُخ" میں ایک نوٹ شایع ہوا تھا۔ جس میں ان کے دو فرزندوں صاحب زادہ محمود احمد اور صاحب زادہ حسن شاہ کے ساتھ ہمدردی کی گئی تھی۔

نورالٰہی، محمد عمر کے خسر کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ ریاست کے محکمۂ مال میں ملازم تھے اور ترقی کرتے کرتے وزیرِ وزارت کے عہدہ تک ترقی کر لی تھی۔ انہیں بھی ادب کا اچھا ذوق تھا اور اکثر کاموں میں وہ محمد عمر کے ساتھ شریک رہے لیکن جس طرح محمد عمر نے کچھ ڈرامے تنہا بھی لکھے تھے۔ نورالٰہی نے بھی ڈراما کا ایک مجموعہ "مدہم پنچم" کے نام سے شایع کیا تھا۔ اس میں اکثر موضوع مزاحیہ ہیں۔

مضمون نگار

افسانہ نگاری کے علاوہ مضمون لکھنے کا ذوق بھی اس زمانے کے لکھنے والوں میں عام تھا، اور سماجی زندگی کے مسایل، مذہبی موضوعات، علمی اور ادبی تاثرات کے اظہار کے لئے یہ بکار آمد صنف سہولت بخش ثابت ہوتی تھی اس لئے وسعت کے ساتھ استعمال ہوتی تھی۔ اوپر جن افسانہ نگاروں کا تذکرہ گذر چکا ہے ان میں سے کئی مضمون بھی لکھتے تھے۔ اور خصوصی طور پر مضمون لکھنے والوں میں سے چند شعر و سخن سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہیں میں سے ایک سوم ناتھ ترچھل بھی ہیں جو مصروف تخلص کرتے تھے۔ ابتدائی دور کے ماہ نامہ "ہمالہ" کے علاوہ "مارتنڈ" میں بھی ان کے مضامین شایع ہوئے ہیں۔ ان کا ایک اچھا مضمون "کیوں؟" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ جس میں اپنی کچھ ذاتی واردات کو بیان کیا ہے۔ اس کی ابتداء وہ اس طرح کرتے ہیں:

" تور کے تڑکے، پھولوں کے چمن میں ٹہلتا ہوں، گُلِ نوشگفتہ کی بو گُد گُداتی ہے۔ نرگس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی ہے۔ دِل بے اختیار ان کی طرف کھنچ جاتا ہے، مجھ میں ترو تازگی آجاتی ہے اور میں اس ترو تازگی کے احساس سے پژمردہ سا بن جاتا ہوں، کیوں؟ "

پریم ناتھ در، اننت ناگ کے رہنے والے ٹاؤن ایریا میں ملازم تھے۔ وہ بھی اچھے مضمون نگار تھے۔

اومکار ناتھ کول ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں عرائض نویس ہیں لیکن شعر ادب کا اچھا مذاق رکھتے ہیں۔

...کے ادا شر رہتے تھے۔ پنڈت ہرلبشور ناتھ تکو خوش دل کاشیری "مارتنڈ" میں ...کرتے تھے۔ سری نگر کا محلہ کنہ کدل، ان کی جائے رہائش ہے۔ ان کے والد نند لال ...، مہاراجہ ہری سنگھ کے آرکٹیکٹ تھے۔ وہ بھی ادب دوست اور صاحب کمال انسان تھے۔ خوشدل مضمون لکھتے اور شعر بھی کہتے ہیں۔ نظم میں وہ بعض وقت ...حد تول سے بھی کام لیتے تھے۔ مثلاً انھوں نے ہلکی زبان میں ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان لکھا ہے :-

"مردان خدا ہیچ فقر فی نہ ہند"

پنڈت شمبھو ناتھ ہکو، پنڈت لمبودری ید کے صاحب زادے، ادب اور شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد حنفیہ ہائی سکول اننت ناگ میں مدرس ہو گئے تھے۔ بعد میں محکمۂ جنگی میں ملازمت کی اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ سماجی اصلاح سے بھی ان کو دلچسپی رہی۔ ان کے مضامین "مارتنڈ" میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کا ایک اچھا مضمون "پیغام نوروز" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس میں نوروز کی اہمیت اور اس کے تقاضوں پر روشنی ڈالی ہے۔

چراغ حسن حسرت جن کی شاعر، مزاح نگار اور صحیفہ نگار کی متنوع صلاحیتوں نے اس صدی کے ربع ثانی کے آغاز سے خراج تحسین حاصل کرنا شروع کیا تھا، جموں کے ضلع پونچھ کے قریب ایک گاؤں بمیار میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ولادت کا سنہ ۱۹۰۴ء ہے۔ حسرت کے والد شیخ بدرالدین اور نانا جناب ...، جن کی نگرانی میں حسرت کی تربیت ہوئی۔ دونوں عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ میٹرک کا امتحان پونچھ میں کامیاب کرنے کے بعد حسرت لاہور گئے اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۲۴ میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے

بعد، اُستاد کی حیثیت سے مختلف سکولوں میں کام کرتے رہے لیکن ان کی گوناگوں صلاحیتوں نے اس کام میں آسودگی نہیں محسوس کی اور وہ معلمی کا پیشہ ترک کرکے، کلکتہ گئے اور صحافت سے منسلک ہوگئے۔ ابتداء میں مختلف جرائد جیسے "عصر جدید" "نئی دنیا" "جمہور" "استقلال" وغیرہ کے حلقۂ ادارت میں شامل رہے۔ اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "پیام" کے ساتھ منسلک ہوگئے۔ مولانا آزاد کا ان کو اپنے اخبار کے لئے منتخب کرنا، حسرت کی قلمی اور ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف ہے لیکن یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اُردو کے ایک اور سربرآوردہ ادیب، شاعر اور صحیفہ نگار، مولانا ظفر علی خان ۱۹۲۸ء میں جب کلکتہ گئے تو حسرت کی قابلیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ اور "زمیندار" کے حلقۂ ادارت میں شامل کرلیا۔ لیکن حسرت کو مبدءِ فیاض سے جو بے چین طبیعت عطا ہوئی تھی، اسے اس کام میں بھی سکون نصیب نہیں ہوا۔ مختلف اوقات میں "انصاف" "احسان" "اسرار" "شہباز" "شیرازہ" غرض کئی اخباروں کے ساتھ وابستہ رہے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کے آغاز پر "فوجی اخبار" کی ادارت ان کے تفویض ہوئی۔ اس سلسلے میں وہ برما اور ملایا بھی رہے۔ پھر اخبار "امروز" کے مدیر کی خدمت بھی کچھ عرصہ تک اس اخبار کی ادارت کے فرایض انجام دینے کے بعد ۱۹۵۱ء میں اس خدمت کو ترک کرکے حسرت کراچی گئے اور ریڈیو پاکستان نے ان کو ملازم رکھ لیا۔ اس کام سے بھی ان کی طبیعت کچھ عرصہ کے بعد اُکتا گئی اور وہ لاہور جاکر سلور میرڈٹ کمپنی میں ملازم ہوگئے۔ اس اثناء میں انہیں قلب کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ چار سال فریش رہے، تاہم اس حالت میں بھی ان کی علمی اور ادبی دلچسپیاں جاری تھیں۔ آخر ۱۹۵۵ء میں حسرت کا انتقال ہوگیا۔

حسرت شعر و سخن کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، لیکن شاعری سے زیادہ ان کی طبیعت کے جوہر طنز و مزاح اور خاص طور پر پیروڈی میں خوب چمکے۔ اس شعبۂ ادب میں

تحریریں ایک انفرادی رنگ رکھتی ہیں۔ "پنجاب کا جغرافیہ" ان کا بہت مقبول مضمون ہے۔ جو پطرس کے بعض اسی نوع کے مضامین کے ساتھ اُردو ادب میں زندہ رہے گا۔ وہ عموماً "سندباد جہازی" کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ ان کی پیروڈی کے کچھ نمونے اُردو میں اس صنف کے قابلِ قدر پارے مانے گئے ہیں۔ مثلاً اختر شیرانی کی مشہور نظم "یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی" کی پیروڈی کی تھی۔ اختر کے حُسنِ گفتار کی جھلک تو اس میں نہ آسکی لیکن نظم کا آہنگ پیدا کرنے اور موقف کو مضحکہ خیز بنانے میں وہ کامیاب رہے۔ اس کا پہلا بند ہے :-

یہی کوچہ ہے وہ ہمدم، جہاں رمضان رہتا تھا

وہ اس کوچہ کا لمبردار، آزاد رہتا تھا
بہت مسرور رہتا تھا، بہت دلشاد رہتا تھا
پریشاں قیسِ عامر، صورت فرہاد رہتا تھا
جو اس کو یاد رکھتا تھا، وہ اس کو یاد رہتا تھا

اور اس دالان میں اس کا چچا رحمان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم، جہاں رمضان رہتا تھا

حسرت کی شعری دلچسپیاں بھی وسیع تھیں۔ انہوں نے غزل کہی نظمیں لکھیں، قومی اور وطنی موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ سیاسی مسائل بھی ان کے موضوع رہے اور کچھ نظمیں انہوں نے بچوں اور عورتوں کے لئے بھی لکھی تھیں۔ غزل سے حسرت کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا اور اگر ان کی صحافتی دلچسپیاں ان کے وقت پر حاوی نہ ہوگئی ہوتیں تو اس میں شبہ نہیں کہ وہ غزل میں ایک مقام حاصل کر لیتے جو سرمایہ غزل کا انہوں نے چھوڑا ہے، وہ حسن و عشق کی وارداتوں کی پیش کشی کے مخصوص اسلوب، نفسِ انسانی کی باریکیوں کو نمایاں کرنے، اندازِ شعر کی پختگی اور

حسنِ گفتار کی بدولت ایک امتیاز رکھتا ہے۔ ایک غزل کے کچھ شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

حُسن کی برہمی معاذ اللہ | گیسوؤں کے بکھرنے کے انداز
میں ہوں اور میری بے پر و بالی | دل ہے اور دل کی حسرتِ پرواز
زُلفِ برہم جھکی ہوئی نظریں | گردنِ ناز میں کمندِ نیاز
قدِ بالا و دامنِ کوتاہ | منزلِ عشق کے نشیب و فراز
قطع ہونے لگا ہے رشتۂ زیست | اے غمِ نارسا تری عمر دراز

غلام احمد میر، مولوی فاضل، علمی موضوعات پر مضمون لکھتے ہیں۔ ان کا ایک خیال آرا مضمون "کشمیری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مسئلہ" کے عنوان پر شایع ہوا تھا۔ جس میں کشمیری زبان کے مسایل اور خاص طور پر اس کے رسم خط کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وطن اور وطن کی ہر چیز پیاری ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے، لیکن پیار و محبت کو نادان دوست کی طرح استعمال کرنا، کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ کشمیری ہماری ملکی زبان ہے، اس کے ساتھ ہمیں محبت ہے...... لیکن یہ کہ اس محبت میں اس درجہ غلو سے کام لیا جائے کہ باقی تمام ملکی مفاد کو یکسر نظر انداز کیا جائے، دیانت داری سے بعید ہے۔

غالباً کشمیری زبان ایک محدود احاطے میں بولی جاتی ہے۔ ریاست کے شمالی حصہ میں شنا وغیرہ مختلف زبانیں رایج ہیں۔ جن کا کشمیری زبان سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جنوب اور مغرب کی طرف پنجابی کے بگڑے ہوئے ڈھانچے یا ڈوگری زبانیں ہیں، جن کا کشمیری زبان...

کوئی لگاؤ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا گریز وغیرہ کے علاقوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ کشیری
زبان پڑھیں جو ان کے لئے انگریزی کا درجہ رکھتی ہے اور روزمرہ
کی زندگی میں بے کار ہے"۔

رسم خط کے بارے میں کہتے ہیں:۔

"کشیری زبان کا کوئی رسم الخط نہیں۔ فارسی رسم الخط، اس زبان
کی خوبصورتی کو قایم نہیں رکھ سکتا۔ ہاں انگریزی اور ہندی رسم الخط
میں یہ صلاحیت ہے کہ اپنی پوری خوبصورتی کو قایم رکھ سکے۔"

پنڈت نرائن جو رینہ عنقا، سری نگر کے مردم خیز محلے رینہ واری سے
اُٹھے تھے۔ روزی کے لئے وہ محکمۂ برقی میں کام کرتے تھے اور دلچسپی کے لئے مضمون اور
انشایئے لکھتے تھے۔ ان دونوں میں انہیں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ ان کا ایک
تمثیلی انشایہ "شکستہ دِل اور بُلبُل" "مارتنڈ" میں شایع ہوا تھا۔ جس میں ایک
غمزدہ انسان کا بُلبل کے چہچہے سُن کر جو صدمہ ہوتا ہے، اس کو بیان کیا ہے۔ وہ
بُلبل کو مخاطب کر کے کہتا ہے!

"مجھ مایوس محبت اور شکستہ دِل کے چھیڑنے سے تجھے کیا مِلے گا۔
کچھ نہیں، حسرت و افسوس کے سوا کچھ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

شیخ محمد عبداللہ، کشمیر کے ہر دلعزیز قاید، جو "شیر کشمیر" کے مقبول لقب سے ملقب ہیں، کشمیر کی آزادی کی جدوجہد میں، صف اول کے مجاہد رہے۔ ان کے عنفوان میں کشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں کی مطلق العنانی اور سرزمین کے لوگوں کی زبوں حالی اور خاص طور پر، نیچے طبقے کے انسانوں کی کسمپرسی نے انہیں ملازمت ترک کر کے میدانِ سیاست میں آنے پر مجبور کیا۔ جیسا کہ ایک سیاسی قاید کا کام ہے وہ اپنی تقریروں کے ذریعے اپنے خیالات عوام تک پہنچاتے رہے۔ لیکن زبان کے ساتھ ساتھ وہ قلم سے بھی کام لیتے رہے۔

شیخ صاحب کے خاندان کے بعض افراد ریاست کے اہم ذمہ دار عہدوں پر بھی مامور رہے، چنانچہ ملک سیف الدین، سلطان سکندر کے وزیر اعظم تھے۔ شیخ صاحب اس معاملے میں بھی اسلاف کے صحیح جانشین ہیں۔ ان کی ولادت سری نگر سے چھ سات میل دور صورہ میں ہوئی۔ جو کبھی ایک گاؤں سمجھا جاتا تھا، لیکن اب سری نگر کا ایک محلہ ہے۔ اگلے شاہی دور کی دینی خدمات اور امارت کے بعد، اس خاندان نے ایک آزاد پیشہ "شالبافی" اختیار کیا تھا۔ جو کشمیر میں معزز پیشہ ہے۔ شیخ صاحب کے والد شیخ محمد ابراہیم اپنے عہد کے ثقہ لوگوں میں سے تھے۔ شیخ صاحب کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم سری نگر میں ہوئی لیکن ایم، ایس، سی کی تعلیم مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ میں پائی۔ علی گڈھ کے قیام نے اُن کے ذہنی اُفق میں بہت وسعت پیدا کی۔ کشمیر لوٹنے کے بعد ایک سکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ لیکن اقبال کے الفاظ میں عشق انسانیت نے انہیں ذوقِ تپش سے آشنا کر دیا تھا۔ وہ بزم کو مثلِ شمع بزم حاصل سوز و ساز دینے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نوجوانوں کے لئے ایک مطالعہ گھر قائم کیا، جسے حالات نے جلد ہی اپنے عہد کے انقلابی نوجوانوں کی سیاسی جدوجہد کا مرکز بنا دیا۔ ڈوگرہ حکمران اور ان کے عہدہ دار، جو مسلمانوں کے کسی طرح کے بھی

اجتماع سے خائف رہتے تھے۔ اس حلقے کے نوجوانوں پر کڑی نگرانی رکھنے لگے۔ آخر شیخ صاحب نے محسوس کیا کہ دو عشق ساتھ ساتھ نبھ نہیں سکتے۔ عشق آل و معشیت اور عشق قوم۔ انہوں نے اول الذکر خدا کے بھروسہ پر چھوڑا۔ اور صحرائے سیاست میں قدم رکھ دیا۔ پہلے مسلم کانفرنس کے ذریعے اور بعد میں نیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ملک میں ذمہ دارانہ حکومت کی صدا بلند کی۔ جس ریاست کے حکمرانوں کے پاس اخبار کے اجراء کا خیال اور اجتماع، بغاوت کے تصور کے مترادف تھا۔ یہ ماننہ سیاسی تحریک نہ بغاوت تھی۔ جس کی پاداش میں ان کو اور ان کے بعض ساتھیوں کو قید و بند کی سزائیں بھگتنی پڑیں۔ یہ کشمکش، ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی تک جاری رہی۔ آزادی کی اسی جدوجہد نے انہیں پنڈت جواہرلال نہرو سے متعارف کیا اور انہیں اُن سے متاثر کیا اور انہیں ان کا دوست بنا دیا۔

"کشمیر چھوڑ دو" تحریک کی کامیابی کے بعد جب ذمہ دار حکومت قائم ہوئی۔ تو شیخ صاحب کو حکومت کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ پہلے وہ ایڈمنسٹریٹر رہے۔ پھر وزیرِ اعظم کے عہدہ پر فائز ہوئے لیکن جلد ہی حکومت ہند سے تصوراتی اختلاف نے انہیں شیکسپیئر کے کردار فالسٹاف کے الفاظ میں دار کے صعود سے دار کی سیڑھی کے ہلوطا تک پہنچا دیا۔ اور تاریخ کو دہرانے کے لئے، وہ قید کے شکنجے میں کس گئے۔ کبھی سلاخوں کے پیچھے اور کبھی سلاخوں سے آگے کے ڈرامے کے بعد اب وہ انقلاب پسند سے تعمیر پسند بن گئے ہیں اور ملک کے وسیع اوقاف اور اس کے ساتھ ملک کے نوجوانوں کی اخلاقی، مذہبی اور تعلیمی باز تعمیر میں مصروف ہیں۔

شیخ صاحب بڑے فصیح مقرر ہیں اور لاکھوں عوام کے دل ان کی مٹھی میں ہیں لیکن اپنی سائنٹفی تربیت کے ساتھ ساتھ وہ ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ وہ شعر کہتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایک مشہور شعر ہے:-

اب تو سنوا کے رہیں گے جو کہیں گے اے شیخ
گولیاں کھانے کو حاضر ہے یہ سینہ اپنا

شیخ صاحب وقتاً فوقتاً اخباروں میں سیاسی مسایل پر لکھتے رہے ہیں۔ ان کا ایک پیغام "محاذ" ہفت روزہ سری نگر کے پہلے شمارہ میں شایع ہوا ہے، جس میں انہوں نے کشمیر میں آزادی کی جدوجہد کی تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس نے اپنے سیاسی پروگرام "نیا کشمیر" میں مختلف علاقوں میں بسنے والی تہذیبی قومیتوں کو حق خود ارادیت عطا کیا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے فرقہ وارانہ سوال کے بنیادی اختلاف کو مٹایا جا سکتا ہے اور موجودہ درپیش اہم مسٔلے کا فیصلہ کرنے کے لئے یہی موزون وقت ہے۔"

"نیا کشمیر" نیشنل کانفرنس کا اہم نظام نامہ اور سیاسی دستاویز ہے، جو شیخ صاحب کے دیباچے کے ساتھ آج سے کوئی ربع صدی قبل شایع ہوئی تھی۔ دیباچہ کے آغاز میں ایک سیاسی متفکر کے خیالات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"آج سے کچھ دن قبل میں اس مشہور اہلِ قلم کے مندرجہ صدر الفاظ پڑھ رہا تھا، جو دُنیا کے حُریت پرست جمہور کی جدوجہد میں بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہا ہے۔ ان الفاظ کو پڑھتے ہی خیال گذرا کہ ہم ممبران آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس بھی یہی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ یہ جہاد ہمارے لئے نیا نہیں۔ ماضی کی تاریخ اس جہاد کے اپنے کارناموں کا مرقع ہے اور مستقبل کی نسبت اس کا اپنا مستقل نظریہ ہے۔ لیکن جہاد کے بنیادی عناصر ہر جگہ ایک ہیں۔ غریبوں کا یہ جہاد

ان لوگوں کے برخلاف ہے جو ان کی کمائی کا استحصال کرتے ہیں۔"

شیخ صاحب کے ادبی افکار کا ایک مضمون اہمیت رکھتا ہے جو "ہما" (دہلی) کے غالب کی سو سالہ برسی کے شمارہ میں شایع ہوا ہے۔ اس مضمون میں غالب کی قومی اور بین قومی اہمیت کو واضح کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اس فخرِ روزگار شاعر کی ہر نوا میں رازِ زندگی و نغمۂ حیات مضمر ہے۔ شوخیِ تحریر سے لبِ تصویر بھی گویا نظر آتا ہے۔ کلام میں تصوف کی چاشنی بھی موجود ہے اور وہ اس حسنِ ازلی کو دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں جو کہ سوزِ زندگی بن کر ہر شئے میں پنہاں ہے۔"

کشمیر کے مشہور عالم، شاعر اور مضمون نگار، پنڈت انند کول بامزئی پنڈتوں کے ایک معتبر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انگریزی میں ان کی دو تین تصانیف کی طرف، حصہ انگریزی میں اشارہ کیا گیا ہے۔ انگریزی کے علاوہ وہ اردو میں بھی کبھی کبھی مضمون لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایک اچھا مضمون "مبارک سالِ نو" کے عنوان سے "مارتنڈ" کے شمارہ ۹ اپریل ۱۹۳۸ء میں شایع ہوا تھا۔ ان کے فرزند پنڈت پرتھوی ناتھ کول بامزئی بھی انگریزی کے مصنف ہیں۔ چنانچہ ان کی تاریخ کشمیر ہمارے عہد کی اہم تصانیف میں سے ہے۔

کوی راج جانکی ناتھ در، سنسکرت کے عالم ہیں اور سری نگر میں آغا حمام کے قریب رہتے ہیں۔ ان کا تعلق کشمیر میں آریہ سماج تحریک سے گہرا ہے۔ وہ بھی اردو میں مضامین لکھا کرتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون "بھاشا" کے عنوان پر شایع ہوا تھا جس میں زبان کے مسائل پر بحث کی ہے۔ محمد عمر رضوانی بھی مضمون لکھا کرتے تھے۔ ان کا ایک اہم مضمون "ادبی چوریاں کرنے والوں کا گروہ" بغیر حوالے کے دوسروں کی تحریروں پر قبضہ کرنے والوں کے خلاف سخت تنقید ہے۔

کوٹی راج ڈاکٹر سری ناتھ بھگوت شاستری سنسکرت کے عالم ہیں۔ مٹن، ان کا وطن
ہے۔ سنسکرت اور طب کے علاوہ انہیں تاریخ سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ اخبار "ہمدرد"
(سری نگر) میں انہوں نے ۱۹۴۲ء میں تاریخ علم و ادب کے مختلف موضوعات پر مضامین
کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان کا ایک اہم مضمون "سنسکرت ادب اور کشمیری مسلمان"
کے عنوان سے اسی اخبار کے ۱۸ جنوری ۱۹۴۳ء کے شمارے میں شایع ہوا ہے۔ اس
مضمون میں کشمیری مسلمانوں کے فرقہ بٹ یا بھٹ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

'اس بات کی وضاحت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ کشمیر
کے ہندوؤں کو عام طور پر بھٹ کہا جاتا ہے۔ جس طرح بہت سے
کشمیری پنڈت بھٹ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں
میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو بھٹ کہلاتے ہیں۔ بھٹ اس
کو کہتے ہیں جو چاروں ویدوں کا جاننے والا ہو اور بھٹ وہی کہلاتا تھا
جو چاروں ویدوں کا پنڈت ہوتا تھا۔ جب کشمیر میں مسلمان آئے تو انہوں
نے کشمیری برہمنوں کو بھٹ ہی کہنا شروع کر دیا اور جو مسلمان بھٹ
ہیں، وہ بھی انہیں کی اولاد ہیں۔'

جگن ناتھ ولی ادب اور صحافت دونوں سے لگاؤ رکھتے تھے۔ لکھنے کا
شوق انہیں زمانہ طالب علمی سے تھا، اور کالج کے رسالے اور اخباروں میں مضامین
شایع کرتے تھے۔ اسی زمانے میں کئی سنجیدہ علمی موضوعات پر ان کے مضامین شایع
ہوئے تھے، جن میں سے ایک مضمون "ہماری ادبی دنیا" کے عنوان پر لکھا تھا۔ یہ مضمون
"مارتنڈ" کے شمارہ ۲۹ فروری ۱۹۳۶ء میں شایع ہوا تھا۔ مضمون میں ولی نے اس زمانے
میں کشمیر میں اخباروں کی کثرت کا تذکرہ کرتے ہوئے، ان کے بنیادی فرائض کی تکمیل
کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اخبار کے مدیروں کو ایک اچھا مشورہ دیا ہے کہ نوجوانوں، میں

ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور ادبی ماحول پیدا کر کے، انہیں لکھنے پر اُبھارا جائے۔ اپنے زمانے کے لکھنے والوں کو ایک اچھا مشورہ یہ دیا ہے کہ انہیں فرسودہ انداز تحریر کو ترک کر کے نئے لکھنے والوں کا اتباع کرنا چاہیئے۔ کشمیر میں ادبی رسالوں کی نا پیدگی پر بھی اظہار افسوس کیا ہے۔

ولی اچھے تنقید نگار ہیں۔ انہوں نے "چکبست" کے عنوان سے لکھے ہوئے ایک مضمون میں آزادی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے جس میں اردو شاعری اور زبان سے متعلق چکبست کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"وہ فرسودہ بندشیں جن سے کہ اردو شعراء نے اپنے آپ کو جکڑ رکھا تھا چکبست نے ان بندشوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا۔ جس چیز کی طرف طبیعت قدرتی طور پر راغب اور منجذب ہوتی ہے۔ وہ اسی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے غزل کی شاعری کو بہت وسیع کیا۔ پامال اور فرسودہ مضامین مثلاً گل و بلبل، زلف و کاکل، کنگھی چوٹی وغیرہ کو خیرباد کہہ کر نئے رنگ میں نظمیں لکھنی شروع کیں اور ایسے مضامین بھی کہے جن میں تکلف، تصنع اور آورد کی بو تک نہیں بلکہ لذت ترک کر دیتے۔"

پنڈت امرناتھ کاک مشہور کاک خاندان سے تھے۔ اس خاندان میں علم و ادب کی روایت رہی ہے۔ امرناتھ کاک کے چھوٹے بھائی راے بہادر پنڈت رام چندر کاک ریاست کے وزیر اعظم بھی رہے۔ امرناتھ کاک وکیل تھے لیکن علم و ادب کا ذوق ان کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ قومی خدمت سے بھی انہیں دلچسپی تھی اور پنڈتوں کی سماجی اصلاح کے لئے بہت کام کرتے رہے تھے۔ ڈوگرا عہد کی پرجا سبھا کے وہ نایب صدر بھی رہے تھے۔ سماجی اصلاح اور تہواروں پر وہ مضامین لکھتے تھے۔

نوروز پر جو کشمیری پنڈتوں کا اہم تہوار ہے اور "نورہ" کہلاتا ہے۔ انہوں نے ایک اچھا مضمون لکھا تھا اس مضمون میں انہوں نے "نورہ" کی اہمیت اور خود اس لفظ کے اشتقاق پر بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "کشمیری پنڈت چیت شُدی ایکم ہی نئے سال کی ابتداء تصور کرتے ہیں اور اس دن کا نام "نورہ" ہے۔ سنسکرت میں نئے سال کو "نو ورش" کہتے ہیں، "نو ورش" کشمیری میں پراکرت (اپشاچہ) کے قواعد کے مطابق حرف "ش"، حرف "ھ" میں تبدیل ہو جاتا ہے جیسے سکھ کو ہاک رشت کو ہت کہتے ہیں۔ اسیطرح نو ورش بدل کر نورہ ہو گیا ہے"

اسی زمانے کے ایک اور ذی علم پنڈت جیالال پنڈتا تھے جن کے خاندان میں علم و ادب کی روایات رہی تھیں۔ ان کے بھائی رام چند پنڈتا فارسی کے عالم تھے۔ فلسفہ اور مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ وہ ایک کالج میں پروفیسر بھی تھے اور قواعد پر کتاب بھی لکھی تھی۔ جیالال پنڈتا کو انشا پردازی کا ذوق تھا اور مضامین لکھتے تھے۔

ایک اور مضمون نگار چندر کا شمیری تھے، جن کے کئی مضامین اس صدی کے تیسرے دہے میں شائع ہوئے۔ ان کا ایک قابل مطالعہ مضمون سورداس کی شاعری پر تھا۔ نذیر احمد خان **پنچھی** جو سری پرتاپ کالج میں زیر تعلیم رہے، زمانہ طالب علمی میں کالج کے رسالہ "پرتاپ" میں مضمون لکھتے تھے۔

پنڈت گوپی ناتھ لال کول، انگریزی اخباروں سے متوسل رہے۔ "کشمیر ٹائمز" کے وہ ایڈیٹر رہے، اس کے علاوہ وہ "کشمیر کرانیکل" بھی نکالتے تھے۔ ان کی تصنیف "کشمیر تھرو ایجز" کا تذکرہ انگریزی کے حصے میں گذر چکا ہے۔ اردو میں وہ عموماً پنڈتوں کے قومی تہواروں کے موقع پر مضامین لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے کئی مضامین اخباروں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۱۹۳۴ء کے "مارتنڈ" کے ایک شمارہ میں ان کا ایک مضمون "نیا سال نئی جد و جہد" ۱۹۳۹ء کے ایک شمارہ میں "شیو اور شکتی" اور ۱۹۳۸ء (۲۸ فروری) میں "شیوراتری" میں شائع ہوئے ہیں۔

بخشی غلام محمد جو کشمیر کی جد و جہد آزادی میں شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ، خواجہ غلام محمد صادق وغیرہ کے دوش بدوش حصہ لیتے رہے تھے۔ شیخ صاحب کی وزارت عظمیٰ میں نائب وزیر اعظم رہے۔ ۱۹۵۳ء میں خود وزیر اعظم ہو گئے اور ۱۹۶۳ء تک ...

پرف ایئر رہے۔ کامراج پلان کے تحت وہ بھی اپنی خدمت سے مستعفی ہوگئے اور اب پارلیمنٹ کے رُکن کی حیثیت سے ملک کی سیاست میں سرگرم حصہ لے رہے ہیں اور نیشنل کانفرنس کو جس کا وجود، کشمیر میں کانگریس کے قیام کے بعد ختم ہو رہا تھا، اُسے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

بہ حیثیت ایک عملی سیاست دان کے عوام کے ساتھ ان کے ربط کا ذریعہ تقریر ہے۔ چنانچہ وہ اچھے اور فصیح بیان مقرر ہیں اور ان کی تقریریں بعض وقت نفیس مزاحیہ اشاروں سے بھی مُتصف ہوتی ہیں۔ وہ اپنی تقریروں کو موثر بنانے کے گُر سے بھی واقف ہیں اور ان کی تقریریں عام طور پر اخباروں میں چھپتی رہی ہیں۔

وزیرِ اعظم کی حیثیت سے بخشی صاحب کا رِشتہ ثقافتی اور ادبی امور کے ساتھ بھی گہرا رہا۔ اہلِ صحافت کی خواہش اور درخواست پر انہیں مضمون بھی لکھنے پڑتے تھے چنانچہ ان کے اس طرح کے مضامین اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوئے ہیں۔ ایک مضمون جو انہوں نے یوم آزادی کے موقع پر لکھا تھا، "تیز تر گام زن" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:-

"آزادی کا ایک ایک برس گذرنے کے ساتھ ساتھ، ہماری نئی قوم اقتصادی اور سماجی ترقی کے مختلف شعبوں میں اپنے قدم تیزی سے آگے بڑھا رہی ہے اور آج بھی منصوبہ بندی کے ذریعے خود کفیل معیشت کی منزل پالینے کے لئے ٹھوس اور جاندار کوشش کی جا رہی ہے۔"

غلام احمد مختار، محکمۂ تعلیم میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ناظمِ تعلیمات رہنے کے بعد وہ کچھ عرصہ تک مشیر تعلیم بھی رہے اور آخر میں جموں و کشمیر یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہوگئے تھے۔ ان کا انتقال سری نگر سے جموں جاتے ہوئے ہوائی جہاز کے حادثہ میں ہوگیا۔ مختار صاحب کے بارے میں مشہور ہفتہ وار "آئینہ" نے ایک

لے بخشی صاحب کا انتقال ۱۹۷۲ء میں ہو چکا ہے۔

نوٹ شایع کیا تھا جس میں ان کی صلاحیتوں اور کام کے بارے میں لکھا تھا :-

" مختار صاحب بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ دن رات کام کر سکتے ہیں، دوڑ دھوپ کر سکتے ہیں، ہنگامہ بپا کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کے چہرہ پر کبھی تھکن کے آثار نمودار نہ ہوں گے۔ . . . . انہیں بچہ نغمہ بہت مرغوب ہے۔"

مختار صاحب کبھی کبھی تعلیمی مسایل پر لکھتے تھے۔ ان کا ایک خیال زا مضمون "تعلیم کا نیا نظریہ" کے عنوان سے" امر" (جموں) میں شایع ہوا تھا، اس مضمون میں تعلیم کے نئے تصور کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :-

" ہمارے ملک کا اہم ترین مسئلہ عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کا ہے۔ نہ کہ چند ایک چیدہ طبقات کو غریب اور جاہل لوگوں کی تعلیمی ضروریات پورا کرنا، نئی تعلیم میں ہمارا فرضِ اولین ہے۔"

اسیر کاشیری اچھی انشا پردازانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ادبِ لطیف کے انداز کے مضامین میں ان کا مضمون" دل کی باتیں" قابلِ مطالعہ ہے۔

اس زمانے کی کچھ خواتین بھی اچھی مضمون نگار ہوئی ہیں۔ ان میں شریمتی متھرا دیوی، شریمتی ارنی کول، مسز دیری کول، شریمتی رادھا رانی اور کماری بے کشوری دیوی در، قابلِ ذکر ہیں۔ متھرا دیوی دیری ناگ کی رہنے والی ہیں۔ اور مذہبی مسایل پر لکھتی تھیں۔ ان کے زمانے میں بیج بہاڑہ کے پنڈتوں میں کچھ اختلافات ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں جو" بیج بہاڑہ کے ہندوؤں سے" کے عنوان سے "مارتنڈ" میں شایع ہوا تھا، سربرآوردہ پنڈتوں سے اپیل کی ہے کہ ــــ" ان کو چاہیے کہ آپس میں صُلح کرا دیں تا کہ سب پریم بھاؤ سے رہیں۔"

شریمتی ارنی کول نے بھی کچھ مضامین لکھے ہیں۔ ایک مضمون میں انہوں نے

عہدِ قدیم کے کچھ واقعات کو افسانے کی شکل میں لکھا تھا۔ جن میں ایک مضمون "راج پُتری سوکیتا" کے بارے میں لکھا تھا۔ راج پُتری سوکیتا" پانچالی دیش کے راجہ کیر بادی کی لڑکی تھی جو ایک رشی کے پرچار کے اثر سے 'نیسوی بن گئی تھی' تاہم اس نے اپنے شوہر کی پوری خدمت گذاری کی اور اس کے کاموں میں مدد دیتی رہی تھی۔

مسز ویری کول کا ایک دلچسپ مضمون "بڑے بڑوں کے وہم" بھی "مارتنڈ" کے ۱۹۳۸ء کے ایک شمارہ میں شائع ہوا تھا، جس میں اس نے کچھ مشاہیر کی مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بڑے آدمیوں میں کسی نہ کسی طرح کا خبط یا سنک ہوتی ہے۔ لکھتی ہیں :-

"آدمیوں کے اندر کسی نہ کسی طرح کا جنون پایا جاتا ہے۔ عام انسان کے اندر جس طرح کسی سے نفرت اور کسی سے محبت پائی جاتی ہے۔ بڑے بڑے اشخاص کے اندر بھی ایسی عادات پائی جاتی ہیں جو کہ جنون کی حد تک پہنچتی ہیں۔"

آگے کچھ مثالوں سے اس کی وضاحت کی ہے۔

شریمتی رادھا رانی نے مذہبی موضوعات پر کچھ مضامین لکھے ہیں۔ ان کا ایک دلچسپ مضمون طلاق کے خلاف شائع ہوا تھا۔ جس میں طلاق سے پیدا ہونے والی برائیوں کو ایک کہانی کے انداز سے پیش کیا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے "طلاق سے توبہ"۔ ایک نوجوان لڑکی اپنی بھاوج سے کہتی ہے :-

"بھابی، آپ کی بات میری سمجھ میں آگئی جہاں پہلے میرا یہ خیال تھا کہ عورت محض سُکھ بھوگنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس کی بلا دُکھ بھوگے، وہ کیوں بے عزتی سہے۔ بیاہ کنٹریکٹ ہوا ہی جاتا ہے، پھر کیا، ہاں اب میں اچھی طرح سے سمجھ گئی کہ سونا تپنے سے ہی نکھرتا ہے۔ جب ہم

میں لیاقت ہو نہیں تو عزت کی کیسی اُمید؟ زندگی کا مقصد تو عیش کرنا ہے۔ بُردباری ہم سے کوسوں دور ہے، نیک صفات نفی کے برابر ہوں تو پھر عزت کیسی۔۔ جب بیاہ کنٹریکٹ ٹھہرا تو بیاہ کی ضرورت ہی کیا رہی۔ یہ دِوہار تو بازاری عورتوں میں بھی ہوتا ہے۔ جب تک دِل چاہا اس مرد سے ملتی رہی، جب کسی وجہ سے دِل اُکتا گیا تو ہٹ تیری کی۔ اچھی ترکیب ہے۔ یہ عیاشی ہے یا تہذیب؟ ..... قطع تعلق کے بارے میں مجھے ایک سوال اور کرنا ہے .... "

کماری جے کشوری دیوی در "مارتنڈ" کے "ناری جگت" کے کالموں میں لکھتی تھیں۔ ان مضامین میں عورتوں اور لڑکیوں کی دِلچسپی کے مسایل سے گفتگو کی جاتی تھی۔ ایک مضمون میں جس کا عنوان ہے — "کیا پڑھ لکھ کر لڑکیاں کماری رہیں گی —" میں قدیم زمانے میں لڑکیوں کی قدر و منزلت اور موجودہ زمانے میں ان کی شادی بیاہ کی راہ میں حایل دقتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جے کشوری کی زبان سنسکرت سے لدی ہوئی ہوتی ہے۔

ایک اچھی صاحب ذوق خاتون اسی زمانے میں ادب لطیف کے انداز کے پارے لکھتی تھیں۔ یہ "مارتنڈ" اور دوسرے اخباروں میں "شش صاحبہ" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ "ادبیات" کے عنوان کے تحت ان کے جو دِلچسپ پارے شائع ہوتے رہے، ان میں سے ایک کا عنوان ہے "میں چاہتی ہوں"۔ اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:۔

"میں چاہتی ہوں، اے مرے محبوب

زندگی کی وہ خوشگوار گھڑیاں، حیات کے وہ شیریں لمحات، جب تیری یاد

— تیرا خیال مجھ پر ایسی محویت طاری کر دے، مجھے یوں بے خود و

مدہوش بنادے کر دنیا کی تمام رعنائیاں، میرے لئے محض بیکار ہو جائیں اور اس جہاں کی سب دلکش زیبائیوں سے بیگانہ ہو جاؤں۔"

ایک اور خاتون کماری اندتی کول بٹ یار محلہ، سری نگر کی رہنے والی، ہندی آمیز اردو میں مضامین لکھتی تھیں۔ وہ ہندی پرچار کا کام کرتی تھیں، اس لئے فطرتاً ان کی زبان پر سنسکرت کا گہرا اثر ہے۔ ان کا ایک مضمون جو "منش سماج سے سب کچھ سیکھتا ہے" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ جس میں سماجی یک جہتی پر زور دیا گیا ہے اور اسی یک جہتی کو تہذیب و شائستگی کی افزائش کا وسیلہ بنایا ہے۔ لکھتی ہیں :-

"سماج کے بغیر، ایکتا کے بغیر الگ الگ منش نہ تو دھرم اُنتی کر سکتے ہیں نہ وہ سکھی ہو سکتے ہیں اور نہ وہ گورو اور شانتی کی پراپتی کر سکتے ہیں۔ اس لئے منشوں کو سماج کی ترقی ضرور کرنی چاہیئے۔"

تصنیف و تالیف

تصنیف و تالیف کے اعتبار سے یہ دور کافی زرخیز رہا۔ مختلف اور متنوع موضوعات، جیسے تاریخ، علمی موضوعات، درس و تدریس، سیاسی مسائل اور کچھ افادی علوم پر اس دوران کئی کتابیں شائع ہوئیں۔

پنڈت جیالال کول ناظر، جن کا ابھی ابھی انتقال ہو گیا۔ وسیع دلچسپیاں رکھنے والے عالم تھے۔ جغرافیہ، تاریخ اور کچھ تہذیبی موضوعات پر بھی انہوں نے لکھا ہے اور ان کی کئی کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں وہ شعر بھی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیق سے بھی انہیں گہرا لگاؤ رہا ہے۔

ناظر کی ولادت ۱۸۹۵ء میں سری نگر میں ہوئی۔ ان کا خاندان کشمیر کے ذی رتبہ خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس خاندان میں کئی عالم، فارسی اور سنسکرت میں دستگاہ رکھنے والے صوفی اور سنت بھی ہوئے ہیں۔ خود ناظر کے والد پنڈت ریشہ کول فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ گھر پر ابتدائی تعلیم کے بعد، وہ سری پرتاپ کالج میں شریک ہوئے اور اپنی ذہانت، علمی اور ادبی اور خاص طور پر شعر گوئی کے ذوق کی وجہ سے، وہ کالج کے ممتاز طلباء میں شمار ہونے لگے تھے۔ کالج میں پنڈت نند لال کول طالب ان کے ہم عصر تھے۔

ناظر کو کالج کے اساتذہ میں ادبی ذوق رکھنے والے کئی ہمدرد اساتذہ میسر آئے۔ ان اساتذہ کی توجہ، دلچسپی اور ہمت افزائی کی بدولت ان کی ادبی اور علمی صلاحیتوں کو نشو و نما پانے اور بروئے کار آنے کے بھی مواقع حاصل ہوئے۔ ان اساتذہ میں سب سے پہلے کالج کے پرنسپل، پنڈت اقبال کشن شرگھا یا شرگا ناظر کی ادبی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ اساتذہ میں مولوی عزیز الدین کشمیری اور قاضی محمد اسحاق

نے ان کی تربیت میں خاص دلچسپی لی۔ قاضی اسحاق، گجرات، پنجاب کے رہنے والے تھے۔ اور کالج کے اساتذہ میں اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔ علم فضل کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا بھی وہ پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ مولوی عزیز الدین فارسی کے عالم تھے۔ اقبال کشن شرغا بڑے اچھے سخن فہم اور سخن سنج بھی تھے۔ چنانچہ "بہارِ گلشن کشمیر" میں ان کا تذکرہ شامل ہے۔ منشی امیر الدین بھی کچھ عرصہ کالج کے اساتذہ میں شامل رہے۔ وہ اپنے تلامذہ میں شعر و ادب کے ذوق کو اُبھارنے میں مشہور تھے۔

کالج میں بزمِ ادب قائم ہو چکی تھی جس کی سرگرمیوں میں ناظر بھی نمایاں حصّہ لیتے تھے۔ اور کالج کے رسالے "پرتاپ" میں وہ لکھتے تھے۔ بزمِ ادب کے اہتمام سے شعر و سخن کی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ ان محفلوں یا مشاعروں کے لئے طرحی مصرعہ پر غزلیں کہی جاتی تھیں۔ ایک مشاعرہ میں، جس کی طرح —— "خورشید نکلتا ہے سدا پردہ شب سے" مقرر تھی، ناظر نے جو غزل کہی تھی۔ اس کا مطلع اور گرہ کا شعر یہاں منقول ہے:

میں منتظرِ جلوہ جانانہ ہوں کب سے

چھٹتا نہیں، اندھیر ہے، اس رنج و تعب سے

چہرے کو ترے دیکھ کے زلفوں نے کہا یوں

خورشید نکلتا ہے سدا پردہ شب سے

بزم کا ایک اور مشاعرہ بھی قابلِ ذکر ہے جس کی طرح تھی:

"یہ ہیں نقشِ قدم ان کے، نہیں ہیں پتلیاں میری"

ناظر نے گرہ لگائی تھی۔

وہ لائے آنکھ کے رستے سے ہیں دِل میں میرے تشریف

یہ ہیں نقشِ قدم ان کے نہیں ہیں پتلیاں میری

کالج کے اہتمام سے جشنِ بہار وسیع پیمانے پر منایا جاتا تھا اور اس تقریب کے

کے سلسلے میں مشاعرہ کا انعقاد، جشن کی دلچسپیوں میں ایک شائستہ اضافہ ہوتا تھا۔ ایک مشاعرے کے لئے پرنسپل نے کالج کے صاحبِ ذوق طلباء سے نظم لکھنے کی فرمائش کی تھی ناظر اور طالب دونوں نے اس موقع پر نظمیں کہی تھیں۔ ناظر کی نظم کے کچھ شعر ہیں :-

یاد آتی ہے مجھے وہ شرفِ شانِ وطن
مخزنِ علم و ادب تھا یہ ہمارا سکن
طفلِ مکتب بھی یہاں کا تھا فلاطون کی نظر
بے بدل تھے خوبیوں میں لوگ اور فخرِ زمن
وہ زمانہ اب کہاں ہے، آ گئی بادِ خزاں
بلبل و قمری کے بدلے اب ہیں یاں زاغ و زغن

اس زمانے میں کئی نظموں میں انہوں نے اپنی مادرِ علمی کو خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔ دو شعر ہیں :

نورِ پرتاپ سے پُر نور ہوئے ہیں گلزار
مئے تعلیم سے پُر جام و سبو ہیں سرشار

ہر برس یہ سیرِ گل [illegible] جمیعِ احباب ہو
رشکِ گلزارِ ارم یہ کالجِ پرتاپ ہو

ناظر نے ۱۹۱۹ء میں بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا اور اس کے بعد وہ مردان گئے۔ جہاں سناتن دھرم ہائی [illegible] مدرس مقرر ہو گئے۔ بعد میں وہ اس سکول کے ہیڈ ما[illegible] ہو گئے تھے۔ لاہور سے بی [illegible] کا امتحان پاس کرکے وہ کشمیر لوٹ آئے اور محکمہ تعلیم میں ملازمت کر لی۔ اسی زمانے میں مہدم [illegible] تبدیلی کشمیر [illegible] تھیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز کی ترویج کے لئے جب [illegible] کو اپنے ساتھ

کام کرنے کے لئے منتخب کیا۔ شیام لال ایکسے جن کا ذکر گذر چکا ہے۔ ان کا شوق [illegible]
کی تربیت سے استفادہ کیا تھا۔ ناظر سری پرتاپ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر
کی حیثیت سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے اور اب [illegible] ناظر کی زندگی [illegible] ہیں اور
ان کی علمی اور ادبی دلچسپیاں جاری ہیں۔[1]

ملازمت کے دوران، محکمہ کے رسالہ "تعلیم جدید" کے وہ ایڈیٹر بھی رہے
تھے۔ کچھ دن "مارتنڈ" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی انہوں نے کام کیا۔ ریاست کی
تعلیمی باز تنظیم کے لئے جو سرکاری کمیٹی بنائی گئی تھی، اس کے سیکرٹری ناظر ہی
مقرر ہوئے تھے اور ایجوکیشن کمیٹی کے داعی کی حیثیت سے بھی انہوں نے کام کیا۔
ناظر کی خصوصی دلچسپی تاریخ اور خاص طور پر کشمیر کی تاریخ اور ثقافت سے
رہی اور ان موضوعات پر انہوں نے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں ایک تاریخ ہندوستان
اور دوسری تاریخ کشمیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جغرافیہ پر بھی انہوں نے ایک
کتاب لکھی ہے۔ ریڈیو کشمیر کے کشمیر کے تاریخی آثار، تہذیب اور ثقافت کے سلسلے
کے پروگراموں میں ناظر نے کوئی ایک سو کے قریب تقریریں نشر کیں۔ ان کے مضامین
اور نظمیں "بہار کشمیر لاہور" "اخبار عام" "مارتنڈ" وغیرہ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

ناظر کے بعد کے دور میں لکھے ہوئے ایک دو شعر حسب ذیل ہیں:

ان دنوں جوش جنوں سے گل کا داماں چاک ہے
نقرئی زنجیر گر چاہو تو ہے آب رواں
جلوۂ رخسار جاناں سے ہوئے شعلے بلند
لالہ زاروں میں پڑا ٹوٹ پڑ کو عکس ارغواں

[illegible] دیوان روگناتھ سنگھ سامیال، جموں کے رہنے والے [illegible] ادب [illegible] تھے۔

---

[1]: ناظر صاحب کا بھی برسوں پہلے انتقال ہو چکا ہے۔

۱۹۲۲-۱۹۲۱ء میں وہ گلگت میں تحصیلدار لینڈ ریکارڈ تھے۔ اپنے گلگت کے قیام کے زمانے میں، انہوں نے شنا زبان سے واقفیت حاصل کی اور اس زبان کے بارے میں "شنا" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جو شائع ہو چکی ہے۔ کتاب کی وجہ تصنیف کے سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے:

> "مجھے اگرچہ ایک سال سے کم عرصہ یہاں آئے ہوئے گذرا ہے، اس کمی کو محسوس کر کے میں نے چند تعلیم یافتہ اشخاص کی رہنمائی میں اس زبان میں بہ طریق صرف، و نحو ترتیب کا امکان موجود پا کر یہ حقیر تحفہ مرتب کیا ــــ"

پنڈت ہری کول نے صحت عامہ کے موضوع پر کچھ رسالے لکھے ہیں۔ ادبی تنقید کا بھی ان کو اچھا ملکہ تھا اور کچھ تنقیدیں بھی ان کی یادگار ہیں۔ اقبال کول سرینگر سے دہلی چلے گئے ہیں۔ انہیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھنے کا ذوق ہے اور مضامین اور رسالے لکھے ہیں۔

پنڈت سالگرام کول سالک کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ ان کے فرزند پنڈت شمبوناتھ کول، وکیل ناظر کو بھی علم و ادب سے دلچسپی تھی۔ ادبی ذوق کے ساتھ صحافت کا شوق بھی انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ سری نگر میں تعلیم ختم کرنے کے بعد، سالک نے انہیں پریس کا کام سیکھنے کے لئے دہلی بھیجدیا تھا۔ ناظر نے قانون کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس لئے سری نگر لوٹنے کے بعد، ان کا تقرر عدالت کے ناظر کی حیثیت سے ہو گیا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد انہوں نے حکام سے کسی بات پر ناراض ہو کر نوکری ترک کر دی اور وکالت کرنے لگے تھے۔ ایک ہفتہ وار "وکیل" کے نام سے جاری کیا تھا۔ ناظر کا انتقال جوانی میں ہوائی جہاز کے حادثے میں ہو گیا۔ ناظر نے کچھ مذہبی رسالے لکھے تھے۔ ان میں سے ایک سماجی مذہبی رسالہ "بیوگان کی فریاد پر ناظر کی اپیل" ہے۔

جس میں کمسن بیواؤں کی دوبارہ شادی پر زور دیا ہے۔ اس زمانے کے پنڈت سماج کا یہ اہم مسئلہ تھا۔ ان کے تایا پنڈت ہرگوپال خستہ نے اس سلسلے میں جو کوششیں کی تھیں، ان کا ذکر گذر چکا ہے۔ کمسن بیوہ کی حالتِ زار کو موثر انداز سے پیش کرنے کے لئے، ناظر نے کچھ اشعار بھی لکھے ہیں۔ مثلاً

روتی ہے بدھوا جو کھو بیٹھی ہے شوہر اپنا
کرتہ ہے کوئی پسر اور نہ برادر اپنا
روتی ہے کوئی کہ اے باپ کروں میں اب کیا
دے دیا داغ یتیمی مجھے تو نے کیسا

یہ منظر پیش کر کے وہ ان لوگوں کو جھنجھوڑتے ہیں، جو بیواؤں کے دوسرے بیاہ کے مخالف ہیں۔ لکھتے ہیں:

"پرانی لکیر کے فقیرو اور نئی روشنی کے امیرو، ذرا دیکھو تو سہی، آپ کی قومی بیوگاں کی کیا حالت ہے، وہ کس رنج وغم میں مبتلا ہیں اور کس طرح زندگی بسر کر رہی ہیں۔ . . . . ."

صحتِ عامہ پر بھی انہوں نے دو رسالے "تندرستی کے سنہری اصول" اور "رازِ صحت" کے نام سے لکھے تھے۔ ان کا ایک اور اہم رسالہ کشمیر میں پنڈتوں کے مشہور تیرتھ کھیر بھوانی کے بارے میں ہے۔ اس رسالے میں جو انہوں نے "کشمیر میں جگت امبا شری راگنیا بھگوتی جی کے استھاپنا کا اُوسر" کے عنوان سے لکھا ہے، مذہبی موضوع کی رعایت سے زبان میں سنسکرت کے لفظ بھی استعمال کئے ہیں۔ کشمیر میں تیرتھوں کی اہمیت کو جتاتے ہوئے پنڈتوں کی ان سے غفلت پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جن رکھیوں منیوں نے اس پرتھوی پر اپنی عبادت اور روحانی طاقت سے ہر دیوی دیوتا کی استھاپنا پرگھٹ کی ہے اور اپنی آنے والی

نولاد کے لئے موکش ہونے کا سامان پیدا کر رکھا ہے۔ آج ان کی یہ اولاد
نہ صرف ان تیرتھوں سے آہستہ آہستہ متنفر ہو رہی ہے بلکہ دھرم کرم
سے گر کر اپنے بزرگوں کے زرّیں اصول کو کھو بیٹھی ہے۔

ناظؔر کا ایک اور رسالہ "دنیا کدھر کو" ۱۹۴۵ء میں چھپا تھا۔ جس میں
نازی جرمنی اور ہٹلر کی بے راہ روی پر مذمت کی ہے۔ کشمیر کی ایک مختصر تاریخ بھی انہوں
نے لکھی تھی۔ جس میں تاریخ سے زیادہ قابلِ دید مقامات کی تفصیل لکھی ہے۔ ناظر کا اہم
ادبی کارنامہ ایک مختصر داستان ہے، جس میں انہوں نے شہزادی نور جمال تک رسائی
حاصل کرنے کے لئے ایک شہزادہ کی مہمات لکھی ہیں۔

پنڈت دینا ناتھ در ریاست کے محکمۂ تعلیم میں ملازم تھے۔ اس تعلق سے انہوں نے
تعلیمی موضوعات پر لکھا ہے۔ ان کی پیدائش کا سال ۱۸۹۹ء ہے، سری نگر ان کی جائے
پیدائش ہے۔ سری پرتاپ کالج میں وہ پروفیسر جیا لال کول کے ہم جماعت تھے اور دونوں
نے ساتھ ہی کرکچھ تصانیف بھی لکھی ہیں۔ ان کا خاندان مشہور در خاندان کی وہ شاخ ہے
جو "صاحب در" کے نام سے موسوم ہے۔ "در" خاندان نے کئی سیاستدان، عہدہ دار، عالم
اور سنت صوفی پیدا کئے۔ مشہور عارف اور فارسی کی شاعر، روپا بھوانی کے خاص
چیلے شری بالا پنڈت در، جن کے نام شری روپا بھوانی نے فارسی میں خطوط لکھے ہیں۔
ان کے مورث اعلیٰ ہوتے ہیں۔

سری پرتاپ کالج سے بی۔ اے۔ آنرز کامیاب کرنے کے بعد پنڈت دینا ناتھ
در سکول میں مدرس مقرر ہو گئے اور ریاست کے مختلف علاقوں میں متعین رہے
لداخ میں تعیناتی کے زمانہ میں انہوں نے وہاں کے تعلیمی نظام کی بہت کچھ اصلاح کی
اور لداخ بدھسٹ ایسوسی ایشن کے قیام میں پنڈت شری دھر کول ڈولو کا ہاتھ بٹایا۔
۴۳-۱۹۴۲ء میں جب کشمیری اساتذہ کی ایسوسی ایشن بنی تو اس کی صدارت کے لئے

ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ کئی سکولوں میں کام کرنے کے بعد وہ ٹیچرز ٹریننگ سکول اور
آخر میں سکولوں کے انسپکٹر کے عہدہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے اور اس وقت فارمل
پریس کو جو سری نگر کے قدیم ترین مطبع میں سے ہے چلا رہے ہیں۔

پنڈت دینا ناتھ کے مضامین انگریزی اور اردو رسایل میں شایع ہوتے رہے —
"تعلیم جدید" میں تعلیمی نفسیات پر انہوں نے جو مضامین شایع کئے تھے، انہیں اب کتابی
شکل میں مرتب کر رہے ہیں۔ انگریزی میں انہوں نے پروفیسر جیا لال کول کے ساتھ مل کر
ایک رسالہ "اپلائیڈ انگلش گرامر" لکھا تھا اور پنڈت نند لال کترو کی معیت میں —
"علم التعلیم پر مختصر نوٹ" کے نام سے ایک کتاب شایع کی۔

پنڈت دینا ناتھ جوگی کی شرکت میں پنڈت [illegible] نے "جغرافیہ جموں و کشمیر" لکھا جو
شایع ہو چکا ہے۔ جوگی بھی محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ سری پرتاپ کالج کے وہ بھی طالب علم
تھے جہاں سے بی۔ اے اور پنجاب سے بی ٹی کا امتحان کامیاب کیا۔ کئی سکولوں
میں مدرس رہے۔ آخر اودھم پور سکول سے بحیثیت ہیڈ ماسٹر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے
اور اس وقت سری نگر میں مقیم ہیں۔

پروفیسر جیا لال کول، جن کا ابھی اوپر ذکر ہوا، انگریزی کے پروفیسر ہیں، لیکن کشمیری
ادب کی ترقی میں بڑی سرگرمی سے کام کرتے رہے ہیں۔ وہ انگریزی، کشمیری اور اردو،
تینوں زبانوں میں لکھتے رہے ہیں۔ پروفیسر کول کا تعلق ایک ذی علم خاندان سے ہے۔ ان
کے والد پنڈت للہ کول، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ فارسی شاعری کے وہ بہت
دلدادہ تھے۔ اردو کا بھی وہ اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اقبال کی اردو اور فارسی شاعری
کا للہ کول نے بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا۔ اور ان کی فارسی شاعری کو اردو شاعری
پر مرجح مانتے تھے۔ کشمیر شیو فلسفہ کا مطالعہ ان کا خصوصی مطالعہ رہا تھا۔

پروفیسر کول نے سری پرتاپ کالج سے بی۔ اے اور پنجاب سے ایم۔ اے کرنے کے

بعد ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کرکے دو تین سال تک وکالت بھی کی۔ پھر کالج میں انگریزی کے لیکچرار ہوگئے۔ اور پرنسپل کے عہدہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ جس زمانے میں وہ امر سنگھ کالج میں پروفیسر تھے ڈاکٹر محمد الدین تاثیر کالج کے پرنسپل تھے۔ مذاق کے اشتراک کے سبب دونوں میں گہرے مراسم ہوگئے تھے۔ خواجہ غلام السیدین اس زمانے میں ریاست کے محکمۂ تعلیم کے ناظم تھے۔ پروفیسر کول کی صلاحیتوں سے وہ بہت متاثر تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہی ان کو میرپور کالج کا پرنسپل مقرر کرکے بھیجا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ ہند بھی اکثر کشمیر آتے تھے۔ اور ان سے بھی پروفیسر کول کا تعارف ہوگیا تھا۔ پروفیسر کول نے جب انگریزی میں "انٹرپریٹیشن آف غالب" نامی رسالہ لکھا تو، ذاکر صاحب ہی نے اس کا پیش لفظ لکھا تھا۔[1]

نواب جعفر علی خاں اثر، اُردو کے صاحب ذوق سخن سنج بھی اس زمانے میں کشمیر ہی میں وزارت کے عہدہ پر فائز تھے۔ پروفیسر کول اکثر ان کی ادبی صحبتوں میں شریک ہوتے اور مباحث میں بھی حصہ لیتے تھے۔ اثر کو جب "گیتا" کا ترجمہ اُردو میں کرنے کا خیال پیدا ہوا تو اکثر [illegible] اور پروفیسر کول سے اس سلسلے میں مشورہ کرتے تھے۔

محکمۂ تعلیم کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پروفیسر کول ریاست کی کلچرل اکادمی کے معتمد مقرر ہوئے اور ۱۹۶۶ء تک اس خدمت پر فائز رہے۔ اس تعلق سے انہیں ریاست کے سارے علمی اور ادبی اداروں اور اس قسم کے کام کرنے والوں سے سابقہ رہا اور ان کی تشکیل میں اپنے مخصوص رجحان کے مطابق رہنمائی کرنے کا موقع ملا۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کشمیری زبان اور ادب کی ترقی سے انہیں گہری دلچسپی رہی۔ چنانچہ اپنے مطالعے کے نتایج کو "اسٹڈیز ان کشمیری" کے رسالے کی شکل میں مدوّن اور شایع کیا۔ پروفیسر موصوف نے اُردو میں کئی اچھے مضامین بھی لکھے ہیں۔ جن میں سے اکثر ریڈیو کشمیر سے شایع ہوئے اور کچھ اکادمی کے دو ماہی رسالے

---

[1] اس ترجمہ کی [illegible] اس کا پیش لفظ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا۔ (ایڈیٹر)

"شیرازہ" میں بھی شائع ہوئے۔ انہیں مضامین میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک خیال نما مطالعہ بھی ہے "جواہر لال نہرو۔ چند پہلو" کے عنوان سے مذکورہ بالا رسالے کے نہرو نمبر میں شائع ہوا۔ مضمون خاصہ جذبات سے پُر اور اس کا انداز بہت دلچسپ ہے۔ اس کا آغاز ایک ڈرامائی انداز میں اس طرح کرتے ہیں:

"جب ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کے اس پُر آشوب دن، گاندھی جی کو قتل کیا گیا اور خود جواہر لال نہرو کے الفاظ میں، روشنی گُل ہو گئی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا، کہا جاتا ہے کہ مسز سروجنی نائیڈو برلا ہاؤس کے اس کمرے میں داخل ہوئی، جہاں ماتم کرنے والے لوگ یتیم بنے ہوئے اور غم کے عالم میں ڈوبے ہوئے بیٹھے تھے، اور پکاری۔ کیا آپ اس کے لئے کسی اور طرح کی موت چُنتے ......؟"

انگریزی کے ایک عالم کے اظہار اور اسلوب کا یہ انداز، اردو کے لئے نیا، لیکن اس کے لئے ایک فطری تقاضا ہے۔ ان کا ایک اور مضمون اسی رسالے میں "قومی یک جہتی اور مصنف کا فرض" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں ملک کے مختلف عناصر میں یک جہتی پیدا کرنے میں، ادیب پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت کی ہے۔

کشمیری میں، اور کشمیری پر پروفیسر کول کی چند تصانیف بھی ہیں جو کشمیری ادب کی تنقید اور تشکیل میں نمونے کا کام دیتی ہیں۔ پروفیسر نند لال کول طالب کی شرکت میں انہوں نے عارفہ للہ دید پر جو رسالہ اردو میں لکھا ہے، اس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ یہ رسالہ ایک بسیط مقدمہ کے علاوہ للہ دید کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے۔ کلام کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"یہ مجموعہ کلام بصیرت، جذبات، عشق حقیقی اور خلوص و صدق کا ایسا مرقع پیش کرتا ہے جس میں حقیقت کی جھلک نمایاں طور پر

نظر آتی ہے۔ بلند پایہ سنتوں اور صوفیوں کے کلام میں یقیناً یہی اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد بیک وقت کئی عالموں میں رہتا ہے، جن کو مجموعی طور پر دو عالموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ...“

آگے ان دو عالموں یعنے خارجی اور داخلی کی تفصیل لکھی ہے، جو بہت خیال نما ہے۔

پروفیسر کول نے کشمیری رسم خط پر بھی کافی غور و خوض کیا ہے اور کشمیری کی مخصوص اصوات کے لئے کچھ علامتیں بھی تجویز کی ہیں، جن کی تفصیل انہوں نے اپنے ایک مضمون ”کشمیری زبان اور رسم الخط“ میں لکھی ہے۔ یہ مضمون ریاست کے رسالے ”تعمیر“ کے شمارہ اگست ۱۹۶۰ء میں شایع ہوا ہے۔ پروفیسر اچھے مکتوب نگار بھی ہیں۔ ان کے مکاتیب میں بھی ان کی اور تحریروں کی طرح ان کا شخصی اسلوب جھلکتا ہے۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

”آپ کا انتظار ہے، مشکل یہ ہے کہ اُردو میں لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں ——“

اور ایسی جرأت، وہ معذرت کے ساتھ یا معذرت کے بغیر اکثر کرتے رہے ہیں۔ خط میں آگے لکھتے ہیں:

”میں پہلے بھی ایک بار اس خوبصورت شہر میں آیا ہوں.... اور چار دن یہاں یونیورسٹی میں ٹھہرا تھا۔ سکندر آباد کی کشادہ سڑکوں پر چلنے اور موٹر چلانے کا موقع ملا اور دو چار دفعہ حیدرآباد بھی گیا —— پارک دیکھا، رادیندر بھارتی کو بھی دیکھا اور ساہتیہ اکادمی کے آفس سیکرٹری سے بھی ملا۔ اس نے تیلگو میں دو کتابیں پیش کیں۔ جن میں میرے دو تصانیف بذریعہ ترجمہ شامل ہیں۔ کل سے ٹیسٹ میچ لال بہادر سٹیڈیم میں دیکھوں گا۔ ایک دفعہ انگلش انسٹی ٹیوٹ

بھی گیا اور ہاں گولکنڈہ فورٹ بھی...... مگر ان مشاغل سے میری
تشفی نہیں ہوئی۔ آپ آئیں تو اس مقام کی بہت ساری اور
دلچسپیوں سے میرا تعارف ہوگا اور یقیناً ہوگا۔"

پروفیسر کول کی انگریزی میں اطلاقی قواعد کا ذکر اوپر کیا گیا، جو انہوں نے پنڈت دینا ناتھ در کے ساتھ مل کر لکھا تھا۔ ان کی مرتب کی ہوئی ریڈریں اور امدادی کتب بھی نصاب میں شامل رہیں۔

اس وقت بھی پروفیسر کول اپنے علمی اور ادبی مشاغل میں مصروف ہیں۔

کشمیر میں شیعہ مسلک کی اشاعت، شیعہ مشاہیر اور ان کے سیاسی، علمی اور ادبی کارناموں کی ایک تفصیلی تاریخ حکیم غلام صفدر ہمدانی نے عرصہ پہلے لکھنی شروع کی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں "شیعیان کشمیر" کے نام سے شایع ہوئی۔ ہمدانی سرکاری ملازمت میں رہے۔ اور ریاست کے محکمہ حسابات میں مختلف عہدوں پر مامور رہے اور ۱۹۶۱ء میں فائنانس سیکرٹری کے عہدے سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ ان مصروفیات کے دوران بھی اپنے علمی کام کو جاری رکھا۔

عہدے کی ان مصروفیتوں کے علاوہ بھی ابتدائی زمانے میں وہ کچھ علمی اور بعض وقت سیاسی کاموں میں لگے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں اپنے کچھ ہم خیال ساتھیوں کی مدد سے انہوں نے ایک خفیہ سیاسی مجلس بنائی تھی۔ اردو اور انگریزی میں ان کے مضامین "مسلم آؤٹ لک"، "سول ملٹری گزٹ" لاہور، "ایسٹرن ٹائمز"، "سن رائیز"، "سفینہ" سرینگر "ارشاد"، "صداقت" وغیرہ میں شایع ہوتے رہے۔ کشمیر میں عزاداری امام حسینؑ پر بھی انہوں نے لکھا ہے اور کشمیری علماء کی بعض بے راہرویوں پر "اظہار حقیقت" کے نام سے ایک رسالہ "مسرور کاشمیری" کے فرضی نام سے لکھا ہے جو شایع ہو چکا ہے۔ کشمیری زبان میں لکھے ہوئے مراثی کو ہمدانی نے "کاشُر مرثیہ" کے عنوان سے مرتب اور

شائع کیا ہے۔ لیکن حکیم صفدر ہمدانی کا یادگار کام ان کی تصنیف "شیعیانِ کشمیر" ہے۔ یہ تفصیلی تاریخ بھی ہے اور شیعیانِ کشمیر کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کے ازالہ کی کوشش بھی۔

کتاب کا آغاز کشمیر میں اسلام کی اشاعت سے ہوتا ہے اور اس زمانے سے ڈوگرہ عہد تک کے سارے شیعہ مشاہیر، ان کے کارناموں، شعراء، علماء اور حکماء کے حالات، شعراء (فارسی) اور کشمیری کلام کے اقتباسات اس میں اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔ میر شمس الدین عراقی کے حالات اور چکوں کے دورِ حکومت کے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس طرح اس قابلِ قدر کتاب سے کشمیر کی ادبی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

میرزا محمد افضل بیگ، جو شیخ محمد عبداللہ "شیرِ کشمیر" کے گہرے دوست اور سیاسی سرگرمیوں میں ان کے قریبی رفیق کار رہے ہیں۔ آزادیٔ کشمیر کے بعد حکومت کی زراعتی پالیسی کے بارے میں ایک رسالے کے مصنف بھی ہیں، جو "زرعی اصلاحات" کے نام سے موسوم ہے اور آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ میرزا صاحب نے بحیثیت منسٹر مال، ریاستِ جموں و کشمیر لکھا تھا اور اسے مولانا محمد سعید مسعودی جنرل سیکرٹری نیشنل کانفرنس نے اپنے پیش لفظ کے ساتھ ۱۹۵۰ میں شائع کیا ہے۔

میرزا محمد افضل بیگ، شیخ محمد عبداللہ کی طرح، اپنے سیاسی خیالات، اظہارات اور عمل کی بدولت نزاعی شخصیت رہے، تاہم جہاں تک کشمیر کے مستقبل کا مسئلہ ہے ان کے طرزِ عمل میں ایک بنیادی استقلال نظر آتا ہے۔ میرزا صاحب کی جائے پیدائش اسلام آباد اننت ناگ ہے اور سنہ پیدائش ۱۹۱۰۔ ان کے والد میرزا نظام الدین بیگ کشمیر کے ثقہ لوگوں میں سے تھے۔ محمد دین فوق نے اپنی تاریخ "اقوام کشمیر" میں ان کے خاندان کے حالات لکھے ہیں لیکن یہ بات غلط درج کی ہے کہ میرزا صاحب کے بزرگ شال کا کاروبار کرتے تھے۔ اصل میں اس خاندان کا تعلق فوجی خدمات سے رہا اور یہ سرہنگ زاد انداز

ان کی تحریروں میں جھلک جاتا ہے۔ میرزا صاحب کی تعلیم سری نگر اور پھر علی گڈھ میں ہوئی۔ بی۔ اے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے کامیاب کیا، اس کے بعد علی گڈھ میں دو سال مقیم رہے اور ایل ایل بی کی تکمیل کی جس کے بعد وہ ریاست میں وکالت کرتے رہے۔ اسی زمانے میں اپنے ذاتی رجحان اور شیخ صاحب کی رفاقت نے، انہیں سیاسی میدان میں لا کھڑا کیا اور باپ دادا نے جو بہیں میدانِ کارزار میں سرکیں تھیں، میرزا صاحب نے میدانِ سیاست میں جیتیں۔ چنانچہ آزادی کی جدوجہد کے وہ سربرآوردہ قایدین میں شمار ہوتے ہیں۔ نیشنل کانفرنس کے وہ سرگرم رُکن رہے اور کانفرنس کی ذمہ دار حکومت کی تحریک کی کامیابی کے بعد جب ریاست میں قانون ساز مجلس قائم ہوئی تو وہ اس کے رُکن منتخب ہوئے اور شیخ محمد عبداللہ نے جب حکومت تشکیل دی تو میرزا صاحب وزیرِ امورِ عامہ رہے۔ کچھ عرصہ وزیرِ مال بھی رہے۔ پھر جب شیخ محمد عبداللہ حکومت سے ہٹائے گئے اور گرفتار ہوئے تو میرزا صاحب نے قید میں بھی ان کی رفاقت نہیں چھوڑی۔ قید سے رہا ہونے کے بعد سے وہ محاذِ رائے شماری کے صدر کی حیثیت سے رائے عامہ کو منظم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

بیگ صاحب[1] قانون میں اپنے نکتہ رس دماغ کی بدولت امتیاز رکھتے ہیں۔ اپنی وزارت کے زمانے میں انہوں نے ریاست کے لئے کئی نئے قوانین مدون کئے۔ ان میں قانونِ اصلاحِ اراضی اور قانونِ تنسیخ قرضہ جات اور رہن اہمیت کے مالک ہیں۔ چنانچہ اول الذکر کی اہمیت کی طرف، امریکی سفیرِ ہند مسٹر چیسٹر بولز نے بھی ایک موقع پر اشارہ کیا ہے۔ بیگ صاحب کا رسالہ "زرعی اصلاحات" ریاست کی اقتصادیات کی نئی تشکیل میں اُس اشتراکی رجحان کا آئینہ دار ہے۔ جس کو شیخ محمد عبداللہ کے اقتدار کے زمانے میں ان کے رفقاء بیگ صاحب اور خواجہ غلام محمد صادق نے نشوونما دینے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ رسالہ میں سرمایہ دارانہ نظام کی خامیاں اور اشتراکی نظام کے فائدوں پر روشنی

---

[1] بیگ صاحب جون ۱۹۸۱ء میں انتقال کر گئے ہیں

ڈالنے کے بعد، بیگ صاحب "ہمارا فیصلہ" کی ذیلی سُرخی کے تحت لکھتے ہیں:

"جہاں تک ریاست جموں وکشمیر کا تعلق ہے، ہم نے اس نظام کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے، جس میں نجی یا پرائیویٹ ملکیت کا اصول کارفرما نہ ہو۔ جہاں صرف ایسے اشخاص کے ہاتھ میں محنت کش عوام کی باگ ڈور نہ ہو جو ذاتی مفاد کی خاطر، کبھی مصنوعی قحط اور کبھی اقتصادی بحران پیدا کر کے عوام کو مبتلائے مصیبت کر دیتے ہیں۔"

مولانا مسعودی نے اپنے پیش لفظ میں اس رسالے کی ترتیب اور اس کے محرک پر روشنی ڈالی ہے۔ پہلے یہ رسالہ کئی تقریروں میں ریڈیو کشمیر سے نشر ہو چکا تھا اور اس کا محرک شیخ محمد عبداللہ کا زمین کسانوں کی ملکیت قرار دینے کا وہ تاریخی اعلان تھا جو ۱۳ جولائی ۱۹۵۰ کو کیا گیا تھا۔ مولانا مسعودی نے اس طرح کے جرأت مندانہ اقدام کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔

بیگ صاحب نے سیاسی مسائل پر کئی مضامین بھی انگریزی اور اُردو میں لکھے ہیں۔ اُردو میں ان کا ایک اچھا مضمون "محاذ" ہفت روزہ (سری نگر) کے اجراء کے موقع پر "تنظیم اور کارکن" کے عنوان سے لکھا تھا۔ جس میں ان دونوں کے باہمی رشتے کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تنظیم، افراد کا ایک مجموعہ ہوتی ہے، افراد کے خیالات ومحسوسات کی ہم آہنگی ہی دراصل کسی تنظیم کے وجود کا باعث بنتی ہے۔ افراد کو جب اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ ان کے مقصد کو ہمہ گیر طریقے پر آگے بڑھانے اور اس میں ایک قسم کی افادیت پیدا کرنے کی ضرورت درپیش ہے تو ان کے منتشر رجحانات اور بکھرے ہوئے غور و فکر کا ردِّعمل ایک وحدت کی صورت اختیار کر کے تنظیم کو

تشکیل دیتا ہے۔ تاکہ ان کی آواز فضاؤں میں ایک پُر اثر گونج کی طرح

چھا جائے اور اس آواز کے ہر پردے سے یک سوئی اور ہم آہنگی

کے جاودانی نغمے تخلیق ہوں۔"

میرزا محمد افضل بیگ کے بڑے بھائی میرزا غلام قادر بیگ جو بہ حیثیت رار کو آپریٹو کے

عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ کشمیر کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیتے رہے، اور

قید و بند کی مصیبتوں میں بھی گرفتار رہے۔ سازش کشمیر کے مقدمے میں بھی وہ ملزم

قرار دیئے گئے تھے۔ ان حوصلہ شکن حالات میں، ادبی دلچسپی ان کے لئے کچھ سہارے

کا کام دیتی رہی۔ وہ کہانیاں لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی امور

پر وہ مزاحیہ انداز میں بھی لکھتے رہے۔ "سفید بادہ" اور "توپ کی کنجی" ان کے

اچھے مضامین ہیں۔ ان کو ایک امتیاز یہ حاصل ہوا کہ انھوں نے اسرائیل مملکت کی سیاحت

کی ہے اور تین مہینے تک مختلف حصوں میں گھوم پھر کر وہاں کی روزمرہ زندگی، ان کے اقتصادی

نظام اور طرزِ فکر کا مطالعہ کیا، اور ایک ضخیم کتاب بھی مدوّن کی ہے، جس کے کچھ

حصے مقامی اخبارات میں شایع ہوئے ہیں۔ میرزا غلام قادر بیگ۔ اشتراکی نظام

کے بہت قایل ہیں۔ چنانچہ انہوں نے عرب اسرائیل آویزش کا علاج، اشتراکی

نظام کی اشاعت بتائی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ عربوں پر اسرائیلی برتری، اسرائیل

میں اقتصادی مساوات اور عربوں میں عدم مساوات کا ایک نتیجہ ہے اور اس نتیجے

پر پہنچے ہیں کہ جب تک عرب سماج میں اقتصادی مساوات رائج نہیں ہوگی، وہ

اسرائیل سے عہدہ برا نہیں ہوسکیں گے۔ اپنے دعوے کی تائید میں انھوں نے

چیکوسلواکیہ، شمالی کوریا، شمالی ویت نام، روس اور چین کی مثالیں پیش کی ہیں۔

حسن ابن علی کے فرزند منشی محمد اسحٰق آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد کے ہراول دستے

میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ لیکن اپنی سیاسی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ، انھوں

نے اردو میں کئی رسالے لکھے ہیں۔ جن میں سے اکثر مذہبی موضوعات پر ہیں یا اصلاحی اور تنظیمی نوعیت رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۳۱۹ھ کو سری نگر میں ہوئی۔ دسویں جماعت تک تعلیم پائی تھی۔ کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اور تعلیم کا سلسلہ ختم کرنا پڑا۔ ابتدا میں حنفیہ سکول میں ملازمت کی پھر کچھ عرصہ محکمۂ جنگلات میں کام کیا، آخر میں سوہن لال اینڈ سنز کی ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازم ہوگئے۔ ان کی دیانتداری کی وجہ سے سارا کام ان پر چھوڑ دیا گیا تھا اور وہ فرم کے منیجر بنا دیئے گئے تھے۔ اس کام کے سلسلے میں انہیں اتنا تجربہ حاصل ہوگیا کہ خود اپنی فرم قائم کرلی۔ اور اسے لمیٹڈ بنا دیا۔ جس کے منیجر وہ خود ہوگئے تھے۔ ان کی گاڑیاں راولپنڈی سے سری نگر تک چلتی تھیں۔ چنانچہ جب یہ آزادی کی لڑائی میں گتھ گئے تو حمل ونقل اور اخبار وغیرہ کے سری نگر پہنچانے میں ان کی گاڑیوں سے بہت کام لیا گیا۔

منشی صاحب نے کچھ عرصہ ایک ہفتہ وار اخبار" ذوالفقار" کے نام سے بھی جاری کیا تھا جس کے ایڈیٹر حکیم غلام حسین مخمور تھے۔ مخمور اچھے انشاپرداز اور شاعر بھی ہیں۔ وہ جموں وکشمیر شیعہ فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری بھی تھے۔ اور تنظیمی مسایل کے بارے میں ایک رسالہ" پیش کش" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ جس کا پیش لفظ منشی اسحق نے بہ حیثیتِ صدرِ فیڈریشن قلمبند کیا تھا۔ اسی رسالے کے آخر میں مخمور کے یہ دو شعر بھی درج ہیں:

کچھ زیرِ چمن میرے نشیمن کی کہانی
افلاک سے ٹوٹے ہوئے رشتہ کی کہانی

ہاں ہاں، وہی کہ طائرِ بے بال بھی نہیں
ہاں ہاں، مگر کہ مایلِ پرواز بھی نہیں

۱۹۲۱ء میں منشی اسحٰق نے اپنے والد مرحوم کے قدم بہ قدم چلتے ہوئے انجمن بہبودی شیعہ بھی قایم کی تھی۔ پہلے وہ بھی مسلم کانفرنس کے سرگرم کارکن تھے لیکن ۱۹۳۸ میں جب یہ کانفرنس نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہو گئی، تو منشی صاحب اس کے رکن رکین بن گئے۔ اسی سلسلے میں پہلی دفعہ ۱۹۳۸ء میں جیل بھیجے گئے اور اس کے بعد کئی دفعہ قید و بند میں رہے۔ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک میں یہ پیش پیش رہے اور جب ان کا کشمیر میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا، تو بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق کے ساتھ لاہور میں رہ کر اس تحریک کو چلاتے رہے۔

آزادی ملک کے بعد جب ایمرجنسی نظم و نسق قایم ہوا اور شیخ محمد عبداللہ اس کے سربراہ مقرر ہوئے تو منشی اسحٰق کو ایمرجنسی افسر مقرر کیا گیا، لیکن چھ ماہ بعد اس خدمت سے وہ الگ ہو گئے۔ اور تنظیمی کاموں میں لگ گئے۔ کل جموں و کشمیر شیعہ فیڈریشن کے وہ بانی اور اس کے صدر بھی رہے اور آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے نائب صدر منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں فریضہ حج ادا کرنے گئے اور شام، عراق اور ایران کا دورہ کر کے کشمیر لوٹے۔ ۱۹۵۴ء میں محاذ رائے شماری کے بانی ارکان میں وہ بھی شامل تھے۔ اور اس کے خزانہ دار منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں جب وہ محاذ کے کارگذار صدر تھے، انہیں گرفتار کر لیا گیا اور دو سال دو مہینے کے بعد رہا ہوئے۔ اور رہا ہونے کے بعد محاذ کے صدر بنائے گئے تو پھر گرفتاری عمل میں آئی۔ ۱۹۶۳ء میں موئے مقدس کی تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں انہیں پھر قید کر دیا گیا۔ ایک سال بعد رہا ہوئے تو پھر صدر محاذ کی حیثیت سے گرفتار ہو گئے۔ آخری مرتبہ ۱۹۶۷ء میں بیماری کی وجہ سے انہیں رہا کیا گیا۔ بیماری کے دوران بھی وہ لکھتے پڑھتے رہے چنانچہ ان کا آخری رسالہ "ندائے حق" ان کے انتقال سے چند ہی دن پہلے ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں شایع ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۶۸ برس کی تھی۔

ان کے لکھے ہوئے رسایل میں "ندائے حق" کے علاوہ "حالات حضرت علیؑ" "پیامِ عمل" "صورِ اسرافیل" "جامع المتفرقین" "کارِ مُلّانی سبیل اللہ فساد" شامل ہیں۔ "پیشِ کش" کی ترتیب میں بھی ان کا بڑا حصّہ رہا۔ ایک اور اہم رسالہ "چودہویں صدی" جو چار حصوں پر مشتمل ہے، ان کا اہم رسالہ ہے، جس میں شیعانِ کشمیر کی تنظیم اور اصلاح کے مسایل سے بحث کی گئی ہے۔ "صورِ اسرافیل" کی ابتداء میں حسن ابن علی کا مرتبہ رسالہ "ترجمہ نماز" کشمیری بھی شامل ہے۔ اس رسالے میں شیعیانِ کشمیر میں اتحاد اور ترقی اصلاح اور تنظیم کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

"کسی کتاب کے لکھنے سے قبل میرے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ لکھوں تو کیوں لکھوں، کیا لکھوں اور کن کے لئے لکھوں، اور آخر الامر فریضہ انسانیت کے، عوام کی بہبودی کی خاطر، جو کچھ بھی مُناسب معلوم ہوتا ہے، لکھ لیتا ہوں۔"

"ندائے حق" کے آغاز میں وہ پڑھنے والوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے رہے ہیں، وہ دینوی منفعت یا نام و نمود کے لئے ہے۔ اسی سلسلے میں اپنے والد مرحوم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"میرے پاس اپنے والد صاحب کی لکھی ہوئی چھبیس سالہ ڈایری مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور کی زیرِ مطالعہ ہے جو کہ میرے لئے موجب تسکین و اطمینان ہے۔ اس سے یہ جائزہ لینے میں مدد مل رہی ہے کہ اس دورِ حکومت اور موجودہ نام نہاد عوامی راج میں موازنہ اور فرق معلوم ہو۔ اگر اول الذکر دور میں مذہبی بنیادوں پر فساد اور جھگڑے ہوتے رہے تو مؤخر الذکر دور میں سیاسی بنیادوں پر ان کا

وجود عمل میں آیا۔"

آگے دونوں ادوار کا مقابلہ اور موازنہ کیا ہے۔ منشی صاحب کو اپنے اگلے سیاسی کارکن ساتھیوں سے بنیادی اختلاف ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس رسالے میں مرزا محمد افضل بیگ، صدرالدین مجاہد، وغیرہ سے اپنی مراسلت کی نقلیں بھی دی ہیں اور اپنے مسلک کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر سری کنٹھ توشخانی سنسکرت اور فلسفہ کے عالم، کالج کی ملازمت سے حال ہی میں سبکدوش ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے بی۔ اے کیا اور سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں ایم۔ اے ایل ایل بی کا پہلا امتحان بھی انہوں نے کامیاب کیا۔ لیکن بعد میں ریاست میں وکالت کا امتحان کامیاب کر کے کچھ عرصہ تک وکالت کی۔ سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء میں وہ کالج کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ کچھ عرصہ سکول میں ہیڈ ماسٹر بھی رہے۔ اور اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز کی خدمت بھی انجام دی۔ آخر میں کالج کے پروفیسر ہو گئے۔ کالج کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ریاست کی کلچرل اکادمی میں وہ کشمیری ڈکشنری کی تدوین کا کام پروفیسر نندلال کول طالب کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔[ے]

پروفیسر توشخانی نے مشہور صوفی شاعر پرمانند کے حالات اور کلام کا انتخاب ایک رسالے کی صورت میں کیا ہے جو "پرمانند" کے نام سے ۱۹۶۰ء میں کلچرل اکادمی کے سلسلۂ انتخابات منظومات کشمیری میں شائع ہوا ہے۔ ابتداء میں "تعارف" کے عنوان کے تحت پرمانند کے مختصر حالات لکھے ہیں اور کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ کشمیری شاعری کو پرمانند کی دین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پرمانند نے پرانے رنگ کی شاعری میں ایک انقلاب پیدا کیا، مدحیہ نظموں کو مناجات کی صورت دی، حکایات اور واقعات پر مبنی اشیاء کو تمثیلی نظموں کی شکل میں پیش کیا، اخلاق یا پند

ے۔ پروفیسر توشخانی [illegible] کر چکے ہیں۔

سے متعلق خیالات کو وعظ خوانی سے نکالا اور حقایق کی طرف توجہ دلاکر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی۔"

پنڈت دینا ناتھ کول، کشمیر کے آریہ سماجی نیتا "مارتنڈ" میں آریہ سماج کے مسایل پر لکھتے تھے۔ اہلِ کشمیر کو آریہ سماج عقاید سے روشناس کرانے کے مقصد سے انہوں نے ایک مضمون "آریہ سماج کا مشن" کے عنوان سے لکھا تھا۔ مضمون میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو اس فرقے کے بارے میں کشمیر میں رایج تھے۔

قاضی غلام الدین، فارسی کے اچھے عالم تھے۔ منشی فاضل کے علاوہ ایم۔ اے اور بی ٹی کا امتحان پاس کر کے وہ محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کے والد قاضی محی الدین بھی اپنے زمانہ کے سربرآوردہ فارسی عالم اور اُستاد تھے۔ چنانچہ پنڈت نند لال کول طالب نے قاضی غلام الدین کے ساتھ ان سے "مخزنِ اسرار" کے درس لیے تھے۔ قاضی غلام الدین کے بھائی قاضی سیف الدین بھی فارسی اور اُردو کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ قاضی غلام الدین کا انتقال حج سے واپس ہوتے لدھیانہ میں ہو گیا۔ انہوں نے فارسی زبان کی ایک قواعد اُردو میں لکھی تھی۔

میر حبیب اللہ کاملی حضرتِ شیخ اکمل الدین مرزا محمد کامل بیگ خاں بدخشی کے سلسلے کے صاحبِ علم و صاحبِ ذوق اصحاب میں سے ہیں۔ کشمیر میں وہ حکومتِ ہند کے محکمۂ مردم شماری کے مہتمم رہے۔ اس عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اب جموں و کشمیر پبلک سروس کمیشن کے رُکن ہیں۔ میر حبیب اللہ نے حضرت اکمل بدخشی کی ضخیم مثنوی "بحر العرفان" کی پہلی جلد یا پہلے دفتر کو مرتب کر کے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ ۱۳۸۱ھ میں شایع کیا۔ "بحر العرفان" کا تذکرہ حصہ فارسی میں کیا جا چکا ہے۔ مولانا رومی کے اتباع میں لکھی ہوئی اسی ہزار اشعار کی یہ ضخیم مثنوی ۱۱۱۱ھ میں اختتام کو پہنچی تھی۔ میر حبیب اللہ نے مقدمہ میں حضرت اکمل کے حالاتِ زندگی اور ان کے

خلفاء اور مثنوی کے بارے میں تفصیل لکھی ہے۔ اس اہم کارنامہ کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے خیال کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"موجودہ دور میں عام طور پر ہر چیز کی قیمت مادی پیمانوں سے ناپی جاتی ہے۔ کچھ نقادوں کی رائے ہے کہ ادب برائے ادب ہونا چاہیئے مگر اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ادب برائے ادب دماغی عیاشی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان ہونا چاہیئے۔"

لیکن آگے وہ وضاحت کرتے ہیں کہ زندگی کا مقصد محض کھانے پینے اور آرام و اطمینان تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک اہم پہلو روحانی بھی ہے اور اس پہلو کی تربیت اور تکمیل میں "بحر العرفان" جیسی تصانیف معاون ہوتی ہیں۔ اس کارنامہ کی اشاعت حقیقت میں صبر آزما کام تھا، جسے میر حبیب اللہ کی عقیدت نے انجام کو پہنچایا۔

غلام محی الدین ہمدانی، ریاست کے ایک سیاسی کارکن تھے اور زمانہ طالب علمی سے وہ اور ان کے ساتھی غلام نبی گلکار جدوجہد میں حصہ لینے لگے تھے۔ وہ نیشنل کانفرنس کے سرگرم رُکن رہے اور کانفرنس کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں انہوں نے ایک مختصر رسالہ "کشمیر کہاں سے کہاں" کے عنوان سے لکھا جو ۱۹۴۹ء میں شایع ہوا۔ ہمدانی نیشنل کانفرنس کے ضلع سری نگر کے صدر رہے۔ رسالے میں اٹھارہ سو سال کی مختصر تاریخ اور حکمرانوں کی عیش کوشی اور استحصال کی دُکھ دینے والی داستان اور عوام کے مصایب کی تفصیل اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس پس منظر میں نئے کشمیر کے معماروں، شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ، بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق، مولانا محمد سعید مسعودی، شیام لال صراف، صوفی محمد اکبر، چودھری غلام عباس، اور دوسرے ساتھیوں کی جدوجہد پر روشنی ڈالی ہے۔

مُسلم کانفرنس کے حلقۂ عمل کو وسیع کرنے کے لئے مُسلم کانفرنس کے ۱۹۳۸ء کے تاریخی اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"۱۹۳۸ء میں قومیت کی جھلکیں نمایاں ہونے لگیں، فرقہ پرستوں کی کمر ٹوٹ گئی اور قائدِ اعظم شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ چھ ماہ کی قید بھگتنے کے بعد جیل سے باہر آئے تو انہوں نے جناب غلام محمد صادق کی صدارت میں مُسلم کانفرنس کا ایک خصوصی اجلاس شاہی مسجد کے احاطہ میں بُلایا...... اس اجلاس میں یہ ہنگامہ خیز تجویز مولانا محمد سعید مسعودی، جنرل سیکرٹری آل جموں و کشمیر مُسلم کانفرنس نے نمائندوں کے سامنے رکھی۔"

یہ تجویز مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی تھی، جو منظور ہوگئی اور اس کے بعد سے ریاست میں سیاسی جد و جہد کا ایک نیا عہد شروع ہوا۔

اس عہد کے سربرآوردہ کشمیری شعراء میں جنہوں نے اُردو میں بھی اپنے آثار چھوڑے ہیں، عبدالاحد آزادؔ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کشمیری شاعروں کو نئے معیاروں سے روشناس کرانے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔ ان کی شعری تحصیلات اُردو سے شروع ہوئی تھیں، لیکن جلد ہی وہ کشمیری کی طرف رجوع ہو گئے اور اس زبان میں اپنی فکر کے لازوال آثار چھوڑ گئے۔

آزاد کشمیر کے ایک موضع رانگر کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد سلطان ڈار، ایک صوفی منش انسان تھے۔ ان کے بارے میں خود آزادؔ نے لکھا ہے کہ وہ عربی اور فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ آزادؔ نے ابتداء میں انہیں سے قرآن پڑھا، پھر اپنے بھائی غلام علی کے مکتب میں تحصیل کی۔ انہیں اعلیٰ تعلیم کا شوق تھا، لیکن یہ شوق پورا نہ ہوسکا۔ جلد ہی انہیں ایک

سکول میں تیرہ روپیہ ماہوار پر مدرسی کی خدمت اختیار کرنی پڑی۔ لیکن ملازمت تعلیم کے سلسلہ شوق کے لئے مقطع ثابت نہیں ہوئی۔ اپنے طور پر مطالعہ کرکے ۲۶-۱۹۲۵ء میں انہوں نے منشی عالم کا امتحان کامیاب کیا۔ پھر منشی فاضل کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ کہ نمونیا کے مرض میں مبتلا ہوگئے اور امتحان نہ دے سکے لیکن ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مروجہ اردو ادب سے وہ بخوبی واقف تھے۔ خاص طور پر شبلی کی "شعر العجم" کا مطالعہ انہوں نے گہری نظر سے کیا تھا جس پر بعد میں انہوں نے اپنی تصنیف "کشمیری زبان اور شاعری" کا ڈول رکھا۔

آزاد پہلے احد تخلص کرتے تھے، بعد میں جانباز تخلص اختیار کیا تھا لیکن اس تخلص کی وجہ سے سیاسی سرگرمیوں میں ان کے حصہ لینے کا شبہ حکومت کے عہدیداروں کو ہوا۔ اور انہیں وطن سے دور، قصبہ ننال کے سکول میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں ان کا اکلوتا چار سال کا لڑکا فوت ہوگیا۔ اس دہرے دکھ کو دور کرنے کیلئے وہ اکثر شاہ ہمدان رح کی خانقاہ میں جا بیٹھتے۔ ایسی ہی ایک نشست میں انہیں آزاد تخلص اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس تخلص کے ساتھ ہی ان کی کشمیری شاعری میں نیا موڑ آیا۔

مدرسی کی تربیت کے سلسلے میں آزاد کچھ عرصہ سری نگر میں بھی رہے۔ صحت کے لحاظ سے وہ کبھی مطمئن نہیں رہ سکے۔ آخر اپنڈی سائٹس کے آپریشن کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۴۸ء میں وہ دنیا سے چل بسے لیکن اپنے پیچھے ایسے نغمے چھوڑ گئے جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے ضامن ہیں۔ آزاد کے سارے کشمیری کلام کو بڑی محنت سے جمع کر کے ان کے دوست ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو نے اردو میں اپنے بسیط مقدمہ اور کچھ نظموں اور اشعار کے اردو تراجم کے ساتھ کلچرل اکادمی کی جانب سے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا ہے۔

آزاد کے کچھ اردو شعر اور نظمیں جو دستیاب ہوئی ہیں وہ ان کے ابتدائی دور کی مشقیں ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو نے لکھا ہے کہ اس دور میں اردو میں بھی کچھ کلام موزون ہوا۔ لیکن آزاد کو اس پر کوئی ناز نہ تھا۔ ذیل میں ان کی ایک مناجات کے انداز کی نظم کے چند شعر درج ہیں:

جہاں کے پالنے والے تو ہی ہے مہرباں میرا
ہوا معمور تیری دین سے ہی خانماں میرا
بنایا اشرف المخلوق مجھ ناچیز ہستی کو
ترے ابرِ کرم .... گلستاں میرا
بٹھایا معرفت کی شاخ پر اس بلبل دل کو
فضائے عرش اعلیٰ میں سجایا آشیاں میرا

آزاد کے زمانے میں محکمہ تعلیم کا حال جیسا ابر تھا۔ اور اساتذہ کی حالت جیسی ناگفتہ بہہ تھی۔ اس کے بارے میں بعض اساتذہ نے لکھا ہے۔ آزاد نے بھی اپنی ایک نظم میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:-

تشدد کی چھری دیکھی، مدرس کا گلا دیکھا
کہاں سے گائے کو لاؤں کہ تھوڑا دودھ ہی پاؤں
ملے مکھن تو میں کھاؤں، ذرا آرام جاں پاؤں
دلائے کھوپری کوئی، صبح سے دردِ سر دیکھا

"کشمیری زبان اور ادب" آزاد کا محنت اور کاوش سے سر انجام کیا ہوا کارنامہ ہے۔ جسے کلچرل اکادمی نے ترتیب دے کر تین جلدوں میں شایع کیا ہے۔ ابھی اس کی ترتیب کا کام باقی تھا کہ آزاد کا انتقال ہو گیا۔ پہلے حصے میں کشمیری زبان کی قدامت، پراکرتوں اور اپ بھرنش مرحلے سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس میں آزاد نے اپنی ذاتی تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔ کیونکہ وہ علم زباں سے نا آشنا تھے۔ کشمیری رسم خط پر انہوں نے کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے اور کچھ پنڈت مصنفین کی طرح انہوں نے بھی فارسی رسم خط کو اس کے لئے ناموزوں قرار دیا ہے۔ کشمیری کے ایک لفظ "کر" کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے بحث کی ہے کہ.

"یہ معنوی تغیرات تلفظ کے تابع ہیں، جو فارسی حرکات ثلاثہ سے ادا نہیں ہو سکتا۔"

زبان کے آغاز اور رسم الخط کی یہ بحثیں علمی اور مخصوص بحثیں ہیں۔ جن پر سند کے ساتھ کچھ لکھنے کے لئے لسانی تربیت کی ضرورت ہے اور اس کے مواقع آزاد کو نہیں مل سکے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ان مسایل سے نبرد آزما ہونے کی جو کوشش کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر جو مواد انہیں مل سکتا تھا، اس سے استفادہ کیا تھا اور اس پر خود بھی غور و فکر کیا تھا۔ کتاب کے وہ حصے جن میں کشمیری شاعروں کا تذکرہ درج کیا ہے۔ وہ آزاد کی ذاتی تلاش کا نتیجہ ہے اور یہ شاید کشمیری شاعری کو تاریخی ترتیب اور تنقیدی نقطہ نظر سے پیش کرنے کی پہلی کوشش ہے۔ آزاد کے مطالعے کا ایک اہم پہلو "کشمیری ریختہ" کے بارے میں ان کے اشارے ہیں۔ کشمیری زبان بھی ابتداء میں اظہار کے سہاروں کے طور پر اُردو کی طرح فارسی الفاظ اور فقروں سے کام لیتی رہی اور بعد کے ادوار میں کچھ شعرا نے یہ کام اُردو سے بھی لیا۔ آزاد نے کشمیری اور اُردو ریختہ کی صورت میں جو اختلاف دکھایا ہے۔ اس پر مفکرانہ انداز میں بحث کی ہے۔ کشمیری فارسی ریختہ نمونے لکھے ہیں۔ لیکن کشمیری اُردو ریختہ کا کوئی نمونہ درج نہیں کیا۔ جن کے چند نمونے اس کتاب میں دیئے گئے ہیں۔

جہاں تک تنقیدی ارزیابی کا تعلق ہے۔ آزاد کا انداز شبلی اور حالی کا

اتباع ہے۔ وہ بعض وقت ضمنی بحثوں میں بھی پڑ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر "تقلید و تتبع" پر وہ بحث کرتے ہیں :۔

" ہر فن کے موجد بھی ہیں اور مقلد بھی۔ اس لئے فن شاعری کا اس کلیہ سے مستثنیٰ ہونا ممکن نہیں۔ موجد نئی بات پیدا کرتا ہے۔ اگر موجد اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایجاد کو ترقی دے تو اس کی تقلید تقلید مناسب کہلائے گی۔ تقلیدِ مناسب کا رتبہ ایجاد کے دوش بدوش ہے۔ اگر تقلید سے ایجاد کو کوئی ترقی نہیں مل سکتی تو تقلیدِ بے جا کہلائے گی۔ اگر مقلد کو، موجد کے نقشِ قدم پر چلنے کا ڈھنگ نہیں آتا اور اس میں مناسب تقلید کی صلاحیت نہیں تو اس کی تقلید نقالی کہلاتی ہے۔ ایسی تقلید سے ایجاد کو صدمہ پہنچتا ہے "

کشمیری شعراء کا جائزہ لیتے ہوئے آزاد نے کہیں کہیں، ان کے الہام کے مٰاخذوں کی طرف بھی اشارے کئے ہیں، جس سے ان کے مطالعے کی وسعت کا پتہ چلتا ہے لیکن جہاں انہوں نے اپنے قابلِ احترام معاصر مہجور کے بعض اشعار کے ماخوذ ہونے کا ذکر کیا ہے، احتیاط ملحوظ رکھا ہے۔ مثلاً ان کا ایک شعر نقل کر کے وہ صرف یہ لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ـــــ " ان کا اور غالب کا ماخذ مشترک معلوم ہوتا ہے۔"

آزاد کے اُردو مکتوب دلچسپ ہوتے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کے نام جو خطوط لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک خط کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

" بھلا حسرت و یاس، درد و کرب کے خیالات کو کہاں تک فروغ دیں؟
اپنا دل تو کمزور تھا، اوروں کے وبال بھی کیوں اپنی گردن پر لے لیں؟
رونا گناہ ہے، اور رُلانا گناہ کبیرہ۔"

آزاد کے ساتھ ہی، ان کے دوست ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کا ذکر ضروری ہے۔ ڈاکٹر

گنجو آزاد کے دوست، معالج اور ہمدرد رہے اور ان کے انتقال کے بعد، ان کے کلام کو اکٹھا کر کے شائع کیا۔ آزاد سے اپنے تعلقات کی ابتداء کے بارے میں وہ اپنے مرتبہ کلیات کی تمہید میں لکھتے ہیں :-

"مرحوم آزاد کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات ۱۹۳۶ء میں مہجور صاحب مرحوم کے توسط سے شروع ہوئے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کا رجحان طبیعت دیکھ کر ہم میں باہمی موانست قائم ہو گئی۔"

اور یہ موانست آزاد کے انتقال تک قائم رہی۔ ڈاکٹر گنجو لکھتے ہیں کہ انتقال سے ایک دن پہلے آزاد نے وصیت کی تھی کہ

"میرے پاس دنیاوی ثروت اور سرمایہ تو کچھ نہیں، ہاں فقط نظموں کے کچھ مسودے اور عمر بھر کی عرق ریزی کا نچوڑ تاریخ ادبیات میرا سارا سرمایہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے بعد ان کاغذات کو پنڈت پریم ناتھ بزاز صاحب یا ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ ان کاغذات کی تکمیل، ترتیب و اشاعت جس طرح مناسب ہو کریں۔"

ڈاکٹر گنجو سری نگر شہر میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے تک یہیں تعلیم پائی۔ اس کے بعد امرتسر جا کر طب یعنی ڈاکٹری کا امتحان کامیاب کیا اور کشمیر لوٹ کر، سرکاری ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ ادب سے انہیں یوں بھی لگاؤ ہے لیکن اردو میں آنرز کا امتحان پاس کرنے کے بعد ان کے مطالعے کے ذوق میں اور بھی ترقی ہوئی۔ چنانچہ تحریر اور انشا پردازی کے گردن پر انہیں پورا قابل حاصل ہے۔ انہوں نے کچھ مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کا قابلِ قدر کارنامہ کلیاتِ آزاد ہے جو ۷۴۳ صفحات پر حاوی اور ترتیب اور تبویب کے لحاظ سے اچھی تصنیف ہے۔ مقدمہ جو کوئی دو سو صفحات پر مشتمل ہے، آزاد کی حیات اور شاعری کا تنقیدی جائزہ ہے۔

کشمیر کی جدوجہد آزادی کے قایدین ہیں، جو اس وقت چوٹی تک ابھر آئے ہیں۔

خواجہ غلام محمد صادق، سیاست اور سماجی زندگی میں اپنے ترقی پسند رجحانات اور اپنی علمی اور ادبی دلچسپی کی بدولت، ایک اہم مقام پر فائز ہیں۔ ان کی ولادت سرینگر میں ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ ان کا خاندان عالموں اور ادیبوں کا ایک سربرآوردہ خاندان ہے۔ صادق صاحب کے والد عبدالغفار فارسی کے عالم، اُردو کے اچھے متعلم اور کشمیری کے قابلِ ذکر شاعر تھے۔ وہ فارغ تخلص کرتے تھے اور کشمیری میں ان کے دوسرے کلام کے علاوہ ان کا حالی کے "مُسدّس مدوجزر اسلام" کا منظوم کشمیری ترجمہ، کشمیری ادب میں ایک مقام رکھتا ہے۔

صادق صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور پھر مشن اسکول میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں کچھ عرصہ وہ لاہور میں رہے اور پھر مُسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے بی۔ اے اور ایل۔ بی کے امتحان ۱۹۳۴ء میں کامیاب کئے۔ وطن لوٹنے کے بعد وکالت شروع کی، لیکن اس زمانے میں کشمیر کی تاریک سیاسی فضائے حساس اور قومی درد رکھنے والے نوجوانوں کی طرح، صادق صاحب کو بھی، سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت مسلم کانفرنس جموں و کشمیر میں برسرِ عمل تھی، صادق صاحب اس کے رُکن بن گئے لیکن اس کی بنیادیں وسیع کرنے کی دُھن میں لگے رہے چنانچہ ۱۹۳۹ء میں اس کا موقع آیا اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، مسلم کانفرنس کا ایک خصوصی اجلاس خود صادق صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں مولانا محمد سعید مسعودی، جنرل سیکرٹری، مسلم کانفرنس نے، کانفرنس کو آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی قرارداد پیش کی، جس کی تائید چودھری غلام عباس نے کی۔ اور یہ قرارداد منظور ہو گئی، جس کے بعد سے جموں کشمیر کی سیاست میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ نئی کانفرنس کے پہلے صدر صادق صاحب چُنے گئے۔

۱۹۴۷ء کے فرقہ دارانہ فسادات میں شیخ محمد عبداللہ اور کانفرنس کے عہدیداروں کی صحیح رہنمائی کی وجہ سے کشمیر کی فضا پاک و صاف رہی، اسی بنا پر گاندھی جی نے کہا تھا کہ کشمیر میں انہیں روشنی کی کرن نظر آئی۔ ۱۹۴۸ء میں جب ریاست میں نمائندہ حکومت قائم ہوئی۔ تو صادق صاحب وزیر بنے۔ ۱۹۵۱ء میں ریاست کا دستور مرتب کرنے کے لئے دستور ساز مجلس بنی، اور اس کے صدر صادق صاحب ہی چُنے گئے۔ نئے دستور کے تحت جو حکومت بنی اس میں ان کے علمی رجحانات کے مدِنظر، صادق صاحب کو وزیرِ تعلیم چُنا گیا۔ اور ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک وزیر تعلیم رہے۔ بخشی غلام محمد صاحب کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں ان سے اختلاف کی وجہ سے ۱۹۵۷ء میں صادق صاحب نے ایک الگ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس قائم کی اور اس کے صدر کی حیثیت سے ۱۹۶۴ء تک اسمبلی میں حزب مخالف کی رہنمائی کرتے رہے۔ بخشی غلام محمد کے مستعفی ہونے کے بعد، شمس الدین صاحب کچھ عرصہ وزارتِ عظمیٰ پر فائز رہے، اس کے بعد صادق صاحب وزیرِ اعلیٰ منتخب ہوئے۔

سیاست کے ساتھ ساتھ، صادق صاحب کو علم و ادب سے بھی گہرا لگاؤ ہے۔ تاریخ اور سیاست ان کے مخصوص موضوع مطالعہ ہیں اور ادب میں وہ ترقی پسند رجحانات کی طرف مائل ہیں۔ عنفوان میں وہ شعر بھی کہتے تھے اور صادق تخلص اختیار کیا تھا۔ لیکن اب تلاش کے باوجود ان کا کہا ہوا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ جموں و کشمیر میں ترقی پسند تحریک اور اداروں سے ان کا قریبی ربط رہا۔ آل جموں و کشمیر سٹیٹ کلچرل فرنٹ کے وہ بانی ہیں، جو بعد میں کلچرل کانگریس میں تبدیل ہوگئی تھی۔ کلچرل فرنٹ کے کئی شعبے تھے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ فرنٹ کی مختلف شاخوں نے ریاست میں ادب اور آرٹ کے نئے رجحانات کو ترقی دینے میں بڑی مساعدت کی۔ تاریخ، آثارِ قدیمہ، تعلیمی اور تہذیبی مسایل کے بارے میں ان

کے تصورات کا اندازہ ان کی مختلف تحریروں اور تقریروں سے ہوتا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں کلچرل اکادمی کے زیر اہتمام جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک کی جانب سے جو نمائش تصاویر سری نگر میں منعقد کی گئی تھی۔ اس کا خطبۂ افتتاحیہ صادق صاحب ہی نے دیا تھا۔ خطبہ میں جرمن آرٹ کے ارتقاء پر جس طرح روشنی ڈالی ہے۔ اس آرٹ کے ارتقاء کے بارے میں ان کی واقفیت اور فن کی پرکھ کے معیاروں کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔ جرمنی میں نشاۃ ثانیہ کے سربرآوردہ مصوروں کا تذکرہ کرتے کہا تھا:۔

> "ڈیوریر نے گرافک آرٹ کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا، اس نے بائیبل کے موضوعات کی تصویر کشی کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مگر یہ تصاویر ابتدائی کلیسائی مصوروں کی غیر حقیقی تصاویر سے مختلف تھیں، کیونکہ اُس کے یہاں گو بائیبل کے کردار روحانی طہارت کا مظہر ہوتے تھے پھر بھی جامد تصورات کی زنجیروں سے آزاد تھے۔"

"کشمیر کا تمدنی ورثہ" کے عنوان سے، صادق صاحب کا ایک مضمون ہفت روزہ "آئینہ" (سری نگر اگست ۱۹۶۶ء) میں شایع ہوا تھا، جس میں کشمیر میں تمدنی آثار کی ابتداء، برزہامہ کے آثار الصادیہ سے لے کر موجودہ دور تک، تمدن کے عہد بہ عہد ارتقاء کے نمایاں رجحانات کا جائزہ لیا ہے اور پشاچ اور ناگ تہذیب، بدھ مت کے شیوع سے سماجی اور تمدنی اُفق کی وسعت، کُشنوں کے زمانے کی مذہبی اور تمدنی سرگرمیوں، ٹیکسیلا کے قدیم علمی مرکز سے کشمیر کے باہمی علمی اور تمدنی ربط اشوک کے عہد سے ثقافتی لین دین کے آغاز اور اس کے اہم خط و خال پر اجمال سے روشنی ڈالنے کے بعد، اسلامی عہد میں احیائے ثقافت کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"اسلام کی آمد سے کشمیری ثقافت کے بنیادی ڈھنگ میں ایک نئی قوت پیدا ہوئی اور فرسودگی کا خاتمہ ہوا۔ . . . . اسلامی تمدن اور عہدِ وسطیٰ کی ترقی یافتہ ہندو ثقافت کے باہمی ملاپ سے ایک نیا کلچر اُبھرا، جو آج ہمارا تمدنی ورثہ بن گیا ہے"۔

تاریخ اور تعلیم، صادق صاحب کے دو محبوب موضوع رہے ہیں۔ تعلیم کے جدید نصب العین کے بارے میں ان کے چند مضامین شایع ہوئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک "تعلیم — فلاح و بہبود کے لئے" ایک خیال زا مضمون ہے جس میں تعلیم کے بدلتے ہوئے تصور کی تفصیل لکھی ہے۔ سیاست میں سماجی اور معاشی مساوات، ان کا اور ان کے ہم خیال قایدین کا اصول رہنما ہے۔ چنانچہ اس بارے میں انہوں نے "تعمیر" (سری نگر، جنوری فروری ۱۹۶۲ء) میں "ہمارا نصب العین — مکمل معاشی، مادی مساوات" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا۔ اس میں، ان اصلاحات اور ترقیوں کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ جو مذکورہ بالا نصب العین کے حصول کے لئے ریاست میں اختیار کی گئیں۔

نیشنل کانفرنس نے جابر اقتدار کے خلاف اپنا آخری وار "کشمیر چھوڑ دو" کی قرارداد منظور کر کے اور اس تحریک کو چلا کر کیا اور صادق صاحب نے اسی عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی، جو ایک اچھے لکھے ہوئے اور خیال آفرین مقدمہ کے علاوہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ا۔ نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ، (۲) شیخ محمد عبداللہ شیر کشمیر کی ایک تاریخی تقریر۔ (۳) ذوالفقار رشن کے نام شیر کشمیر کا تار اور (۴) ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ایک نظم — کتاب میں کشمیری کی آزادی کے بارے میں مشہور سیاسی مفکرین کے بیانات اور سربرآوردہ شعراء کی نظمیں، ۱۹۴۶ء میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری پر اخبارات کے تبصروں کے اقتباسات اور نظمیں، ریاست میں آتے ہوئے پنڈت نہرو کی گرفتاری اور اس کی بابت اخباروں کے تبصرے، "کشمیر چھوڑ دو" تحریک

کا پسِ منظر اور اس کے مضمرات، سب کچھ شامل کر دیا گیا ہے۔ اور ان الگ الگ اجزاء کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ صادق صاحب کے ان پر تبصروں کے بغیر بھی مسئلہ کی صورت حال اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ مقدمہ جو سلیس اور صاف ستھری زبان میں لکھا گیا ہے، ایقان کا وزن اور تبلیغ کا جوش بھی رکھتا ہے۔ آزادی چاہنے والی قوتوں کو سرنگون کرنے کے لئے ڈوگرہ حکومت نے استبداد کا جو رویہ اختیار کیا تھا، اس کی مذمت جس طرح کی ہے، اس کا انداز خطیبانہ تو ہے ہی، لیکن اس میں ادبی آہنگ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"لیکن دنیا کا فیصلہ ان کے خلاف ہے، وقت کا تقاضا ان کو تباہی کی طرف دھکیل رہا ہے اور ملک بھر کی انقلابی اور ترقی پسند طاقتیں ان پر ہنس رہی ہیں۔ آج اگر کشمیر کی سرسبز وادی کو ہمارے بچوں اور ہماری ماؤں اور ہمارے بوڑھوں کے خون سے لالہ زار بنایا جا رہا ہے تو یہ ہمارے واسطے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی:

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اس خون کی ہولی سے ہمارے ارادے مضبوط ہو گئے ہیں، ہمارے پاؤں آزادی کے میدان میں جم چکے ہیں۔ ہمارے دلوں میں روحِ انقلاب پورے طور پر بیدار ہو چکی ہے اور ہم انقلاب کے پرچم کو لہراتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے جائیں گے اور کشمیر کی سرزمین میں ایسا راج قایم کریں گے، جہاں تاجِ شاہی مزدوروں اور کسانوں کے سر پر ہو گا اور نسل اور قومیت کے نام سے کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکے گا۔ اور جہاں انسان آزاد ہو گا اور اسے بازاروں میں بکنے والی چیز نہیں سمجھا جائے گا۔ ہمارا کشمیر، بھوک، مفلسی اور بیماریوں کا شکار نہیں ہو گا۔ ہمارے کشمیر میں مہاجے ہوں گے اور نہ عوام کے خون پر پلنے والے جاگیردار۔"

اپنی سیاسی مصروفیتوں کو بھی علمی اور ادبی دلچسپیوں کا رنگ دینے کا صادق صاحب کا ایک اپنا انداز ہے ـــ ادب کے بارے میں وہ سوچ سمجھ فقط نظر رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی ادبی رفاقتوں سے ہوتا ہے اور اس تعارف سے ہوتا ہے جو انہوں نے، کشمیر کے پریم چند، پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں کے مجموعے "بہتے چراغ" پر لکھا ہے۔ کشمیر کو جنت ارضی کہہ کر مطمئن ہو جانے والے باہر کے ایسے شاعروں اور افسانہ نگاروں پر تنقید کرتے ہوئے، جنہوں نے کشمیر کی حقیقی زندگی کی تصویر نہیں دیکھی، صادق صاحب کہتے ہیں:-[1]

"خود پردیسی کو باہر کے افسانہ نگاروں سے سخت شکایت تھی، جنہوں نے کشمیر کے قدرتی اور خوبصورت مناظر کے تخیلی اور رومانی خاکے کھینچے ہیں: جن کا یہاں کی زندگی اور یہاں کی خارجی حقیقتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ جنہوں نے جنت کو تو دیکھا، لیکن جہنم کی آگ میں دہکتی ہوئی زندگیوں کو نظر انداز کیا۔ جنہوں نے کشمیر کے کسی پہاڑی قصبے کو ریاست کشمیر کا نام دے کر، اپنے آپ کو کشمیر کی سیاسی اور سماجی زندگی کا ترجمان بتایا۔ جنہوں نے چناب کے کنارے واقع کسی گاؤں کو اٹھارہ لاکھ کشمیری بولنے والے عوام کا نمائندہ بنایا اور چناب کی مناسبت سے من گھڑت اور رومانی قصے بیان کئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

خواجہ غلام نبی گلکار، کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کے لئے کام کرنے والے بنیاؤں میں سے ہیں۔ وہ آزاد کشمیر کے علمبردار ہیں اور اس موضوع پر "آزاد کشمیر" ہی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ سری نگر ان کا وطن ہے، لیکن آج کل راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ ان کی تعلیم سری پرتاپ کالج میں ہوئی۔ تعلیم کے زمانے سے انہیں سیاست

---

[1] صادق صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

ان کے لکھے ہوئے رسایل میں "ندائے حق" کے علاوہ "حالات حضرت علیؑ" "پیامِ عمل" "صورِ اسرافیل" "جامع المتفرقین" "کارِ ملائی سبیل اللہ فساد" شامل ہیں۔ "پیش کش" کی ترتیب میں بھی ان کا بڑا حصّہ رہا۔ ایک اور اہم رسالہ "چودہویں صدی" جو چار حصوں پر مشتمل ہے، ان کا اہم رسالہ ہے، جس میں شیعانِ کشمیر کی تنظیم اور اصلاح کے مسایل سے بحث کی گئی ہے۔ "صورِ اسرافیل" کی ابتداء میں حسن ابن علی کا مرتبہ رسالہ "ترجمہ نماز" کشمیری بھی شامل ہے۔ اس رسالے میں شیعیانِ کشمیر میں اتحاد اور ترقی اصلاح اور تنظیم کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

"کسی کتاب کے لکھنے سے قبل میرے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ لکھوں تو کیوں لکھوں، کیا لکھوں اور کن کے لئے لکھوں، اور آخر الامر فریضہ انسانیت کے، عوام کی بہبودی کی خاطر، جو کچھ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، لکھ لیتا ہوں۔"

"ندائے حق" کے آغاز میں وہ پڑھنے والوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے رہے ہیں، وہ دینوی منفعت یا نام و نمود کے لئے ہے۔ اسی سلسلے میں اپنے والد مرحوم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"میرے پاس اپنے والد صاحب کی لکھی ہوئی چھبیس سالہ ڈایری مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور کی زیرِ مطالعہ ہے جو کہ میرے لئے موجب تسکین و اطمینان ہے۔ اس سے یہ جائزہ لینے میں مدد مل رہی ہے کہ اس دورِ حکومت اور موجودہ نام نہاد عوامی راج میں موازنہ اور فرق معلوم ہو۔ اگر اول الذکر دور میں مذہبی بنیادوں پر فساد اور جھگڑے ہوتے رہے تو مؤخر الذکر دور میں سیاسی بنیادوں پر ان کا

وجود عمل میں آیا۔"

آگے دونوں ادوار کا مقابلہ اور موازنہ کیا ہے۔ منشی صاحب کو اپنے اگلے
سیاسی کارکن ساتھیوں سے بنیادی اختلاف ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس رسالے
میں مرزا محمد افضل بیگ، صدرالدین مجاہد، وغیرہ سے اپنی مراسلت کی نقلیں
بھی دی ہیں اور اپنے مسلک کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر سری کنٹھ توشخانی سنسکرت اور فلسفے کے عالم، کالج کی ملازمت
سے حال میں سبکدوش ہوئے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے بی۔ اے کیا اور ۲۱-۱۹۲۰ء
میں ایم۔ اے ایل ایل بی کا پہلا امتحان بھی انہوں نے کامیاب کیا۔ لیکن بعد میں
ریاست میں وکالت کا امتحان کامیاب کر کے کچھ عرصہ تک وکالت کی۔ ۳۰-۱۹۲۹ء میں
وہ کالج کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ کچھ عرصہ سکول میں ہیڈ ماسٹر بھی رہے۔
اور اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز کی خدمت بھی انجام دی۔ آخر میں کالج کے پروفیسر
ہو گئے۔ کالج کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ریاست کی کلچرل اکادمی میں وہ کشمیری
ڈکشنری کی تدوین کا کام پروفیسر نند لال کول طالب کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ ؎

پروفیسر توشخانی نے مشہور صوفی شاعر پرمانند کے حالات اور کلام کا انتخاب
ایک رسالے کی صورت میں کیا ہے جو "پرمانند" کے نام سے ۱۹۶۰ء میں کلچرل اکادمی کے
سلسلۂ انتخابات منظومات کشمیری میں شائع ہوا ہے۔ ابتداء میں "تعارف" کے
عنوان کے تحت پرمانند کے مختصر حالات لکھے ہیں اور کلام کی خصوصیات پر روشنی
ڈالی ہے۔ کشمیری شاعری کو پرمانند کی دین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پرمانند نے پرانے رنگ کی شاعری میں ایک انقلاب پیدا کیا،
مدحیہ نظموں کو مناجات کی صورت دی، حکایات اور واقعات پر
مبنی اشیاء کو تمثیلی نظموں کی شکل میں پیش کیا، اخلاق یا پند و

؎۔ پروفیسر توشخانی ۱۹۶۱ء میں وفات پا چکے ہیں۔

سے متعلق خیالات کو وعظ خوانی سے نکالا اور حقایق کی طرف توجہ دلا کر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی۔"

پنڈت دینا ناتھ کول، کشمیر کے آریہ سماجی نیتا "مارتنڈ" میں آریہ سماج کے مسایل پر لکھتے تھے۔ اہلِ کشمیر کو آریہ سماج عقاید سے روشناس کرانے کے مقصد سے انہوں نے ایک مضمون "آریہ سماج کا مشن" کے عنوان سے لکھا تھا۔ مضمون میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو اس فرقے کے بارے میں کشمیر میں رایج تھے۔

قاضی غلام الدین، فارسی کے اچھے عالم تھے۔ منشی فاضل کے علاوہ ایم۔ اے اور بی ٹی کا امتحان پاس کرکے وہ محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کے والد قاضی محی الدین بھی اپنے زمانہ کے سربرآوردہ فارسی عالم اور اُستاد تھے۔ چنانچہ پنڈت نند لال کول طالب نے قاضی غلام الدین کے ساتھ ان سے "مخزنِ اسرار" کے درس لئے تھے۔ قاضی غلام الدین کے بھائی قاضی سیف الدین بھی فارسی اور اُردو کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ قاضی غلام الدین کا انتقال حج سے واپس ہوتے لدھیانہ میں ہوگیا۔ انہوں نے فارسی زبان کی ایک قواعد اُردو میں لکھی تھی۔

میر حبیب اللہ کاملی، حضرتِ شیخ اکمل الدین مرزا محمد کامل بیگ خاں بدخشی کے سلسلے کے صاحبِ علم و صاحبِ ذوق اصحاب میں سے ہیں۔ کشمیر میں وہ حکومتِ ہند کے محکمۂ مردم شماری کے مہتمم رہے۔ اس عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اب جموں و کشمیر پبلک سروس کمیشن کے رُکن ہیں۔ میر حبیب اللہ نے حضرت اکمل بدخشی کی ضخیم مثنوی "بحر العرفان" کی پہلی جلد یا پہلے دفتر کو مرتب کرکے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ ۱۳۸۱ھ میں شایع کیا۔ "بحر العرفان" کا تذکرہ حصہ فارسی میں کیا جا چکا ہے۔ مولانا رومی کے اتباع میں لکھی ہوئی اسی ہزار اشعار کی یہ ضخیم مثنوی سنہ ۱۱۱۱ھ میں اختتام کو پہنچی تھی۔ میر حبیب اللہ نے مقدمہ میں حضرت اکمل کے حالات زندگی اور ان کے

خلفاء اور مثنوی کے بارے میں تفصیل لکھی ہے۔ اس اہم کارنامہ کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے خیال کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"موجودہ دور میں عام طور پر ہر چیز کی قیمت مادی پیمانوں سے ناپی جاتی ہے۔ کچھ نقادوں کی رائے ہے کہ ادب برائے ادب ہونا چاہیئے مگر اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ادب برائے ادب دماغی عیاشی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان ہونا چاہیئے۔"

لیکن آگے وہ وضاحت کرتے ہیں کہ زندگی کا مقصد محض کھانے پینے اور آرام و اطمینان تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک اہم پہلو روحانی بھی ہے اور اس پہلو کی تربیت اور تکمیل میں "بحر العرفان" جیسی تصانیف معاون ہوتی ہیں۔ اس کارنامہ کی اشاعت حقیقت میں صبر آزما کام تھا جسے میر حبیب اللہ کی عقیدت نے انجام کو پہنچایا۔

غلام محی الدین ہمدانی، ریاست کے ایک سیاسی کارکن تھے اور زمانہ طالب علمی سے وہ اور ان کے ساتھی غلام نبی گلکار جدوجہد میں حصہ لینے لگے تھے۔ وہ نیشنل کانفرنس کے سرگرم رُکن رہے اور کانفرنس کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں انہوں نے ایک مختصر رسالہ "کشمیر کہاں سے کہاں" کے عنوان سے لکھا جو ۱۹۴۹ء میں شایع ہوا۔ ہمدانی نیشنل کانفرنس کے ضلع سری نگر کے صدر رہے۔ رسالے میں اٹھارہ سو سال کی مختصر تاریخ اور حکمرانوں کی عیش کوشی اور استحصال کی دُکھ دینے والی داستان اور عوام کے مصایب کی تفصیل اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس پس منظر میں نئے کشمیر کے معماروں، شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ، بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق، مولانا محمد سعید مسعودی، شیام لال صراف، صوفی محمد اکبر، چودھری غلام عباس، اور دوسرے ساتھیوں کی جدوجہد پر روشنی ڈالی ہے۔

مُسلم کانفرنس کے حلقۂ عمل کو وسیع کرنے کے لئے مُسلم کانفرنس کے ۱۹۳۸ء کے تاریخی اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"۱۹۳۸ء میں قومیت کی جھلکیں نمایاں ہونے لگیں، فرقہ پرستوں کی کمر ٹوٹ گئی اور قائد اعظم شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ چھ ماہ کی قید بھگتنے کے بعد جیل سے باہر آئے تو انہوں نے جناب غلام محمد صادق کی صدارت میں مُسلم کانفرنس کا ایک خصوصی اجلاس شاہی مسجد کے احاطہ میں بُلایا۔ . . . اس اجلاس میں یہ ہنگامہ خیز تجویز مولانا محمد سعید مسعودی، جنرل سیکرٹری آل جموں و کشمیر مُسلم کانفرنس نے نمائندوں کے سامنے رکھی۔"

یہ تجویز مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی تھی، جو منظور ہوگئی اور اس کے بعد سے ریاست میں سیاسی جدوجہد کا ایک نیا عہد شروع ہوا۔

اس عہد کے سربرآوردہ کشیری شعرا میں جنہوں نے اُردو میں بھی اپنے آثار چھوڑے ہیں، عبدالاحد آزاد کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کشیری شاعروں کو نئے معیاروں سے روشناس کرانے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔ ان کی شعری تحصیلات اُردو سے شروع ہوئی تھیں، لیکن جلد ہی وہ کشیری کی طرف رجوع ہو گئے اور اس زبان میں اپنی فکر کے لازوال آثار چھوڑ گئے۔

آزاد کشیر کے ایک موضع رانگر کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد سلطان ڈار، ایک صوفی منش انسان تھے۔ ان کے بارے میں خود آزاد نے لکھا ہے کہ وہ عربی اور فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ آزاد نے ابتداء میں انہیں سے قرآن پڑھا، پھر اپنے بھائی غلام علی کے مکتب میں تحصیل کی۔ انہیں اعلیٰ تعلیم کا شوق تھا، لیکن یہ شوق پورا نہ ہوسکا۔ جلد ہی انہیں ایک

سکول میں تیرہ روپیہ ماہوار پر مُدرسی کی خدمت اختیار کرنی پڑی۔ لیکن ملازمت تعلیم کے سلسلہ شوق کے لیے مقطع ثابت نہیں ہوئی۔ اپنے طور پر مطالعہ کرکے ۲۶-۱۹۲۵ء میں انہوں نے منشی عالم کا امتحان کامیاب کیا۔ پھر منشی فاضل کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ کہ نمونیا کے مرض میں مبتلا ہوگئے اور امتحان نہ دے سکے لیکن ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مُرَوجہ اُردو ادب سے وہ بخوبی واقف تھے۔ خاص طور پر شبلی کی "شعر العجم" کا مطالعہ انہوں نے گہری نظر سے کیا تھا جس پر بعد میں انہوں نے اپنی تصنیف "کشمیری زبان اور شاعری" کا ڈول رکھا۔

آزاد پہلے احمد تخلص کرتے تھے، بعد میں جانباز تخلص اختیار کیا تھا لیکن اس تخلص کی وجہ سے سیاسی سرگرمیوں میں ان کے حصہ لینے کا شُبہ حکومت کے عہدیداروں کو ہوا۔ اور انہیں وطن سے دور، قصبۂ ترال کے سکول میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں ان کا اکلوتا چار سال کا لڑکا فوت ہوگیا۔ اس دہرے دُکھ کو دور کرنے کیلئے وہ اکثر شاہ ہمدانؒ کی خانقاہ میں جا بیٹھتے۔ ایسی ہی ایک نشست میں انہیں آزاد تخلص اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس تخلص کے ساتھ ہی، ان کی کشمیری شاعری میں نیا موڑ آیا۔

مُدرسی کی تربیت کے سلسلے میں آزاد کچھ عرصہ سری نگر میں بھی رہے۔ صحت کے لحاظ سے وہ کبھی مطمئن نہیں رہ سکے۔ آخر اینڈری سائٹس کے آپریشن کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۴۸ء میں وہ دنیا سے چل بسے لیکن اپنے پیچھے ایسے نغمے چھوڑ گئے جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے ضامن ہیں۔ آزاد کے سارے کشمیری کلام کو بڑی محنت سے جمع کرکے ان کے دوست ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو نے اُردو میں اپنے بسیط مقدمہ اور کچھ نظموں اور اشعار کے اُردو ترجمے کے ساتھ کلچرل اکاڈمی کی جانب سے ۱۹۶۶ء میں شایع کیا ہے۔

آزاد کے کچھ اردو شعر اور نظمیں جو دستیاب ہوتی ہیں وہ ان کے ابتدائی دور کی مشقیں ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو نے لکھا ہے کہ "اس دور میں اردو میں بھی کچھ کلام موزون ہوا۔ لیکن آزاد کو اس پہ کوئی ناز نہ تھا۔" ذیل میں ان کی ایک مناجات کے انداز کی نظم کے چند شعر درج ہیں:

جہاں کے پالنے والے تو ہی ہے مہرباں میرا
ہوا معمور تیری دین سے ہی خانماں میرا
بنایا اشرف المخلوق مجھ ناچیز ہستی کو
ترے ابرِ کرم .... گلستاں میرا
بٹھایا معرفت کی شاخ پر اس بلبلِ دل کو
فضائے عرش اعلیٰ میں سجایا آشیاں میرا

آزاد کے زمانے میں محکمۂ تعلیم کا حال جیسا ابتر تھا۔ اور اساتذہ کی حالت جیسی ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے بارے میں بعض اساتذہ نے لکھا ہے۔ آزاد نے بھی اپنی ایک نظم میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

تشدد کی چھری دیکھی، مدرس کا گلا دیکھا
کہاں سے گائے کو لاؤں کہ تھوڑا دودھ ہی پاؤں
ملے مکھن تو میں کھاؤں، ذرا آرام جاں پاؤں
دیا ہے کھوپری کوئی، صبح سے دردِ سر دیکھا

"کشمیری زبان اور ادب" آزاد کا محنت اور کاوش سے سر انجام کیا ہوا کارنامہ ہے۔ جسے کلچرل اکادمی نے ترتیب دے کر تین جلدوں میں شایع کیا ہے۔ ابھی اس کی ترتیب کا کام باقی تھا کہ آزاد کا انتقال ہو گیا۔ پہلے حصے میں کشمیری زبان کی قدامت، پراکرتوں اور اپ بھرنش مرحلے سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس میں آزاد نے اپنی ذاتی تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔ کیونکہ وہ علم زبان سے ناآشنا تھے۔ کشمیری رسم خط پر انہوں نے کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے اور کچھ پنڈت مصنفین کی طرح انہوں نے بھی فارسی رسم خط کو اس کے لئے ناموزون قرار دیا ہے۔ کشمیری کے ایک لفظ "کر" کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے بحث کی ہے کہ:

"یہ معنوی تغیرات تلفظ کے تابع ہیں، جو فارسی حرکات ثلاثہ سے ادا نہیں ہوسکتا۔"

زبان کے آغاز اور رسم الخط کی یہ بحثیں علمی اور مخصوص بحثیں ہیں۔ جن پر سند کے ساتھ کچھ لکھنے کے لئے لسانی تربیت کی ضرورت ہے اور اس کے مواقع آزاد کو نہیں مل سکے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ان مسایل سے نبرد آزما ہونے کی جو کوشش کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر جو مواد انہیں مل سکتا تھا، اس سے استفادہ کیا تھا اور اس پر خود بھی غور و فکر کیا تھا۔ کتاب کے وہ حصے جن میں کشمیری شاعروں کا تذکرہ درج کیا ہے۔ وہ آزاد کی ذاتی تلاش کا نتیجہ ہے اور یہ شاید کشمیری شاعری کو تاریخی ترتیب اور تنقیدی نقطہ نظر سے پیش کرنے کی پہلی کوشش ہے۔ آزاد کے مطالعے کا ایک اہم پہلو "کشمیری ریختہ" کے بارے میں ان کے اشارے ہیں۔ کشمیری زبان بھی ابتداء میں اظہار کے سہاروں کے طور پر اُردو کی طرح فارسی الفاظ اور فقروں سے کام لیتی رہی اور بعد کے ادوار میں کچھ شعرا نے یہ کام اُردو سے بھی لیا۔ آزاد نے کشمیری اور اُردو ریختہ کی صورت میں جو اختلاف دکھایا ہے۔ اس پر فکر نما انداز میں بحث کی ہے۔ کشمیری فارسی ریختہ نمونے لکھے ہیں، لیکن کشمیری اُردو ریختہ کا کوئی نمونہ درج نہیں کیا۔ جن کے چند نمونے اس کتاب میں دیئے گئے ہیں۔

جہاں تک تنقیدی ارزیابی کا تعلق ہے۔ آزاد کا انداز شبلی اور حالی کا

اتباع ہے۔ وہ بعض وقت ضمنی بحثوں میں بھی پڑ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر "تقلید و تتبع" پر وہ بحث کرتے ہیں :۔

"ہر فن کے موجد بھی ہیں اور مُقلد بھی۔ اس لئے فن شاعری کا اس کلیہ سے مستثنیٰ ہونا ممکن نہیں۔ موجد نئی بات پیدا کرتا ہے۔ اگر موجد اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایجاد کو ترقی دے تو اس کی تقلید تقلید مناسب کہلائے گی۔ تقلیدِ مناسب کا رتبہ ایجاد کے دوش بدوش ہے۔ اگر تقلید سے ایجاد کو کوئی ترقی نہیں مل سکتی تو تقلید بے جا کہلائے گی۔ اگر مقلد کو، موجد کے نقش قدم پر چلنے کا ڈھنگ نہیں آتا اور اس میں مناسب تقلید کی صلاحیت نہیں تو اس کی تقلید نقالی کہلاتی ہے۔ ایسی تقلید سے ایجاد کو صدمہ پہنچتا ہے"

کشمیری شعراء کا جائزہ لیتے ہوئے آزاد نے کہیں کہیں، ان کے الہام کے مآخذوں کی طرف بھی اشارے کئے ہیں، جس سے ان کے مطالعے کی وسعت کا پتہ چلتا ہے لیکن جہاں انہوں نے اپنے قابلِ احترام معاصر مہجور کے بعض اشعار کے ماخوذ ہونے کا ذکر کیا ہے، احتیاط ملحوظ رکھا ہے۔ مثلاً ان کا ایک شعر نقل کر کے وہ صرف یہ لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ــــــ "ان کا اور غالب کا ماخذ مشترک معلوم ہوتا ہے۔"

آزاد کے اُردو مکتوب دلچسپ ہوتے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کے نام جو خطوط لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک خط کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"بھلا حسرت و یاس، درد و کرب کے خیالات کو کہاں تک فروغ دیں؟ اپنا دل تو گزر دہ تھا، اوروں کے وبال بھی کیوں اپنی گردن پر لے لیں؟ رونا گناہ ہے، اور رُلانا گناہِ کبیرہ۔"

آزاد کے ساتھ ہی، ان کے دوست ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کا ذکر ضروری ہے۔ ڈاکٹر

گنجو آزاد کے دوست، معالج اور ہمدرد رہے اور ان کے انتقال کے بعد، ان کے کلام کو اکٹھا کر کے شائع کیا۔ آزاد سے اپنے تعلقات کی ابتداء کے بارے میں وہ اپنے مرتبہ کلیات کی تمہید میں لکھتے ہیں :-

"مرحوم آزاد کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات ۱۹۳۶ء میں مہجور صاحب مرحوم کے توسط سے شروع ہوئے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کا رجحان طبیعت دیکھ کر ہم میں باہمی موانست قائم ہوگئی"۔

اور یہ موانست آزاد کے انتقال تک قائم رہی۔ ڈاکٹر گنجو لکھتے ہیں کہ انتقال سے ایک دن پہلے آزاد نے وصیت کی تھی کہ

"میرے پاس دنیاوی ثروت اور سرمایہ تو کچھ نہیں، ہاں فقط نظموں کے کچھ مسودے اور عمر بھر کی عرق ریزی کا نچوڑ تاریخ ادبیات میرا سارا سرمایہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے بعد ان کاغذات کو پنڈت پریم ناتھ بزاز صاحب یا ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ ان کاغذات کی تکمیل، ترتیب و اشاعت جس طرح مناسب ہو کریں۔"

ڈاکٹر گنجو سری نگر شہر میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے تک یہیں تعلیم پائی۔ اس کے بعد امرتسر جا کر طب یعنی ڈاکٹری کا امتحان کامیاب کیا اور کشمیر لوٹ کر، سرکاری ملازمت میں منسلک ہوگئے۔ ادب سے انہیں یوں بھی لگاؤ ہے لیکن اردو میں آنرز کا امتحان پاس کرنے کے بعد ان کے مطالعے کے ذوق میں اور بھی ترقی ہوئی۔ چنانچہ تحریر اور انشاپردازی کے گُر پر انہیں پورا قابل حاصل ہے۔ انہوں نے کچھ مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کا قابلِ قدر کارنامہ کلیاتِ آزاد ہے جو ۶۴۳ صفحات پر حاوی اور ترتیب اور تبویب کے لحاظ سے اچھی تصنیف ہے۔ مقدمہ جو کوئی دو سو صفحات پر مشتمل ہے، آزاد کی حیات اور شاعری کا تنقیدی جایزہ ہے۔

کشمیر کی جدوجہد آزادی کے قایدین میں، جو اس وقت چوٹی تک ابھر آئے ہیں۔

خواجہ غلام محمد صادق، سیاست اور سماجی زندگی میں اپنے ترقی پسند رجحانات اور اپنی علمی اور ادبی دلچسپی کی بدولت، ایک اہم مقام پر فائز ہیں۔ ان کی ولادت سرینگر میں ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ ان کا خاندان عالموں اور ادیبوں کا ایک سربرآوردہ خاندان ہے۔ صادق صاحب کے والد عبدالغفار فارسی کے عالم، اُردو کے اچھے منتظم اور کشمیری کے قابلِ ذکر شاعر تھے۔ وہ فارغ تخلص کرتے تھے اور کشمیری میں ان کے دوسرے کلام کے علاوہ ان کا حالی کے "مسدس مدوجزر اسلام" کا منظوم کشمیری ترجمہ، کشمیری ادب میں ایک مقام رکھتا ہے۔

صادق صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور پھر مشن اسکول میں ہوئی۔ اعلی تعلیم کے سلسلے میں کچھ عرصہ وہ لاہور میں رہے اور پھر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان ۱۹۳۴ء میں کامیاب کئے۔ وطن لوٹنے کے بعد وکالت شروع کی، لیکن اس زمانے میں کشمیر کی تاریک سیاسی فضا نے حساس اور قومی درد رکھنے والے نوجوانوں کی طرح، صادق صاحب کو بھی سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت مسلم کانفرنس جموں و کشمیر میں برسرِ عمل تھی، صادق صاحب اس کے رُکن بن گئے لیکن اس کی بنیادیں وسیع کرنے کی دُھن میں لگے رہے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں اس کا موقع آیا اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، مسلم کانفرنس کا ایک خصوصی اجلاس خود صادق صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں مولانا محمد سعید مسعودی، جنرل سیکرٹری، مسلم کانفرنس نے، کانفرنس کو آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی قرارداد پیش کی، جس کی تائید چودھری غلام عباس نے کی۔ اور یہ قرارداد منظور ہو گئی، جس کے بعد سے جموں کشمیر کی سیاست میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ نئی کانفرنس کے پہلے صدر صادق صاحب چُنے گئے۔

۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات میں شیخ محمد عبداللہ اور کانفرنس کے عہدیداروں کی صحیح رہنمائی کی وجہ سے کشمیر کی فضا پاک و صاف رہی، اسی بناء پر گاندھی جی نے کہا تھا کہ کشمیر میں انہیں روشنی کی کرن نظر آئی۔ ۱۹۴۸ء میں جب ریاست میں نمائندہ حکومت قائم ہوئی۔ تو صادق صاحب وزیر بنے۔ ۱۹۵۱ء میں ریاست کا دستور مرتب کرنے کے لئے دستور ساز مجلس بنی، اور اس کے صدر صادق صاحب ہی چنے گئے۔ نئے دستور کے تحت جو حکومت بنی اس میں ان کے علمی رجحانات کے مدنظر، صادق صاحب کو وزیر تعلیم چنا گیا۔ اور ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک وزیر تعلیم رہے۔ بخشی غلام محمد صاحب کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں ان سے اختلاف کی وجہ سے ۱۹۵۷ء میں صادق صاحب نے ایک الگ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس قایم کی اور اس کے صدر کی حیثیت سے ۱۹۶۴ء تک اسمبلی میں حزب مخالف کی رہنمائی کرتے رہے۔ بخشی غلام محمد کے مستعفی ہونے کے بعد، شمس الدین صاحب کچھ عرصہ وزارت عظمیٰ پر فائز رہے، اس کے بعد صادق صاحب وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔

سیاست کے ساتھ ساتھ، صادق صاحب کو علم و ادب سے بھی گہرا لگاؤ ہے۔ تاریخ اور سیاست ان کے مخصوص موضوع مطالعہ ہیں اور ادب میں وہ ترقی پسند رجحانات کی طرف مائل ہیں۔ عنفوان میں وہ شعر بھی کہتے تھے اور صادق تخلص اختیار کیا تھا۔ لیکن اب تلاشی کے باوجود ان کا کہا ہوا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ جموں و کشمیر میں ترقی پسند تحریک اور اداروں سے ان کا قریبی ربط رہا۔ آل جموں و کشمیر سٹیٹ کلچرل فرنٹ کے وہ بانی ہیں، جو بعد میں کلچرل کانگریس میں تبدیل ہوگئی تھی۔ کلچرل فرنٹ کے کئی شعبے تھے جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ فرنٹ کی مختلف یونٹوں نے ریاست میں ادب اور آرٹ کے نئے رجحانات کو ترقی دینے میں بڑی مساعدت کی۔ تاریخ، آثار قدیمہ، تعلیمی اور تہذیبی مسایل کے بارے میں ان

کے تصورات کا اندازہ ان کی مختلف تحریروں اور تقریروں سے ہوتا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں کلچرل اکادمی کے زیر اہتمام جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک کی جانب سے جو نمائش تصاویر سری نگر میں منعقد کی گئی تھی۔ اس کا خطبۂ افتتاحیہ صادق صاحب ہی نے دیا تھا۔ خطبہ میں جرمن آرٹ کے ارتقاء پر جس طرح روشنی ڈالی ہے۔ اس آرٹ کے ارتقاء کے بارے میں ان کی واقفیت اور فن کی پرکھ کے معیاروں کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔ جرمنی میں نشاۃ ثانیہ کے سربرآوردہ مصوروں کا تذکرہ کرتے کہا تھا:۔

"ڈیورر نے گرافک آرٹ کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا، اس نے بائیبل کے موضوعات کی تصویر کشی کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مگر یہ تصاویر ابتدائی کلیسائی مصوروں کی غیر حقیقی تصاویر سے مختلف تھیں، کیونکہ اُس کے یہاں گو بائیبل کے کردار روحانی طہارت کا مظہر ہوتے تھے پھر بھی جامد تصورات کی زنجیروں سے آزاد تھے۔"

"کشمیر کا تمدنی ورثہ" کے عنوان سے، صادق صاحب کا ایک مضمون ہفت روزہ "آئینہ" (سری نگر ۶ اگست ۱۹۶۶ء) میں شایع ہوا تھا، جس میں کشمیر میں تمدنی آثار کی ابتداء، برزہامہ کے آثار الصادیہ سے لے کر موجودہ دور تک، تمدن کے عہد بہ عہد ارتقاء کے نمایاں رجحانات کا جائزہ لیا ہے اور پشاچ اور ناگ تہذیب، بُدھ مت کے شیوع سے سماجی اور تمدنی اُفق کی وسعت، کُشنوں کے زمانے کی مذہبی اور تمدنی سرگرمیوں، ٹیکسیلا کے قدیم علمی مرکز سے کشمیر کے باہمی علمی اور تمدنی ربط اشوک کے عہد سے ثقافتی لین دین کے آغاز اور اس کے اہم خط وخال پر اجمال سے روشنی ڈالنے کے بعد اسلامی عہد میں احیائے ثقافت کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"اسلام کی آمد سے کشمیری ثقافت کے بنیادی ڈھنگ میں ایک نئی قوت پیدا ہوئی اور فرسودگی کا خاتمہ ہوا۔ . . . اسلامی تمدن اور عہدِ وسطیٰ کی ترقی یافتہ ہندو ثقافت کے باہمی ملاپ سے ایک نیا کلچر اُبھرا، جو آج ہمارا تمدنی ورثہ بن گیا ہے۔"

تاریخ اور تعلیم، صادق صاحب کے دو محبوب موضوع رہے ہیں۔ تعلیم کے جدید نصب العین کے بارے میں ان کے چند مضامین شایع ہوئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک "تعلیم ___ فلاح و بہبود کے لئے" ایک خیال زا مضمون ہے جس میں تعلیم کے بدلتے ہوئے تصور کی تفصیل لکھی ہے۔ ریاست میں سماجی اور معاشی مساوات، ان کا اور ان کے ہم خیال قایدین کا اصول رہنما ہے۔ چنانچہ اس بارے میں انہوں نے "تعمیر" (سری نگر، جنوری فروری ۱۹۶۲ء) میں "ہمارا نصب العین ___ مکمل معاشی، مادی مساوات" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا۔ اس میں، ان اصلاحات اور ترقیوں کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ جو مذکورہ بالا نصب العین کے حصول کے لئے ریاست میں اختیار کی گئیں۔

نیشنل کانفرنس نے جابر اقتدار کے خلاف اپنا آخری وار "کشمیر چھوڑ دو" کی قرار داد منظور کر کے اور اس تحریک کو چلا کر کیا اور صادق صاحب نے اسی عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی، جو ایک اچھے لکھے ہوئے اور خیال آفریں مقدمہ کے علاوہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ (۱) نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ، (۲) شیخ محمد عبداللہ شیر کشمیر کی ایک تاریخی تقریر۔ (۳) درلدتی رشن کے نام شیر کشمیر کا تار اور (۴) ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ایک نظم ___ کتاب میں کشمیری کی آزادی کے بارے میں مشہور سیاسی مفکرین کے بیانات اور سربرآوردہ شعراء کی نظمیں، ۱۹۴۶ء میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری پر اخبارات کے تبصروں کے اقتباسات اور نظمیں، ریاست میں آتے ہوئے پنڈت نہرو کی گرفتاری اور اس پر اخباروں کے تبصرے، "کشمیر چھوڑ دو" تحریک

کا پس منظر اور اس کے مضمرات، سب کچھ شامل کر دیا گیا ہے۔ اور ان الگ الگ اجزاء کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ صادق صاحب کے ان پر تبصروں کے بغیر بھی مسئلہ کی صورت حال اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ مقدمہ جو سلیس اور صاف ستھری زبان میں لکھا گیا ہے، ایقان کا وزن اور تبلیغ کا جوش بھی رکھتا ہے۔ آزادی چاہنے والی قوتوں کو سرنگون کرنے کے لئے ڈوگرہ حکومت نے استبداد کا جو رویہ اختیار کیا تھا، اس کی مذمت جس طرح کی ہے، اس کا انداز خطیبانہ تو ہے ہی، لیکن اس میں ادبی آہنگ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"لیکن دنیا کا فیصلہ ان کے خلاف ہے، وقت کا تقاضا ان کو تباہی کی طرف دھکیل رہا ہے اور ملک بھر کی انقلابی اور ترقی پسند طاقتیں ان پر ہنس رہی ہیں۔ آج اگر کشمیر کی سرسبز وادی کو ہمارے بچوں اور ہماری ماؤں اور ہمارے بوڑھوں کے خون سے لالہ زار بنایا جا رہا ہے تو یہ ہمارے واسطے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی:

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اس خون کی ہولی سے ہمارے ارادے مضبوط ہو گئے ہیں، ہمارے پاؤں آزادی کے میدان میں جم چکے ہیں۔ ہمارے دلوں میں روح انقلاب پورے طور پر بیدار ہو چکی ہے اور ہم انقلاب کے پرچم کو لہراتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے جائیں گے اور کشمیر کی سرزمین میں ایسا راج قایم کریں گے، جہاں تاج شاہی مزدوروں اور کسانوں کے سر پر ہوگا اور نسل اور قومیت کے نام سے کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکے گا۔ اور جہاں انسان آزاد ہوگا اور اسے بازاروں میں بکنے والی چیز نہیں سمجھا جائے گا۔ ہمارا کشمیر، بھوک، مفلسی اور بیماریوں کا شکار نہیں ہوگا۔ ہمارے کشمیر میں مہاجن ہوں گے اور نہ عوام کے خون پر پلنے والے جاگیردار۔"

اپنی سیاسی مصروفیتوں کو بھی علمی اور ادبی دلچسپیوں کا رنگ دینے کا صادق صاحب کا ایک اپنا انداز ہے ــــ ادب کے بارے میں وہ سوچ سمجھے نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی ادبی رفاقتوں سے ہوتا ہے اور اس تعارف سے ہوتا ہے جو انہوں نے کشمیر کے پریم چند، پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں کے مجموعے "بہتے چراغ" پر لکھا ہے۔ کشمیر کو جنتِ ارضی کہہ کر مطمئن ہو جانے والے باہر کے ایسے شاعروں اور افسانہ نگاروں پر تنقید کرتے ہوئے، جنہوں نے کشمیر کی حقیقی زندگی کی تصویر نہیں دیکھی، صادق صاحب کہتے ہیں[ط]:-

"خود پردیسی کو باہر کے افسانہ نگاروں سے سخت شکایت تھی، جنہوں نے کشمیر کے قدرتی اور خوبصورت مناظر کے تخیلی اور رومانی خاکے کھینچے ہیں، جن کا یہاں کی زندگی اور یہاں کی خارجی حقیقتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ جنہوں نے جنت کو تو دیکھا، لیکن جہنم کی آگ میں دہکتی ہوئی زندگیوں کو نظر انداز کیا۔ جنہوں نے کشمیر کے کسی پہاڑی قصبے کو ریاست کشمیر کا نام دے کر، اپنے آپ کو کشمیر کی سیاسی اور سماجی زندگی کا ترجمان بتایا۔ جنہوں نے چناب کے کنارے واقع کسی گاؤں کو اٹھارہ لاکھ کشمیری بولنے والے عوام کا نمائندہ بتایا اور چناب کی مناسبت سے من گھڑت اور رومانی قصے بیان کئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

خواجہ غلام نبی گلکار، کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کے لئے کام کرنے والے نیتاؤں میں سے ہیں۔ وہ آزاد کشمیر کے علمبردار ہیں، اور اس موضوع پر "آزاد کشمیر" ہی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ سرینگر ان کا وطن ہے، لیکن آج کل راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ ان کی تعلیم سری پرتاپ کالج میں ہوئی۔ تعلیم کے زمانے سے انہیں سیاست

[ط]. صادق صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

میں حصہ لینے کا شوق ہوا۔ اور ایک سٹوڈنٹ فیڈریشن بھی بنایا تھا، جس کے وہ صدر رہے۔ لکھنے کا شوق بھی زمانۂ طالب علمی سے رہا۔ اور کالج کے رسالے "پرتاپ" میں لکھتے رہتے۔ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کے سلسلے میں، جس کا اوپر ذکر کیا گیا، شیخ محمد عبداللہ پر جو مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اس کی روداد، اس کتاب میں مرتب کی ہے۔ ۱۹۳۱ء سے کشمیر میں آزادی کی جدوجہد کی تاریخ بیان کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

"بعض اوقات اہلِ کشمیر نے آزادی کے لئے تحریک شروع کی مگر وہ حالات ناسازگار ہونے کے باعث دب جاتی رہی۔ ۱۹۳۱ء میں ایک زبردست تحریک حریت شروع ہوئی اور اہلِ کشمیر کو حقوق ملکیت اراضی ملنے کے علاوہ اہلِ ریاست کو پریس کی آزادی، پلیٹ فارم کی آزادی، اسمبلی (گو ناقص) کے قیام وغیرہ کے حقوق مل گئے۔"

آگے ان حالات کی تفصیل بیان کی ہے، جن کے تحت شیخ محمد عبداللہ کشمیر چھوڑ دو تحریک کا آغاز کرنے پر مجبور ہو گئے۔

"خواجہ گلکار کو" جیسا کہ شمیم احمد شمیم، ایڈیٹر "آئینہ" نے اخبار کے سالنامہ ۱۹۷۰ء میں ان کے مضمون "سری نگر کو خوبصورت بنانے کا منصوبہ کے تعارفی نوٹ میں لکھا ہے۔ "کشمیر سے عشق ہے اور اس عشق نے انہیں دیارِ غیر میں بھی خیالِ یار کو متاعِ حیات بنانے کا حوصلہ بخشا ہے۔ مضمون میں خواجہ صاحب نے ان سارے وسایل اور مسایل پر تفصیل سے نظر ڈالی ہے۔ جن سے شہرِ سری نگر کو اس کے گرمائی قیام گاہ کے لئے خوبصورت بنایا جا سکتا ہے۔

آزادی کشمیر کے مجاہدین کی اسی صف میں چودھری غلام عباس اور سردار محمد ابراہیم خان بھی تھے۔ جنہوں نے اپنے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اس جنگ میں حصہ لیا اور دونوں نے اپنی اپنی خود نوشت، مرتب کی ہے۔

سردار محمد ابراہیم خان، تقسیم سے پہلے جموں وکشمیر کے اسسٹنٹ ایڈوکیٹ جنرل تھے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ ملازمت سے مستعفی ہوکر ریاستی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور ۱۹۴۷ء میں "آزاد کشمیر" کے پہلے صدر بنائے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ اس عہدے سے ہٹائے گئے، لیکن ۱۹۵۷ء میں وہ دوبارہ "آزاد کشمیر" کے صدر بنے۔ کچھ عرصہ گرفتار بھی رہے۔ اس وقت لاہور کی عدالت عالیہ میں وکالت کر رہے ہیں۔

چودھری غلام عباس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "کشمکش" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں اپنے ذاتی حالات، مشاہدات اور تاثرات کو جدوجہد آزادی کے سوانحات کے ساتھ مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے، لیکن اس کے نسخے یہاں نہیں دستیاب ہوتے۔ شمیم احمد شمیم ایڈیٹر "آئینہ" (سری نگر) اس کا اور سردار محمد ابراہیم خان کی "متاع زندگی" کے نسخے پاکستان سے اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کے ابواب وہ اپنے ہفتہ وار میں شائع بھی کرتے رہے۔ "کشمکش" کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ــــ "چودھری صاحب کی یہ کتاب ان کی سوانح حیات ہی نہیں، تحریک حریت کشمیر کی تاریخ بھی ہے۔" اور یہ بھی لکھا ہے کہ "کشمکش" میں واقعات کی صحت سے زیادہ، جذبات کی شدت نمایاں ہے۔"

اس خود نوشت کے ایک حصے سے، جو مابہ النزاع نہیں ہے، ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ نواب بہادر یار جنگ کے سری نگر میں ورود سے تعلق رکھتا ہے، جو مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے کانفرنس کی دعوت پر آئے تھے۔ لیکن حکومت نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"میر واعظ منزل میں پہنچ کر نواب صاحب نے ابھی دم بھی نہ لیا تھا

حکومت کی جانب سے سری نگر سے ان کے اخراج کا حکم پہنچ گیا۔ اس
خبر سے ہم سب گم سُم ہو گئے۔ ہمارے سامنے دو ہی راستے تھے کہ
نواب صاحب خلاف ورزی احکام کریں یا بہ امر مجبوری کشمیر سے
واپس تشریف لے جائیں۔ مجلس عاملہ کے اکثر ممبروں کی خواہش
تھی کہ نواب صاحب قید ہو جائیں۔ لیکن نواب صاحب کو یہ پوزیشن
متعدد وجوہ کی بناء پر منظور نہ تھی۔ مجھے بھی ان سے اتفاق تھا کیونکہ
نواب صاحب کی گرفتاری سے مسلم لیگ کی پوزیشن مخدوش ہونے
کا احتمال تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اندریں حالات ہم نے بمصداق "زندہ
صحبت باقی" نواب صاحب کو رخصت کیا۔"

سردار محمد ابراہیم خاں کی "متاعِ زندگی" میں جذبات
کی وہ شدت نہیں ہے، جس کے نمونے "کش مکش" میں ملتے ہیں۔
اس کے علاوہ ان کو ایک زیادہ سلیس اندازِ بیان پر قدرت ہے۔
ایک بات ضرور ہے کہ "کش مکش" میں مصنف کے ہر جگہ پیش منظر
میں موجود رہنے کی وجہ سے اس کا مطالعہ دلچسپ بن جاتا ہے اس
کے مقابلے میں سردار ابراہیم کی پیش کشی کا انداز زیادہ معروضی اور
عموماً واقعاتی ہے۔ تاہم واقعات اس میں دلچسپی پیدا کر رہے ہیں۔
ذیل کے اقتباس سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

"ان صاحب کے ذاتی تجربہ زندگی کا یہ عالم تھا کہ ان کے علم میں جھیل
وُلر بھی ایک افسانوی معاملہ تھا، حقیقی وجود ہی نہ تھا۔ ان صاحب
کا ایک چکر ایک ماہ کے اندر کراچی سے راولپنڈی رہتا تھا۔ اس طرح
کہ کشمیر کے آزاد کرانے میں گویا وہ بہت بڑا کردار ادا کر رہے تھے۔

ان کے افسروں نے خوشامد کر کے ان کا دماغ اس قدر خراب کر دیا تھا کہ واقعی وہ سکندرِ اعظم کے جانشین اپنے آپ کو سمجھنے لگے۔"

منشی نصیر الدین جن کو "آئینہ" کے ایڈیٹر نے "بے نام مجاہدوں" میں شمار کیا ہے، آزادی کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے قربانیاں دیتے رہے اور اسی ایڈیٹر کے الفاظ میں "ان کے خلوص اور ان کے ایثار نے بڑے لیڈروں کو جنم دیا۔ ۱۹۳۱ء سے پہلے بھی عوامی حقوق منوانے کے لئے انہوں نے جد و جہد کی تھی اور بعد میں بھی عرصہ تک وہ سیاستِ کشمیر میں ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے حصہ لیتے رہے۔ اب وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو کر آزادی کی جد و جہد کی تاریخ مرتب کرنے میں مصروف ہیں، جو جلد ہی مکمل اور شائع ہو جائے گی [۱]۔

پروفیسر پی۔ این۔ پُشپ (ولادت سری نگر ۱۹۰۸ء) سنسکرت کے عالم، فارسی میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ محکمۂ تعلیم سے ان کی ملازمت کی ابتداء ہوئی۔ کئی کالجوں میں سنسکرت کے پروفیسر رہے، آخر میں پرنسپل ہو گئے تھے۔ جہاں سے وہ اب ریسرچ، لائبریریز اور آرکائیوز کی نظامت پر متبدل ہو گئے ہیں [۲]۔ پُشپ کے خاندان میں علمی روایات عرصہ سے چلی آ رہی ہیں۔ ان کے خسر پنڈت لچھمی نراین کول کا تعلق "بہارِ کشمیر" لاہور سے رہا۔ پروفیسر پشپ خود اچھے صاحبِ قلم ہیں۔ انگریزی میں لکھتے ہیں اور سنسکرت ادب پر ان کی نظر گہری ہے۔ اردو میں بھی پروفیسر پُشپ روانی سے لکھتے ہیں۔ ان کا خاص مطالعہ کشمیری شاعری ہے، جس کے بعض پہلوؤں پر انہوں نے مضامین لکھے ہیں۔ ایک مضمون جو "کشمیری شاعری میں جذبات نگاری" کے

۱۔ یہ تاریخ سری نگر کے ایک پبلشر علی محمد اینڈ سنز کی طرف سے شائع کی جا چکی ہے۔

۲۔ پُشپ صاحب اب وظیفہ حسن خدمت حاصل کر رہے ہیں۔

عنوان سے "کونگ پوشس (جون ۱۹۵۴ء) میں شایع ہوا تھا۔ اس میں للہ دید سے لے کر خود اپنے عہد تک شعرا، عارف، نادم، روشن، امبار دار، عارض، پریمی اور راہی کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس کا اختتام وہ اس طرح کرتے ہیں:

"موجودہ دور کی بہت ساری انبساطی شاعری، حال کی نہیں مستقبل کی سی معلوم ہوتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ مسرت کا اظہار حقیقی اور فطری بننے کے لئے ابھی بھی ساز گار ماحول کی تلاش میں سرگرداں ہے۔"

پروفیسر پُشپ نے کشمیری کے دو اہم شاعروں کے حالات اور انتخاب کلام پر رسالے مرتب کئے ہیں۔ ان میں سے ایک مہجور پر ہے اور دوسرا آزاد پر۔ یہ دونوں رسالے کلچرل اکادمی کے لئے مرتب کئے گئے ہیں۔ اور سلسلۂ انتخاب منظومات کشمیری میں شایع ہوئے ہیں۔ آزاد سے متعلق رسالہ ۱۹۵۹ء میں اور مہجور پر ۱۹۶۰ء میں شایع ہوا۔ دونوں رسالوں میں پہلے شاعر کا تعارف ہے جس میں اس کی حیات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کلام پر تبصرہ، تبصرے کشمیری شاعری کے بارے میں قدردانی کے جذبات کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور سے بھی پُر ہیں۔ ان کا اپنا مخصوص اسلوب بھی ہے اور اس کو وہ عروج تک کس طرح پہنچاتے ہیں، ذیل کے اقتباس سے واضح ہوگا:

"آزاد کی شاعری کا روشن ترین پہلو، ان کی انسان دوستی ہے۔ ان کے کلام میں جو بلیغ اور وسیع نظریہ نکھرا ہوا ملتا ہے وہ جمال اور جلال کی ہم آہنگی ہی میں، پنپ سکتا ہے۔"

کشمیری ادبیات کا جائزہ لیتے ہوئے، انہیں ادبیات کے سماجی محرکات پر بھی غور کرنے کا موقع ملا۔ اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں بھی توانا ہوتی گئیں۔ بہت جلد یہ اس مقام پر جا پہنچے جہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

مہجور کی غزل کا جائزہ لیتے ہوئے، وہ کشمیری شاعری کے گوناگوں رجحانات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور مہجور کی غزل پر رسول میر کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"بے شک، ان سے پہلے رسول میر نے غزل کو تصوف کے کلی تصرف سے آزاد کر کے ناز و نیاز کی فطری کیفیتوں کا حسین ترین ترجمان بنا دیا تھا۔ اور شباب کی تلاطم خیزیوں کا ایک رنگین مرقع پیش کیا تھا۔ لیکن میر کا انداز فارسی روایات کے بوجھ سے دبا دبا سا جان پڑتا ہے۔ اس کی بے ساختہ سپردگی اور بے باک شوخی کا مداح ہوتے ہوئے بھی مہجور کو اس کی مفرس ترکیبیں اور اجنبی تشبیہیں ایک آنکھ نہ بھا سکیں۔ اسی لئے بہت جلد ان کی غزلوں میں (کیا خارجی، کیا داخلی، دونوں پہلوؤں سے) مقامی رنگ نکھرتا گیا۔"

غالب کا مطالعہ پروفیسر پُشپ نے گہری نظر سے کیا ہے، چنانچہ "غالب کا طنز و ظرافت" کے عنوان سے انہوں نے ایک دلچسپ مضمون لکھا تھا، جو ماہنامہ "تعمیر" (شمارہ جنوری، فروری ۱۹۶۰) میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے، جس میں غالب کے عہد کے حوصلہ شکن حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غرض کہ غالب کے لئے دنیا ایک ہیبت ناک غمکدہ بن گئی۔ انہیں کے الفاظ میں "پوچھو کہ غم کیا ہے، غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت، اس کثرتِ غم سے بھی اگر غالب سودائی نہ ہوئے اور قوتِ فکریہ نہیں کھو بیٹھے تو اسے ان کی توانا شخصیت کا ہی کرشمہ سمجھ لیجئے۔"

اُردو کے شہرہ آفاق ادیب، ڈراما نگار اور یادگار کارنامہ "ناٹک ساگر" کے مُصنّف صاحبزادہ محمد عمر کے فرزند صاحب زادہ حسن شاہ تاریخ کے اچھے عالم اور اُردو ادب کے متعلم ہیں۔ جموں، ان کے خاندان کا وطن ہے۔ جہاں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اور اعلیٰ تعلیم کی تکمیل پنجاب میں کی، جہاں پنجاب یونیورسٹی سے انہوں نے تاریخ میں ایم۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ پہلے لیکچرار رہے بعد میں پروفیسر اور پھر امر سنگھ کالج، سری نگر کے پرنسپل ہوگئے تھے۔ کچھ عرصہ وہ ریسرچ لائبریری اور آرکائیوز کے ناظم بھی رہے۔ اس زمانے میں لائبریری میں جموں اور کشمیر کے مصنفین اور شعراء کے کارناموں کو اکٹھا کرنے کی سعیِ بلیغ کی۔ جو کتابیں دستیاب نہیں ہو سکی تھیں۔ ان کی نقلیں، مائیکروفلم یا فوٹو اسٹاٹ، سارے ملک اور بیرونِ ملک کے کتب خانوں سے فراہم کئے۔ رنبیر کلکشن، جس میں اُردو کے بہت سے مخطوطات شامل ہیں، اور جن کی تفصیل پچھلے صفحات میں دی گئی ہے، اس کی تہذیب کی۔

صاحب زادہ حسن شاہ شُستہ علمی اور ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ وہ عرصہ تک کلچرل اکیڈمی کے ترجمان "شیرازہ" کی مجلس مشاورت کے رُکن رہے۔ کشمیر کی تاریخ اور تمدن پر انہوں نے نئی معلومات آفرین مضامین لکھے اور شائع کئے ہیں، جن میں "عہدِ سلاطین میں کشمیر کی تمدنی ترقی" اور "کشمیر کا پہلا عوامی شاعر ــــ کھیشمندر ــــ" قابلِ ذکر ہیں۔ کھیشمندر، کشمیر میں بُدھ مت کے زوال کے بعد منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس نے اپنے زمانے میں کشمیر کی سماجی زندگی کے بارے میں جو تاثرات چھوڑے ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے، آج کے کسی طنز نگار کے افکار معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانے کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے، شاہ صاحب لکھتے ہیں:-

"کشمیر میں بودھ تہذیب کے زوال کے بعد نویں سے بارہویں صدی کا دور برہمنی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ اس زمانے میں سنسکرت شعر و ادب، شیو فلسفہ اور فن تعمیر کے شاندار شاہکار معرض وجود میں آئے۔ لیکن علماء، فلسفی اور فنکار، سب انسانوں کی دنیا سے دور، دیوی، دیوتاؤں، عالم بالا، اور حیات بعد الممات کے دقیق مسائل کے محدود دائرے سے باہر نکلنا مُبتذل سمجھتے تھے ۔۔۔"

اس پس منظر میں، انہوں نے کھیشمندر کے سماجی شعور اور عوامی اہمیت کے کارناموں کو اُبھارا ہے۔ جس نے اپنے عہد کے مختلف سماجی طبقوں، جیسے طوائف، قحباؤں، بخیلوں کے بڑے دلچسپ اور مؤثر کردار پیش کئے ہیں۔

شاہ صاحب کئی کتابوں کے مُصنّف اور مرتب ہیں۔ ان کی مختصر تاریخ کشمیر، وسیع مطالعے کا نچوڑ ہے جو متعلمین اور عام قارئین کو مجمل طور پر کشمیر کی سیاسی اور تمدنی تاریخ سے واقف کرانے میں بہت مفید ہے۔ ان کا قابل قدر کارنامہ پیر غلام حسن کی فارسی تاریخ کشمیر کی ترتیب اور تدوین ہے۔ جس کی تین جلدیں اول، دوم اور چہارم، بسیط عالمانہ مقدمے اور حواشی کے ساتھ سرکاری محکمۂ ریسرچ کی جانب سے شایع ہوئی ہیں۔ پہلی جلد ۱۹۵۴ء میں شایع ہوئی۔

ڈاکٹر عزیز احمد قریشی وسیع دلچسپیوں کے حامل ہیں۔ جو ادب، تاریخ آثار قدیمہ اور مذہب پر لکھتے رہے ہیں۔ ان کے خاندان کا وطن مظفر آباد ہے جہاں وہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم لاہور اور دہلی میں پائی اور انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی تاریخ میں۔ فرانسیسی اور جرمن زبانیں بھی جانتے ہیں۔ اوائل عمر سے لکھ رہے ہیں۔ لاہور میں قیام کے زمانے میں وہاں کی علمی اور ادبی محفلوں

میں شریک ہونے کے موقع نصیب ہوئے، چنانچہ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، چراغ حسن حسرت، ہری چند اختر، جیسے صاحب ذوق اصحاب کی صحبتوں میں ان کی ادبی تربیت ہوئی۔ ان کی تصانیف ہیں حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں:

(۱) جدید تنقیدی زاویئے: جس میں شاعری کے بارے میں اکثر یورپی نقادوں کے تصورات کو پیش کرکے، اس کے مفہوم کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ شاعری کے متعلقات، تخیل، وجدانیت، لاشعوریت، ابہام اور اسلوب اور بنیادوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

۲۔ ہماری قومی انقلابی شاعری۔ اس میں سیاسی شاعری، قومی شاعری، انقلابی شاعری کی تفہیم اور ان موضوعات پر اُردو شاعری کے اچھے انتخابات اکٹھے کر دیئے ہیں۔ آزادی ہند اور بٹوارہ کے بارے میں جن شعراء نے نظمیں کہی ہیں ان کو منتخب کرکے شامل کرلیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۹ء میں لکھی گئی۔

تاریخی موضوعات، خاص طور پر کشمیر کی تاریخ پر ان کی تصنیف "اسرارِ کشمیر" جو چار جلدوں میں لکھی گئی ہے، کشمیری قوم، اس کے آثار، رسم و رواج اور زبان کے بارے میں ہے، جس کی صرف ایک جلد شائع ہو سکی ہے۔ ان کی دوسری تاریخی تصانیف میں کشمیری کتبوں کے بارے میں ایک کتاب قابلِ مطالعہ ہے۔

مذہب اور اس کے مخصوص موضوعات پر بھی ان کی تصانیف ہیں جن میں "حجۃ السالکین" جس میں اپنے روحانی تجربوں کو سائینسی دلایل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس موضوع پر ان کی دوسری تصانیف، حجۃ الامامہ، شرعۂ بصیرت، اسلام میں طریقہ طلاق، مسئلہ ختم نبوت، خیال تصانیف ہیں۔ مارکس اور اس کے نظریوں پر بھی انہوں نے کچھ رسالے لکھے ہیں۔[۱]

ڈاکٹر عزیز احمد کو شعر و سخن سے بھی لگاؤ ہے۔ اور کافی ذخیرہ نظموں کا

---

[۱] قریشی صاحب کا انتقال سری نگر میں ہو چکا ہے۔

اکٹھا کر لیا ہے۔ جن میں سے چند رسالوں میں شایع ہوئے ہیں۔ کچھ عرصہ وہ رسالہ "گلریز" کو بھی ترتیب کرتے رہے۔

مشہور عالم فلسفہ، خلیفہ عبدالحکیم، جو اقبال کے نقاد کی حیثیت سے دنیائے ادب میں ممتاز ہیں، کشمیری نژاد تھے۔ ان کا خاندان پنجاب میں منتقل ہو گیا تھا۔ لاہور میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی اور پنجاب یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد میں فلسفہ کے اُستاد ہو گئے تھے۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران وہ جرمنی گئے اور ہائیڈلبرگ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی حاصل کی۔ حیدر آباد لوٹنے کے بعد، وہ فلسفہ کے ریڈر ہو گئے اور آخر میں پروفیسر بھی رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے وظیفہ پر سبکدوش ہونے سے قبل، وہ کشمیر بُلائے گئے اور ناظم تعلیم اور امر سنگھ کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ ۱۹۴۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی لوٹے، جہاں فیکلٹی آف آرٹ کے ڈین منتخب ہوئے۔ اس کے بعد وہ لاہور چلے گئے، جہاں اقبال اکادمی کے ناظم کی حیثیت سے اقبال کے فکر و فن کی توضیح اور تشریح کی اہم خدمات انجام دیں اور کئی تصانیف کیں۔

خلیفہ کو شعر و سخن سے بھی لگاؤ تھا۔ انہوں نے کئی خیال زا نظمیں لکھی ہیں، کشمیر میں قیام کے زمانے میں انہوں نے کشمیر پر ایک نظم کہی تھی، جو اپنے وطن سے ان کے جذبات محبت کی آئینہ دار ہے۔ نظم حسب ذیل ہے :-

وادی تری ایمن ہے تو پربت ترا سینا — دھرتی کا نگینہ
اس پر یہ غلامانہ مشقت کا پسینا — افگار ہے سینہ
مرنے سے ہے بدتر تھا اس طرح سے جینا — یوں زہر کا پینا
کر یاد ذرا موسئی عمران کی تدبیر — اے خطۂ کشمیر

افسوس کہ اُٹھتی نہیں سینے سے فغاں ایک — ہے گرچہ زباں ایک
مقصد نہیں رکھتے ہیں ترے پیر و جواں ایک — مطلب ہے کہاں ایک
لازم ہے کہ ہو قوم عیاں، ایک نہاں ایک — سب خورد و کلاں ایک
وابستہ ہوں باہم صفت، حلقۂ زنجیر — اے خطۂ کشمیر

کچھ لعل تری کان کے بیرونِ وطن ہیں — جو فخرِ یمن ہیں
بیرونِ چمن بھی ترے کچھ سرو سمن ہیں — اور تا بہ دکن ہیں
جن نافوں کی خوشبو سے معطر ہوئے بن ہیں — بیرونِ ختن ہیں
ماتم میں ترے صورتِ گُل سینہ زیا چیر — اے خطۂ کشمیر

ماسٹر موہن لال جنہوں نے تعلیمی موضوعات پر کچھ تصانیف لکھی ہیں، میرپور کے متوطن تھے۔ اور وہاں ایک سکول میں اُردو کی تعلیم دیتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ جموں آگئے اور یہاں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد، خود علوم مشرقی کی تعلیم کا ایک ادارہ قایم کیا ہے اور کشمیر اور جموں یونیورسٹی، علی گڈھ اور جامعہ اُردو کے امتحانات کے لئے اُمیدواروں کو تیار کر رہے ہیں۔

صحافت اور صحیفہ نگار

برطانوی ہند کے علاقوں میں، عوامی اخباروں کی اجرائی کے بعد سے ریاست کے اہلِ قلم اصحاب میں، ریاست سے بھی عوامی اخبار جاری کرنے کی جو خواہش پیدا ہوگئی تھی، اور جس کی پیش رفت کے لئے کوششیں بھی ہوئیں۔ ان میں سے پنڈت سالگرام سالک اور ان کے بھائی پنڈت ہرگوپال کول خستہ کی جدوجہد کی طرف پچھلے صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ مہاراجہ کے دربار سے نا اُمید ہوکر، کئی دلچسپی رکھنے والوں نے، لاہور، امرتسر اور سیالکوٹ وغیرہ سے جو اخبار نکالے تھے، ان کی تفصیل بھی دی جا چکی ہے۔ سالک کے بعد ان مساعی میں جو پیش پیش رہے، ان میں لالہ ملک راج صراف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ صراف نے سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے پاس پریس کے قیام اور اخبار کے اجراء کے لئے درخواست پیش کی تھی، جو نامنظور ہوئی۔ لیکن وہ نا اُمید نہیں ہوئے اور اپنی کوشش برابر جاری رکھی۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں پھر درخواست پیش کی۔ لیکن اس کا انجام بھی پہلی درخواست سے کچھ بہتر نہیں ہوا۔ آخر ۱۹۲۴ء میں حالات کچھ ایسے سازگار ہوئے کہ انہیں اجازت مل گئی۔ اور ان کے ہفتہ وار "رنبیر" کا پہلا شمارہ ۲۴ جون ۱۹۲۴ء کو جموں سے شایع ہوا۔ لالہ ملک راج صراف نے اپنی ان مساعی کی تفصیل اپنی خود نوشت "ففٹی ایرز ایز اے جرنلسٹ" میں اپنی زندگی کے حالات کے ساتھ وہ اپنا اخبار جاری کرنے کی فکر میں لگ گئے۔

"رنبیر" کے پہلے شمارہ میں انہوں نے اخبار کے مقاصد میں تعلیمی ترقی، سماجی اصلاح اور بہبودی، بےگار کے طریقے کی مسدودی، دیہاتی قرضداری کی سبکدوشی، ملک کی زراعتی، صنعتی، مالی اور تجارتی ترقی کی سعی، ریاست میں آمد و رفت کے وسائل

کی ترقی اور صحت عامہ کے لئے کوشش کو شامل کیا تھا۔ اخبار کے سرنامے پر یہ اشعار درج تھے:۔

مل جل کے ہم ترانے حُبِ وطن کے گائیں
بُلبُل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں
اظہار حال ملکی خاص اس کا مُدعا ہے
رنبیر نام کا یہ جام، جہاں نُما ہے

اس شمارہ کے اداریہ میں اغراض و مقاصد کی تفصیل لکھی تھی۔ اس کے علاوہ مشاہیر کے مبارک باد کے پیامات بھی اس میں شامل ہیں۔ جن میں پریم چند کا نام خاص طور قابلِ ذکر ہے۔ پہلے صفحہ پر اخبار کی تعریف میں ایک نظم بھی درج کی تھی جس کے کچھ شعر حسبِ ذیل ہیں:۔

آؤ پیدا کریں پھر مل کے وہ آنِ رنبیر
پھر سے عالم کو دکھا دیں وہی شانِ رنبیر
اس کے آنے سے سُدھر جائے گی حالت اپنی
خیر مقدم کو بڑھو، آیا جوانِ رنبیر
ہندو مسلم کی حمایت یہ کرے گا دل سے
فقرہ بازی سے نہ پُر ہوگا بیانِ رنبیر

اخبار میں خبریں، خبروں پر تبصرے اور نظمیں بھی شامل ہوتی تھیں، اس کے لکھنے والوں میں لالہ ہنس راج وکیل، سردار بُدھ سنگھ، پنڈت ہرکشن لال حبیب، سید ذوالفقار علی نسیم رضوی۔ مولوی محمد زین العابدین کوہی پنڈت رام سرن داس شاندلیہ، ایڈیٹر ماجستان، ڈاکٹر برکت رام، لالہ بالمکند ورما، سرو شری وشو ناتھ کرنی، حبیب اللہ، شری رام، گردھاری لال آنند، ایس۔ ایس، نشاط، سرون ناتھ

آفتاب، ارجن سنگھ عرش، بنسی لال سوری، قیس شیروانی، جواہر لال ولی، متھرا داس، میرزا مبارک بیگ، ماسٹر زندہ کول ثابت، نرسنگ سہلک چوہان، امرناتھ شاہد، سیوک رام بصیر، غلام حیدر خاں چشتی، محمد اکبر اعظم، صاحب زادہ محمد عمر، محی الدین قمر قمرازی، گوسائیں تاراچند، پنڈت انند رام ڈوگرہ، پنڈت لوک ناتھ شرما، سردار مہندر سنگھ، لالہ رام سرن داس ملہوترہ، پنڈت پنڈی داس گوسامی، سردار کاہن سنگھ بلاوریہ، ڈاکٹر ہری چند ہری، پنڈت نند لال کول طالب، سردار دلیپ سنگھ، رائے زادہ لکشمی چند کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں!

ان میں بہت سے ریاست کے اہلِ قلم ہیں، جن کا ذکر اس کتاب میں شامل ہے۔ شعراء میں کشن سمیل پوری، لالہ بدری ناتھ وکیل، پنڈت پریم ناتھ سادھو پردیسی، رونق، میرزا مبارک بیگ، مبارک، رام کشن فاضل، کے افکار اس میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے تھے۔

آر۔ ایس۔ داس، بھی کبھی کبھی " رنبیر" میں لکھتے تھے۔ ان کا ایک معلومات سے پُر مضمون " راجپوت اور ٹھکر کے باہمی رشتے " پر اخبار کے ایک شمارہ (۱۷ ساون ۱۹۹۵ بکرمی) میں شائع ہوا تھا۔

رنبیر پہلی دفعہ چھ سال جاری رہنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں، مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بارے میں خبر اور تبصرہ چھاپنے کی پاداش میں بند کر دیا گیا۔ ایڈیٹر کی اس سلسلے میں مہاراجہ کے پاس نمائندگی کے باوجود، جب مسدودی کے احکام منسوخ نہیں ہوئے تو صراف نے لاہور جا کر، وہاں سے " امر " ہفتہ وار جاری کیا اور پنڈت گنگا ناتھ شرما اور لالہ شیو رام گپتا جو " رنبیر " کے جوائنٹ ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ اخبار کی ادارت اور انتظام میں صراف کے شریک تھے لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔ اس اخبار کے بند ہونے کے بعد کشن سمیل پوری کے ساتھ مل کر انہوں نے " شیر " جاری کیا جس میں

کشمیر ہی سے متعلق خبریں زیادہ چھپتی تھیں۔

صراف کو ریاست اور باہر کی صحافتی برادری میں اہم مقام حاصل ہو چکا تھا۔ ان کی کوششوں سے ریاست میں آل جموں اینڈ کشمیر جرنلسٹ ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا اور وہی اس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں آل جموں و کشمیر نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کی صدارت کے لئے بھی انہیں کا انتخاب عمل میں آیا۔ ہیلسنکی میں عالمی صحیفہ نگاروں کا جو پہلا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اسی میں ہندوستان کی نمائندگی کے لئے صراف کو نامزد کیا گیا تھا۔ اسی زمانے میں وہ روس کے دورہ پر بھی گئے۔ ۱۹۶۴ء میں وہ انڈین فیڈریشن آف ورکنگ جرنلسٹ کی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں بحیثیت صحیفہ نگار انہوں نے پچاس سال پورے کر لئے تو اس کی گولڈن جبلی منائی گئی۔ اسی سال انہوں نے اپنی خود نوشت بھی شایع کی۔

صراف نے رنبیر کے ادارہ سے بچوں کے لئے ایک رسالہ "رتن" کے نام سے بھی جاری کیا تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر شانتی سروپ نشاط مقرر ہوئے تھے جو رنبیر کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی تھے۔ اس کا اجراء ۱۹۳۴ء کے اواخر میں ہوا تھا۔ اس زمانے میں بچوں کی دلچسپی کے بہت کم رسالے شایع ہوتے تھے۔ اس لئے 'رتن' کو ہندوستان بھر کے ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ رسالہ مضامین کے تنوع اور ترتیب کے سلیقے کی وجہ سے، ایک مقام حاصل کر چکا تھا۔ بچوں کی ذہنی سطح کے ادبی مضامین کے علاوہ اس میں افسانے اور نظمیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ "رتن" کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں ہندوستان کے مشہور اہل قلم حضرات کے علاوہ لالہ ہنس راج، اندر پرکاش، پرتاپ سنگھ، آگیا رام، عشرت رحمانی، دینا ناتھ صراف، پنڈت شیام لال ایمہ، سہیل عظیم آبادی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

رسالے کے اجرا کے دو سال بعد، شانتی سروپ نشاط کی بجائے، لالہ

ملک راج صراف کے فرزند ادم پرکاش صراف، اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ گوردن لال نے بھی اس کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ لیکن جب وہ دہلی یونیورسٹی میں تاریخ کے اُستاد ہو کر چلے گئے۔ تو صراف نے اس کی ترتیب و اشاعت کی نگرانی خود اپنے ذمے لی، یوں بھی، وہ عام طور پر اس کی ترتیب اور اشاعت میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اس زمانے میں ریاست کی ملازمت میں تھے۔ انہوں نے ایک موقع پر اس کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اس میں جو مضامین جمع کئے جاتے ہیں اور جس انداز سے اس کی ترتیب ہوتی ہے، قابلِ تعریف ہے۔" رتن" کے خاص مصور شمارے بھی شایع ہوتے تھے۔ یوراج کرن سنگھ کی سال گرہ کے موقع پر بھی اس کے خاص شماروں کی اشاعت کا انتظام کیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ اس رسالے کی اشاعت پچیس (۲۵) ہزار تک پہنچ گئی تھی اور جب کہ لالہ ملک راج صراف نے اپنی خود نوشت "ففٹی ایئرز ایز اے جرنلسٹ" میں لکھا ہے:۔

"ان ریاستوں اور برطانوی ہند میں جہاں اُردو بولی جاتی ہے ارباب تعلیم نے اسے منظورشدہ رسائل کی فہرست میں شامل کر لیا تھا۔"

"رہبر" کے اجراء کے بعد سے جموں میں اخبار کے اجراء کا راستہ گویا کھل گیا۔ اور کئی مؤقر اخبار اور کچھ رسالے شایع ہونے لگے۔ لالہ شیو رام گپتا کا "امر" اور نرسنگ داس نرگس کا "چاند" کافی مقبول رہے۔ شیو رام گپتا جموں کے مشہور انشاپرداز اور صحیفہ نگار ہیں اور لالہ ملک راج صراف کے رفیق کار رہے ہیں۔ "امر" میں بچوں کی دلچسپی کے مضامین خاص طور پر شایع ہوتے تھے۔ اس کے خاص شمارے بھی نکلے۔ جن میں تعلیم بالغاں، دیہات سدھار نمبر اور یوراج کرن سنگھ (سابق صدر ریاست اور گورنر اور مرکزی وزیر، ہند) کی سال گرہ کے موقع پر نکالا ہوا 'کرن نمبر' کچھ پائیدار دلچسپی رکھنے والے مضامین پر مشتمل ہیں۔ غلام حیدر خاں چشتی، ان

خاص نمبروں کی ترتیب میں لالہ شیو رام کی مدد کرتے تھے۔

دیوان نرسنگ داس نرگس، جن کا تذکرہ گذر چکا ہے، ایک ادارہ کی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ تصنیف و تالیف اور صحیفہ نگاری کا یہ ادارہ ایک معاوی نام دیوان برادرس سے متعارف ہے جس سے "چاند" کے علاوہ رسالہ "پریم" بھی نکلتا تھا۔ یہ رسالہ ملک بھر میں مقبول رہا۔ اس کے ایڈیٹر نرگس کے فرزند اقبال تمنائی تھے۔ گلزار احمد فدا نے بھی اس کی ادارت کی۔ یہ ۴۳-۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک نکلتا رہا۔ اس زمانے کے سارے مشہور انشاء پرداز اور شاعر، اس میں لکھتے تھے۔ جن میں خاص طور پر اندر جیت لطف، منوہر لال دل، مجبوبہ یاسمین، پردیسی، مہاسن، اللہ رکھا ساغر، صادق کاشمیری، رونق کاشمیری، رسا جاودانی، اعجاز ساقی، دیا کرشن گردش، کشن سمیل پوری، حمید نظامی، حبیب کیفوی، معراج الدین احمد، اور غلام حیدر خان چستی قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض کا اس تاریخ میں شاید اور کہیں تذکرہ نہ آسکے گا۔

جموں سے ایک اور ماہ نامہ "فردوس" کے نام سے قیس شیروانی نکالنے لگے تھے اور کشمیری لال ذاکر بھی قیس کے ساتھ ادارت میں شامل تھے۔ "گلاب" بھی جموں سے نکلتا تھا اور دینو بھائی پنت اس کے سربراہ تھے۔

"کوہسار" اور "پکار" بلراج پوری نکالتے تھے۔ جو جموں کے مشہور سیاستدان اور قائد ہیں۔ ان کی ولادت جموں ہی میں ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ وہیں پرنس آف ویلز کالج میں تعلیم پائی اور بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد، دہلی گئے اور دہلی یونیورسٹی میں معاشیات میں ایم۔ اے۔ کیا۔ سیاست اور صحافت سے انہیں نو عمری ہی سے لگاؤ رہا۔ چنانچہ ابھی وہ پندرہ برس کے تھے کہ اخبار نکالنے کی خواہش ہوئی۔ لیکن نابالغ ہونے کی وجہ سے خود اخبار نہیں نکال سکتے تھے۔ اس لئے ایک اور صاحب

کو ایڈیٹر بنایا اور ۱۹۴۳ء میں "کشمیر سنسار" ہفتہ وار نکالا۔ اخبار مقبول بھی ہوا جس کی وجہ سے ایڈیٹر میں اور ان میں اخبار کی ملکیت کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ تو خود انہوں نے ایک نیا اخبار "پکار" ۱۹۴۴ء میں جاری کیا۔ جسے وہ خود مرتب کرتے تھے۔ اس اخبار کا ایک حصّہ ادبی بھی ہوتا تھا۔ جس کے لئے وہ خود اور اثر لکھنوی، قیس شیروانی، صاحب زادہ محمد عمر اور دوسرے ادیب لکھا کرتے تھے۔

کالج میں تعلیم کے دوران پوری کے سپرد کالج کے رسالے "ولر" کی ادارت بھی رہی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ نیشنل کانفرنس کے سرگرم رُکن بن گئے۔ لیکن ۱۹۵۱ء میں نیشنل کانفرنس سے علیحدہ ہو گئے۔ اور اگلے سال پرجا سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو کر، اس کی ریاستی شاخ منظم کی۔ اسٹیٹس پیوپلز کانفرنس[1] کی سٹیرنگ کمیٹی کے بھی وہ رُکن رہے اور ۱۹۶۷ء میں جموں اٹانومی فورم کے نام سے ایک سیاسی تنظیم قایم کی، جو اب بھی موجود ہے۔

پوری کی ادبی دلچسپیاں ابتداء سے تھیں۔ وہ بزم اُردو کے رُکن رہے اور ۱۹۴۷ء میں جب ڈوگری سنستھا قایم ہوئی تو وہ اس کے رُکن منتخب ہوئے۔ اپنے اخبار کے علاوہ، وہ دوسرے مقامی اور باہر کے اخباروں میں مضامین لکھتے رہے۔ مضامین کا مجموعہ "گلدستہ مضامین" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ جس میں ادبی، سماجی، سیاسی اور معاشی موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔ ان کی ایک اور دلچسپ اور مفید کتاب "سائینس دانوں کی کہانی" ہے جو عنقریب شایع ہو سکے گی۔ ایک دو مختصر کتابیں یا رسالے بھی انہوں نے لکھے ہیں۔ جن میں "نئے بھارت کی تعمیر کا نقشہ" اور "ترقی کی حقیقت" چھپ چکے ہیں۔

"شمشیر" سردار رگھبیر سنگھ ٹکٹ نکالتے تھے۔

---

[1] یہ دراصل اسٹیٹ پیوپلز کونشن ہونا چاہیئے۔ جو شیخ محمد عبداللہ نے سرینگر میں طلب کیا تھا۔

لالہ ملک راج صراف نے اپنی تصنیف "ففٹی ایرز ایز اے جرنلسٹ" میں، اُس زمانے کے جموں کے اخباروں کا ذکر کرتے ہوئے، ان کی تعداد تین درجن کے قریب بتائی ہے۔ جموں کے اخباروں کی اس کثیر تعداد کے علاوہ، جموں کے ملحقہ علاقوں جیسے پونچھ اور میرپور سے بھی، اس زمانے میں اخبار نکلنے لگے تھے۔ پونچھ کا مردم خیز علاقہ ریاست اور خاص طور پر جموں میں شعر و ادب کا ذوق پھیلنے کے ساتھ ہی انشاء پردازوں اور خوش فکر شعراء کی افزائش کا مرکز بن گیا تھا۔ چنانچہ چراغ حسن حسرت، سردن ناتھ آفتاب اور کئی سخن سنج اور انشاپرداز یہاں سے اُٹھے۔

پونچھ میں صحافت کی ابتدائی کوششیں، دیانند کپور سے شروع ہوئیں۔ جو چراغ حسن کے گہرے دوست تھے۔ انہوں نے ایک ہفتہ وار "پربھات" کے نام سے جاری کیا تھا۔ جس میں خود ان کے علاوہ حسرت اور اس زمانے کے مشہور لکھنے والے قلمی طور پر ہاتھ بٹاتے تھے۔

منشی سراج الدین اس زمانے کے مشہور صحیفہ نگاروں میں سے تھے، وہ "پاسبان" نکالتے تھے۔ اور اس زمانے کے دوسرے اخباروں میں بھی لکھتے تھے۔ ان کا ایک اچھا مضمون ہے "مذہب نہیں سکھاتا، آپس میں بیر رکھنا" جو ان کے اخبار میں شایع ہوا تھا۔ اس کا ایک اقتباس ذیل میں درج ہے:

"کاش انسان، ساز فطرت پر چھیڑے ہوئے نغموں کو لئے اور ان نغموں کے اندر جو درس پایا جاتا ہے، ان کی ماہیت کو سمجھے تو پھر بتلائے کہ مذہب جس منزل کی طرف لے جاتا ہے، جس ہستی کے نام کا وظیفہ پڑھنے کا حکم دیتا ہے اور جس ابدی خوشی کو منانے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہاں دشمنی کے لئے کسی گوشے میں بھی جگہ ہے۔"

اس میں عام دلچسپی کی خبروں اور تبصروں کے علاوہ، خاص طور پر مسلمانوں سکھوں اور ہندوؤں کے مفاد کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ پونچھ کے مزید اخباروں کے نام یہ ہیں: "صادق" "المجاہد" "آفتاب" "رہبر"۔ "صادق" ضیاء الحسن ضیائی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اور زیادہ تر مسلمانوں کے مفادات سے تعلق رکھتا تھا۔ یہی صورت "المجاہد" کی بھی ہے، جو ۱۹۳۳ء میں شیخ نبی بخش نظامی کی ادارت میں شائع ہونے لگا تھا۔ کچھ عرصہ جاری رہنے کے بعد یہ دونوں اخبار بند ہوگئے۔ 'آفتاب' سرون ناتھ آفتاب کا اخبار تھا جس کی اشاعت ۱۹۴۷ء سے عمل میں آنے لگی تھی۔

میرپور سے نکلنے والے اخباروں میں "صداقت" "ہمت" اور "سچ" بہت اہم رہیں۔ "ہمت" لالہ گیان چند کا اخبار تھا۔ جو اس صدی کے تیسرے دہے میں جاری کیا گیا تھا اور ۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔ اس کا مقصد ہندوؤں کے مفاد کی نگہداشت تھی۔ "ہمت" میرپور کے مشہور فدائے قوم راجہ محمد اکبر خان نے جاری کیا تھا۔ راجہ ریاستی مسلم کانفرنس کے سرگرم کارکن اور قائد تھے۔ اور ابتداء میں مسلم مفادات کی خاطر لڑتے رہے۔ ان کے خلوص اور ان کی لگن کا یہ عالم تھا کہ وہ میرپور سے پاپیادہ سفر کرتے ہوئے سری نگر آتے تھے۔ اور راستہ بھر تنظیم کے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ حکومت کے احکام سے جب یہ اخبار بند ہوگیا تو انہوں نے "سچ" جاری کیا تھا۔ جو "ہمت" کی طرح ہفتہ وار تھا۔ "سچ" ۱۹۴۰ء میں جاری ہوا تھا۔ لیکن جب مسلم کانفرنس، نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہوگئی، تو راجہ محمد اکبر خان قوم پرست لیڈر بن گئے۔ اور شیخ محمد عبداللہ کے دوش بدوش آزادی کی جدوجہد کے لئے کام کیا۔ ابتداء میں وہ فوج میں ملازم تھے، لیکن قومی خدمت کے جذبے نے ان سے ملازمت ترک کرائی اور وہ سیاست میں حصّہ لینے

لگے۔ راجہ فیض بیان مقرر بھی تھے۔ چنانچہ ان کی تقریروں کی اثر آفرینی کے بارے میں صدرالدین مجاہد لکھتے ہیں کہ ــــــ " وہ بہترین مقرر تھے، ان کی تقریروں میں جادو کا اثر تھا (محاذ" سری نگر، شمارہ اول)۔ ڈوگرا مطلق العنانی کے خلاف ان کی سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں انہیں کئی بار قید و بند میں رہنا پڑا۔

" سچ " بہت صاف ستھرا اخبار تھا جس میں ملکی خبروں کے علاوہ خبروں پر تبصرے بھی شایع ہوتے تھے۔ قومی نقطۂ نظر سے وہ ترقی پسند اصول حکومت اور سماجی اصلاح کے تصورات کا وکیل تھا۔ ۴ جنوری ۱۹۵۲ء کے اخبار میں اس کی پالیسی کا اعادہ اس طرح کیا گیا ہے:۔

" سچ " مطلق العنان حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے، جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنے، غریب اور نادار عوام کو سرمایہ داروں کے چنگل سے آزاد کرنے، تباہ کُن بد رسوم کو ملک سے مٹانے، فرقہ پرستی کو ختم کرنے اور نیشنل کانفرنس کا اتحاد اور پریم بھرا پیام عوام تک پہنچانے کے لئے میدان میں آیا۔"

راجہ محمد اکبر خان کے انتقال کے بعد اس کی ترتیب اور اشاعت کا کام ماسٹر روشن لال نے سنبھالا اور اب تک یہ اخبار جاری ہے اور روزانہ کر دیا گیا ہے۔ " سچ " نیشنل کانفرنس کے ترجمان کی حیثیت سے شایع ہو رہا ہے۔

سری نگر میں صحافتی جدوجہد کا عملاً آغاز ۱۹۳۲ء سے ہوا۔ جب پریم ناتھ بزاز نے اپنا اخبار " وِتستا " ہفتہ وار جاری کیا۔ سری نگر اور عام طور پر کشمیر میں صحافتی اور انشا پردازی کا شوق پیدا کرنے میں اس اخبار کو وہی اہمیت حاصل ہے جو جموں اور اس پاس کے علاقوں میں " رنبیر " کو حاصل رہی۔ یہ اخبار آزاد پالیسی کا حامل تھا، اس لئے اسے حکومت کے حکم سے کچھ عرصہ بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد بزاز نے

ایک اور اخبار "ہمدرد" کے نام سے جاری کیا۔ اس طرح بزاز کشمیر کے لئے بابائے صحافت کا مقام رکھتے ہیں۔

بزاز کی ولادت ۱۹۰۵ء؁ میں سری نگر کے ایک برہمن خاندان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سری نگر میں حاصل کی، پھر پنجاب سے ۱۹۲۷ء؁ میں بی اے کامیاب کیا۔ اس کے بعد سے وہ عوامی زندگی میں حصہ لینے لگے۔ پہلے وہ سری نگر کے ایک گرلز اسکول کے سوپر وائزر رہے۔ ۱۹۳۱ء میں جب حکومت کی جانب سے عوام کی شکایات کی تفتیش کے لئے کمیشن مقرر ہوا، تو بزاز اس کے رکن بنائے گئے۔ اور دستوری اصلاحات کمیشن کے بھی وہ رکن رہے۔ ۱۹۳۲ء؁ میں انہوں نے صحافت میں قدم رکھا اور اپنا روزنامہ "وِتستا" جاری کیا، جس کا مقصد سیاست میں غیر مذہبیت اور آزادی اور جمہوریت کے تصورات کی اشاعت تھی۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے ایک ہفتہ وار "ہمدرد" کے نام سے بھی جاری کیا تھا۔ کشمیر میں آزادی کی جدوجہد کی صف اول کے قائدین میں ان کا مقام ہے۔ چنانچہ اسی کی پاداش میں ۱۹۳۸ء میں وہ گرفتار ہوئے اور چھ ماہ بعد رہا کئے گئے۔ ۱۹۴۰ء میں وہ دوبارہ قید ہوئے اور اس دفعہ تین سال بعد رہا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء؁ میں وہ کشمیر میں خارج البلد بھی کئے گئے۔

بزاز سیاسی میدان میں عرصہ تک شیخ محمد عبداللہ کے دوش بدوش کام کرتے رہے اور سیکولرازم، جمہوریت اور آزادی کا پرچار کرتے رہے۔ بزاز کا تعلق ایم۔ این رائے کی ریاڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی سے بھی رہا، غرض کشمیر کی سیاست میں وہ بہت سے ہچکولے کھاتے رہے، یہاں تک کہ اب ان کے صحیح سیاسی عقائد کا اندازہ لگانا دشوار ہوگیا ہے۔

"وِتستا" چار پانچ سال جاری رہنے کے بعد سیاسی اسباب پر بند

لے۔ بزاز کے والد دراصل سُنبل (سوناواری) کے رہنے والے تھے (ٹینگ)

کر دیا گیا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے تو بزاز نے "ہمدرد" کے نام سے ایک اور ہفتہ وار جاری کیا۔ جس کے حلقۂ ادارت میں پنڈت نند لال واتل، پرتھوی ناتھ کول اور پیتمبر ناتھ فانی بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ بزاز کی سیاسی زندگی کی طرح، ان کے مشاغل بھی متنوع رہے۔ جب کبھی قید بھی ہوئے، قید سے چھوٹنے کے بعد نئے عزائم کے ساتھ میدانِ سیاست میں آتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں جب انہیں کشمیر سے خارج البلد کیا گیا تو وہ دہلی میں مقیم رہے اور وہاں سے "وائس آف کشمیر" کے نام سے ایک ماہنامہ انگریزی میں جاری کیا تھا۔ ۱۹۴۲ء کے بعد "وتستا" جب دوسری بار نکلنے لگا تو کچھ عرصہ بعد انہوں نے اسے ہندی میں منتقل کر دیا۔ "ہمدرد" کے ایڈیٹر ۱۹۴۷ء میں پنڈت جگن ناتھ سنتھو تھے۔

بزاز انگریزی اور اردو میں کئی مستقل تصانیف اور رسالوں کے مصنف ہیں۔ انگریزی تصانیف "تذکرہ حصہ انگریزی" میں آیا ہے۔ ان کی مستقل اردو تصانیف میں "کشمیر کا گاندھی" جو شیخ محمد عبداللہ کی سوانح حیات ہے ــــ "شاعر انسانیت" کشمیری کے مشہور شاعر عبدالاحد آزاد کے حالات اور کلام پر تبصرہ اور "گاندھی ازم، جناح ازم اور سوشلزم" وقتی مسایل کی تصانیف سے کچھ زیادہ اہمیت ہی رکھتی ہیں۔ ان کے جاری کردہ اخباروں میں تو ان کی تحریروں کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔ لیکن اپنے اخباروں سے ہٹ کر بھی وہ مضمون لکھتے رہے۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۴۰ء کے شمارہ "مارتنڈ" میں انہوں نے "قومی زبان اور اس کا رسم خط" کے عنوان سے ایک خیال آفریں مضمون شایع کیا تھا۔ اس کے ایک ذیلی عنوان "ہندو لیڈر کیا کہتے ہیں" کے تحت انہوں نے دیوناگری رسم خط کی اہمیت کے بارے میں جو خیالات ظاہر کئے تھے اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

"یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو لڑکے اردو زبان اور فارسی رسم خط

کو پسند کرتے ہیں اور حکومت نے ان کی مرضی کے خلاف ہندو لیڈروں کو خوش کرنے کے لئے، ایسا کیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو وقت بتلا دے گا، کوئی لڑکا دیوناگری رسم خط پڑھنے کی خواہش ظاہر نہ کرے گا یا ان کی تعداد بہت کم ہوگی اور پندرہ فی صد کی شرط کو پورا نہ کرے گی۔ حکومت مجبور ہوگی کہ اپنے احکام واپس لے، ورنہ احکام خود ہی مرجائیں گے۔ لیکن اس کے لئے بھی ضروری تھا کہ مسلمان اس مسئلے کو زیادہ اہمیت نہ دیتے۔ کیونکہ اب تو یہ حالت ہوجائے گی کہ فرقہ پرست ہندو لیڈروں کو اپنے پرسٹیج کی خاطر زبردست پروپاگنڈا کرنا پڑے گا۔ ......"

مولانا محمد سعید مسعودی وادی کے ایک اور جادو نگار اہل صحافت میں سے ہیں، جو اپنی لسانی اور تحریری صلاحیتوں کے بل بوتے پر، آزادی خواہوں کی صف اول میں پہنچ گئے۔ "ہمدرد" "صداقت" "حقیقت" "خدمت" غرض کئی اخباروں سے ان کا علانیہ یا درپردہ واسطہ رہا۔ اور جس اخبار سے ان کا قلم چھوٹ گیا، وہ اس کے لئے جادو کی چھڑی ثابت ہوا۔

مولانا، کشمیر کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے والد زمیندار اور پیر بھی تھے۔ فارسی کے اچھے عالم تھے، مولانا کی ولادت ۱۹۱۳ء[1] میں مظفر آباد میں ہوئی، ابتدائی فارسی تعلیم، والد کے یہاں پائی۔ والدہ کا خاندان عربی سے لگاؤ رکھتا تھا اور خود بھی وہ عربی اچھی جانتی تھیں۔ انہیں سے مولانا نے عربی پڑھی، اس کے بعد لاہور گئے۔ اور اورینٹل کالج میں داخل ہوئے، جہاں سے مولوی فاضل کامیاب کیا اور بعد میں مولانا احمد علی سے تفسیر اور حدیث کا درس لیا۔

---

[1] ملحوظہ: مولانا کا صحیح بیان ولادت ۱۹۱۰ء ہے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مظفر آباد ہائی سکول میں فارسی کے اُستاد مقرر ہو گئے۔ کشمیر میں دینہ داری ہائی اسکول میں دہ درس دیتے رہے۔ جموں کے پرنس آف ویلز کالج میں ایک سال لیکچرار کی خدمت انجام دی۔ اور ایس۔پی۔ کالج میں بھی ایک سال درس دیتے رہے۔

سیاست سے دلچسپی کی بدولت، انہیں ملازمت سے دست کش ہونا پڑا۔ تاہم ان کے علمی ربط اس طرح قائم رہے کہ پہلے وہ مسلم کانفرنس کے ترجمان "صداقت" کے در پردہ ایڈیٹر رہے۔ مولوی عبدالرحیم اس کے ایڈیٹر تھے ۱۹۳۹ء میں جب "ہمدرد" نیشنل کانفرنس کا ترجمان قرار پایا، تو مولانا مسعودی نے اس کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ مرزا غلام حسن بیگ عارف[1] کی شرکت میں "خدمت" جاری کیا۔ جو عرصہ تک نیشنل کانفرنس کا ترجمان رہا اور اب نیشنل کانگریس کے ترجمان کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ کشیپ بندھو نے "مارتنڈ" اسی زمانے میں جاری کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور اچھے اہلِ قلم علامہ حسین میر کاشمیری امرتسری "اسلام" بھی نکال رہے تھے۔

مولانا مسعودی جب اپنے نام سے نہیں لکھتے تھے، اپنا قلمی نام "رجلِ لیلیٰ" اختیار کیا تھا۔ چنانچہ ان کے بہت سے اچھے مضامین اسی نام سے شایع ہوئے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان، ان کی قلمی اور تقریری صلاحیتوں کی وجہ سے ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ شعر کہنے کا شوق بچپن سے تھا لیکن کلام کبھی اکٹھا نہیں کیا۔ فارسی میں غزلیں کہی ہیں اور اچھی کہی ہیں لیکن کچھ سرمایہ اپنے پاس محفوظ نہیں رکھا۔ کچھ غزلیں جو سری پرتاپ کالج کی لیکچرار کے زمانے میں "پرتاپ" میں شایع ہوئی تھیں، وہ اب دستیاب نہیں ہوتیں۔ کیونکہ ان کے ابتدائی

---

[1] سردری صاحب سے چوک ہوئی ہے۔ یہ عارف در اصل غلام رسول عارف تھے۔

شمارے محفوظ نہیں ہیں۔ ایک آدھ مصرعہ جو میرزا عارف نے مجھے سنایا تھا وہ ہے:

"کہ از خاک سید بنگر گریباں چاک می آید"

مولانا مسعودی عرصہ تک نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔ اسی تعلق سے انہوں نے نئے کشمیر کے آئین اور میرزا افضل بیگ کے مصنف رسالے زرعی اصلاحات کو شایع کیا۔ نیشنل کانفرنس کے اجلاس بارہمولہ کے موقع پر شیخ محمد عبداللہ کی فرمائش پر، مولانا نے کشمیری کا قومی ترانہ، جھنڈے کے گیت کے طور پر لکھا تھا۔ یہ ترانہ حسب ذیل ہے:

لہرا، اے کشمیر کے جھنڈے　　طفل و جوان و پیر کے جھنڈے

بازوئے بے شمشیر کے جھنڈے　　ہل والے　دلگیر کے جھنڈے

ہر سو لہرا، ہر دم لہرا

تا بہ قیامت پیہم لہرا

لہرا، اے کشمیر کے جھنڈے　　لہرا، اے کشمیر کے جھنڈے

میدان اور جبل پر لہرا

دشت پر لہرا، ڈل پر لہرا

کٹیا اور محل پر لہرا

خشکی اور جل تھل پر لہرا

ہر سو لہرا، ہر دم لہرا　　تا بہ قیامت پیہم لہرا

لہرا، اے کشمیر کے جھنڈے

تو ہے ہماری آنکھ کا تارا

مظلوموں کے دل کا سہارا

رنگ ترا ہے لال دلارا

ہل ہے جس پر پیارا پیارا

ہر سو لہرا، ہر دم لہرا تا بہ قیامت، پیہم لہرا

لہرا، اے کشمیر کے جھنڈے

یہ گیت "گلریز جا کشیر" کے مجموعہ میں شامل ہے، جسے پیر عبدالاحد شاہ، صدر قومی کلچرل محاذ نے ۱۹۹۳ء میں اپنے مختصر تعارف کے ساتھ شایع کیا ہے۔ پیر عبدالاحد کا آزادی کی جدوجہد میں نمایاں حصہ رہا ہے۔ قومی کلچرل محاذ کے دوسرے سرگرم کارکنوں میں شوداں سنگھ چوہان اور غلام رسول رینزو بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جو محاذ کے آرگنائزنگ سیکرٹری تھے۔

ان کے ہم عصر اہلِ صحافت میں پنڈت کشیپ بندھو، میر غلام محمد کشفی، میر عبدالعزیز، محمد ایوب صابر، پیر مبارک شاہ، پیر عبدالواحد اور پنڈت نند لال واتل قابلِ ذکر ہیں۔

پنڈت کشیپ بندھو نے جو کشمیر کے قدیم اہلِ صحافت میں اپنی رنگارنگ شخصیت کی وجہ سے نمایاں رہے، کئی اہم اخباروں کی ادارت کے فرائض انجام دیئے اور ادب کی بھی خدمت کی۔ ان کا پہلا نام تارا چند تھا۔ لیکن کشیپ بندھو کے قلمی نام سے زیادہ متعارف ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۰۰ء میں قصبہ گیرو (نور پورہ) میں ہوئی۔ گیرو میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سری نگر میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۹ء میں انٹرنس کا امتحان کامیاب کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ لاہور گئے۔ جہاں وہ برہمو ودیالیہ میں چار سال زیرِ تعلیم رہے اور سنسکرت اور ہندی کے امتحانات کامیاب کئے۔ وطن لوٹ کر وہ، محکمۂ بندوبست اراضی میں شجرہ کش کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ لیکن یہ ملازمت جلد ہی ترک کردی اور پھر لاہور جاکر ملازمت کی اور بعد میں کوئٹہ، بلوچستان گئے اور تار کے محکمہ

میں ملازم ہوئے۔ اس دوران ان کے سیاسی رجحانات بیدار ہوئے اور کانگریس کی عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو کر ملازمت ترک کر دی۔ کشمیری مزدور بورڈ منظم کیا، جس کے وہ سیکرٹری بھی رہے۔ پنڈت موتی لال نہرو نے بھی اس بورڈ کے لدھیانہ کے اس اجلاس میں شرکت کی اور تقریر بھی کی۔ اس بورڈ کے پلاٹ فارم سے پہلی دفعہ "کشمیر کشمیریوں کے لئے" کا نعرہ بلند ہوا۔

لاہور میں صحافت سے انہیں عملی تعلق پیدا ہوا۔ اور "اخبارِ عام" "اخبارِ کشمیری" اور "بہارِ کشمیر" کے حلقۂ ادارت میں شامل رہے۔ اور "آریہ گزٹ" کی ادارت بھی کی۔ ۱۹۳۱ء میں جب کشمیر میں اخبارات کے اجراء کی آزادی مل چکی تھی کشمیر لوٹے اور "سناتن یوک سبھا" قائم کی اور روزنامہ "مارتنڈ" جاری کیا۔ جو پچھلے سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ مسلم کانفرنس کی نیشنل کانفرنس میں تبدیلی کے بعد، وہ نیشنل کانفرنس کے سرگرم کارکن بن گئے۔ آزادی کے حصول کے بعد، جب عوامی حکومت قائم ہوئی، تو پنڈت کشیپ بندھو دیہات کے محکموں کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے بعد وہ بھی جیل بھیجے گئے۔ اور ۱۹۵۸ء میں دوبارہ گرفتار ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں رہا ہوئے۔ اس وقت گیبرو میں مقیم ہیں اور حصولِ علم کے ذوق کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

کشیپ بندھو شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتے ہیں اور بلبل تخلص کرتے ہیں۔ پہلے کشمیری میں کہنے کی کوشش کی، لیکن بعد میں اردو میں کہنے لگے۔ اور پروفیسر ننداں لال طالب سے مشورہ بھی کرتے رہے۔ کچھ عرصہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کو بھی کلام دکھایا۔ ۱۹۲۱ء میں جب وہ کوئٹہ میں مقیم تھے۔ انہیں بلوچستان کی ندی لورا پر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ لورا کو دیکھ کر، کشمیر کے ایک سچے دلدادہ فرزند کی طرح انہیں اپنی وِتستا کی یاد آگئی اور ایک نظم کی صورت میں ان کے جذبات

ہوئے ہیں۔ یہ نظم "مارتنڈ" کے شمارہ مارچ ۱۹۳۵ء میں ان کے ایک نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ نوٹ اور نظم کا ایک بند ذیل میں درج ہے :

"آج سے تقریباً چودہ سال پہلے، چند دوستوں کے اصرار پر مجھے کوئیٹہ بلوچستان کی ایک چھوٹی سی ندی، لورا کے کنارے پر جانے کا اتفاق ہوا، وہاں مجھے اپنی وِتستا یاد آگئی"۔۔

اے آبِ رودِ لورا، اتنی ہو مہربانی

جب سندھ، بہہ کے آئے جہلم سے تجھ میں پانی
میری طرف سے اس کو چھاتی سے تو لگانا

رو رو کے اس کو میری پھر داستاں سُنانا
کہنا، اُسے خدارا، اے آبِ رودِ جہلم

شیدا ہے دور تیرا، غربت میں تجھ سے چھُٹ کر
گودی میں جس کو تو نے پالا تھا مثلِ مادر
وہ دُکھ اُٹھا رہا ہے، غربت میں تجھ سے چھُٹ کر

نظم کے کُل چھ بند ہیں۔ آخری شعر ہے :

بلبل، نہ یہ وصیت، احباب بھول جائیں
گنگا کے بدلے میرے، جہلم میں پھول جائیں

کشیپ بندھو اپنے زمانے کے اچھے مزاح نگار بھی رہے۔ جس کی کچھ تفصیل نیچے آرہی ہے۔ ان کی بعض غزلوں میں بھی مزاح کا رنگ جھلک جاتا ہے۔ ایک غزل جو "گلشن بلتستان کے بُلبُل" کے توصیفی نام کے ساتھ "مارتنڈ" میں شایع ہوئی تھی۔ اس کے کچھ شعر ہیں :

مری تقدیر بھی اُلٹی، مری تدبیر بھی اُلٹی
کسی محبوب کی ترچھی نگاہیں یاد آتی ہیں

ہوئی ہیں راہیِ ملکِ عدم میری تمنائیں
مجھے ان بے کسوں کی خوابگاہیں یاد آتی ہیں

رگوں میں خون جم جاتا ہے بلبل ہار ُ ساون ہیں
جب اقلیمِ محبت کی ادائیں یاد آتی ہیں

ایک اور غزل "میں کون ہوں" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ جس کے دو شعر ہیں :-

ہے کوئی اس شوق دید کی حد کہ تیرے چہرہ پہ او ستمگر
پڑے ہیں چیچک کے داغ جتنے، نگاہیں اتنی گڑھا چکا ہوں

اُٹھاؤں کیوں کر نہ ان کے نخرے، نہ کھاؤں کیوں لات ان کے گھونسے
جتا کے اُلفت، بڑھا کے ہمت، خود اپنی لُٹیا ڈبا چکا ہوں

کشیپ بندھو کی چند اچھی نظمیں "سواستکا" کے مختلف شماروں میں شائع ہوئی تھیں، جن میں "برق و شرار" اور "نالۂ نیم شب" اچھی نظمیں ہیں۔ اول الذکر ایک طویل نظم ہے، جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے :

میں تخم اشک خونیں بوتا ہوں اس زمیں میں
شعر و سخن کی وادی تو لالہ زار بن جا

میری شکستہ پائی ہے، منتظر خلش کی
اے شاہ راہِ اُلفت، تو خار زار بن جا

شاید معاف کر دے، وہ کردگار خوبی
اے مجرمِ محبت، تو اشکبار بن جا

نغموں سے بھولتا ہوں، دنیا کے رنج و غم میں

اے بلبلِ خوش الحان، پھر نغمہ یار بن جا

"نالہ نیم شب" کے بھی کچھ شعر یہاں منقول ہیں:

میری نوائے غم کو صوتِ ہزار کر دے

مرغِ خزاں کو یارب مرغِ بہار کر دے

بیتابیِ جگر ہو اک لالہ زار سوزش

دِل کو عطا مسلسل اک خلفشار کر دے

اے برقِ حسن، اگرچہ صبر و قرار پر تو

پھر یادِ یار مجھ کو تو بے قرار کر دے

"مارتنڈ" کے علاوہ بھی کشیپ بندھو کئی اخباروں کے بانی اور مدیر رہے۔ "دیش" اور "کیسری" ان کے مشہور اخبار ہیں۔ ایک اور اخبار "سماج سُدھار" بھی انہوں نے جاری کیا تھا۔ "مارتنڈ" کے مزاحیہ اور ذکاہیہ کالم کے وہ مالک تھے۔ اور علامہ مجہول کے فرضی نام سے "چلنت" اور "پاگل کی ڈائری" کے عنوانوں کے تحت لکھا کرتے تھے۔ "چلنت" میں انہوں نے اپنے بعض معاصرین کے چہرے بھی لکھے ہیں۔ ایم۔ اے۔ صابری جو چہرہ انہوں نے لکھا تھا۔ اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے :-

"ہمارے ملک میں ایم۔ اے تو بہت موجود ہیں، لیکن جو امتیاز ہمارے محترم دوست، صابر کو حاصل ہے، شاید کسی اور ایم۔ اے کو حاصل نہیں۔ ۔ ۔۔۔۔۔ شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ صابر صاحب کے ایم۔ اے کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر ایک ایم۔ اے پاس شخص کے پیچھے ایم۔ اے کے حروف لکھے جاتے ہیں۔ لیکن

صابر صاحب کے اسمِ گرامی کے پہلے یہ حروف درج ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

جہاں انہوں نے اپنے معاصرین کو اپنے قلم کا تختۂ مشق بنایا۔ وہ خود بھی اپنے ہمعصر "علامہ صدیقی ساہنوی کے کالم" اراکینِ محفلِ ادب" کا موضوع بنے۔ اس کا ذیل کا اقتباس، ان کی پہلودار شخصیت کو سمجھنے میں کسی قدر مدد دے سکتا ہے۔

"آیئے۔ پدھاریئے، جے ہو آپ کی۔

سنایئے، کیسے ہیں آپ، بہت خوش! ابھی آپ کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک بزرگ کی زبانی سنا ہے کہ آپ کا اصلی نام تارا چند ہے اور تخلص بسمل، تعلیم پانے کے بعد آپ چند سال محکمۂ بندوبست میں بھی ملازم رہے۔

"کشمیر سے ہجرت اختیار کی، آریہ ودیارتھی کلاس میں کچھ عرصہ تک ودیارتھی کی حیثیت میں رہے۔ کوئیٹہ جاکر طائرانہ پر و بال نکالے۔ "آریہ گزٹ" کی ایڈیٹری کے دوران تحریر میں مشق بہم پہنچائی اور معاش کی سبیل لگالی۔ سر ننگے، ہاتھ میں ڈنڈا، پیروں میں کھڑاؤں، کشمیریوں نے جو مدت کے بعد آپ کو نئے رنگ میں دیکھا تو بڑے تپاک سے آؤبھگت کی۔ ۔ ۔ ۔

مولانا علائی کی رائے میں یہ تین چیزیں آپ کی باندیاں ہیں، ایک قلم، دوسری زبان، تیسری طاقتِ رفتار، مزاح نگاری میں آپ کشمیر کے پطرس ہیں، اب سنا ہے کہ بچپن میں جو شاعری کا شوق دامنگیر تھا، دوبارہ عود کر آیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ایم۔ اے۔ صابر جن کا ابھی کشیپ بندھو کے قلم سے تعارف ہوا۔ ۱۹۳۵ء سے "البرق" ہفتہ میں دو بار نکالتے تھے جو ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ ان کا پورا نام محمد ایوب

اور تخلص صابر تھا۔ اس خاندان میں علم و ادب اور صحافت کا ذوق ہمیشہ رہا۔ ان کے والد مولوی عبداللہ کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ صابر "آئینہ" ہفت روزہ سری نگر کے ایڈیٹر شمیم احمد شمیم کے چچا ہوتے ہیں۔ پیر مبارک شاہ "البرق" کے مدیر معاون کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اور "حقیقت" کے محض نام کے لئے ایڈیٹر بھی رہے۔

میر غلام محمد کشفی، صاحب ذوق ادیب اور عالم ہیں۔ بانڈی پور کے قریب گاؤں ونرگام ان کا وطن ہے۔ ابتداء میں، وہ کشمیر کے محکمۂ تعلیم میں ملازم تھے لیکن اس دوران بھی ان کی قلمی صلاحیتیں روبکار آنے لگی تھیں۔ چنانچہ جب "خدمت" کے لئے مدیر کی تلاش ہوئی تو نظر انتخاب ان پر پڑی اور وہ سکول کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اس روزنامہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اس اخبار میں "انکشافات" ان کا خاص مزاحیہ کالم ہوتا تھا۔ جس کے مشتملات خاص اثر کے مالک ہوتے تھے۔ آزادی کے بعد، کچھ اختلافات کے باعث وہ پاکستان چلے گئے۔ اور وہاں آزاد کشمیر ریڈیو سے وابستہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی خدمات بھی جاری ہیں، چنانچہ کشمیری ادب کے بارے میں انہوں نے دو تصانیف لکھی ہیں "کشمیری شعر و شاعری کے دور" کافی ضخیم کتاب ہے۔ "کشمیری زبان اور ادب" کے عنوان سے ان کا ایک معلومات آفرین مضمون "ادبی دنیا" لاہور" کے کشمیر نمبر (۱۹۶۶ء) میں شایع ہوا ہے۔ اسی شمارہ میں ان کا ایک اور مضمون "کشمیر — اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ" کے عنوان سے لکھا ہوا بھی شامل ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف "کشمیر ہمارا ہے" بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ اس وقت وہ "ہماری آواز" بھی نکال رہے ہیں۔

احمد شمیم بھی صحافت سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ ثناء اللہ بٹ مدیر "آفتاب" (سری نگر) نے اپنے پاکستان میں قیام کے زمانے میں حکومت کی جانب سے راولپنڈی

سے "کشمیر" نام سے جو اخبار جاری کیا تھا اس کے معاون مدیر رہے۔ بڑے سلجھے ہوئے مذاق کے ادیب اور تنقید نگار ہیں۔ اس وقت پاکستان کی حکومت کے جاری کیے اخبار "آزاد کشمیر نیوز" کے ایڈیٹر ہیں۔[لہ] میر عبدالعزیز

میر عبدالعزیز، سری نگر سے ہفت روزہ "روشنی" نکالتے تھے۔ انہیں کی ادارت میں ایک اور ہفت روزہ "جوہر" اور ایک ہفتہ وار "ملت" بھی نکلتا رہا۔ میر بھی اب پاکستان میں ہیں۔ وہاں راولپنڈی سے ایک ہفتہ وار "آوازِ حق" جاری کیا تھا، جو حکومت کے احکام کے تحت بند کر دیا گیا۔ اور اب "انصاف" کے نام سے ایک اور ہفتہ وار نکال رہے ہیں۔ چودھری عبدالواحد ایک اور صاحبِ قلم، سری نگر سے "اصلاح" کے نام سے ہفتہ وار اخبار نکالتے تھے۔ یہ جماعت احمدیہ کا ترجمان تھا۔ اور میرزا بشیر الدین احمد محمود اس کے بانی تھے۔ بعد میں عبدالغفار ڈار شوپیانی اسے نکالتے رہے، جو اس وقت پاکستان چلے گئے ہیں۔

چودھری عبدالواحد کا خاندان کشمیر سے میاں والی منتقل ہو گیا تھا لیکن وہ خود سری نگر میں رہتے تھے۔ اور خواجہ کمال الدین مبلغ اسلام کے ہمراہ انہوں نے انگلستان سماٹرا، جاوا وغیرہ کے دورے بھی کیے تھے۔ "اصلاح" کے کاتب عبدالرحمٰن جامی انشاپرداز تھے اور اصلاح میں "جامِ جہاں نما" کے عنوان سے لکھتے تھے۔

دینا ناتھ چکن مست، جن کا تذکرہ لکھا جا چکا ہے، صحافت سے بھی متعلق رہے۔ چنانچہ سری نگر سے ہفت روزہ اخبار "جوہر" نکالتے تھے۔ اور بعد میں ایک اور ہفت وار "سنسار" کے نام سے بھی جاری کیا تھا، جو کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔ مست نے غلام محی الدین کے روزنامہ "رہبر" کے ہفتہ وار میں تبدیل ہونے کے، اس کے مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ حفیظ اللہ جالب اور نورالدین اختر بھی کشمیر میں صحافت کے سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں اب پاکستان میں مقیم ہیں۔

لہ۔ احمد شمیم ۱۹۸۲ء میں غریب الوطنی میں انتقال کر گئے۔

اور راولپنڈی سے ایک ہفتہ وار "آغاز" نکال رہے ہیں۔ محمد الدین فوق کا "کشمیر جدید" سری نگر سے ۱۹۳۳ء میں جاری ہوا تھا، جو کچھ عرصہ بند ہو گیا۔ ۱۹۳۳ء میں بزاز کے "ہمدرد" کے علاوہ "اسلام" "روزنامہ کشمیر جدید" روز "رہبر" جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اور "ہدایت" "خالد" اور "صداقت" جاری ہوئے۔ "اسلام" میرواعظ مولوی محمد یوسف شاہ نے جاری کیا تھا۔ اور محمد امین اس کے مدیر تھے۔ یہ اخبار میرواعظ کی جماعت کا ترجمان تھا اور مسلمانوں کی سماجی اور معاشی اصلاح اور ترقی اس کے مقاصد تھے۔ میرواعظ ہی کی جانب سے ایک اور ہفتہ وار "حریت" بھی جاری ہوا تھا۔

ہفت روزہ "ہدایت" بھی اسی زمانے میں میرواعظ ہمدانی کی ادارت میں نکلنے لگا تھا۔ "خالد" کے ایڈیٹر صدرالدین مجاہد تھے۔ یہ اخبار نیشنل کانفرنس کا ترجمان تھا۔ اس سے ایک سال پہلے یعنی ۱۹۳۲ء میں مجاہد نے ایک ہفتہ وار "بیکار" کے نام سے جاری کیا تھا۔ یہ سال بھر کے اندر بند کر دیا گیا اور مجاہد نے دوسرا ہفتہ وار "خالد" جاری کیا۔ پنڈت شمبو ناتھ وکیل نے ہفتہ وار "وکیل" ۱۹۳۵ء میں جاری کیا تھا۔

"صداقت" شیخ محمد عبداللہ اور ان کی جماعت کی جانب سے جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیر کچھ عرصہ محمد عبدالرحیم رہے۔ بعد میں محمد ایوب رینہ اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہ سال بھر کے اندر بند ہو گیا اور اس کی جگہ "ہدایت" جاری ہوا۔ جس کے ایڈیٹر پریم ناتھ بزاز تھے۔ اور "قلندر" کے فرضی نام سے لکھا کرتے تھے۔

۱۹۳۹-۴۰ء میں جو اخبار جاری ہوئے۔ ان میں "نور" اور "پیغام" قابلِ ذکر ہیں۔ "نور" محی الدین نور، ایم۔ ڈی۔ نور کے نام سے نکالتے تھے۔

"پیغام" ہفتہ وار قریشی محمد ایوب اور نظام الدین چشتی کی ادارت میں جاری ہوا تھا، لیکن ایک سال بعد بند ہو گیا۔

"پریم ناتھ کنہ جو کچھ عرصہ "مارتنڈ" کے ایڈیٹر بھی رہے تھے، ہفتہ وار "کشمیر" کے بھی مدیر رہے، جو اسٹیٹس پیوپلز پارٹی کا ترجمان تھا۔ "جہانگیر" ایک اور ہفتہ وار ایس۔ کیو قلندر نے جاری کیا تھا۔ جس میں مولانا مسعودی بھی لکھتے تھے۔ پیرزادہ محمد یحییٰ رفیقی بھی اس اخبار میں کام کرتے رہے۔ مشہور ماہرِ قانون پنڈت جیا لال کلم، جو ریاست کی عدالت العالیہ میں جج رہے تھے۔ تصنیف و تالیف اور صحافت سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی تصنیف "دی کشمیری پنڈتس" کا ذکر گذر چکا ہے۔ اردو میں وہ اچھے مضمون نگار بھی تھے۔ ایک ہفتہ وار اخبار "قومی درد" کے نام سے انہوں نے ۱۹۴۳ء میں جاری کیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر عمر بٹ تھے۔ مولوی یوسف شاہ ایک اور اخبار "الانوار" کے بھی بانی تھے۔ یہ مذہبی اخبار تھا جس کے ایڈیٹر نور الدین تھے۔

۹۔ ایک دو مخصوص مفادات کے اخبار یا رسایل بھی اس زمانے میں جاری ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک کشمیر کے جاگیر داروں کی متحدہ جماعت کی جانب سے ان کے ترجمان کے طور پر "اتحادِ جاگیر داراں" کے نام سے ہفتہ وار کی صورت میں جاری کیا گیا تھا۔ لیکن یہ زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا۔ اور بند کر دیا گیا۔ ایک اور "دیہاتی دنیا" ماہ نامہ تھا۔ جو محکمۂ ترقیات دیہات کی جانب سے جاری ہوا تھا۔ دیہات سدھار کے مسائل، پنچایتی اغراض و مقاصد کو فروغ دینے کا کام اس سے لیا جاتا تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر شیخ غلام قادر مقرر ہوئے تھے۔ بعد میں پنڈت گنگا دھر بھٹ دیہاتی بھی کچھ عرصہ اس کے ایڈیٹر رہے۔ کچھ سال بعد، اس کے انتظام میں تبدیلی ہوئی اور موجودہ زمانے میں "دیہات سدھار"

کے روپ میں شایع ہو رہا ہے۔

"مارتنڈ" وادی کے قدیم اخباروں میں سے ہے اور مسلسل ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک شایع ہوتا رہا۔ جیسا کہ اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔ پنڈت کشیپ بندھو نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن یہ کسی فرد کا اخبار نہیں تھا بلکہ سناتن یووک سبھا' کشمیر کا ترجمان تھا۔ اور اس زمانے کے سارے اہلِ قلم اور خاص طور پر ادبی ذوق رکھنے والے پنڈتوں کا مرکزِ نظر اور ان کی قلمی مساعی کا محور رہا۔ اس میں خبروں کے علاوہ پنڈتوں کے مذہبی اور ملی مفاد، مذہبی تہواروں، مشاہیر، ادبی مشاغل، غرض ہر نوع کے مضامین شایع ہوتے رہے۔ مزاح نگاری کے ذوق کو بھی اس کے پہلے ایڈیٹر کشیپ بندھو، پردیسی اور کچھ اور لکھنے والوں نے فروغ دیا۔ اس کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن خاص طور پر دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ اس کے ایڈیٹر بدلتے رہے۔ کشیپ بندھو کے بعد پنڈت گواشہ لال کول نے اس کی ادارت سنبھالی۔ کچھ عرصہ شمبھو ناتھ کول اس کے ایڈیٹر رہے۔ پریم ناتھ کنہ جن کا ذکر دوسرے اخباروں کے سلسلے میں گذر چکا ہے۔ چند سال اس کو مرتب کرتے رہے۔ اس وقت وہ "ملاپ" دہلی کے ایڈیٹر ہیں۔ پنڈت اومکار ناتھ کول کا بھی اس کے حلقۂ ادارت سے تعلق رہا۔ وہ اچھے انشاء پرداز ہیں اور کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ پچھلے آٹھ دس سال سے بدری ناتھ مٹو کے ہاتھ میں اس کی عنانِ ادارت رہی۔ پچھلے سال ملکیت کی نزاع کے سلسلے میں یہ اخبار بند ہو گیا۔

اس کے لکھنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے، بلکہ شاید ہر پنڈت جو قلم استعمال کر سکتا تھا، اس کے لئے "مارتنڈ" کے صفحات وقف تھے کئی مسلمان لکھنے والوں نے بھی اس کی خدمت کی اور یہ بھی درست ہے کہ خاص طور پر پنڈتوں میں "وِتستا" "ہمدرد" کے ساتھ ساتھ اُردو کا علمی اور ادبی ذوق پیدا کرنے

اور اسے سنوارنے اور ترقی دینے میں اس اخبار کی خدمات یادگار رہیں گی۔ اس کے قابلِ ذکر لکھنے والوں میں پریم ناتھ پردیسی، دینا ناتھ دلگیر، پنڈت نارا چند ترسل، پنڈت دشوا ناتھ در ماہ جوی، پنڈت دینا ناتھ نادم، علامہ عامل درویش بھی شامل تھے۔

"خدمت" "مارتنڈ" کی طرح وادی کے طویل المیعاد اخباروں میں سے ہے۔ "مارتنڈ" پچھلے سال بند ہوگیا۔ لیکن یہ اخبار اب بھی جاری ہے اور حکومتی کانگریس پارٹی کے ترجمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا اجرا مولوی محمد سعید مسعودی کے ہاتھوں ۱۹۳۹ء میں عمل میں آیا تھا۔ لیکن ادارت میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہی۔ ۱۹۴۳ء میں اس کے ایڈیٹر خواجہ غلام رسول عارف رہے۔ اور یہ ہفتہ وار سے روزانہ کردیا گیا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز کا بھی اس سے تعلق رہا۔ مولوی غلام احمد میر کشفی، مولوی فاضل بھی کافی عرصہ تک اس کو مرتب کرتے رہے۔

اس وقت نند لال واتل اس کے ایڈیٹر ہیں۔ واتل بھی مولانا مسعودی اور کشیپ بندھو کی طرح صحافت میں خصوصیت حاصل کرچکے ہیں۔ وادی کے کئی اخباروں کی ادارت سے ان کا تعلق رہا۔ اسی وقت ۱۹۴۹ء سے وہ "خدمت" کو ترتیب دے رہے ہیں۔ سری نگر کے پنڈتوں کے ایک خاندان سے ان کا تعلق ہے۔ تعلیم یہیں سری پرتاپ کالج میں پائی۔ ۱۹۳۹ء میں بی۔ اے کیا۔ اور زمانہ طالب علمی سے اُردو انشا پردازی اور ادب کا انہیں ذوق رہا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد ہی وہ صحافت کے میدان میں اتر گئے اور ۱۹۳۹ء میں ہفتہ وار اخبار "ہمالہ" کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے جب "ہمدرد" کو ہفتہ وار سے روزنامہ میں تبدیل کردیا۔ تو بزاز کے ساتھ کام کرنے لگے۔ "نوجگ" روزانہ کی ادارت کے فرائض ۱۹۴۷ء میں سنبھالے اور اب

"خدمت" کے ایڈیٹر ہیں۔

"خدمت" کو ریاست کے اخباروں میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ہمیشہ حکومتی جماعت کا ترجمان رہا۔ اس طرح اس کی خبروں اور اس کے اداریوں کو ایک اہمیت حاصل ہے۔ اس کو ابتداء سے جیسے اچھے صاحب طرز اور اہلِ قلم مُرید ملے۔ ان کی بدولت اس کو ادبیت سے لگاؤ رہا۔

"خدمت" سے متوسل صحافت کا ذوق رکھنے والوں میں پنڈت شری دھر رینہ زار بھی ہیں۔ زار کے علاوہ پنڈت مکھن لال تحو بھی اسی اخبار سے وابستہ ہیں۔ تحو کشمیری کے اچھے شاعر ہیں۔

پنڈت کاشی ناتھ اُپمہ کنول، جو اس وقت محکمہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے ڈپٹی سیکرٹری کے عہدہ پر مامور ہیں۔ ابتداء میں سیاست کے میدان میں رہے اور صحافت سے بھی ان کا تعلق رہا۔ وہ بخشی غلام محمد کے پرائیویٹ سیکرٹری بھی رہے۔ ان کی تعلیم اُردو میں اونچے درجے کی ہوئی ہے اور جموں و کشمیر یونیورسٹی سے ادیب فاضل کا امتحان کامیاب کیا ہے۔ انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ابتداء میں "ہمدرد" کے حلقۂ ادارت میں بھی کام کیا۔ اور "خالصہ گزٹ" کے بھی کچھ عرصہ ایڈیٹر رہے۔ وہ مضمون نگار بھی ہیں۔ چنانچہ ان کے مضامین "ہمدرد" اور دوسرے اخباروں میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ ۲۵۔ فروری ۱۹۴۳ء کے شمارہ "ہمدرد" میں ان کا "تاجکستان اور مسلمان" کے عنوان سے ایک اچھا مطالعہ شایع ہوا ہے۔

پنڈت رادھا کرشن کاک وادی کے قدیم اہلِ صحافت میں ہیں۔ مختلف اوقات میں وہ کئی مؤقر اخباروں جیسے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور، "سٹیٹسمین"، "ہندو" کے علاوہ یونائیٹڈ پریس آف انڈیا کے بھی کشمیر کے لئے مراسلہ نگار رہے۔ ۱۹۳۸ء سے پہلے وہ "ملاپ" لاہور کے لئے مراسلہ نگار مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں

"امرتا بازار پتریکا" نے انھیں ریاست اور ملحقہ علاقوں کے لئے اپنا نامہ نگار مقرر کیا۔ ۱۹۶۲ء سے وہ ساری ذمہ داریوں سے دست ہو کر صرف "سٹیٹسمین" کے لئے لکھ رہے ہیں۔

کاک کی تعلیم سری پرتاپ کالج میں ہوئی۔ انگریزی سے ان کی دلچسپی کی بدولت وہ "پرتاپ" کے حصہ انگریزی کے ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ ریاست کی سرکاری ملازمت بھی کی اور محکمۂ مردم شماری میں دو سال تک کام کیا۔ اس کے بعد ملازمت ترک کر کے، صحیفہ نگاری کی تربیت بعض معتبر اہلِ صحافت جیسے کرنل جانسن، اور جے۔ ایچ سانڈرس کی نگرانی میں حاصل کی۔ کرنل جانسن، جو "سٹیٹسمین" اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نمائندہ تھے، ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ وسط ایشیا اور لداخ، کاک کے مطالعے کے خصوصی موضوع رہے ہیں۔ کشمیر کی تاریخ اور تہذیب پر ریڈیو کے لئے انہوں نے کئی مضامین لکھے اور نشر کئے۔ مقامی اخباروں میں بھی ان کے مضامین خاص طور پر سالِ نو کے موقعے پر شایع ہوتے رہے ہیں۔

اس زمانے میں بھی کئی کشمیری اہلِ قلم جو کشمیر سے باہر تھے، کشمیر سے اپنے لگاؤ کے نتیجے کے طور پر اپنے اپنے شہروں سے اخبار نکالا کرتے تھے، جن میں کشمیر سے متعلق خبروں کا بیشتر حصہ ہوتا تھا۔ ان میں "بہارِ کشمیر" "صبحِ کشمیر" "اخبارِ کشمیر" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "اخبارِ کشمیر" فوق نکالتے تھے۔ "بہارِ کشمیر" ماہوار تھا۔ اس رسالے کے پہلے ایڈیٹر پروفیسر پران ناتھ کرواین، پروفیسر فورمن کرسچین کالج لاہور تھے۔ بعد میں اس کی ادارت پنڈت لچھمی نارائن کول کے سپرد ہوئی۔ دوسرے دور میں ڈاکٹر ہر پرشاد منگلو اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ رسالہ کشمیری پنڈت سبھا، لاہور کا ترجمان تھا۔ اس سبھا کے سرپرست راجہ نرندر ناتھ کول تھے۔

"صبحِ کشمیر" بھی لاہور سے نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر رگھوناتھ کول تھے۔ "بہارِ کشمیر" کے مینیجنگ ایڈیٹر پنڈت لچھمی نارائن کول، فارسی اور اُردو ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور صحافت کے ساتھ ان کی دلچسپی نے انہیں "بہارِ کشمیر" کے علاوہ، اور کئی اخباروں سے متوسل رکھا۔ وہ احرار پارٹی، لاہور کے روزنامہ "آزاد" کے بھی مینیجنگ ایڈیٹر رہے۔ رسالہ "صفر" ماہوار کے ایڈیٹر اور سر تیج بہادر سپرو کے رسالے "کشمیر درپن" سے بھی ان کا تعلق رہا۔ لاہور سے ایک انگریزی رسالہ "ناردرن انڈیا بی جرنل" نکلتے تھے اور اس میں ایک حصہ اُردو کا بھی ہوتا تھا۔ سیالکوٹ سے لالہ ہنسراج رہبر ہفتہ وار "رہبر" کے نام سے شائع کرتے تھے۔

لالہ ملک راج صراف نے اپنی تصنیف "ففٹی ایرز" میں کشمیر سے باہر رہنے والے کشمیریوں یا کشمیر سے ہمدردی رکھنے والوں نے جو اخبار جاری کئے تھے۔ ان کی تعداد کافی بتائی جاتی ہے، لیکن ان کی تفصیل نہیں دی۔ صراف نے ایک خاص اخبار "شادی" کا تذکرہ کیا ہے، جو ولی اللہ مخدومی نکالتے تھے۔ اور یہ غالباً امرتسر سے نکلتا تھا۔ اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ اہلِ کشمیر کے درمیان شادی بیاہ کے رشتے طے کرانا چاہتا تھا اور یہ اخبار کشمیریوں اور پنجابیوں کے درمیان ناطوں پر زور دیتا تھا۔ چنانچہ اس کے سرنامہ پر یہ کشمیری شعر لکھا ہوتا تھا۔

پنجاب کشمیر، کُنُے کرُو　　تیلہِ نو مرُو تیلہِ نو مرُو

(پنجاب اور کشمیر کو ایک کرو، پھر ہم نہیں مریں گے)

کشمیر میں اخباری صحافت کی جیسی گہما گہمی رہی۔ ادبی صحافت سے ویسی دلچسپی نہیں رہی۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہفت روزہ اخبار اور روزناموں کے ادبی ایڈیشن، اس کمی کو پورا کر دیتے تھے۔ ایک اور وجہ بھی تھی، کالجوں اور بعض سکولوں کی جانب سے بھی میعادی رسالے شائع ہوتے تھے۔ اور ان سے پڑھے لکھے اصحاب کے ذوق انشاء کی تسکین ہو جاتی تھی۔ اس کے باوجود ایک اچھے بلند پایہ ادبی رسالے کی ضرورت سارے شعور رکھنے والے اہل ذوق کو باقی رہی۔ اس کا کچھ اندازہ ابتدائی دور کے ایک رسالے "سواستکا" کے اس اقتباس سے ہوتا ہے۔ اس کے مدیر مشہور اردو اور ہندی ادیب پنڈت ویر وشیشور تھے۔ وہ جنوری ۱۹۴۳ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:-

"ریاست میں ایک ادبی جرنل کی کمی کو محسوس کیا جا رہا ہے ..... جو یہاں کے ادباء کے خیالات پریشاں کو ایک سنگم پر لا سکے اور ملک کے ادباء کی آواز کو ملا کر ایک ایسا سوز و ساز پیدا کر سکے، جو ریاست کی ادبی فضا میں وجد آفرین اور مسرور کن ارتعاشں پیدا کرنے کا موجب ہو۔"

ان کی اسی خواہش نے انہیں اس بات پر ابھارا تھا کہ ایک طبی رسالہ جو اردو میں کچھ پہلے سے نکل رہا تھا، اس کو اس کے مدیر کے تعاون سے ادبی رسالے میں تحویل کریں۔ یہ ۱۹۴۰ء میں ادبی روپ میں جلوہ گر ہوا اور خود ویر وشیشور اس کے مدیر بنے۔

ویر جی نے اس سے پہلے اس بارے میں جو کوششیں ہوئی تھیں ان کی طرف بھی اجمالی اشارے کئے ہیں کہ اس سے پہلے ایک ادبی رسالہ "ہمالیہ"

جاری کیا گیا تھا لیکن وہ زیادہ عرصہ چل نہ سکا۔ ریاست کے اخباروں کے ادبی شماروں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو دراصل ملک کے اہلِ ذوق اصحاب کی خواہشوں کی تکمیل کا ایک ذریعہ تھے۔ پھر اپنی کوشش کا ذکر کیا ہے کہ وہ خود "نرگس" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالنا چاہتے تھے لیکن کچھ مسائل کے سبب یہ رسالہ جاری نہ ہو سکا۔ انہوں نے ایک اور کوشش "جہلم" کا ذکر نہیں کیا ہے، جو سری نگر کے ابتدائی رسالوں میں سے تھا۔ یہ ساری کوششیں انتظامی ناتجربہ کاری کا شکار ہو گئیں۔

"سواستکا" کو ادبی روپ دیتے ہوئے، دیر وشیشور کے پیشِ نظر "مخزن" لاہور تھا، جو کشمیر میں بہت مقبول تھا اور واقعتاً، یہ کشمیر کے اہلِ ذوق اصحاب کی فکر کی اشاعت کا بھی واسطہ بن گیا تھا۔ اس میں شک نہیں، ادبی "سواستکا" اب طبعی نہیں رہا تھا، تاہم اپنی پرانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے، وہ طب پر بھی مضامین شایع کرتا تھا۔ اس کے لکھنے والوں میں گنگا دھر بھٹ دیہاتی، دلکش کاشمیری، پریم ناتھ پردیسی، پنڈت دینا ناتھ وارکیو شاہد، غلام رسول نازکی، غلام محمد طاؤس، علامہ عاؔل درویش، پنڈت دینا ناتھ نادؔم، رہ الک کاشمیری، برؔق کاشمیری، پنڈت شیام لال ولی تیرتھ کاشمیری، ملک محی الدین قمر قمرازی، میرزا کمال الدین شیدا، نیاز کاشمیری اور کچھ دوسرے خوش فکر شامل تھے۔

رسالے میں خواتین کی دلچسپی کے موضوعات پر بھی مضامین شایع ہوتے تھے اور ایک حصہ بچوں کی دلچسپی کے مضامین اور نظموں کے لئے وقف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کوشش بھی دیرپا ثابت نہیں ہوئی، تاہم اپنی دو تین سال کی مختصر زندگی میں اس کے شمارے، پردیسی کی ایک دو اچھی کہانیوں، جیسے اپنی دو تین سال کی مختصر زندگی میں اس کے شمارے، پردیسی کی ایک دو اچھی کہانیوں جیسے "کلس" اور "لی لو"۔ گنگا دھر بھٹ دیہاتی کے ایک اچھے ڈرامے "سپاہی" اور کچھ مزاحیہ پاروں، پنڈت

کشیپ بندھو کی ایک دو نظمیں جیسے "برق و شرار" اور "نالۂ نیم شب" شیام لال ولی تیرتھ کے افکار اور خود دیر جی کے "میرا ساجن" ادبِ لطیف کے انشائیے جیسے "گمنام قبر" "گنبد" وغیرہ کو منظرِ عام پر لانے کا باعث ثابت ہوئے۔

کچھ اور لکھنے والوں کے نام جو "سوا سنگا" کے لکھنے والوں میں ملتے ہیں، وہ پنڈت بشمبر ناتھ کول کو یراج پنڈت جانکی ناتھ در، پنڈت شنکر ناتھ کول سفیر بی اے۔ ایس شنکر ناتھ کول قصبۂ ڈورو کے مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ جانکی ناتھ در، طلبا کے موضوعات پر لکھتے تھے۔ بشمبر ناتھ کول "دلبش" کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ غالباً رسالے کو مقبول بنانے کے مقصد سے ویریشیشور نے فلموں پر تبصروں کا بھی آغاز کیا تھا۔ اور یہ تبصرے "فلمی بھیدی" کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔

اس دور میں سری نگر کے کالجوں خاص طور پر سری پرتاپ کالج اور امر سنگھ کالج سے معیاری ماہنامے بھی نکلنے لگے تھے۔ سری پرتاپ کالج، جو کشمیر میں سب سے قدیم کالج ہے۔ اس کے اساتذہ اور طلباء میں ادبی ذوق اس صدی کے تیسرے دہے کے آغاز میں بہت فروغ پر تھا۔ کالج کے پرنسپل اور اساتذہ میں کئی صاحبِ ذوق اساتذہ موجود تھے۔ پرنسپل اقبال کشن شرگا اور اس کے بعد خاص طور پر پرنسپل محمد دین تاثیر کے عہد میں کالج میں ایک ادبی انجمن اردو سبھا کے نام سے قائم تھی۔ جس کی کچھ تفصیل ادبی اداروں کے ماتحت آرہی ہے۔ کالج سے ایک میقاتی رسالہ "پرتاپ" نکلتا تھا۔ جس میں اساتذہ اور طلباء کے مضامین شامل ہوتے تھے۔ "پرتاپ" اردو کے علاوہ اور چار زبانوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ رسالے کے نگران اساتذہ میں پروفیسر طیب شاہ صدیقی ضیغم، پروفیسر محمد ابراہیم اور پروفیسر حامدی کاشمیری جیسے صاحبِ ذوق ادیب شامل رہے۔ رسالے میں انشائیوں، عام مضامین، نظموں، غزلوں کے علاوہ بعض اچھے پایہ کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی شایع ہوتے رہے۔

کالج میں طلباء کی زیادتی کی وجہ سے ایک نیا کالج، امر سنگھ کالج کے نام سے قایم ہوا تو تاثیر اس کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ اور ان کے اساتذہ میں، پروفیسر محمود ہاشمی اور ڈاکٹر اپوربسومناتھ قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر طیب شاہ ضیغم بھی اس کالج میں درس دیتے رہے۔ تاثیر اپنے ساتھ، سارا ادبی ذوق لے کر آئے تھے۔ اس لئے جلد ہی کالج کے اساتذہ اور طلباء دونوں میں شعر و ادب کا ذوق پرورش پانے لگا۔ اس صدی کے چوتھے دہے میں کالج سے ادبی رسالہ "لالہ رُخ" شایع ہونے لگا تھا۔ اساتذہ اور طلباء کے علاوہ مشہور ادیبوں اور شاعروں کے افکار کے لئے بھی اس میں جگہ تھی۔ چنانچہ پریم ناتھ پردیسی، شہ زور کشمیری اور اثر لکھنوی بھی اس رسالے کے لئے لکھتے رہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکم بھی اس کالج کے پرنسپل رہے۔ رسالے کے بعض شماروں میں کئی اچھے تنقیدی مضامین، افسانے اور نظمیں شایع ہوئی ہیں۔

ادبی ذوق کالجوں کے علاوہ سکولوں کے طلباء میں بھی نمایاں تھا۔ ماہوار رسالے "جہلم" کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ گورنمنٹ ہائی اسکول فتح کدل سے شایع ہونے لگا تھا۔ اس سکول کے نمایاں طالب علموں میں پیتامبر ناتھ در فانی و چارناگی بھی تھے۔ جن کا تذکرہ، اسی باب میں گذر چکا ہے۔

ایک فتویٰ

۱۹۳۶ء (م ۱۳۵۵ھ) میں سری نگر کی ایک مسجد میں مٹی کے تیل کے چراغ کی بجائے بجلی نصب کرنے کے بارے میں نزاع پیدا ہوئی جس پر ایک استفتا سربرآوردہ علما کے یہاں روانہ کیا گیا تھا۔ فتویٰ طلب مسائل یہ تھے:۔

"وقف کی آمدنی سے کفایت کے علاوہ موقوف میں خرچ لگانا جائز ہے یا نہیں۔ اور کیا متولی کو ایسا کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ مثلاً چراغ کی روشنی جس کے مصرف میں چند آنے فی ماہ لگتے ہیں، مسجد کے لئے کفایت کرتی ہو اس صورت میں اگر متولی اپنی مرضی سے چراغ کی بتیاں، جن کی فیس وغیرہ میں چراغ کی نسبت تقریباً سہ چند صرف ہوتا ہے، لگوائے۔ تو کیا یہ ساری فیس یا جس قدر چراغ کی نسبت اس میں خرچ زیادہ ہو، وقت کی آمدنی سے متولی ادا کر سکتا ہے؟ یا یہ کہ وہ اس کے لئے خود ضامن ہوتا ہے۔"

اسی سلسلے میں کچھ اور سوالات درج کئے گئے ہیں اور ان کے جوابات بھی لکھے ہیں۔ اصل مسئلے کے بارے میں جو فتویٰ دیا گیا تھا، نیچے درج ہے:۔

"مسجد کے وقف کی آمدنی سے قدرِ کفایت سے علاوہ مسجد کے کسی خرچ میں لگانا درست نہیں ہے۔"

ہر سوال کے جواب کے ساتھ، ماخذی کتابوں کے نام بھی درج ہیں، جن پر یہ فتویٰ مبنی ہے۔ ان میں "دُرِ مختار" "رد المختار" "فتاویٰ عالمگیری" "بحر الدقائق" کے نام بھی شامل ہیں۔ فتوؤں کے آخر میں جن علما کی رائیں عربی، فارسی یا اُردو میں درج ہیں۔ اور دستخط اور مہریں ثبت ہیں۔ وہ اس عہد کے جید علماء میں سے تھے۔ ان کے نام

۱۔ مفتی اعظم مولانا شریف الدین۔ جن کی رائے عربی میں لکھی ہے

۲۔ مُفتی غلام محی الدین جامعی "اَصابَ مَن اُجابَ" اہالی کو لازم ہے کہ بروفق شرع عملدرآمد کریں، اوروں کو بھی اطلاع دیویں تاکہ خلافِ شرع سے بچیں۔

۳۔ مُفتی نورالدین جامعی۔ "المجیبُ مصیبُ"

۴۔ مُفتی ضیاء الدین۔ "اَصاب المجیب فیما اجاب تکا وغیرہ۔ بجلی پر زائد از خرچ، چراغ خرچ لگانا مالِ وقف سے جائز نہیں۔"

۵۔ مفتی محمد قوام الدین (مہر)۔ "جوابات محررہ درست اور صحیح بلکہ قابلِ عمل ہیں۔ مسلمانوں کو لازم ہے کہ مسائلِ صدر پر واقف ہوکر خود عمل کریں اور باقی مسلمانوں کو عمل کرنے کی تحریک کرتے رہیں اور سعادتِ دارین حاصل کریں۔"

۶۔ مفتی محی الدین فتح کدلی (مہر)۔ عربی اور فارسی میں رائیں لکھی ہیں۔

۷۔ مفتی محمد سعادت مورخ (مہر) فارسی میں رائے۔

۸۔ مولوی احمد علی شاہ جامعی (مہر) عربی میں رائے۔

۹۔ مُفتی صدرالدین جامعی۔ "المجیبُ مُصیب" اہالیانِ اسلام کو لازم بلکہ واجب ہے کہ در ہر امور خواہ دینوی ہو یا اُخروی اتباع شریعت مطہرہ وتعمیل احکام شرعیہ پابند ہوں۔"

۱۰۔ میرک شاہ (ملارٹہ) کی رائے خود ان کے اپنے قلم سے درج ہے:۔

" اوقاف مسجد کی آمدنی سے فرش اور روشنی میں صرف اسی قدر صرف کیا جاسکتا ہے جس سے ان چیزوں کی ضرورت بقدرِ کفایت رفع ہوجائے۔ قدر کفایت سے زاید مقدار میں صرف کرنے کی صورت میں متولی پر ضمان آتا ہے۔ یعنی متولی کو اپنی جیب سے ادا کرنا پڑے گا اور اس

صورت میں کہ چراغ کا خرچ اہلِ محلہ ادا کرنے پر آمادہ ہیں اور بجلی لگانے کی صورت میں، روشنی کا خرچ وقف سے کرنا پڑتا ہے، اگر متولی ایسے اوقاف سے جن کی واقفین نے صراحت کے ساتھ بجلی کے لئے اوقاف میں حصہ نہیں رکھا ہے، بجلی لگاتا ہے۔ تو ایسا متولی قابلِ تولیت ہی نہیں۔"

۱۱۔ محمد یوسف علی، میر واعظ۔ فارسی میں خود ان کے قلم سے درج ہے۔

ایک عرضداشت

یہ عرض داشت ایک تاریخی دستاویز ہے، جو مسلمانانِ کشمیر کی جانب سے مولانا مولوی محمد یوسف شاہ، میر واعظ کشمیر کی قیادت میں، مہاراجہ ہری سنگھ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ اس سے ریاست کی زبان کے بارے میں اہلِ کشمیر کی اکثریت کے مطالبوں اور اس زمانے میں ریاست کی لسانی صورتِ حال پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ عرضداشت طویل ہے۔ اس لئے اس کا اہم اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے:-

"عرضداشت منجانبِ مسلمانانِ کشمیر بوساطتِ مولانا مولوی محمد یوسف میر واعظِ کشمیر لعالی خدمت حضورِ پُرنور، اندر مہندر بہادر سُپتر سلطنتِ انگلیشیہ، مہاراج ادھیراج، ہز ہائی نیس مہاراجہ صاحبِ بہادر، والئ سلطنت جموں وکشمیر۔

"۱۸۴۶ء میں جب کہ حضور کے نیک نیت اسلاف کے قبضے میں صوبۂ کشمیر آیا، اس وقت یہاں بھی دفتری، کاروباری اور درسی

زبان باقی کل ہندوستان کی طرح فارسی تھی، جو تقریباً سات سو سال تک متواتر اسی حیثیت سے چلی آتی تھی۔ اس کے بعد بھی قریباً اور نصف صدی تک یہی سلسلہ بے کم و کاست جاری رکھتے ہوئے قانوناً تسلیم کیا گیا کہ صوبہ کشمیر کی دفتری زبان، فارسی اور صوبہ جموں کی اُردو ہے۔ چنانچہ یہاں کی قانونی کتابوں میں اس مضمون کے سرکلر ابھی تک موجود ہیں۔ ایک سرکلر ۱۲۵ مجریہ سمت ۱۹۴۵ بکرمی (۸۸-۱۸۸۷ء) مجموعہ سرکلرات جوڈیشل، حصہ اول میں ہے ..... غیر مسلم اہل دفاتر نے اپنی زبان کو قانوناً فارسی یا اُردو تسلیم کرایا ... یہاں یہ سوال پیدا کیا جاسکتا ہے کہ اُردو نے پھر کیوں فارسی کی جگہ لی ؟ جناب والا، یہ اسی رسم الخط کی یکسانیت اور جملوں اور فقروں کی تراکیب، بندش اور اسلوبِ بیان کی یک رنگی کی خوبی ہے۔ زبان (فارسی) بدلنے کے بعد نئی زبان (اُردو) کے سمجھنے، لکھنے، پڑھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ ... حضور کی قلمرو کے دونوں صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہ بھی غالب اکثریت، یعنی ایک صوبہ میں ۹۷ فیصدی اور دوسرے میں ۷۵ فیصدی سے متجاوز ہے۔ پھر حضورِ والا کی یہ غالب اکثریت والی رعایا اس ایک اور صرف ایک وجہ عداوت کی بنا پر اس عام فہم زبان (اُردو) کو خارج البلد کرنے کی کوشش کو اسلام دشمنی سے تعبیر کرنے میں حق بجانب نہیں ہے ..... یہاں مسلم رعایا نے تھوڑے ہی عرصہ سے تعلیم میں کچھ ترقی کرنی شروع کی تھی تو وہ بھی اسی اُردو کی بدولت۔ اب اگر یہ دوسری چیز ان پر جبراً اطلاق کی جائے گی تو یقیناً وہ بہت ہی پیچھے ہٹ جائیں گے .....“

یہ عرضداشت میر واعظ حافظ غلام رسول شاہ نے اپنے ایک خط کے ساتھ اس زمانے کے وزیرِ اعظم، مسٹر آینگار کے نام بھیجی تھی۔ خط بھی ذیل میں منقول ہے۔

"جناب پرائم منسٹر صاحب!

تسلیمات ۔ تبدیلِ زبان و رسم الخط کے سلسلے میں اس بہی خواہ سرکار نے آپ سے پچھلی ملاقات میں کچھ سرسری گفتگو کی تھی جس میں قرار پایا تھا کہ احکام کے متعلق مسلمانانِ کشمیر کی طرف سے جو اعتراضات ہو سکتے ہیں، وہ بصورت یادداشت پیش کیے جائیں۔"

اسی گفتگو کے سلسلے میں مذکورہ بالا یادداشت مہاراجہ کی خدمت میں ایک عرضداشت کی صورت میں مرتب اور پیش کی گئی تھی۔

ادارے

اس زمانے میں جموں و کشمیر میں کئی علمی اور ادبی ادارے، علمی اور ادبی ذوق رکھنے والے اصحاب کی دلچسپی اور مساعی کی بدولت، جموں اور سرینگر میں قائم تھے یا نئے قائم ہوئے۔ اکثر ادارے کالجوں، جیسے سری پرتاپ کالج یا امر سنگھ کالج سے وابستہ تھے جن میں اساتذہ اور طلباء دونوں حصہ لیتے تھے۔ یہ ادارے عموماً بزمِ ادب کے نام سے موسوم تھے۔ کالجوں کے علاوہ کئی معتبر اخبار جیسے "دِلستا" "ہمدرد" "مارتنڈ" "خدمت" وغیرہ بھی کسی حد تک اداروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن سے قابلِ اعتبار لکھنے والے وابستہ تھے۔ اور کبھی کبھی علمی اور ادبی محفلیں بھی اُن اخباروں کے اہتمام سے منعقد ہوتی تھیں، جن میں ایک آدھ کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے۔

ان سے ہٹ کر ادبی مذاکرات کے مقصد سے جو ادارے قائم ہوئے تھے ان میں سے ایک کشمیر رائیٹرز لیگ تھی۔ جس کے قیام میں شیام لال ولی تیرتھ کاشمیری کی

کی مساعی کو دخل تھا اور اس کے اراکین میں پریم ناتھ پردیسی، پیرزادہ غلام احمد مہجور، سومناتھ ترجھل، سومناتھ زتشی، پنڈت گنگادھر بھٹ دیہاتی، شاد کشمیری وغیرہ شامل تھے۔ اور اس کے اہتمام سے شعر و سخن اور علم و ادب کی محفلیں وقتاً فوقتاً منعقد ہوتی تھیں۔ ایک اور ادارہ اہلِ ریڈنگ روم کے نام سے بھی قایم تھا۔ جس کے قیام کے لئے مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے خاص طور پر اجازت اور منظوری حاصل کی گئی تھی۔ اس ریڈنگ روم میں ملک بھر کے اردو اخبارات آتے تھے اور اس کے اراکین مل بیٹھ کر شعری اور ادبی مذاکرات میں حصہ لیتے تھے۔ شیام لال ولی، اس کے بھی بانی مبانیوں میں سے تھے۔

شیخ محمد عبداللہ جب علی گڈھ سے تعلیم کی تکمیل کرکے آئے تو ان کے اور ان کے چند رفقاء کے ذہن میں بھی نوجوانوں کی علمی اور ادبی دلچسپیوں کو ترقی دینے کے مقصد سے ایک ادارہ قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس کی پیش رفت میں انہوں نے مسلم ریڈنگ روم قایم کیا تھا۔ اس ریڈنگ روم میں بھی ملک بھر کے اردو اور انگریزی اخبار آتے تھے اور تعلیم یافتہ نوجوان یہاں اکٹھے ہو کر علمی، ادبی اور بعض وقت سیاسی امور پر بھی تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ آیندہ کے سیاسی کارکنوں کی تربیت گاہ بن گئی اور اگلے دور کی آزادی کی جدوجہد کے نیتا یہیں سے اٹھے۔

اردو سبھا۔

سری پرتاپ کالج سری نگر کے اساتذہ اور طلباء کی بزم تھی۔ یہ پہلے بزمِ ادب کے نام سے موسوم تھی، لیکن محمد دین تاثیر کے اس کالج کے پرنسپل مقرر ہو کر آنے کے بعد، اُن ہی کی تجویز سے بزم کا نام "اردو سبھا" میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس بزم کے اہتمام سے وسیع پیمانے پر علمی ادبی جلسے اور مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ علمی اور ادبی جلسوں میں

مشاہیر بھی بدعو کئے جاتے تھے۔ سر تیج بہادر سپرو نے اپنی تاریخی تقریر جن کا تذکرہ آگے آرہا ہے، اسی کالج اور اسی سبھا کے پلیٹ فارم سے کی تھی۔ کچھ عرصہ یہ بزم خاموش سی بھی رہی تھی۔ لیکن ۱۹۴۴ء میں اس کا احیاء ہوا۔

بزمِ اُردو، جموں و کشمیر

ستمبر ۱۹۳۴ء میں، سری نگر میں قائم ہوئی تھی۔ بزم کے مقاصد میں علمی اور ادبی محفلوں کے انعقاد کے علاوہ خاص طور پر مشاعروں کی محفلیں وسیع پیمانہ پر منعقد کرنا تھا۔ اس بزم کا پہلا مشاعرہ، مشن اسکول، سری نگر کے احاطے میں، ۷ ستمبر ۱۹۳۴ء کو منعقد ہوا تھا، جس کی صدارت پروفیسر نند لال کول طالبؔ نے کی تھی۔ اس موقع پر بزم کے عہدہ دار بھی چنے گئے۔ صدر، پنڈت دینا ناتھ چکن مستؔ کاشمیری، معتمد قیس شیروانی۔ دوسرے مشاعرے کی صدارت پروفیسر علیم الدین سالکؔ نے کی تھی۔ اور محفل میں وشوناتھ ماہؔ، مولانا مہرؔ شکوہ آبادی، اثرؔ عسکری، محمد الدین فوقؔ، فاضلؔ کاشمیری، غافلؔ کاشمیری، پنڈت رادھا کشن بھان جنوںؔ اور چودھری خوشی محمد ناظرؔ نے شرکت کی اور اپنا کلام سنایا۔ پروفیسر سالکؔ نے اپنے خطبۂ صدارت میں مشرقی شاعری کی خصوصیات کے علاوہ اُردو زبان کی تاریخ پر بھی مختصراً روشنی ڈالی تھی۔

بزم کا تیسرا مشاعرہ۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۳۴ء کو پروفیسر نند لال کول طالبؔ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ عبدالرحمٰن نیازی نے بھی اپنا کلام سنایا تھا۔

۷ ستمبر ۱۹۳۴ء کو بزم کا ایک کاروباری جلسہ منعقد ہوا تھا۔ جس میں یہ طے پایا کہ بزم کی دو شاخیں جموں اور کشمیر کی ہوں گی۔ ان دونوں شاخوں کے عہدیدار بھی منتخب ہوئے۔ کشمیر کی شاخ کے صدر پنڈت دینا ناتھ مستؔ، نائب

صدر میرزا کمال الدین شیدا اور معتمد حکیم برکت علی برکت۔ معتمد فائینانس حکومت جموں وکشمیر اور جموں کی شاخ کے نایب صدر میرزا مبارک بیگ مبارک اور شیخ غلام حیدر خان چشتی اور معتمد محمد اکبر اجگر منتخب ہوئے۔ ان عہدیداروں کے علاوہ ہر شاخ کے ایک ایک "امین" یا خزانہ دار کا بھی انتخاب ہوا۔ کشمیر کی شاخ کے امین پیرزادہ علی اکبر اور جموں کی شاخ کے لالہ گردھاری لال صراف تمنا، پروفیسر سالک اور محمد الدین فوق، بزم کے سرپرست مقرر ہوئے۔ فوق اس زمانے میں "اخبار کشمیری" نکالتے تھے۔

ایک اور بزم، کشمیری بزم ادب کے نام سے، میرزا غلام حسن بیگ عارف اور ان کے کچھ ساتھیوں کی مساعی سے ۱۹۴۴ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا مقصد بھی نوجوان ادیبوں میں شائستہ ادبی صلاحیتوں کو ابھارنا اور ان کے اظہار کے مواقع فراہم کرنا تھا۔ 'بزم ساغر'، کے نام سے شعر وسخن کی ایک انجمن، سری نگر میں قائم ہوئی تھی، جس کے سرگرم اراکین میں پنڈت زنار دن ٹینگ ساغر، پنڈت دینا ناتھ نادم، دینا ناتھ مست، پنڈت لسہ کول شائق، اور کئی نوجوان شاعر شامل تھے۔ علامہ عامل درویش گو اس بزم کے سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے۔ بزم کی محفلیں انہیں کی قیام گاہ، باغ نشاط کے قریب، گپت گنگا میں منعقد ہوتی تھیں۔ غزل کہنے کے لئے طرح مصرع دیا جاتا تھا اور ایک دو محفلوں کے لئے طرح مصرعہ ساغر کی غزلوں سے منتخب کیا گیا تھا۔

پس نوشت: پوٹھوہاری کے نامور شاعر میاں محمد بخش (جنہیں پنجابی اور پہاڑی زبان کے دعویدار اپنے اپنے حلقۂ لسانی سے منسلک قرار دیتے ہیں) ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں وفات پا گئے۔ وہ ضلع میرپور کے رہنے والے تھے۔ اُن کی تصنیف "سیف الملوک" کا درجہ پنجابی زبان میں ہیر رانجھا کے بعد آتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے پندرہ سولہ اور کتابیں لکھیں۔ تازہ تحقیق کے مطابق وہ ایک غیبی رمز کے تحت سرینگر آئے۔ اور شیخ احمد کشمیری (غالباً شیخ احمد تارہ بلی متوفی ۱۲۹۲ھ) سے سلیک و سلوک کے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ بعد میں باطنی ترغیب اور مرشد کے اشارے پر وہ خود حضرت شیخ نورالدین نورانی ولیؒ کی بارگاہ پر حاضری دینے کے لئے چرار شریف گئے۔ اسی طرح یہ بات بھی تذکروں میں بیان ہوتی ہے کہ حضرت شیخ مخدوم حمزہ کشمیری (وفات: ۱۵۷۶ء) جب چرار شریف جاتے تو تعظیماً کئی میل اِدھر ہی جوتے اتار کر ننگے پاؤں زیارت کی طرف سفر جاری رکھتے۔